حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور اُنکے معاصر اُردو شعرا

• ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کیلئے مقالہ •

غلام احمد لطف اللہ بدوی

بی۔ اے (آنرز)۔ ایم۔ اے

پروفیسر گورنمنٹ کالج شکارپور سندھ

•

زیر نگرانی

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب

ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی۔، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی۔ لٹ۔

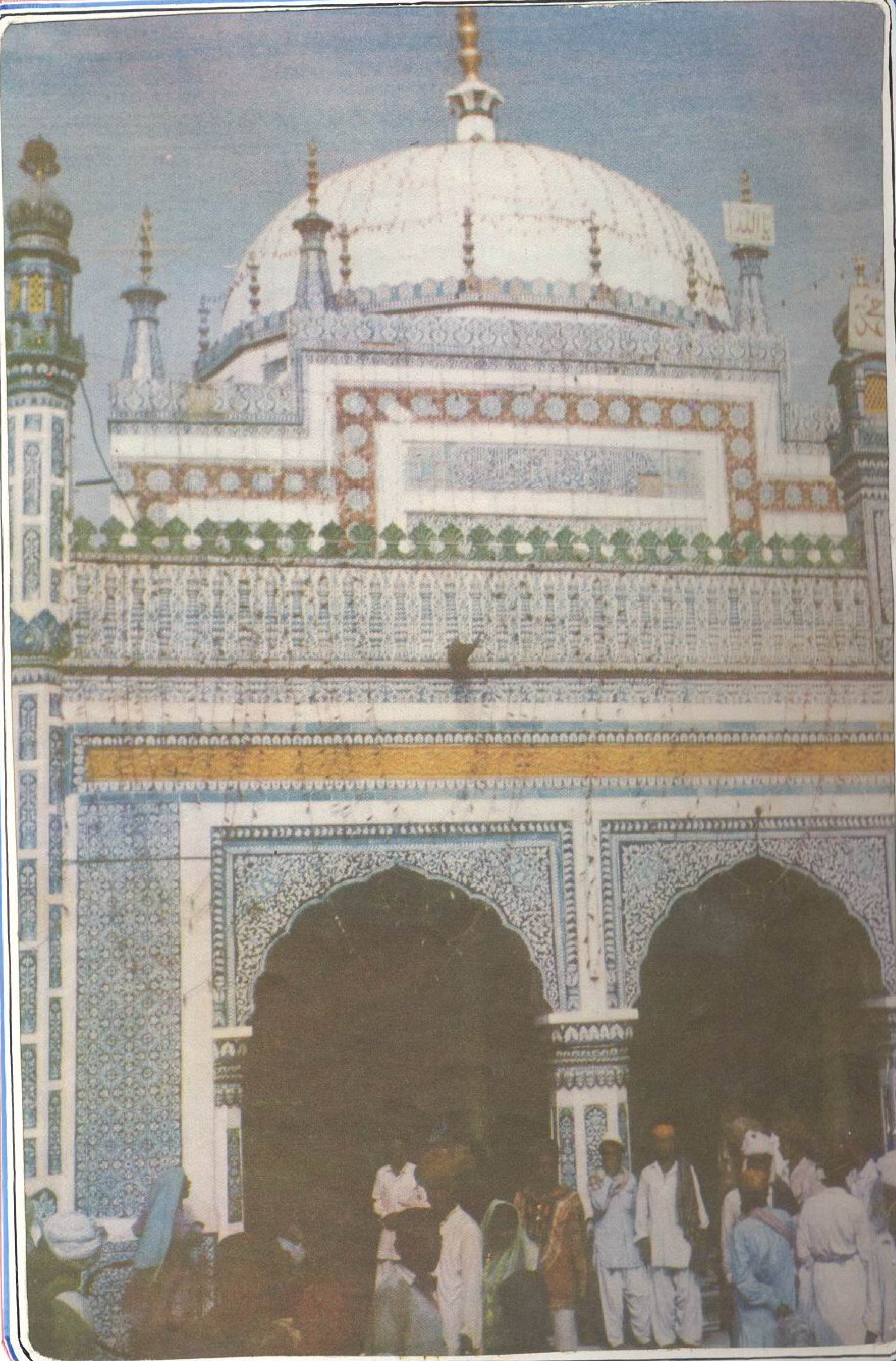
پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی جامشورہ

•

سندھ یونیورسٹی جامشورہ۔

سنہ ۱۹۷۵ء


GHULAM AHMED BADVI




بسم الله الرحمن الرحيم لا اله الا الله محمد رسول الله

فہرست مضامین

سلسلہ شمار — عنوان — صفحہ

حصۂ چہارم

گزارش

بیا و رید گر این جا بود زبان دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

۱۹۴۷ء کے شروع زمانہ میں، میں گورنمنٹ ہائی اسکول شکارپور سندھ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت سندھ کے ناظم تعلیمات مرحوم شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ہمارے اسکول میں تشریف فرما تھے۔ طالب علموں کو اسکول کے ہال میں جمع کیا گیا تھا اس لئے کہ علامہ موصوف طلبا کو چند باتیں کرنا اور ہدایات دینا چاہتے تھے۔ علامہ صاحب کی بزرگانہ و عالمانہ شخصیت اور اُن کی تقریر نے نوجوان طالب علموں پر بڑا اثر کیا۔ علامہ صاحب نے حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی شخصیت اور پیغام پر باتیں بتائیں۔ باتوں باتوں میں ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے کا ذکر بڑے سنجیدہ اور پر درد لہجے میں کیا۔ فرمایا "ایک مستشرق انگلینڈ سے آکر سندھ کے عظیم صوفی شاعر و بزرگ حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے سوانح اور کلام پر تحقیق کرکے ایک مقالہ لکھ کر آکسفورڈ یونیورسٹی لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر سکتا ہے، لیکن یہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ ہم میں سے ایسا کوئی بھی فرد نہیں ہے جو ہمت سے کام لیکر شاہ لطیف بھٹائیؒ پر تحقیق کر سکے۔" یہ جملے جن میں گویہ جادو کا اثر تھا، میرے دل پر بڑا اُثر کیا۔ اس دن سے میری یہ تمنا رہی کہ میں بڑا ہو کر حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ پر تحقیق کرونگا۔

ان دنوں میں میرے والد بزرگوار مخدومی پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم و مغفور، اللہ تعالیٰ اُنہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے شکارپور چھٹیوں پر آئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی دل کی مدعا آپ سے کہدی۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کی تقریر اور حضرت شاہ لطیف بھٹائیؒ، ڈاکٹر سورلے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے سوالات کیئے۔ والد بزرگوار نے میرے عزم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہدایت دیکر دعا فرمائی۔ کاش! وہ آج میرے ساتھ ہوتے اور میری یہ محنت دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

وقت اپنی رفتار سے گذرتا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ میری زندگی میں بھی عجیب انقلابات آئے لیکن شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے کلام کو پڑھنا اور سمجھنا میرا معمول بن گیا۔ ۱۹۵۸ء میں، ایم۔ اے سندھی ادب کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ مجھے شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ کا پھر سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا جس سے میری گذری ہوئی تمنا کی یاد تازہ ہوگئی۔ ۲۱ نومبر ۱۹۶۵ء کو میرے محسن و مربی بھائی پروفیسر احسان احمد بدوی کی کراچی میں شہادت ہوئی اور ۱۹ نومبر ۱۹۶۸ء کو میرے والد بزرگوار کی ناگہانی وفات کے بعد زیادہ تر میرا رجحان ادب کی طرف ہوا۔ میں نے اپنے بھائی مرحوم اور والد بزرگوار کے چھوڑے ہوئے ضروری ادبی کام مکمل کیئے جن میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کے لئے دو حصہ "کلہوڑا خاندان کا زوال اور تالپوری حکومت کا آغاز" مکمل کرکے دیا۔ جو ۱۹۷۱ء میں شایع ہوا۔ چنانچہ اُردو زبان سے میری دلچسپی کی وجہ سے مجھے شاہ بھٹائیؒ پر تحقیق کرنے اور اُردو زبان میں لکھنے کا خیال ہوا۔ اس طرح میری دل کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ میں سندھ یونیورسٹی جاکر گراں رتبہ، ذی شان استاد جناب پروفیسر غلام مصطفیٰ خانصاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خان صاحب نے میری بڑی ہمت افزائی کی اور میرے لئے یہ موضوع تجویز فرمایا اور رہنمائی کی آج میں اس لائق ہوں کہ جامع الصفات "حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ سندھی زبان کے عظیم شاعر اور انکے معاصر اردو شعرا" پر اپنی تحقیق مکمل کر سکا ہوں اس طرح اللہ پاک نے میری یہ ارزو پوری کی۔

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ پر سندھی زبان میں کافی سے بھی زیادہ لکھا گیا ہے اور مزید لکھا جائے گا۔ اس طرح اُردو زبان میں بھی اچھا خاصا مواد جمع ہو چکا ہے لیکن ابھی تک اس میں تشنگی باقی ہے۔ شاہ لطیفؒ کی نسبت وہ تمام باتیں اور اُنکے کلام و شخصیت کو سمجھنے، اس وقت اور

ماحول کی عکاسی کرنے کے لئے اب تک کوئی ایسی مربوط کتاب اردو زبان میں نظر نہیں آتی، جس میں "یاد لطیف" کے متعلق تمام باتیں یک جا کردی گئی ہو۔ یا اُن کے فن شاعری، بزرگی اور سوانح کو جدید تنقیدی اصولوں کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی گئی ہو۔ خاص طور پر اُردو دان حضرات کو شاہ عبداللطیف بھٹائی کو متعارف کرانے کے لئے یہ کوشش کی گئی ہے اس سلسلے میں پرانے وسائل سے بعض مواد کے ذریعے وضاحت سے کام لے کر جگہ جگہ نفسیاتی تجزیہ کرکے۔ ان مسائل کو واضح کیا گیا ہے۔ تاکہ شاہ بھٹائیؒ کے صحیح مرتبے کا تعین کیا جا سکے۔ اور آنے والی نسلوں پر شاہ لطیف بھٹائیؒ کے افادیت کے اثرات کو پیش کیا جائے اس لئے میں بھی "حضرت یوسف نبی علیہ وسلام کے خریداروں میں شمار ہوکر" شاہ لطیف بھٹائیؒ کے سوانح، کلام اور دیگر اوصاف کو لکھنے کا قصد کیا۔ اگر قبول ہو جائے تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی"۔

ہر زبان کو اپنی تہذیب، ثقافت، وطن اور اپنا مزاج ہوتا ہے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے زبان اور ادب کے عروج وزوال کی داستان وابستہ ہوتی ہے۔ ہم اگر کسی زبان کے ادب کی تاریخ پر نظر کرینگے تو اس کے ساتھ ملک اور قوم کے ادب اور ثقافت کی تاریخ کو بھی ضرور دہرائینگے۔ ہر ملک کے ادب کا آغاز شاعری سے ہوا ہے۔ اس مہذب ملک اور قوم میں قدرت کی طرف سے ایک دُرِّ بے بہا نمودار ہوتا ہے جو اس قوم کے مذہب، مزاج، تاریخ، ادب، ثقافت اور تہذیب پر چھایا رہتا ہے۔

سندھی زبان کو بھی اپنا ایک خاص مزاج ہے اور اسکے مزاج میں اسلامی تمدن اور مسلمانوں کی خصوصیات کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ اس اسلامی اثرات سے متاثر وہ دُرِّ بے بہا شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی صورت میں نمودار ہوا۔ شاہ بھٹائیؒ وہ واحد عظیم المرتبت شخصیت ہے جس کی شان میں ہر ذکر کرنے والے نے گلہائے عقیدت پیش کئے ہیں۔ سبھی معصر مورخوں نے اس حقیقت کو نمایاں طور پر لکھا ہے کہ وہ باکمال بزرگوں میں سے تھے۔ انکے سینائی دل پر انوار الاہی کی تجلی نے وہ نور پیدا کیا تھا، جو ایک پیغام کی صورت میں انکے قلب کی گہرائیوں سے نکلے اور زندہ دوام کے مرتبے پر پہنچے، مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی کو بھی پیش نظر رکھیں سندھ کے عبقری شاعر بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان جیسی ہستیاں دنیا میں نہایت دیر سے آتی ہیں۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ سے کم و بیش پانچ سو سال اور امیر خسرو سے ساڑھے تین سو سال بعد سندھ میں یہ باکمال مفکر پیدا ہوئے جسکے بعد اس سرزمین کو پھر کوئی ایسی شخصیت مل نہ سکی۔ علامہ اقبالؒ نے سچ فرمایا ہے:۔

نہ اُٹھا پھر کوئی رومیؒ عجم کے لالہ زاروں میں
وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی۔

یہ ہی حال سندھ کی سرزمین کا ہے جہاں صدیوں سے دریا مہران موجیں مارتے ہوئے رواں دواں ہے وہی ریت کے ٹیلے، وہ سندھ کی پاک زمین لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ جیسی شخصیت پھر پیدا نہ ہوئی۔

جو لوگ سندھی زبان سے واقف ہیں اور شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ حضرات شاہ بھٹائیؒ کے ہر شعر پر تصویر حیرت بن جاتے ہیں اور مدت تک اس کے مزے لے کر وجد کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ شاہ بھٹائیؒ کا کلام معجز نظام ہے جو ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہے ہر شخص اپنی استعداد اور مذاق (مزاج) کے مطابق شاہ بھٹائیؒ کے کلام سے روحانی اور معنوی فیض حاصل کرتا ہے۔

آج اس دنیا کے دور میں انسانیت کا فقدان ہے، ہر طرف معاشرہ میں نفرت بدمزگی، بدامنی کی فضا کا دور دورہ ہے، دلوں میں بغض و نفاق پیدا ہوگیا ہے۔ ہم لوگ قدیم بزرگوں کے روایات کو بھول گئے ہیں۔ اب یہی وقت ہے کہ ہم اس بات کو محسوس کریں اور بزرگانہ قدماء کے پیغام کو گھر گھر پہنچائیں تاکہ نفرت محبت میں بدل جائے۔ شاہ لطیف بھٹائیؒ کا پیغام اس مقصد کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ اس بات کا بیان ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ شاہ لطیفؒ کے کلام اور شخصیت سے عشق بچپن ہی سے میرے دل میں رہا ہے جو کہ میری ذہنی کیفیات کا جز رہا ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

کتاب کی ترتیب کا اندازہ فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر شاہ لطیف بھٹائیؒ اور اُردو کے متقدمین، معاصر اور متاخرین شعرا کے کلام کو شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام سے مماثلات کر کے اُن کے قریب لایا گیا ہے۔ اس طرح اردو کے اور شعرا کے کلام سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے انکی مکمل یاداشت خاتمہ کتاب پر شامل کر دی گئی ہے۔

انسان سراپا خطا کا مجسمہ ہے کمالیت ہے تو صرف اللہ کی ذات اُقدس کو ہے۔ میں اہل زبان نہیں ہوں میری مادری زبان نہ تو اُردو ہے نہ ہی پنجابی لیکن ان زبانوں سے چاہت ضرور ہے۔ لازماً مجھ سے خامیاں اور سقم رہ گئی ہونگی۔ خصوصاً تذکیر و تانیث، املا اور زبان کی صحت میں۔ میری علماءٔ بزرگان کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ صاحبان میری خطاؤں کو عفو و درگذر فرماکر اصلاح فرمائیں اور اس ناچیز کو ہمیشہ اپنے نیک خیالوں سے نوازتے رہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اہل علم حضرات کی خدمت میں شرف قبولیت حاصل کریگی۔

میں اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی سمجھوں گا۔ اگر میں اپنے شفیق استاد واجب الحترام جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان صاحب صدر شعبہ اُردو، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کا خصوصی شکریہ ادا نہ کروں۔ جنہوں نے میری تحقیق کے لئے یہ موضوع تجویز فرمایا اور میری ہمت افزائی فرما کر اپنی نگرانی میں اپنے گران قدر مشوروں سے نوازتے رہے۔

میرے مہربان دوست جناب سید تجمل حسین لیکچرر اردو ادب گورنمنٹ کالج شکارپور کی کرم فرمائی شامل حال نہ ہوتی تو شاید اس کتاب کی تکمیل میں بڑی تعویق ہوتی۔ میں اُنکا بڑا شکر گذار ہوں۔

میں اپنے محسن جناب پروفیسر مولوی محمد سلیم صاحب، اسسٹنٹ پروفیسر عربی ادب گورنمنٹ کالج شکارپور سندھ کا بیحد ممنون ہوں۔ اُنہوں نے میری کتاب کا مسودہ اپنی غائر نظر سے دیکھا اور بیش بہا مشورے دیئے۔ اس کے علاوہ جناب علی احمد زیدی لیکچرر اُردو ادب گورنمنٹ کالج حیدرآباد جناب حسیب احسن لیکچرر اُردو ادب گورنمنٹ کالج روہری۔ جناب اویس عبداللہ عباسی ایم۔اے (فلسفہ و نفسیات) پنجاب۔ نذیر احمد پٹھان۔ لیکچرر انگریزی ادب گورنمنٹ کالج شکارپور۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد۔ ایم۔بی۔ایچ۔ڈی لیکچرر اردو ادب گورنمنٹ کالج شکارپور۔ برادرم نوراحمد بدوی ایم۔اے۔بی۔ٹی۔ فرسٹ اسسٹنٹ گورنمنٹ ھائی اسکول شکارپور سندھ۔ جناب نذیر احمد سومرہ لائبریرین گورنمنٹ کالج شکارپور سندھ کے دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں ان حضرات نے میری بڑی مدد کی ہے۔

آخر میں ان تمام حضرات نے جن لطف و کرم اور تعاون کا اظہار کیا ہے ان کے لئے بے حد ممنون ہوں

وَمَنْ یَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ

خادم علم

غلام احمد لطف اللہ بدوی

شکارپور سندھ

۲۱ جولاءِ ۱۹۷۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصۂ اوّل

باب اوّل

سترھویں صدی عیسوی میں سندھ کی سیاسی حالت

سولہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں سندھ کے کامیاب حکمران شاہ حسن ارغون کی وفات کے بعد سندھ کی حکومت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، ایک بکھر اور دوسرا ٹھٹھ چونکہ شاہ حسن کو کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے بکھر پر اس کا ایک سردار سلطان محمود قابض ہوگیا، اور ٹھٹھ پر دوسرا سردار مرزا عیسیٰ خان ترخان۔ اگرچہ یہ دونوں سردار سلطان کے دیرینہ ملازم تھے، لیکن حکومت حاصل کرتے ہی، باہم قدیم چشمک کی باعث دائمی خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئے۔ اس افتراق کا نتیجہ بالآخر دونوں ریاستوں کی تباہی بن کر نکلا

اس آئے دن کے جنگ وجدل سے تنگ آکر، ایک دن مرزا محمود نے بکھر، اکبر اعظم کی تحویل میں دے دیا۔ مرزا عیسیٰ کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا مرزا محمد باقی تخت نشین ہوا، تو یہ اقتدار کی جنگ، محمود اور محمد باقی کے درمیان بھی قائم رہی۔ اگرچہ محمد باقی اکبری تسلط سے آزاد تھا، تاہم ہند کے اس باجبروت شہنشاہ کی طاقت سے خائف ضرور تھا۔ محمد باقی کی متعدد روش اور مخالفانہ کارنامے، اکثر مغل اعظم کو اشتعال دلاتے رہے، مگر اکبر وہ حکمران نہ تھا، جو معمولی چنگاری کی طرح تھوڑی ہی ہوا سے بھڑک اٹھے۔ اس کی پیچیدہ سیاست بڑی دور اندیشانہ تھی وہ بڑے تحمل سے محمد باقی کی حرکتوں کو ٹالتا رہا، کیونکہ وہ ہندوستان میں بساط سیاست پر اپنے حریفوں سے بہادرانہ بازی کھیل رہا تھا۔ ایسے پرآشوب زمانہ میں ایک دور دراز ملک میں نئے فتنہ کا دروازہ کھولنا وہ ایک غیر دانشمندانہ حرکت سمجھتا تھا۔

بالآخر سلطان محمود بڑی عمر میں چل بسا۔ اور بکھر کا علاقہ براہ راست قلمروئے اکبری میں داخل ہوگیا۔ شہنشاہ نے اپنی نئی ریاست کے انتظام کیلئے اپنے کارندے مقرر کردے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد، محمد باقی نے بھی اپنی ظالمانہ زندگی کا اپنے ہاتھوں خاتمہ کردیا[1]۔ اس کا لائق اور شجاع پوتا، مرزا جانی بیگ بڑی خونریزی کے بعد تخت نشین ہوا اس جانی بیگ سے اکبر اعظم کا نزاع ہوا۔ شہنشاہ نے اپنے سالار فوج عبدالرحیم خانخانان کو بڑی فوج دے کر مرزا جانی کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا۔ مرزا جانی نے بڑی دلیری سے مقابلہ کیا مگر اکبری اقبال کے سامنے اس کے بخت کا ستارہ غروب ہوگیا۔ جانی بیگ، جنگی قیدی کے حیثیت میں دہلی پہنچا اور سندھ کا مغلیہ سلطنت سے مکمل الحاق ہوگیا۔ اکبر نے مرزا جانی بیگ کی شجاعت کی قدر کی۔ اُسے پنج ہزاری کا منصب عطا ہوا، لیکن اسے لوٹ کر اپنے وطن مالوف کا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اکبر نے دور اندیشی سے کام لے کر اس کے کمسن بیٹے مرزا غازی بیگ کو سندھ کا پہلا صوبیدار مقرر کردیا۔ اکبر کی وفات کے بعد مرزا جانی بیگ بھی جلد ہی چل بسا۔ اور اُس کا لاش دہلی سے لاکر ٹھٹھ کے نزدیک کوہ مکلی پر دفن کیا گیا۔

اکبر کی وفات کے بعد اُس کے جانشین شہنشاہ جہانگیر نے بھی مرزا غازی بیگ کو سندھ کا حاکم تسلیم کرلیا۔ اور بعد میں قندھار بھی اُس کی تحویل میں دے دیا مرزا موصوف نے سندھ میں اپنے معتمد خاص خسرو خان چرکس کو نائب مقرر کیا۔ اور خود قندھار میں رہنے لگا۔ جہاں اُس سخی اور لائق حکمران کو[2] ایک نمک حرام غلام نے ہین

---

[1] اکثر مورخین لکھتے ہیں کہ مرزا محمد باقی، اپنی آخری عمر میں کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوگیا تھا۔ شدت مرض سے تنگ آکر خودکشی کرلی تھی یہ واقعہ سال ۱۵۸۴ء کا ہے

[2] بیگلرنامہ میں مرزا غازی بیگ کا سال شہادت ۱۰۲۱ھ دکھایا ہے۔ مرزا غازی بیگ، عالم، سخن شناس اور باکمال سخن گو تھے[3]۔ ملا عبدالنبی فخر الزمانی نے اپنی تصنیف میخانہ میں مرزا غازی کی ہنرمندی کی تعریف اس طرح کی ہے۔ "برائی انور ہنرمندان وضمیر ضیا گستر خردمندان پوشیدہ نماند کہ میرزای ترخان جامع الفضایل والکمالات بودہ، شعرش کم از شعرای این جزو زمان نیست چنانچہ زین دو سہ بیت معلوم می توان کرد۔" ابیات متفرقہ مرزا غازی (میخانہ باعتناء مولوی محمد شفیع صفحہ ۲۲۷،۲۸)

در عہد تو مارا ہمہ با غیر خطاب است
سر پنجۂ مژگان و گریبان عتاب است

شاخ مژہ ام سبز شد و غنچہ خون کرد
این باہمہ از تربیت چشم پُرآب است

عالم شباب میں زہریلا جام پلا کر شہید کر دیا۔ مرزا غازی بیگ ٹھٹھہ کے آزاد حکمرانوں کی آخری نشانی تھی۔ اس موت نے ارغون اور ترخان خاندانوں

مرزا غازی بیگ

کی جھلملاتی ہوئی شمع کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔ اب سندھ کے حکمران براہ راست دہلی سے مقرر ہوا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ سلطنت مغلیہ کے انحطاط تک قائم رہا۔ مرزا غازی بیگ بڑے عالم اور شاعر تھے۔ شعر میں "وقاری" تخلص کرتے تھے۔ ایران کا مشہور شاعر "طالب آملی" اس کا درباری شاعر تھا۔ مصنف آتشکدہ نے ایک پر اثر ساقی نامہ اس سے منسوب کیا ہے۔

مغلیہ دور میں سندھ کی انتظامی حالات اطمینان بخش نہ تھے۔ نواب اگرچہ دہلی کی مرکزی حکومت کے سامنے جواب دہ تھے مگر پھر بھی اُن کے حالات غیر یقینی تھے، اور طاقت غیر محدود تھی۔ وہ ملکی اور جنگی دونوں اختیارات رکھتے تھے۔ چونکہ سندھ اُن کا آبائی وطن نہ تھا، اس لئے وہ ملکی اور جنگی بہبودی کے لئے چنداں پرواہ بھی نہ کرتے تھے۔ اکثر نوابوں کی سی حالت تھی مگر ان میں کچھ تو ایسے بھی تھے جنہوں نے سندھ کی آبادی اور ترقی کے لئے بہت کچھ کام کیا۔ اس وقت کے ملکی حالات پر ایک فرنگی سیاح نکولاس وزنگتن

نکولاس وزنگتن ۱۶۱۳ء - ۱۶۱۴ء

نے بہت کچھ لکھا ہے۔ شاید یہ پہلا سفید فام فرنگی تھا، جس نے سندھ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ یہ سیاح خشکی کی راہ سے گجرات سے ٹھٹھہ آیا تھا، جہاں اس کو مشہور انگریز سفیر رابرٹ شرلے سے مل کر ایران جانا تھا۔ مگر بدقسمتی سے جو راہ اس نے اختیار کی تھی، وہ مصائب اور مشکلات سے بھری ہوئی تھی۔ کچھ کے بے آب و گیاہ صحرا کو طے کرنے کے بعد جب وہ نگر پارکر کے شہر میں پہنچے تو راستے میں اُسے ڈاکوؤں کے مسلح گروہ سے دوچار ہونا پڑا، کافی نقصان کے بعد، اس کو گجرات واپس جانا پڑا اور ٹھٹھہ تک اُسے آنا نصیب نہ ہوا۔ یہ فرنگی مسافر ان حالات کے ماتحت مغل حکومت کے انتظام کا بہت شاکی نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے سفر کے لئے وہ مخدوش راہ اختیار کی تھی، جس پر بجھتی شہنشاہیت کے زمانہ میں بھی پیادہ پا سفر کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔

فرے سباستین مانریقہ

نکولاس وزنگتن کے بعد فرے سباستین مانریقہ ۱۶۴۱ء میں دوسرا مغربی سیاح تھا جو سندھ میں آیا۔ وہ اپورٹو بندر (پرتگال) کے رہنے والے تھے۔ بنگال آگسٹینین مشن ہگلی کا واعظ تھا۔ عیسائی کی تبلیغ کے لئے اس کو اراکان (برما) بھیج دیا گیا تھا۔ اسی تبلیغ کے سلسلے میں اُسے سندھ میں بھی آنا ہوا۔ یہ مغل شہنشاہ شاہجہان کا زمانہ تھا۔ وہ اپنے کوائف میں لکھتے ہیں:

"اپنے دوستوں کی مہربانی سے مجھے موقعہ حاصل ہوا کہ میں شاہی پروانہ کے ذریعہ سندھ کا سفر کر سکا یہ سفر میں نے اس لئے اختیار کیا تھا، کہ وہ گرجے جو شہنشاہ خرم کے حکم سے منہدم کر دئے گئے تھے، اُن کی از سر نو تعمیر کی جائے شہزادہ آصف خان سے جو اس وقت سندھ اور ملتان کے وائسرائے تھے، خاص احکامات حاصل کرکے میں عازم سفر ہوا شہنشاہ کے پروانہ اور آصف خان کے احکامات کا یہ اثر ہوا کہ مجھے راہ میں کسی چوکیدار کے تشدد کا سامنا کرنا نہیں پڑا اور میرے اسباب اور اسلحہ محصول سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔"

مانریقہ دریائے سندھ کے راستہ سے لاہور روانہ ہو کر ٹھٹھہ پہنچے اور پھر جیسلمیر کی راہ سے واپس دہلی پہنچے۔ مانریقہ کے حالات سندھ وزنگتن سے بہت مختلف ہیں۔ لاہور سے لیکر بکھر تک اپنے حالات سفر اس طرح بیان کرتے ہیں

ہم نے اطمینان سے اپنے بیڑے کو دریا پر چھوڑ دیا، البتہ رات کو ہم اس کی پاسبانی کرتے جاتے تھے۔ راستے میں ہم جہاں لنگر انداز ہوئے، تو ہمیں بڑے انداز میں غلہ میسر ہوتا تھا، اکثر جگہوں پر پانی پایاب ہوتا تھا۔ چھوٹے بڑے تعداد میں

Some notable travellers in Sind in Seventeenth century. Shah Abdul Latif of Bhit by Dr. H.T. Sorley. page. 68-

سلطان احمد کے نسل سے داؤد پوترہ اور کلہوڑہ سندھ کی سرزمین پر مدت تک حکومت کرتے رہے. داؤد پوترہ خاندان نے شکارپور[1] شہر کی بنیاد رکھکر اُسے اپنی ریاست کا تخت گاہ بنایا، اور کلہوڑہ خاندان نے خدا آباد کا سنگ بنیاد رکھکر اُسے اپنی ریاست کا تخت گاہ بنایا. کلہوڑہ خاندان اس طرح اپنی طاقت کو بڑھا کر پوری سندھ کے حاکم ہوئے.

ہمارے قومی شاعر حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی رح کا کلہوڑہ خاندان کے دور حکومت کے ابتدائی ایام سے تعلق ہے اس لئے ہم کلہوڑہ خاندان کے عروج کا ذکر وضاحت سے بیان کرینگے (تاکہ حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی سوانح اور بزرگی، پڑھنے والے پر واضح ہو جائے. اور اس زمانہ میں سندھ کے سیاسی حالات کیسے تھے، یہ اس حالات سے تشنہ نہ رہی

کلہوڑے امیروں کی بتدریج ترقی

سندھ کے تذکرہ نویسوں میں میر علی شیر قانع ٹھٹوی کا مرتبہ بہت بلند ہے، اس کی تصنیف تاریخ تحفۃ الکرام بہترین تاریخی یادگار ہے یہ مشہور شاعر اور مورخ کلہوڑہ کے عہد میں پیدا ہوئے، اس نے مشہور کلہوڑہ حاکم غلام شاہ کے عہد تک مفصل واقعات اپنے تذکرہ میں درج کئے ہیں، چونکہ وہ کلہوڑہ دور کی پیداوار تھے، اس لئے اس مورخ کے مورخانہ کوائف بڑی حد تک صحیح اور مستند نظر آتی ہیں، ہم اسی تذکرہ کی مدد سے انگریزی مورخین کے دیئے ہوئے حالات پر محاسبہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہینگے. کیونکہ انگریز مورخین نے سیاسی ضرورتوں سے ماضی کے صحیح نقوش کی صورت ہی مسخ کرڈالی ہے، مورخانہ بلندی سے گر کر تعصب کے تحت الثریٰ میں جا پہنچے ہیں، ہم ان حالات میں محقق کی یاداشت کو چھوڑ کر دروغ بیانی پر اعتبار نہیں کر سکتے.

میاں آدم شاہ

سلطان احمد عباسی کی اولاد میں او دھانہ کے بعد آدم شاہ نامی ایک بڑے عارف پیدا ہوئے، جن کے فیض باطنی سے بہت سے لوگ خدا رسیدہ بن گئے، وہ سید میران محمد جونپوری بانی فرقہ "مہدویہ" کے مریدان باصفا میں سے تھے، میاں آدم شاہ نے سندھ کی سیر و سیاحت کے بعد چانڈوکہ[2] پرگنہ کی ایک بستی ھڈڑی کے نزدیک مستقل طور پر بود باش اختیار کرلی. بتدریج ان کے مریدوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا، اس زمانے میں نواب عبد الرحیم خانخانان، اکبری فوج لے کر مرزا جانی بیگ کے مقابلہ کیلئے سندھ میں آئے، خان موصوف نے میاں آدم شاہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ہونے والی جنگ کیلئے دعائے نصرت کی درخواست کی، جب وہ تائید ایزدی سے مظفر اور منصور ہوکر دہلی واپس جانے لگے تو میاں آدم شاہ کو چانڈوکہ کا علاقہ بطور جاگیر نذر کرتا گیا، یہ علاقہ پہلے چانڈیہ بلوچ قوم کے اختیار میں تھا، اس قوم کے نام سے یہ علاقہ چانڈوکہ کہلاتا تھا.

چند سال کے بعد میاں آدم شاہ نے لاہور کے ایک باخدا صوفی لال حسین سے ملنے کے لئے ملتان کا سفر اختیار کیا جہاں اُن کے ارادتمندوں کا بڑا اجتماع ہو رہا تھا. اُنہوں نے اپنے شیخ کے لئے وہیں دوامی سکونت کا بندوبست کیا، اور بڑی اراضی اس غرض کیلئے منتخب بھی کرلی مگر ملتان کے حاسد نواب نے میاں کے بڑھتی ہوئی طاقت اور رسوخ کو دیکھکر، اس درویش بے ضرر کو شہید کرادیا. (آغا محمد کوتوال آپ کے مرید نے حب وعقیدت آپ کی میت کو سکھر سندھ لایا. اور ایک پہاڑی پر دفن کردیا، جس کو اس بیگناہ مقتول کے نام سے آدم شاہ کی پہاڑی کہتے ہیں.

---

[1] شکارپور کا شہر شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں آباد ہوا. (سنہ ۹۲۷ھ — سنہ ۱۵۲۰ء) اس کی تاریخ بنیاد سنہ ۱۵۲۹ ہجری ہے جو لفظ "غوک" سے برآمد ہوتی ہے: یہ کتبہ مسجد حاجی فقیر اللہ صاحب علوی قدس سرہ واقع سندھ واہ روڈ پر مرقوم ہے.

[2] سندھ گزیٹر لاڑکانہ، والیوم بی۔ جلد ۴. مرتب جے. ڈبلیو۔ سمتھ، طبع ۱۹۱۹ء صفحہ ۱۱. چانڈکہ موجودہ لاڑکانہ ہے

۸ میاں آدم شاہ کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا داؤد خان مسند فقر پر بیٹھے اور ھٹڑی میں مستقل رہائش اختیار کی داؤد شاہ ھنگامی زندگی سے بیزار رہا، اور گوشہ نشینی میں زندگی بسر کرکے عالم جاودانی کو سدھارے۔ داؤد کے بعد اس کا صاحبزادہ الیاس شاہ مسند نشین ہوئے، اُس کے مریدوں کی تعداد جو اکثر کاشتکار تھے، روز بروز بڑھتی رہی۔ ان کے باہمی امداد سے لاڑکانہ کی نزدیکی میں نارہ کی نہر کھودی گئی۔ نارہ کے دونوں کناروں پر اس کے مریدوں میں سے سانگی اور ابڑھ قوموں نے مختلف زمین کے قطعات پر قبضہ کرلیا۔ شاھل محمد کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو دیکھکر خود اُس کے مریدوں میں رشک پیدا ہوا چونکہ شاہ علی عرف شاھل محمد، اپنے بڑے بھائی الیاس کے بعد مسند نشین ہوا تھا، جو کہ خدا رسیدہ بزرگ تھا، جس کے بڑھتے رسوخ کو رشک سے دیکھا گیا، آخر بکھر کے گورنر سے ساز باز کرکے، ان شقی القلب مریدوں نے موقع پاکر اپنے شیخ کو شہید کردیا یہ واقعہ ۱۱۰۸ھ مطابق سنہ ۱۶۹۶ء کا ہے۔

میاں نصیر محمد | میاں شاھل محمد کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا نصیر محمد مسند نشین ہوا میاں نصیر محمد نے مخالفت کو بڑھتا ہوا دیکھکر اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہکر ریگستان میں جا بسا، چند سالوں کی غریب الوطنی کے بعد پھر لوٹ کر آبائی وطن آگیا۔ مگر بکھر کے نواب نے چالبازی سے فوج بھیجی اور اُسے گرفتار کرکے شہنشاہ اورنگزیب کے حضور میں بھیج دیا۔ میاں نصیر محمد عالمگیری فوج کی چھاؤنی سے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر سندہ میں آگیا، اور اپنے مریدوں کی فوج جمع کرکے بکھر کے نواب، میر یعقوب کے مقابلہ کے لئے بڑھا، ایک خونریز جنگ کے بعد میاں نصیر محمد کو فتح حاصل ہوئی اور یعقوب خان بھاگ کر جان بچائی، یعقوب خان کی شکست کی خبر سن کر سبی کے مغلیہ نواب مرزا خان افغان کو بڑا غصہ آیا، میاں نصیر محمد کا تسلط سیہون سے بکھر تک ہوگیا، نواب مرزا خان نے میاں نصیر محمد کو سزا دینے کیلئے لاڑکانہ پر حملہ آور ہوا لیکن خفیف مقابلہ کے بعد وہ سبی چلا گیا، ان فتوحات کے بعد میاں نصیر محمد نے چند نئے شہر آباد کئے، جن میں نوشہرہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ میاں نصیر محمد نے سندہ میں کلہوڑہ خاندان کی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

میاں دین محمدؒ | میاں دین محمدؒ، اپنے والد نصیر محمد کے بعد اُن کا جانشین ہوا، اس زمانے میں پنہور قوم کا رئیس میر پنہور خان، کلہوڑہ سجادہ نشین سے خائف ہوکر مغلیہ دربار میں فریاد لے کر حاضر ہوا، اس وقت دہلی کے تخت پر اورنگزیب کا بیٹا شاہ عالم متمکن تھا، بادشاہ نے امیر شیخ جہان کو شکست نصیب ہوئی۔ اللہ یار خان تو میدان سے جان بچا کر بھاگ نکلا مگر عین اُسوقت قنبر خان بروھی نے جو شاہی فوج کی مدد کے لئے سبی سے آرہا تھا، موقع پر پہنچ کر اچانک فقیروں پر حملہ کردیا۔ اس ناگہانی حملہ سے فقیروں کی فوج کا بڑا نقصان ہوا، مگر پھر بھی میدان سے جان بچا کر بھاگ نکلا مگر پھر بھی میدان کلہوڑہ فوج نے جیت لیا۔ شیخ جہان نے میاں دین محمدؒ کی اطاعت قبول کرلی اور ھمیشہ کے لئے اُن کی باجگذار رعیت بن گئے

۱۷۱۲ء

امیر شیخ جہان کی شکست نے مغل شہزادہ معزالدین جہاندار شاہ کو بڑا فروختہ کردیا، جو اس وقت ملتان اور لاھور کا صوبدار تھا، ایک بڑی فوج لیکر بذات خود بکھر پہنچے، میاں دین محمدؒ کو جب شہزادہ کے آمد کی اطلاع ہوئی تو اپنے بھائی میر محمد کو اُن کی خدمت میں اظہار عقیدت کیلئے بھیجدیا۔ شہزادہ نے میاں کی گذشت خطاؤں سے درگذر کیا، اور کسی مقابلہ کے بغیر لاھور چل دیا مگر جلد ہی میاں دین محمدؒ کے ایک مرید مقصودہ نے اُچ (ریاست بھاولپور) پر حملہ کردیا، اور کشت وخون کے بعد اُچ پر قبضہ کرکے امن پسند شہریوں پر بڑے بڑے مظالم توڑے، شہزادہ معزالدین، فقیر مقصود کی جابرانہ اور سنگین کاروائیوں کے حالات سنکر بہت مشتعل ہوئے، اور ایک دفعہ پھر میاں پر غضب ناک ہوکر چڑھ آئے، فقیر مقصود تو اس تیز وتند طوفان کے ایک جھٹکے کی بھی تاب نہ لا سکا، میاں دین محمدؒ تاب مقاومت نہ لا کر سیہوں کے نزدیک شہزادہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اطاعت کی مگر فقیروں نے اطاعت کرنے کے بجائے بڑی فوج جمع کرلی، گاج نہر کے نزدیک شاھی فوج اور فقیروں کے درمیان سخت مقابلہ ہوا فقیر سپہداروں نے بڑی بیجگری سے

مقابلہ کیا، اور ہزاروں لڑتے ہوئے کھیت رہے۔ اگرچہ میدانِ جنگ شہزادہ نے جیت لی تھی، مگر فقیروں کے تصادم نے شاہی فوج کا حد سے زیادہ نقصان کیا۔ شہزادہ میاں دین محمد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جس نے بقیہ زندگی ملتان میں قیدی کی حیثیت سے گذاری۔

میاں یار محمدؒ دین محمد کے بھائی، میاں یار محمدؒ نے شہزادہ کے خوف سے بھاگ کر قلات میں جاکر پناہ لی کچھ عرصہ گزارنے کے بعد الہٰس خان بروہی کے کمک سے خروج کیا، اور آبائی علاقہ پر چڑھ آیا، فتح پور کے قلعے کو فتح کرلیا، اس کی آمد کی خبر سن کر پھر فقیر اس کے گرد جمع ہونے لگے، اُن کی مدد سے لاڑکانہ فتح کیا، مختیار خان جو مغل حکومت کی طرف سے اُس حصہ کا حاکم تھا، میاں کے عقیدتمندوں سے تنگ آکر شہزادہ معزالدین جہاندار شاہ کی خدمت میں کمک کا طالب ہوا، مگر چند وجوہات کے باعث شہزادہ موصوف سندھ میں آنہ سکا۔ اب حالات نے پلٹا کھایا۔ شہزادہ بختیار خان کی بدعنوانیوں سے آزردہ ہو کر سندھ میں آیا، مختیار خان مارا گیا، اور کوہستان کی حکومت بتدریج میاں یار محمد کو سپرد ہوئی۔ شہزادہ کے دربار سے میاں کو خدایار خان کا لقب عطا ہوا، اُسی اثنا میں ڈیرہ غازی خان میں بغاوت نمودار ہوئی، میاں نے اپنی ایک فوج کے سردار ٹالپور خاندان کے مورث اعلیٰ میر شہداد خان کی خدمات شہزادہ کیلئے وقف کردیں، میر صاحب نے بڑی مستعدی سے بغاوت کو فرد کرکے شہزادہ کا اعتبار حاصل کرلیا، اس کے صلہ میں میر کو پٹ باران کی جاگیر تفویض ہوئی، اور میاں یار محمد پر عنایات شاہانہ کی بارش ہونے لگی میاں یار محمدؒ کے آخری نو سال صلح اور آرام میں گذرے اُس نے خدا آباد (دادو ضلع) کو حکومت کا مرکز بنایا، اور سبی سے لیکر سیہون تک اس کا حکم چلنے لگا۔

الیگزنڈر ہملٹن سندھ میں ۱۶۹۹ء

کپتان الیگزینڈر ہملٹن[1] اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے تھے، وہ سیاح اور پیشہور تاجر تھے، اُس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سنہ ۱۶۸۸ء سے سنہ ۱۷۲۲ء تک دنیا کے مختلف حصوں میں سیر و سیاحت میں بسر کیا، وہ تعلیم یافتہ اور زیرک تھا اُس کا سفرنامہ جو سنہ ۱۷۲۲ء میں شایع ہوا بڑا ہی دلچسپ ہے۔

یہ سیاح سنہ ۱۶۹۹ء میں لاہری بندر میں آیا تھا، کچھ وقت ٹھٹہ میں رہ کر اپنے وطن مالوف واپس ہوا اُس کے سفر کا زمانہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے زمانے سے قریب تر تھا، ہمارے قومی شاعر اس وقت بمشکل آٹھ یا سات برس کے ہونگے اس لئے الیگزینڈر کے مشاہدات متعلق سندھ اور اس زمانے کے ملکی حالات پرکھنے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہونگے۔

کپتان کو سفر کرتے ہوئے راہ میں جو دقتیں پیش آئیں، اُن کا ذکر بڑی وضاحت سے کرتا ہے۔ وہ اپنے سفرنامہ میں سندھ کی بدانتظامی، ڈاکہ زنی اور بے قاعدگی کی بڑی شکایت کرتا ہے۔ مگر بقول ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے مصنف "شاہ عبداللطیف بھٹائی" اس وقت انگلستان میں بھی یہی حالات تھے، سندھ میں سفری مصائب کے باعث ہملٹن مغل حکومت کی کمزوری بتاتا ہے اس میں شک نہیں کہ مغل نواب جو اکثر غیر سندھی تھے، سندھ کے ملکی حالات سے قطعی بے خبر تھے، اس لئے اُن سے وقتاً فوقتاً ملکی انتظام میں اہم غلطیاں سرزد ہو جاتی تھیں جن کے باعث ملک میں بدانتظامی پھیل جاتی تھی۔ ہملٹن لاہری بندر کو دریائے سندھ کی ایک شاخ بتاتا ہے جو سمندر سے چار یا پانچ فرسخ دور تھی۔ بندر اتنا وسیع تھا، کہ ۲۰۰۰ ہزار ٹن کا وزنی جہاز آسانی سے آسکتا تھا، مگر شہر اُسے بلکل پسند نہ آیا لکھتا ہے:-

---

[1] کپتان الیگزینڈر ہملٹن، سکاچ تھے، اور اس نے اپنی مکمل حیاتی تجارت میں گزاری وہ عمدہ جہازران تھا کیپ آف گڈ ہوپ (آفریقہ) سے لے کر جہاں تک سفر کیا اس کا ذکر کیا ہے۔ سنہ ۱۶۹۹ء میں سندھ میں آیا تھا، کچھ وقت کے لئے ٹھٹہ میں بھی مقیم رہا۔ لاہری اور ٹھٹہ کے متعلق جو کچھ اپنی تصنیف "New Account of the East Indies" میں لکھا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے ہملٹن کا زمانہ کلہوڑہ دور حکومت کا شروعاتی دور تھا اس لئے اُس دور کے سیاسی اور معاشی حالات کے سمجھنے کے لئے اِن کی تصنیف سے کافی مدد ملتی ہے

شہر میں بہ مشکل سو گھر تھے، جن کی چھتیں مٹی اور لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ مگر اس کے گرد پتھر کا ایک مضبوط قلعہ تھا، جس کے فصیل پر چار یا پانچ توپیں نصب تھیں، جن سے باہر کے آنے والے مال کی حفاظت کی جاتی تھی، کیونکہ بندر پر اکثر بلوچ اور مکرانیوں کے حملے کا خوف رہتا تھا۔ یہ قومیں اپنی لوٹ مار کے باعث، اس وقت بدنام تھیں، جو ہمیشہ شکار کی تاک میں رہتے تھے۔ یہ ڈاکو و جرائم پیشہ لوگ ندی کے کنارے گھنے جنگل میں چھپے رہتے تھے، اکثر قافلے اپنی حفاظت کیلئے سو یا دو سو مسلح سواروں کا دستہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اکثر اور بعض اوقات یہ حفاظتی دستہ ڈاکوؤں سے مل جاتا تھا، اور قافلے والوں کو لٹیروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔

سنہ ۱۶۹۹ء میں ہملٹن ایک بد نصیب قافلے کی بربادی کا ذکر کرتا ہے، جس میں ۲۵ سوار اور پانچ سو قافلے والوں کا ڈاکوؤں کے ہاتھوں خاتمہ ہو گیا تھا۔ ہملٹن نے تختگاہ شہر ٹھٹہ کا مفصل احوال بیان کرتا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"شہر تین میل طول اور ڈیڑھ میل عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ لاہری بندر سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ شہر کے مغرب میں ایک بڑا قلعہ ہے جس میں پانچ سو سپاہی آسانی سے رہ سکتے ہیں۔ نواب کا محلات بھی اس قلعہ میں ہے۔ ملک کا بہت سا حصہ گنجان جنگلوں سے بھرا ہوا ہے۔ جس کے باعث راستہ کا سلامتی سے گذرنا مشکل ہے۔ گاڑیاں اکثر بیل کھینچتے، اور اُن کی رفتار بہت دھیمی ہوتی ہے۔"

ہملٹن ملبار سے لاہری بندر تک ایک تجارتی کشتی میں آئے تھے، جس میں قریباً دس ہزار پاؤنڈ کا تجارتی سامان لدا ہوا تھا، مگر امن و امان کے مفقود ہونے کے باعث کسی سوداگر نے اس کے مال سے سودا کرنا نہ چاہا۔ جب وہ ٹھٹہ میں آیا، تو ہر طرف سے سوداگروں کی بھیڑ لگ گئی۔ ہملٹن کا قافلہ بڑے ساز و سامان سے لاہری بندر سے روانہ ہوا، قریباً ایک ہزار پانچ سو جانور اور اتنے ہی مسافر موجود تھے، ان کے علاوہ دو سو سواروں کا دستہ بھی قافلہ میں شریک تھا۔ جب یہ قافلہ سولہ میل سفر طے کر چکا تو خبر ملی کہ بلوچ اور مکرانی ڈاکوؤں کا ایک مسلح دستہ قافلہ پر حملہ کرنے کیلئے تیار بیٹھا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی ہملٹن اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جو بڑے نشانہ باز تھے ڈاکوؤں کے مقابلے کیلئے تیار ہو گیا، اُنہوں نے ڈاکوؤں کو ڈرانے کیلئے دو چار بندوقیں داغ دیں اس طرح قافلہ نصف راہ طے کرنے کے بعد ایک قافلہ سرائے میں اترا، جس کے گرد مٹی کا ایک مضبوط قلعہ تھا، یہ قافلہ والوں کے لئے شب باشی کا مقام تھا، جس میں ایک وسیع میدان اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ قلعے کے گرد قریباً بیس خام مکان موجود تھے جہاں کے رہنے والے قافلے والوں کو مرغیاں بکریاں اور بھیڑیں فروخت کرتے تھے، یہ مختصر آبادی تھی جو ان کو ٹھٹہ اور لاہری بندر کے درمیان نظر آئی۔

ٹھٹہ میں ہملٹن کو رہنے کیلئے بڑی شاندار جگہ ملی۔ نواب جو اس وقت پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ڈاکوؤں کے قلع و قمع کیلئے راہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ فرنگی قافلہ سالار کے آنے کی اطلاع پاکر اسے بہت سی اشیاء خوردنی روانہ کی دوسرے دن ہملٹن نے بھی دلکش تحائف اس کی خدمت میں پیش کئے، ہملٹن نواب کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس نے فرنگی تاجر کو بڑی رعایتیں دیدی تھی، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اُسے قرض وصول کرنے کیلئے خاص اختیارات دئے گئے تھے، جس کے باعث اسے دارالقضا میں جانے کی ضرورت نہ رہی۔ ہملٹن دریائے سندھ پر کشتیوں کی آمد و رفت سے بڑا متاثر نظر آتا ہے، وہ کشتیوں کی ساخت کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ لکھتا ہے:-

"بعض ان میں سے ۲۰۰ ٹن اُٹھانے کے متحمل ہیں، اکثر ان کی سطح ہموار ہوتی ہے اور ان میں چھوٹے کمرے (CABINS) بھی ہوتے ہیں"

وہ لکھتا ہے کہ اس ساخت کی کشتیاں اُسے کہیں نظر نہ آئیں۔ ہملٹن شہروں کی تجارت، شہریوں کی خوش حالی، عوام کی آسودگی، اور فصلوں کی افراط کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ مغل حکومت کے انتظام کا شاکی ہے۔ لیکن ملک کی فارغ البالی کا ہر جگہ اعتراف کرتا ہے۔ اس آسودگی سے متاثر ہو کر ہمارے قومی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف نے فرمایا ہے

سائين سدائين ڪرين مٿي سنڌ سڪار (سر سارنگ)

آقا ہمیشہ سندھ پر ارزانی کر۔

ہملٹن کی تصنیف کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ کا ملک سترھویں صدی عیسوی میں اپنی خوشحالی کے باعث بہت ہی آسودہ اور خوش نصیب تھا۔

باب دوم

ایک دلگداز واقعہ

مغلیہ حکومت کے سایہ میں میاں یار محمد کی زندگی بڑے آرام سے گذر رہی تھی، مگر آخر عمر میں اس کے ہاتھوں ایسی خونریزی ہوئی جس کو تاریخ سندھ میں قتل ناحق سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حضرت شاہ عنایت اللہ صوفی کی شہادت کا سانحہ اور جھوک میرانپور کا واقعہ سنہ ۱۱۳۰ھ مطابق سنہ ۱۷۱۸ء کا ہے۔ سندھ پر اگرچہ مغل حکومت کا برائے نام تسلط تھا، مگر ملک کے طول و عرض میں بدنظمی اور طوائف الملوکی کا دورہ تھا۔ اگر شمال سندھ میں داؤد پوتہ زور پکڑ رہے تھے، تو بکھر اور ٹھٹہ میں علیحدہ علیحدہ نواب حکومت کر رہے تھے، وسط سندھ میں میاں یار محمد کا طوطی بول رہا تھا، غرض یہ کہ ملک کا اجتماعی شیرازہ منتشر ہو چکا تھا، فتنہ اور فساد کی آگ ہر طرف بھڑک رہی تھی۔ ایسے وقت میں جب معمولی ہوا سے چنگاری شعلہ بن سکتی تھی، تو ہولناک طوفان میں اسے نار نمرود بننے میں کون سی شے مانع تھی، پھر یہ تو ہمیشہ ہوتا ہی رہا ہے کہ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی لڑتا ہی رہا ہے زمانے نے ایک بار پھر دیکھ لیا کہ شاہ شہید پر اس وقت کے کوفی امڈ کر آئے، اور جھوک میرانپور کو کربلائے ثانی بنا دیا۔ مخدوم عنایت اللہ کے والد کا نام مخدوم فضل اللہ تھا، جو مخدوم صدھو لانگاہ کی اولاد سے[1] تھے۔ مخدوم موصوف کو مشائخ کبار میں شمار کیا جاتا ہے۔ ملا اجب ولد مخدوم صدھو لانگاہ، اہل اللہ میں سے تھے، صاحب تحفۃ الکرام[2] سے روایت ہے کہ ایک بار ملا اجب دریا کے گھاٹ پر پہنچے، لیکن اسے کوئی کشتی نظر نہ آئی موسم سرما کی شام تھی، سردی بڑے آب و تاب سے بڑھتی جا رہی تھی، خادم نے عرض کیا رات گھر لوٹ کر گذاریں اور صبح آکر دریا کو عبور کریں لیکن ملا اجب نے انکار کر دیا، جب رات کی زلفیں دراز ہو گئیں تو، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے دریا پایاب ہو گیا اور ندا آئی "اے شیخ اگر ارادہ عبور دریا ہو تو چلے آئیے"۔ شیخ نے یہ سنکر جواب دیا ہم خدا پر توکل رکھتے ہیں، کسی غیر کے محتاج نہیں ہیں" رات دریا کے کنارے پر بسر کی اور صبح کے وقت کشتی میں سوار ہو کر دریا عبور کیا۔ شاہ شہید کے والد بزرگوار مخدوم فضل اللہ کا شمار بھی اہل اللہ میں ہوتا تھا۔

شاہ عنایت اللہ صوفی بچپن میں ہی صراط المستقیم کی طرف متوجہ تھے، اکثر محنت و مشاقہ کرتے رہتے تھے، جوانی میں تحقیق حق کا شوق دامنگیر ہوا، اور سیر و سیاحت کرتے ہوئے حیدرآباد دکن پہنچے، وہاں آپ کو ایک خدا رسیدہ بزرگ شاہ عبدالملک کی صحبت نصیب ہوئی، حسب ارشاد پیر تحصیل علوم ظاہری کے لئے جہان آباد میں شاہ غلام محمد کے پاس پہنچے، شاہ غلام محمد سے ظاہری علوم تو حاصل کر لئے، مگر انوار الٰہی کی چمک چھپنے والی نہ تھی، استاد شاگرد کی خدمت میں اپنی تشنہ لبی بجھانے کیلئے جھکا، اور مریدان با صفا میں داخل ہو گیا جب شاہ صوفی نے جہان آباد کو الوداع کہا تو، شاہ غلام محمد نے بھی اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہکر جھوک میرانپور چلے آئے، شاہ صوفی کی خدمت میں بڑے عجز سے حاضر ہوتے تھے، علماء کو جب مرشد اور مرید کے اس ظاہری سلوک کا حال معلوم ہوا تو بہت بگڑے اور شریعت کے احترام کے لئے، غلام محمد شاہ کو تعزیر شرعی کے لئے بلایا گیا، علماء ظاہر کی بار بار اذیت کے باعث بالآخر غلام محمد کو جھوک میرانپور چھوڑنا پڑا اور باقی زندگی جہان آباد میں یاد الٰہی میں بسر کی۔

اس زمانہ میں شاہ صوفی کے فیض اور رشد کا غلغلہ سندھ کے گوشہ گوشہ میں جا پہنچا تھا، تشنگان فیض الٰہی جوق در جوق شاہ صوفی کے چشمہ فیض سے سیراب ہونے کیلئے جمع ہونے لگے، یہ جاہ و جلال دیکھکر گرد و نواح کے حاسد زمیندار اور پیران خود پرست کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

---

[1] لانگاہ قوم نے بڑی مدت تک ملتان پر حکومت کی مرزا شاہ حسین آرغون نے ملتان فتح کرکے لانگاہ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

[2] تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع صفحہ ۲۲۰

وہ خود تو شیخ کے مقابل نہ ہوئے، مگر درپردہ حکومت سے ساز باز کرتے رہے۔ ٹھٹہ کے مغلیہ نواب میر لطف علی، اور نواب محمد اعظم خان نے شیخ کے بڑھتے ہوئے رسوخ کو حکومت کے حق میں مضر سمجھا۔ ٹھٹہ کے نواب میر لطف علی بغیر سوچے سمجھے، نور محمد ولد منبو پلیجو جو ابوجہل کی اولاد سے تھے، اور پلیجہ قوم کے بڑے زمیندار تھے۔ اجازت دی کہ شیخ عنایت اللہ پر حملہ کردے۔ نور محمد نے پہاڑی لوگوں اور بلاڑی والوں کی مدد سے بیشمار لشکر جمع کرکے اچانک فقیروں پر حملہ کردیا۔ جس کی وجہ بہت سے بیگناہ فقیروں نے اپنے مرشد حضرت شیخ صوفی پر نثار ہوکر شہادت کا جام نوش کیا۔ شہیدوں کے وارثوں نے دہلی جاکر بادشاہ فرخ سیر کی بارگاہ میں فریاد کی اور ظالموں کے لئے قصاص کا حکم لے کر واپس آئے۔ اس وقت کے قانون کے مطابق قاتلوں کی پوری زمین خون بہا کے بدلے شہیدوں کے وارثوں کو دی گئی۔

جت قوم کا ایک شخص عمل بن لاکو جت جو فقیروں کے گروہ کا دشمن تھا، ان کے خلاف اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کرنے لگے۔ ادھر حق اور توحید کا نعرہ بلند ہوا دن بہ دن فقیروں اور طلبگاروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اس دوران، نواب میر لطف علی معزول ہوا اور اس کی جگہہ اعظم خان[2] صوبہ ٹھٹہ کا نواب مقرر ہوا۔ اعظم خان نے آتے ہی معافی زمینوں کے لگان کا تقاضا کیا۔ جس پر فقیروں نے بادشاہ کا حکم دکھا کر لگان دینے سے انکار کردیا۔ اس پر اعظم خان بہت برہم ہوا۔ اور بادشاہ فرخ سیر کی خدمت میں لکھا، کہ فقیروں نے بادشاہت چھینے کا منصوبہ تیار کیا ہے بادشاہ کی طرف سے حکم ہوا کہ فقیروں کو سختی سے سمجھایا جائے بس اس حکم کی دیر تھی، نواب اعظم خان پہلے سے تیار تھے۔ میاں یار محمد کلہوڑہ کی مدد سے جھوک میرانپور کا گھیراؤ کیا۔ شاہ صوفی نے نواب کی ان زیادتوں کو دیکھکر ایک رقعہ دہلی کے بادشاہ فرخ سیر کو لکھا، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور نواب نے حملہ شروع کردیا جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں فقیر شہید ہوگئے۔ شاہ صوفی کے ایک مرید جان اللہ شاہ رضوی[3] نے اجازت چاہی کہ ہم بھی مقابلہ کریں، لیکن شاہ صوفی نے لڑنے سے منع فرمایا یہ گھیراؤ چھ مہینے تک جاری رہا۔ آخر میاں محمد خان بن یار محمد کلہوڑہ اور میر شہداد خان تالپر نے دغا سے قرآن پاک بیچ میں لاکر شاہ صوفی کو مصالحت کے بہانے نواب اعظم خان کے دربار میں لے آئے نواب نے شاہ صوفی کو دربار میں دیکھا تو بیحد برہم ہوا اور گرفتاری کا حکم دیا۔

اعظم خان نے یار محمد کلہوڑہ کو اس خون ناحق کو بہانے کیلئے دعوت دی، یار محمد جو مغل حکومت کے نوازشوں سے اب خدایار بن گیا تھا، اپنے آقاؤں کے بار احسان سے سبکدوش ہونے کیلئے نواب سے جا ملا بڑے کروفر سے افواج لیکر فقیروں پر حملہ آور ہوا شاہ صوفی نے ہر چند نواب کی خدمت میں جھوٹے الزاموں سے بریت کا اظہار فرمایا۔ مگر نواب جس پر سیاسی اندیشوں کا بھوت سوار تھا، اپنی ضد پر اڑا رہا۔ شاہ صوفی کو بہ ظاہر مصالحت اور گفت و شنید کے بہانے نواب کے دربار میں لایا تھا، سیاست کے داؤ پیچ سے سادہ ذہن درویش اب ایک ظالم سفاک اور وعدہ فراموش انسانوں کے قبضے میں تھا، اعظم خان کے بگڑے ہوئے تیور کو دیکھکر میر شہداد کو سندھی زبان میں یہ فقرہ سنا کر وعدہ یاد دلایا۔

" ڏونگر ڏني ڏاڙهي، ڪره ڪني جو پڇ "

"پہاڑ نے داڑھی پکڑی (وعدہ کیا) لیکن وہ کتے کی دم ثابت ہوئی۔"

نواب نے شیخ صوفی سے چند سوالات کئے، جس کے جواب میں شاہ صوفی نے حافظ شیرازی، مولانا جامیؔ اور دیگر شعراء کے ابیات میں جواب دیا جن میں چند سوالات اور جوابات پیش کئے جاتے ہیں۔ نواب نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا:-

---

[1] مقالہ شاہ عنایت شہید کی سوانح کے ماخذ" مقالہ نگار پیر حسام الدین شاہ راشدی رسالہ "نئی زندگی" ماہ مئی سنہ ۱۹۷۰ء

[2] اعظم خان بن صالح خان بن فدائی خان، سال ۱۱۲۸ھ ہجری میں ٹھٹہ کا نواب مقرر ہوا تھا۔

[3] حضرت جان اللہ شاہ رضوی امیر محمد مکی کی اولاد میں سے تھے، روحانی فیض شاہ عنایت صوفی شہید سے حاصل کیا۔ ان کی وفات روہڑی میں سنہ ۱۱۶۷ھ میں ہوئی (تذکرہ لطفی حصہ دوم)

سوال :- تو نے یہ شور و غل کیوں کر پیدا کیا ہے ؟

شاہ صوفی نے جواب دیا :- آنروئی کہ توسنِ فلک زین کردند آرائش مہر و ماہ و پروین کردند

این بود نصیب از دیوان قضا ما را چہ گناہ قسمت ما این کردند

جب آسمان کے گھوڑے پر زین رکھی گئی اور سورج، چاند، ستارے سجائے گئے، قضا کے حاکم سے ہمیں یہی ملا، ہمارا گناہ کیا، ہماری قسمت ہی ایسی بنائی گئی ہے۔

نواب :- اپنے آپ کو کیوں بدنام کرکے بلا کے تیر کا نشانہ بننا چاہتے ہو ؟

شاہ صوفی :- عاشق چہ کند گر نکشد بار ملامت ہیچ دلدوز سپر از قضا نیست

عاشق کیا کرے ملامت کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا، کوئی بھی مصیبت میں مبتلا سر قضا سے خالی نہیں ہے۔

نواب :- اب جو تم قتل کئے جاؤ گے پھر یہ تمہاری طویل عمر کیوں کر رہے گی ؟

شاہ صوفی :- ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

جو عشق کے طفیل زندہ ہوا وہ کبھی نہیں مرتا، اس جہان کے دستاویز پر ہماری مہر ہمیشہ کے لئے ثبت رہے گی۔

نواب :- اُولی الامر کی اطاعت کیوں نہیں قبول کرتے ؟

شاہ صوفی :- ما مرید بسوئے کعبہ چون آریم چون بسوئے خانۂ خمار دارد پیر ما

ہم مرید کعبہ کی طرف رخ کیوں کریں، جب ہمارے مرشد کا رخ میخانہ کی طرف ہے۔

نواب :- آپ قضا کے تکمیل نہ ہونے کا کوئی تجھے غم ہے ؟

شاہ صوفی :- من ہمان دم کہ وضو ساختم، از چشمۂ عشق

چہار تکبیر زدم ہر چہ کہ ہست۔

میں نے اس وقت ہی عشق کے چشمہ سے وضو کرلیا، اور چار تکبیریں لگا دیں، اس کے بعد جو کچھ بھی ہو سو ہو۔

اس مقالہ کے بعد نواب کے دل کا غبار اور بڑھا، اُسے کیا معلوم کہ شاہ صوفی کی گفتگو میں کون سی حقیقت ہے۔ حقیقت پسندی سے آنکھیں بند کرکے ایک راست گو اور خدا آگاہ شخصیت کے لئے موت کا فتویٰ دیدیا۔

اب دیر نہ تھی، جلاد کو حکم دیا گیا، شاہ صوفی نے بڑے صبر و اطمینان سے اپنا سر جھکایا، اعظم خان کے اشارہ سے اس بیگناہ، مرد باخدا کا سرتن سے جدا کردیا، کہتے ہیں کہ جب نوک شمشیر اس سرشار عشق حقیقی کے نزدیک لائی گئی تو فرمایا۔

رہانیدی مرا از قید ہستی جزاک اللہ فی الدارین خیرا۔

زندگی کے شور و غل سے آپ نے مجھے چھڑایا، خدا تعالیٰ اس کے بدلے تمہیں دونوں جہانوں کی اچھائی عطا فرمائیگا۔

بعد میں اس غواص بحر حقیقت کے سر مبارک کو ٹھٹہ کی گلیوں میں تشہیر کیا گیا، یہ خون ناحق رنگ لایا، نہ یار محمد کلہوڑہ رہے اور نہ سندھ میں مغلیہ حکومت کا تسلط باقی رہا، یہ خون معمولی خون نہ تھا، یہ خونی واقعہ سنہ ۱۱۳۰ھ مطابق سنہ ۱۷۱۸ء[1] میں ہوا۔

---

[1] تذکرہ لطفی (تاریخ ادبیات سندھ) جلد اول تیسرا ایڈیشن مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۶۳۔

تاریخ تحفۃ الکرام میں آپ کی تاریخ وفات اس طرح دی ہے۔[1]

کلک قانع خادم خدام۔ ذوالمجد والصمد

بود قطب عہد خویش او بہ سال وصلش زد رقم

حضرت قادر بخش بیدل روہڑوی نے اس قیامت خیز واقعہ کا ذکر اپنے اشعار میں اس طرح کیا ہے۔[2]

عشق چندین حملہ بر عشاق خستہ می نمود

بر رخ صاحبدلان صد رہ در رحمت کشود

سویمی صفرا قیامت در ہزار دس صد

سر بریدن صوفی بیخود کمالش را فزود

شاہ صوفی کی شہادت کو عرصہ گذرا لیکن اس خون ناحق کی سُرخ لکیرین تاریخ کے اُوراق سے اب تک خشک نہ ہو سکین یہ تھے اس وقت کی سیاسی حالات۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را

چندان امان نداد کہ شب را سحر کند۔

۱۔ تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع صفحہ ۱۳۲

۲۔ تذکرہ لطفی جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۶۴

باب سوم

نور محمد کلہوڑہ

(۱۷۱۸ء — ۱۷۵۵ء)

میاں یار محمد کلہوڑہ کی وفات کے بعد اس کا نوجوان اور ہونہار بیٹا میاں نور محمد کلہوڑہ جانشین ہوا۔ اس کلہوڑہ امیر نے سندھ میں اپنے خاندان کی حکومت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کی۔ اس کا چھوٹا بھائی داؤد اگرچہ اس سے کچھ عرصہ کبیدہ خاطر رہا، مگر بعد میں راہ راست پر آگیا۔ میاں نور محمد کو اپنی حکومت کی توسیع کیلئے سندھ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے مقابلہ کرنا پڑا چونکہ وہ ملکی تدبر اور سیاست میں بڑے ہوشیار تھے۔ اکثر اکثر ریاستیں لڑ بھڑ کر اپنی حکومت میں شامل کرلیں صرف شکارپور کی ریاست رہ گئی تھی، جس کے داؤدپوترہ حکمران کسی بھی صورت میں متابعت کرنے تیار نہ تھے

داؤدپوتروں کے متعلق ہم نے اس سے پہلے ہی مختصر ذکر کیا ہے۔ چونکہ نور محمد اور داؤدپوترہ کے درمیان بہت عرصے سے کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ اس لئے یہ ذکر تفصیل سے کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

شکارپور کی تعمیر

یار محمد کلہوڑہ کے آخری ایام میں داؤدپوتروں کا قبیلہ زور پکڑنے لگا، اس قوم کے ایک سردار بہادر خاں کو نواب مرزا خان جو مغلیہ حکومت کے جانب سے سبی اور ڈھاڈھر کے نواب تھے، اپنے علاقہ میں سے ایک حصہ بطور جاگیر دیا۔ جس کے ایک طرف دریاء سندھ اور دوسری طرف جنگل تھا، اس علاقہ کے حدود پر ایک طرف خانپور اور بختیارپور، اور دوسری طرف لکھی کے مضبوط قلعے تھے۔ امیر بہادر خاں اس گھنے جنگل کو صاف کراکے ایک نئے شہر شکارپور کی بنیاد رکھی۔ گزیٹر سندھ میں یہی روایت موجود ہے۔ مرزا عطا محمد[2] نے روزنامچے میں اس روایت کو اس طرح لکھتے ہیں:-

"داؤدپوترہ اپنے پہلے وطن سے نکلے تو جس جگہ بعد میں شکارپور آباد ہوا وہ مویشی چرانے اور شکارگاہ تھی۔ اس نواح کے باشندی کا صدر مقام لکھی تھا، اور شیر خان مہر حاکم تھے۔ داؤدپوترہ امیر بھی شکار کھیلا کرتے تھے، مہر زمینداروں کو یہ روش پسند نہ آئی اور ان سے حسد کرنے لگے۔ مہروں کے روزمرہ کی چھیڑ چھاڑ اور کشمکش سے تنگ آکر عباسیوں نے اپنے پیر کو کہا تاکہ وہ مہروں کو سمجھائے کہ مہران کے مال مویشی کی مزاحمت نہ کریں اور شکار میں خلل انداز نہ ہوں۔ مہر بھی ان کے عقیدتمند تھے مگر انہوں نے اپنے مرشد کی سفارش کو ٹال دیا۔ آخر امیر بہادر خاں اپنی شجاعت اور عربی طاقت سے مہروں کے بارہ ہزار لشکر کو صرف چار سو آدمیوں سے خونریز جنگ کے بعد شکست دی۔ اس فتح کی خوشی میں لکھی شہر سے ۹ نو میل دور شمال میں شہر آباد کیا، جسکا نام شکارپور مرشد پیر سلطان محمد ابراہیم[3] نے رکھا، اور شکارپور شہر کے قلعے کا بنیاد سال ۱۰۲۶ھ مطابق ۱۶۱۷ء میں رکھا۔ اس بابرکت بزرگ کی دعا سے شکارپور ہمیشہ آباد رہا، حالانکہ بارہا اجڑ کر آباد ہوتا رہا۔ امیر بہادر خاں نے شہر کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا، جو انگریزوں کے ابتدائی دور ۱۸۴۵ء تک بالکل محفوظ تھا، بعد میں مرور ایام سے شکستہ ہوکر برباد ہوگیا۔"

امیر بہادر کا اقتدار دن بدن بڑھتا گیا، نواب مرزا خان افغان کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا بختیار خان باپ کی جگہ پر مسند نشین ہوا تو داؤدپوترہ نے خانپور کے قلعے پر بھی قبضہ کرلیا، جو شکارپور شہر کے مشرق میں آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ اب خانپور کا چھوٹا سا شہر آباد ہے۔ بختیار خان جب

1۔ شکارپور تاریخ کی روشنی میں مقالہ نگار راقم الحروف۔ پلیٹینم جوبلی گورنمنٹ ہائی اسکول شکارپور سندھ سینئر 1973 - 1873

2۔ نوای معارک منشی عطا محمد شکارپوری انجمن سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد

3۔ حضرت محمد ابراہیم اُچ ملتان کے گیلانی بزرگوں کے مرید تھے۔ آپ لکھی کے نزدیک آکر مقیم ہوئے۔ حضرت موصوف کی مزار مبارک لکھی کے نزدیک ایک بستی وزیر آباد میں موجود ہے۔ مقالہ (شکارپور تاریخ کی روشنی میں) (الراقم الحروف)

شہزادہ معزالدین جہاندار شاہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ تو امیر بہادر خان کے بعد اس کا بیٹا امیر مبارک خان جانشین ہوا۔ اس امیر سے یار محمد اور نور محمد کلہوڑہ کے سیاسی چپقلش شروع ہوئی۔ یار محمد اور مبارک خان کے مابین ایک مختصر جھڑپ بھی ہو گئی۔ مگر جلد ہی آپس میں صلح ہو گئی۔

شکارپور پر حملہ

میاں نور محمد نے۔ جو سندھ پر مطلق العنانی کا متمنی تھا۔ مبارک خان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنا چاہا، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر امیر مبارک خان کا اثر باقی رہا تو وہ مسند پر اطمینان سے حکومت نہ کر سکے گا۔ اس لئے وہ موقعے کا منتظر رہا۔ جلد ہی میاں نور محمد کو ایسا موقعہ ملا کہ ملّا جنید آبڑہ جو نوشہرہ آبڑہ[1] کا ایک چالاک رئیس تھا۔ امیر مبارک سے بگڑ بیٹھا تھا۔ اس نے میاں کو جاکر کذب اور افترا سے بھرے ہوئے افسانے سنائے۔ میاں وہ باتیں سنکر کبیدہ خاطر ہوا اور شکارپور پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ داؤدپوترہ نے بھی شکارپور اور خانپور کے قلعے کو زیادہ مستحکم کرلیا اس موقع پر امیر مبارک خان نے وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے امیر محمد صادق خان کی رسم دستاربندی کی عظیم الشان مجلس منعقد کی۔ میاں نور محمد اس عیش میں خلل ڈالنے کیلئے بڑی فوج لیکر شکارپور پر چڑھ آیا۔ لیکن میاں نے داؤدپوتروں کی جمعیت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ قلعے کا محاصرہ تو کرلیا لیکن کامیابی کی امید نظر نہ آئی۔ امیر مبارک بھی کھلے مقابلے کے بجائے چرب زبانی سے کام لیتا رہا، جس سے میاں کا جوش وخروش فرار ہو گیا۔ بظاہر صلح وصفائی سے کام لیکر خدا آباد کو واپس ہوا۔ اب امیر مبارک نے میاں کی لسانی ترغیب سے فریب کھایا اس پر اعتماد کرتے ہوئے زائد جمعیت کو منتشر کردیا۔ جب جاسوس نے میاں کو امیر مبارک کی دفاعی حیثیت کے کم ہونے کی اطلاع پہنچائی تو اُس نے اپنے تمام واعدوں کو بالائے طاق رکھکر لشکر کثیر لیکر شکارپور پر دوبارہ حملہ کردیا۔ چھ ماہ متواتر مقابلہ ہوتا رہا، مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ بالآخر اس طویل محاصرہ سے تنگ، اکر میاں کو اس کے صلاح کار راجو لیکھی نے محاصرہ اُٹھانے کا مشورہ دیا۔ ایک بار پھر صلح ہو گئی، اور میاں نے فوجیں ہٹانے پر مجبور ہوا۔ ناکامی کا داغ میاں کے دل پر رہ گیا۔ اُس پر آشوب زمانے میں امیر مبارک خان کا انتقال ہو گیا۔ اور ریاست کا نظم ونسق براہ راست امیر صادق محمد کے ہاتھ آیا۔ اب پھر میاں کے دل میں شکارپور پر حملہ کرنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ امیر صادق کی نا تجربہ کاری سے فائدہ اُٹھانے کیلئے شکارپور پر بڑی فوج اور ساز وسامان سے حملہ کردیا۔ امیر صادق محمد تاب مقاومت نہ لاکر شکارپور کو خالی کردیا۔ اور خانپور میں پناہ گزین ہوا میاں نے شکارپور کا قبضہ حاصل کرکے خانپور کے سمت کوچ کردیا۔ امیر صادق محمد نے خانپور کا قلعہ بھی خالی کردیا۔ اور بیٹ دبلی (علاقہ ڈیرہ غازی خان) کے طرف چلا گیا۔ اب میاں کی حکومت سبی تک وسیع ہو گئی اور شکارپور سے مراجعت کرتے ہوئے سکھر اور بکھر پر بھی قبضہ کرکے مغل نوابوں کی برائے نام حکومت کا خاتمہ کردیا۔ امیر صادق محمد کا تعاقب میرپور ماتھیلہ تک تیزی سے کیا۔ مگر شکار ہاتھ نہ آیا[2]۔ تھوڑے عرصہ میں میاں کا عبداللہ خان والی قلات سے تنازعہ ہو گیا۔ اور عبداللہ خان بروہی فوج لیکر میاں کے مقابلے کے لئے سندھ کی سرحد عبور کرکے لاڑکانہ تک چلا آیا۔ میاں اس وقت

عبداللہ خان والی قلات سے مقابلہ

دھاریجہ قوم کے مقابلہ کے لئے کلکرالہ کے نزدیک لشکر انداز تھے۔ یہ خبر سنکر طوفان کی طرح اٹھا۔ طرفین میں سخت مقابلہ ہوا مگر بروہی قوم کے نامور سردار نے میاں سے شکست کھاکر بڑے ذلیل شرائط پر جان چھڑالی یہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد میاں کی حکومت بہت مضبوط ہو گئی۔ ٹھٹہ جو اب تک مغل نوابوں کے قبضہ میں چلا آیا تھا، بعد میں مغل شہنشاہ محمد شاہ نے میاں کے تحویل میں دیدیا۔ اب وہ سندھ کے واحد حکمران تھے اور اُس کی حکومت دن بہ دن مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔

نادر شاہ کا حملہ

سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دہلی کو فتح کرلیا تھا۔ محمد شاہ سے صلح کرنے کے بعد ایشا کے یہ جابر فاتح لاہور پہنچے، تو میاں نور محمد اس خبر وحشت اثر کو سنکر بہت ہراساں ہوئے اور اپنے اہل وعیال اور خزینۂ شاہی کو لے کر تلہار[3] بھیجدیا اور خود عمرکوٹ

---

[1] نوشہرہ آبڑہ اب گڑھی یاسین تعلقہ (ضلع سکھر) میں ایک چھوٹی سی بستی رہ گئی ہے۔

[2] صبح صادق طبع ثانی۔ مصنف مولانا عزیز الرحمان صاحب بہاولپوری صفحہ ۷۰ [3] تلہار حیدرآباد سندھ کے ضلع میں ایک چھوٹا شہر ہے۔

جاکر چھپا، نادر شاہ نے دہلی کی فتح کے بعد سندھ میں آئے تھے۔ اس حالت کو دیکھکر غصہ میں آکر مختصر فوج سے عمرکوٹ کی طرف یلغار کی ریگستانی علاقوں سے گزرکر عمرکوٹ کے قریب جا پہنچے۔ ایک صبح کو جب میاں نیند سے جاگا تو اُسے اطلاع ملی کہ نادر شاہ فیصل قلعہ کے سامنے پہنچ چکے ہیں۔ اب نور محمد کی حالت مصداق "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" تھی۔ مجبوراً خمناک فاتح کے سامنے پہنچ کر پریشان حالی میں حاضر ہوا۔ نادر شاہ کو اس کی زبوں حالی پر ترس آیا۔ اور اُسے لاڑکانہ ساتھ لائے۔ ایک کروڑ روپیہ لیکر شاہ قلی کا خطاب دیا۔ اور حکومت بحال کردی۔ مگر شکارپور کا علاقہ داؤد پوتروں کو اور سبی کا علاقہ خان قلات کو لوٹا دیئے گئے۔ نادر شاہ کی یلغار کے بعد، میاں نے بتدریج پھر سندھ کے مختلف حصوں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔ نادر شاہ کے قتل ہونے تک اس کی جارحانہ کاروائی رکی رہی۔ لیکن اس کی شہادت کے بعد بالکل آزاد اور مطلق العنان ہوگیا۔ پھر داؤد پوتروں سے جنگ اور شکارپور واپس لینے کا مصمم ارادہ کرلیا ۱۷۴۲ء کے شروع میں بڑی فوج لیکر اچانک حملہ کردیا۔ نواب محمد صادق خان نے اپنے فرزند بہاول خان کو جو اس وقت بہاولپور کے نزدیک بیٹ دبلی[1] کی جاگیر میں مقیم تھا، فوری کمک کیلئے لکھا۔ مگر امدادی فوجوں کو پہنچنے سے پیشتر میاں نے شکارپور کے قلعہ کے آٹھوں دروازوں[2] پر مضبوط نگرانی قائم کردی نواب محمد صادق خان نے جب معاملہ دگرگوں دیکھا۔ تو "راضی بہ قضا" ہوکر سب حرموں کی حفظ ناموس کے خاطر قتل[3] کرکے کفن سر سے باندھ کر شمشیر بدست، بعض جاں نثاروں کے باہر نکل آیا۔ اور بہت دلاوری سے مقابلہ کیا۔ پر سب پرمہ متاد ئے، مگر بالآخر لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ سورج غروب ہوتے ہی اس غیور بہادر شخصیت کے اقبال کا آفتاب بھی ہمیشہ کیلئے[4] ڈھل گیا، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ بقیۃ السیف فوج بھاگ کر بہاول خان کے پاس اس المناک واقعہ کی خبر دی۔ اس کشت و خون کے بعد کامل سال میاں نور محمد نے حکومت کی۔

احمد شاہ ابدالی اور میاں نادر شاہ کی شہادت کے بعد جب احمد شاہ ابدالی نے افغانستان میں اپنی وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی تو، ۱۷۴۸ء میں میاں نور محمد کو سندھ کے نواب کی سند اور شاہنواز کا لقب عطا فرمایا۔ ۱۷۵۵ء میں جب یہ نامور سلطان پنجاب اور دہلی پر حملہ کرنے کے لئے سندھ میں آیا تو میاں نور محمد اس اطلاع سے ستوحش ہوکر جیسلمیر کی طرف بھاگ گیا۔ ابدالی تاجدار میاں کے فرار ہونے کی خبر سنکر بڑا فروختہ ہوا مگر اُس کے سفیر دیواں گدومل نے شاہ کے دل سے گرد و غبار دور کیا۔ احمد شاہ نے میاں کو بحال کرتا ہوا پنجاب روانہ ہوا۔ مگر میاں کو سندھ کی سرزمین دیکھنے کو نصیب نہ ہوئی، وہ جیسلمیر اور عمرکوٹ کی راہ میں وفات پاگئے۔

اس میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں کہ میاں نور محمد کلہوڑہ خاندان کے زبردست اور دوراندیش حکمران تھے۔ اُس نے اپنے تدبر سے اپنی قوت بازو سے تمام سندھ پر کلہوڑہ حکومت قائم کردی تھی۔ خود بھی بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔ اُس کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوتی رہی مگر محمد مرادیاب کی معزولی کے بعد میاں غلام شاہ تخت و تاج حاصل کرکے کھوئی ہوئی طاقت کو پھر سے بحال کردیا اور بڑے جاہ و جلال سے حکومت کی۔ چونکہ اس کتاب میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[2] کے زمانہ تک سندھ کے سیاسی، تمدنی اور معاشی حالات دکھانا مقصود تھا۔

۱۔ بیٹ دبلی، ریاست بہاولپور میں ایک مقام ہے۔ صبح صادق مصنف عزیز الرحمان بہاولپوری۔

۲۔ شکارپور کے قلعہ کو آٹھ دروازے اور ایک کھڑکی تھی، جن کے نام مختلف شہروں کے طرف جانے کے لئے رکھے گئے تھے جو آج بھی اس نام سے مشہور ہیں۔ ا۔ لکی دروازہ ۲۔ ہزاری دروازہ، ۳۔ ہاتھی دروازہ، ۴۔ خانپوری دروازہ ۵۔ سیوی دروازہ ۔ ۶۔ فوشہرو دروازہ ۷۔ واگنہ دروازہ ۸۔ کرن دروازہ ۹۔ صدیق ماڑی۔

۳۔ سندھ گزیٹیر رقمطراز ہے کہ داؤد پوترہ نواب صادق محمد نے اپنی مستورات کو قتل کرکے اُن کے نعش کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ وہ کنواں آج بھی محلہ ماہو میں موجود ہے۔ "ماہو کی معنیٰ قتل عام ہے" شاید اس خونی واقعہ کی یاد میں اس محلہ پر ماہو نام مشہور ہوگیا ہو۔

۴۔ آپ کا مزار شکارپور میں اسٹوسٹ گنج ٹیکرائی بزار کی مسجد کے ساتھ گورستان میں ہے۔

۵۔ سندھ گزیٹیر میں اس واقعہ کو بُری طرح مسخ کردیا ہے۔ اس مشہور محاصرہ کو افغانستان کی طرف سے منسوب کیا ہے جو غلط ہے سندھ گزیٹیر صفحہ ۱۱۔

شاہ عبدالکریم بلڑیؒ عوام شاہ کریم بھی کہتے ہیں، آپ اپنے وقت کے مشائخ میں بلند درجہ رکھتے تھے۔ سید موصوف سنہ ۹۴۴ ہجری میں تولد ہوئے[1] بچپن میں ہی آپ کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا، آپ کی پرورش آپ کی مہربان والدہ ماجدہ نے نہایت عمدہ طور پر کی، تعلیم و تربیت کا بھی اچھا بندوبست کیا، لیکن ظاہری علوم سے کچھ دل بستگی پیدا نہ ہوئی تاہم کچھ نہ کچھ حاصل کر لیا، عہد طفلی میں آپ سے اکثر ایسی باتیں ظہور میں آتی تھیں جن کو دیکھکر صاحب حال بزرگ آپ کی روحانیت کے قائل ہو جاتے تھے۔

شاہ صاحب نے اپنی جوانی بڑی محنت اور مشقت سے بسر کی، یاد الٰہی میں ان کے دن اور راتیں کٹ جاتی تھیں، یہی ایک دھن اُن کو لگی رہتی تھی، اگرچہ محنت اور مزدوری بھی سخت کرتے تھے تاہم ایک رات بھی عبادت الٰہی سے غافل رہتے تھے۔ اتفاقاً ان دنوں ایک بزرگ سلطان ابراہیم بہاری جو مشائخ ہند میں سے تھے، شاہ عبدالکریمؒ کے گاؤں کی مسجد میں آکر مقیم ہوئے۔ شاہ کریم ان کی صحبت کے بعد اُن کے گرویدہ ہوگئے، اور بڑی خلوص دلی سے اُن کی خدمت کی، اس بزرگ نے بھی شاہ کریم میں شوق خداشناسی پیدا کی۔ شیخ طریقت کے اچانک جانے کا بڑا قلق ہوا۔ کیوں کہ شیخ طریقت شاہ کریم کے یہاں چھ ماہ مہمان رہکر غائب ہوگئے تھے، شاہ کریم ان کی تلاش میں بہت پریشان اور سرگرداں پھرتے رہے، بالآخر بڑی تلاش کے بعد اُن کو ٹھٹہ کے ایک بزرگ سیدؒ میراں شاہ یوسف بکھری[2] کے یہاں پالیا، چونکہ سلطان ابراہیم کو سیر سفر کا شوق تھا، اس لئے شاہ کریم کو تسلی دیکر پھر رخصت ہوگئے۔ اُن کے جانے کے بعد شاہ کریم اپنی زندگی کے نایاب لمحات، ذکر و فکر میں بسر کرنے لگے۔ اس وقت کے بڑے بڑے بزرگان دین مثلاً حضرت مخدوم نوحؒ میراں سیدؒ یوسف بکھری اور مخدوم آدم سمیجہ کی صحبتوں میں بھی رہے اور اُنھوں نے بہت کچھ حاصل کرلیا ان بزرگوں کے اشاروں سے مٹیاری سے ہجرت کرکے بلڑی[3] میں جاکر مقیم ہوئے۔ جہاں اس کے چشمہ فیض و رشد و ہدایت سے ہزاروں پیاسے سیراب ہوتے رہے۔ آپ کی زندگی کے آخری لمحات خدا کی خلق کی تلقین میں گذرے، یہ برگزیدہ اور عابد ہستی سنہ ۱۰۳۲ ہجری میں اٹھاسی برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ آپ کی اولاد[4] میں سے تھے۔

۱؎ تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴

۲؎ بکھر شہر کی آبادی کے لئے تاریخ طاہری اور تاریخ تحفۃ الکرام میں ذکر ملتا ہے، جب سید محمد مکی اس مقام میں داخل ہوئے تو، انکے خادموں نے پوچھا منزل کس جگہ کریں، آپ نے فرمایا جس جگہ صبح کے وقت بقر (گائے) کی آواز سنو اس وقت منزل کرنا۔ جب صبح کے وقت آپ وہاں پہنچے تو بقر کی آواز سنی، اور وہاں ٹھہر گئے۔ اس بقر سے رفتہ رفتہ نام بکھر ہوگیا۔ 'تاریخ تحفۃ الکرام صفحہ ۱۳۴ جلد سوم'

۳؎ بلڑی حیدرآباد میں ایک گاؤں ہے، جو شاہ کریم کے نام سے مشہور ہے۔

۴؎ حسب نام حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اس طرح ہے۔ حضرت مرشد زماں و سید دوراں سرخیل عارفاں، افتخار عابداں سید عبداللطیف بھٹائیؒ بن سید حبیب شاہ، بن سید کامل شاہ، بن سید کبیر شاہ، بن سید عبدالرشید شاہ، بن سید عبدالقدوس، بن سید جمال شاہ، بن حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی قدس سرہ، بن سید لعل شاہ، بن سید عبدالمومن شاہ، بن سید ہاشم شاہ، بن سید حاجی شاہ، بن سید جلال محمد شاہ، بن سید شرف الدین شاہ، بن سید میر شاہ، بن سید حیدر شاہ، بن سید میر علی شاہ، بن سید محمد شاہ، بن سید حسین شاہ بن سید علی شاہ بن سید یوسف شاہ، بن سید حسن، بن سید ابراہیم شاہ، بن سید علی جواری شاہ، بن سید لاکبری، بن سید جعفر ثانی شاہ بن امام ولایت حضرت موسیٰ کاظم بن امام المسلمین حضرت جعفر صادق بن حضرت امام محمد باقر بن امیر المسلمین سید الساجدین امام زین العابدین علیہ السلام بن سید الشہداء شفیعہ کربلا زین دارین حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ بن امیر المومنین شیر خدا حضرت علی اسد اللہ کرم اللہ وجہہ

شاہ عبدالکریم اپنے وقت کے بلند پایہ شاعر اور مفکر تھے. اُن کے اشعار سندھی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں. آپ کے کلام میں کل "چورانوے ۹۴" ابیات ہیں. شعر کی نزاکت اور زبان کی شیرینی اور پختگی کے علاوہ پورا کلام تصوف کے باریک نکتوں سے بھرپور ہے. تذکرہ لطفی[1] کے مصنف کی رائے کے مطابق آپ کے کلام میں تصوف خالص وہ ہے جو عراق کے بزرگوں حضرت بایزید بسطامی، حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی اور معروف کرخی کا ہے آپ کا تصوف اسلامی تصوف ہے.

شاہ عبدالکریم بلڑی کے آٹھ فرزند تھے، جن میں سے سیّد جمال شاہ کی پشت سے سندھ کے عرفانی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[2] پیدا ہوئے. کسی شاعر نے شاہ عبدالکریم کی تاریخ ولادت اور سال ارتحال اس طرح منظوم کیا ہے[2]

شاہ عبدالکریم سیّد ما — بود از ھادیان راہ خدا.

از نبی و علی نژادش دان — وز حسین و بتول اصلش

بود از اولاد حیدر ھروی — زادہ شد اولاً بمتعلوی

سال نھصد و چھار دگر — بود از ھجرت شفیع بشر

چونکہ سی و دو ھزار گذشت — شد لقائش نصیب و وصلش گشت

شھر ذی قعدہ ھفتمیں از ماہ — شب یکشنبہ ان خدا آگاہ

وقت شام از جھان برضوان رفت — قد بَلَغَ، نیست در حساب

سال تاریخش از رہ ابجد — جر بَلَغَ نیست در حساب خرد

برحمت حق برادو مریدانش — وز خداباد عفو وغفرانش.

آپ کا مزار مبارک، آپ کی گاؤں "سیّد پور" بلڑی شہر ملا کاتیار کے نزدیک دریا کے کنارے واقع ہیں جہاں ہر ماہ کے پہلے دوشنبہ پر عرس ہوتا ہے، جہاں پر اولیاء بزرگ، مرید، خادم جمع ہوکر سماع کرتے ہیں.

سیّد حبیب شاہ قدس سرہ

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[2] کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سیّد حبیب شاہ ہے، آپ حضرت پیر سیّد عبدالکریم بلڑی[2] کے فرزند سیّد جمال شاہ کی اولاد میں سے تھے، سیّد حبیب شاہ کے والد کا نام سیّد عبدالقدوس شاہ تھا، سیّد جمال شاہ بھی اپنے دور کے صالحین میں سے تھے، میرعلی شیر قانع تاریخ تحفۃ الکرام میں اس طرح آپ کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

عابد روزگار آمدہ

آپ اپنے والد کی زندگی میں ہالا کے قریب ڈاکوؤں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگئے. صاحب تحفۃ الکرام[3] سیّد حبیب شاہ کے متعلق لکھتے ہیں

"حبیب شاہ از بنائر اظہر سیّد عبدالکریم است، ھمیشہ صاحب حال و وجد بودہ و استغراق کمال داشت و تکلم نمودی ی فرمود کیستی؟ وچوں دے میفرمود کہ غلام حضرت ایشان عبداللطیف است، فرمودے نشنیدم"

---

[1] تذکرہ لطفی "تاریخ ادبیات سندھ" مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی جلد اول

[2] شاہ عبدالکریم بلڑی والے کا کلام مرتب ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ صفحہ ۱۸ [3] تاریخ تحفۃ الکرام صفحہ ۱۷۳ جلد سوم

ترجمہ:- سید حبیب شاہ سید عبدالکرام کی پاک اولاد میں سے ہیں، وہ ہمیشہ حال اور وجد کا صاحب تھا، اور نہایت استغراق کی حالت میں رہتا تھا، کہتے ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ آپ کا نامی گرامی شان فرزند سید عبداللطیف جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر باتیں کیا کرتا تھا، تو آپ فرماتے تھے، تو کون ہے شاہ عبداللطیف جواب میں کہتے تھے آپ کا غلام عبداللطیف ہوں آپ فرماتے تھے میں نے نہیں سنا

سید حبیب شاہ بقول صاحب تحفۃ الکرام اپنے زمانے کے اہل اللہ میں سے تھے، عین جوانی میں وقت نا سازگاری اور عزیز و اقارب کی بے مہری کے، بلڑی سے نقل سکونت کرکے ہالا حویلی[1] میں جاکر مقیم ہوئے۔ چونکہ نرینہ اولاد سے محروم تھے اس لئے ہمیشہ متفکر رہتے تھے۔ روایت ہے کہ سید حبیب شاہ اس مایوسی کی عالم میں کسی درویش[3] کی خدمت میں جاکر اپنا درد سنایا، اس خدا اندیش بزرگ نے اُسے تسلی دی اور فرمایا، کہ اُسے ایک فرزند تولد ہوگا، جو اپنے زمانے کا غوث اور قطب، ساتھ ساتھ یہ بھی وصیت کی کہ اس بچہ کا نام عبداللطیف رکھا جائے۔ کچھ عرصہ کے بعد سید حبیب شاہ کے یہاں ایک فرزند تولد ہوا سید حبیب شاہ نے اس کامل ولی کی وصیت کے مطابق اپنے فرزند کا نام عبداللطیف رکھا، لیکن یہ بچہ چھوٹی عمر میں چل بسا، اس کے بعد سید صاحب کو دوسری حرم سے ایک فرزند تولد ہوا، جس کا نام جمال شاہ رکھا، جس کی اولاد آج تک بھٹ کی مسند فقر پر جانشین ہوتے رہے ہیں۔ جمال شاہ کی ولادت کے بعد سید حبیب شاہ کو پھر پہلی بیوی سے ایک فرزند تولد ہوا، جس کا اسم گرامی عبداللطیف رکھا، یہ بچہ حضرت مرشد زمان و سید دوران سرخیل عارفان سردار عشاقان، سرتاج شعراء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمت اللہ علیہ تھے، جن کی صدائے سخن سے سندھ کا ذرہ ذرہ گونج اُٹھا، جس طرح عموماً مشاہیر زمانہ کی سال ولادت یا سن ارتحال میں اختلاف و روایت ہوتا رہا ہے، اس طرح حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[2] کے سن پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔ ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی[4] نے اپنی تصنیف میں اس پر جہت دلچسپ بحث کی ہے اور تاریخ ولادت سنہ ۱۱۰۲ھ مطابق سنہ ۱۶۸۹ء، سنہ ۱۶۹۰ء بتلائی ہے۔ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ[5] نیز اپنی تصنیف میں ڈاکٹر گربخشانی کی تائید کرتا ہے، لیکن ڈاکٹر ارنیسٹ ٹرمپ[6] جن کو شاہ بھٹائی کے کلام جمع کرنے اور اس کی اولیں طباعت کا شرف حاصل ہے۔ شاہ صاحب کا سال ولادت سنہ ۱۶۸۰ء بتایا ہے۔ لیکن بیرونی شہادتیں میسر ہوئی ہیں۔ انکی رو سے ڈاکٹر ٹرمپ کا دیا ہوا سال ولادت اعتبار سے گرا ہوا نظر آتا ہے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ولادت کا سنہ ۱۱۰۲ھ مطابق سنہ ۱۶۸۹ء ہے۔ شاہ صاحب کی والدہ مخدوم عربی دھیانی کے خاندان سے تھی۔ شاہ دھیان[7] کو تحفۃ الکرام میں مخدوم عربی دھیانی لکھا ہے۔ کیونکہ ان کے آباء واجداد عرب سے ہجرت کرکے سندھ میں آکر بسے تھے۔ مخدوم عربی دھیانی کے روحانی حالات کا ذکر آگے صفحات پر آئیگا۔

---

1. ہالا حویلی تعلقہ ہالا ضلع حیدرآباد سندھ میں ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اب ویران رہ گئی ہے بھٹ شاہ سے نو میل کے فاصلے پر ہے

2. احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ مصنف شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ صفحہ ۲۰

3. ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیق کے مطابق، شاہ حبیب نے درویش سید هاشم شاہ (مدفون مٹیاری) کو اولاد نرینہ کے لئے دعا کے واسطے عرض کی تھی (نئین زندگی ۵۷)

4. مقدمہ رسالہ شاہ عبداللطیف مصنف ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی صفحہ ۱۷

5. احوال شاہ عبداللطیف مصنف شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ صفحہ ۱۱۔

6. Dr: Ernst Trump, had collected and prepared the Shah-Jo-Risalo, which was published in 1866. It was first time that this master piece of Sindhi Literature was published in Germany. no Sindhi has forgotten this great service rendered by the German Scholar.

7. ڈاکٹر گربخشانی نے اپنی تصنیف مقدمہ (صفحہ ۱۷) شاہ بھٹائی کی والدہ کو مخدوم عربی کی دختر لکھا ہے، لیکن یہ روایت صریحاً غلط ہے مخدوم عربی دھیانی کا سن وفات ۹۸۰ھ ہے۔ اور شاہ بھٹائی کی ولادت سنہ ۱۱۰۲ھ ہے اس لحاظ سے ڈاکٹر گربخشانی کی یہ روایت قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ولادت کے بعد، سید حبیب شاہ نے ہالا حویلی کو چھوڑ کر کوٹڑی کے ایک چھوٹی سی بستی میں جاکر بسے۔ شاہ حبیب نے کن وجوہات کی بنا پر ہالا حویلی سے ہجرت کی تھی، اُس کا حال کسی تذکرہ سے معلوم نہیں ہوسکتا، لیکن ڈاکٹر نبی بخش خان[1] بلوچ کی تحقیق کے مطابق جب تیسری بار پہلے حرم سے بچہ ہوا تو تولد ہونے سے پہلے شاہ حبیب کو اس درویش کے کہنے پر ہالا حویلی سے ہجرت کرکے آئے، یہ شرف ہالا حویلی کو ہوا جو کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ وہیں تولد ہوئے۔ جہاں سے شاہ حبیب چند دنوں کے بعد ہجرت کرکے علی محمد ڈیری کے گاؤں میں جاکر رہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا بچپن:-

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بچپن کے متعلق قدیم روایتوں سے جس قدر معلوم ہوسکا ہے وہ خوش اعتقادی کی باتیں ہی نظر آتی ہیں، جو روایتں شاہ بھٹائی کے بچپن سے منسوب ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادرزاد ولی تھے۔ بچپن کے کھیلنے والے ساتھیوں سے جب وہ الہیات کے نکتے بیان کرتے تھے، تو بڑی عمر کے سننے والے بھی حیران رہ جاتے تھے۔ اس ہونہار بچہ کی ہر بات سے کرامت اور صداقت ٹپکتی تھی۔

بالائی سرش زہوشمندی   می تافت ستارۂ بلندی

جب اُس کے ساتھی کھیل کود میں مشغول ہوتے تھے، تو آپ کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ کر غور و فکر میں ڈوب جاتے تھے کھیل بند ہو جاتا تھا کھیلنے والے اپنے گھروں کو پہنچ جاتے تھے، لیکن ان کو اپنے ساتھیوں کے متعلق کچھ خبر نہ رہتی تھی، یہ استغراق اور محویت ان پر پوری زندگی طاری رہی روایت ہے کہ ایک بار شاہ عبداللطیف، بستی کے چند لڑکوں کے ساتھ بہت دور ریت کے ٹیلوں کی طرف جانکلے لڑکے تو کھیلنے میں مشغول تھے، لیکن شاہ بھٹائی ایک ٹیلہ کے سایہ میں تنہا کسی فکر میں ڈوب گئے شام ہوگئی۔ لڑکے تو اپنے گھر چلے گئے مگر شاہ لطیفؒ پر محویت اتنی چھائی ہوئی تھی، کہ آپ کو مطلق خبر نہ ہوئی، کہ ان کے ساتھی، اپنا کھیل ختم کرکے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ شاہ بھٹائیؒ اپنے گھر نہ آئے، آپ کے والد کو بڑی تشویش ہوئی، وہ ڈھونڈھتے ہوئے، ایک ٹیلہ سے دوسرے ٹیلہ پر چڑھتے رہے، رات کی تاریکی میں کچھ نہیں سوجھتا تھا، مگر پدری محبت کے مارے ریگستان میں دوڑتے رہے، جب وہ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئے، تو عالم مایوسی میں ان کی زبان سے بے اختیار یہ فقرہ نکلا:-

ٻگي ٻگي واءُ ويا انگڙا لٽيي

افسوس! ریت نے اُڑ کر نازک جسم کو ڈھانپ لیا۔

کہتے ہیں کہ باپ کا یہ فقرہ جب بیٹے کے کان پر پڑا، تو اُنھوں نے فی البدیہ جواب میں کہا۔

پٽي ڪئي پساھ، پسڻ ڪارڻ پرينءَ جي۔

دوست کے دیدار کے لئے، اپنا بڑا دم لے رہا ہے۔

جب شاہ بھٹائی سات برس کے ہوئے تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں داخل کردیا۔ آخوند نور محمد اس مکتب کے معلم تھے، جن کے درس میں ان کو بٹھایا گیا تھا، اس وقت کے بہترین اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، آخوند صاحب ذات کے "بھٹی" تھے، اور وائی[3] کے رہنے والے تھے، طویل مدت سے درس و تدریس کا مشغلہ رکھتے تھے۔ آپ کے درس سے بہت لوگ فیضیاب ہوکر نکلے تھے، کہتے ہیں کہ جب شاہ صاحب کو آخوند صاحب نے لوح ہاتھ

1۔ تاریخ تحفۃ الکرام صفحہ ۱۵۰   کوٹڑی کی بستی بھٹ شاہ سے چار میل کے فاصلے پر ہے اور آج کل ویران ہے۔

2۔ مقالہ "شاہ حبیب کا خاندان" مقالہ نگار ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، رسالہ نئی زندگی ماہ نومبر ۱۹۵۷ء

3۔ وائی یہ بستی اسٹیشن اُڈیرو لعل (حیدرآباد ضلع) سے دو کوس کے فاصلے پر ہے۔

میں دیکر الف کی طرف انگلی اُٹھا کر اشارہ کیا۔ تو آپ نے فوراً "الف" کہہ دیا، مگر اخوند صاحب جب "ب" پر آئے تو چھوٹے بچے نے ادب سے عرض کیا۔ استاد یہ "ب" کیوں، میرے لئے "الف" کافی ہے۔ "ب" کی نہ طلب ہے نہ ضرورت۔ آخوند صاحب "ب" کا بہتیرا تکرار کرتے رہے، مگر یہ بچہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ تنگ آکر آخوند صاحب نے بچہ کو ساتھ لیا، اور شاہ حبیب کی خدمت میں آئے۔ اور گذرا ہوا واقعہ لفظ بلفظ دھرایا۔ سید حبیب شاہ بچے کو تسلی دیکر تائید کی اور ساتھ ہی نصیحت فرمائی کہ علوم ظاہری کیلئے "ب" کا پڑھنا بھی لازمی ہے[1]

شاہ بھٹائی کی تعلیم کے متعلق مورخین کی متضاد رائیں ہیں، متقدمین اس بات پر متفق ہیں کہ شاہ بھٹائی اُمی تھے، مگر متاخرین نے اپنی تاویلات سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاہ صاحب تعلیم یافتہ تھے؟ شاہ صاحب کی سوانح حیات لکھنے والوں نے جداگانہ رائیں لکھکر اپنے اپنے خیالات پیش کئے ہیں، مندرجہ ذیل مصنفین کے نام قابل توجہ ہیں ۔

۱۔ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ ۔ ۲۔ ارنسیٹ ٹرمپ ۳۔ ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی ۔

۴۔ ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے ۵۔ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤدپوتہ۔ ۶۔ لیلارام سنگھ وطن مل ۔

ان مصنفین کے دلائل کو ہم تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جا سکے، سب سے پہلے ہم تاریخ تحفۃ الکرام کی شہادت کو پیش کرتے ہیں

آثار کرامت واخبار خوارقاتش اظہر من الشمس دریں مختصر چہ قدر گنجایش پذیرد

مادر اُمی بود، حق تعالیٰ تمام علوم بر لوح سینہ اش مثبت داشتہ

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف نے اپنی مختصر تحریر میں دو اہم باتوں کا اعادہ کیا ہے ۱۔ شاہ صاحب، صاحب کرامات تھے ۔

۲۔ ان کی کرامتوں میں اُن کا اُمی ہونا نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے، اپنی تصنیف شاہ عبداللطیف بھٹائی میں ایک جگہ رقمطراز ہے[4]

شاہ صاحب کی زندگی کے متعلق جاننے والوں میں مرزا قلیچ بیگ کا رتبہ محققین میں سے ہیں اور اُس کی تحقیقات یقین کے درجہ پر ہے۔ وہ خوش نصیب ہے کہ جو روایتیں اس تک سینہ بہ سینہ پہنچی ہیں۔ وہ شاہ بھٹائی کے زمانے تک جا پہنچتی ہیں۔ اور ان آدمیوں سے جا ملتی ہیں جنہوں نے خود شاہ بھٹائی کو دیکھا تھا، مگر آج وہ سلسلہ منقطع ہے ۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے نے یہ حقیقت مرزا صاحب کی سندھی تصنیف "احوال شاہ بھٹائی" سے مستعار لی ہے ۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں ۔

یہ اطلاعات اُس کے ارادتمندوں اور دوسرے متعلقین سے ہاتھ آئے مگر افسانوی صورت میں "

یہ تعجب کا مقام ہے کہ ڈاکٹر سورلے صاحب آگے چل کر مرزا صاحب کی ان سینہ بہ سینہ روایات سے شدید اختلاف کرتا ہے۔ لکھا ہے

" ایک محقق کے لئے یہ طفلانہ باتیں صحیح حقائق کے دھرانے کے بغیر بے صدری روایات علم النفس کے جاننے والوں کیلئے فقط زبانی روایات ہی رہ جاتی ہیں جن پر اس حقیقت کے انکشاف سے مرا مقصد ہے تاریخ کا طالب علم کس طرح اعتبار کرسکتا ہے "

۱۔ احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی" مرتب مرزا قلیچ بیگ مرحوم صفحہ ۱۱ ۔ تاریخ تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع ۔

۲۔ ایضاً " " "

۳۔ تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع ۔ جلد سوم صفحہ ۱۵۲

۴۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی" مصنف ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے

۵۔ احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی مرتب مرزا قلیچ بیگ دیباچہ

پر مقصد ہے :-

۱۔ مرزا صاحب اور دوسرے مصنفین نے محض زبانی روایات پر اپنی علمی تحقیقات کی بنیاد قائم کی ہے

۲۔ سینہ بہ سینہ روایات بقول ڈاکٹر سورلے، مرزا صاحب پر ختم ہوگئی ہیں، افسوس ہے کہ ڈاکٹر سورلے نے مرزا صاحب کی تصنیف "شاہ بھٹائی کی حالات" کی تصحیح سے متاثر ہوکر ایک غلط رائے قائم کر رکھی تھی، اور سینہ بہ سینہ روایات کے ملنے سے قطعی نا امید ہو چکے تھے، ورنہ اُنکے ایک جداگانہ تصنیف مرتب ہو سکتی تھی۔ ڈاکٹر سورلے کی اس علمی لغزش نے اُسے قیمتی معلومات سے محروم رکھا، یہ بلکل غلط ہے کہ یہ صدری روایات مرزا قلیچ بیگ صاحب پر ختم ہوگئی تھیں، کتنی روایتیں ایسی بھی موجود ہیں کہ وہ مرزا صاحب تک نہ پہنچ سکی ہیں۔ میں نے ایک سماع کی محفل میں دیکھا کہ ایک سندھی آزاد نظم میں شاہ صاحب کی شاعرانہ نوک جھونک کا ذکر نہایت دلکش انداز میں بیان کر رہے تھے۔ مثلاً صابر شاعر اور شاہ بھٹائی کے شاعرانہ سوال جواب بیان کر رہا تھا۔ صابر شاعر نے شاہ صاحب کو کہلا بھیجا [1] کہ

نالوں نے بہہ کر دریا کو دبا لیا ہے۔

اس سے شاعر کی شاعرانہ تعلی مقصود تھی، اور شاہ بھٹائی کی شاعری پر چوٹ کرنا چاہتا تھا، لیکن شاہ صاحب نے صابر کو یہ معقول جواب دیکر خاموش کیا۔

نالے بہہ کر کس طرح دریا کو دبا سکتے ہیں۔

جب دریا میں موج آئے، تو ان سے راستہ بنالے گا

اور وہ ایک ناچیز نالی کس طرح، بہہ کر خاموش ہو جائیگی۔

ایسی روایات شمال اور جنوب سندھ میں کثرت سے سننے میں آتی ہیں۔ اگر اُن کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ متاخرین نے جب اپنی تعمیر کی بنیاد زبانی روایات پر رکھی ہیں تو ہم ایک تاریخی تحقیقات کی اصلیت، کو کیوں متزلزل ہونے دیں۔ خدا جانے ڈاکٹر گربخشانی نے کس سند پر تحفۃ الکرام کی روایت کی تکذیب کی ہے، اس نے دلائل پیش کئے ہیں۔ وہ غیر تاریخی اور تاویلات پر مبنی ہیں، ہم فرداً فرداً یہاں اُن کا ذکر کرینگے۔

یہ واضح حقیقت ہے کہ تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف سید میر علی شیر قانع ٹھٹہ کے رہنے والے تھے، اور اُنہوں نے یہ اپنی تصنیف میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے ایام حکومت میں لکھکر ختم کی تھی، یعنی شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کی وفات سے پندرہ سال بعد ۱۱۸۱ھ میں اس حقیقت سے معلوم ہوتا ہے کہ میر علی شیر قانع، شاہ صاحب کی آخری عمر میں جوان سال تھے، اس کو اگر شاہ صاحب کا همعصر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اب ہم اس کی روایت پر تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی جن سے شاہ بھٹائی کے گہرے تعلقات تھے، میر علی شیر قانع کے استاد مخدوم نعمت اللہ سے دوستانہ تعلقات تھے میر علی شیر قانع اپنے استاد کے ساتھ مخدوم محمد معین کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ میر علی شیر قانع کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] صابر کا سندھی میں شعر اس طرح ہے :- واھڙ ويا وهي درياهُ دريا ۾ کي (الخ)

شاہ بھٹائی کا جواب واهڙ وهي ڇا درياهين درياه کي

اينديءَ موج مهراڻ کي هنديءَ گس گهي۔

کسي جان ڪهي، ويندا منجهه پيٽ مانِ پُٺ۔ "شاہ ای تی با خواندہ" مضمون نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی (شاعرہ جو سرتاج)

مخدوم محمد معین ؒ کی وفات کے وقت شاہ صاحب اُن کے سرہانے موجود تھے مخدوم کی وفات کے بعد آپ نے فرمایا تھا :-

مخدوم صاحب کی ملاقات کیلئے ہی ہم ٹھٹہ آتے تھے۔ اب جبکہ آپ نے
رحلت فرمائی ہے۔ ٹھٹہ میں اب ہمارا آنا موقوف ہوگیا۔

مخدوم معین ؒ کی وفات کے وقت میر علی شیر قانع جوان تھے۔ شاہ بھٹائی ؒ اور مخدوم صاحب کے تعلقات کو وہ بخوبی طور پر جانتے تھے۔ ایسی حالات میں ایک باکمال مورخ ایک غلط روایت کو کیسے پیش کر سکتا ہے۔ اگر ہم قانع کی اس روایت کی تکذیب کرینگے، تو پھر تاریخ تحفۃ الکرام کی اور روایات کسطرح معتبر ہو سکتی ہیں۔ یہ نکتہ کسی تاریخ کے طالب علم سے پوچھنا چاہیئے۔

ڈاکٹر گربخشانی نے شمس العلماء مرزا قلیچ مرحوم کی ایک زبانی روایت پر اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی ہے وہ روایت اسطرح ہے کہ [۲]

میاں نور محمد کلہوڑہ نے شاہ بھٹائی کو ایک موقعہ پر مثنوی مولانا رومؒ کا ایک نسخہ تحفتاً دیا تھا جس سے ڈاکٹر صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر شاہ صاحب علوم رائجہ پر حاوی ہوتے تو میاں نور محمد کلہوڑہ کیوں کر اُنہیں مثنوی کا نسخہ دیتے۔ لیکن یہ روایت زبانی ہوتے ہوئے بھی مرزا صاحب نے صاف لکھدیا ہے کہ اُسی مثنوی کے نسخہ پر بطور یاداشت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ آپ کے بھتیجے کے بیٹے سید جمال شاہ کے دستخط سے تھے۔ مرزا صاحب نے اس حقیقت کا انکشاف نہایت سادہ طور پر کیا ہے اس پر اپنی رائے نہیں دی لیکن اس حقیقت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اگر شاہ صاحب اُمی نہ ہوتے تو جمال شاہ کے بجائے خود عبارت لکھتے۔

محبت کی اولین تجلی :-

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ کے اکثر سوانح نگاروں نے اُن کے ایام شباب کے ایک عشقیہ رومان کا ذکر کیا ہے۔ روایت یوں ہے کہ کوٹڑی کے نزدیک ارغون خاندان کے چند امیر رہتے تھے۔ مرزا مغل بیگ اُن میں بلند اقتدار رکھتے تھے۔ اور قبیلے کے رئیس تھے۔ اکثر سندھی رئیس اور زمیندار مرزا موصوف کے زور اور طاقت سے مرعوب رہتے تھے۔ شاہ بھٹائی کے والد بزرگوار سید حبیب شاہ سے مرزا مغل بیگ اور اس کے قبیلہ کے بہت سے لوگ بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ شاہ صاحب اکثر اُن کے حرم خانہ میں آتے جاتے تھے۔ بیماری یا کسی ناگہانی مشکلات میں وہ وہاں دعا اور نقش کے لئے بلائے جاتے تھے

ایک مرتبہ مرزا مغل بیگ کی چہیتی بیٹی سیدہ بیگم بیمار ہوگئی اور اس کی حالت غیر ہوگئی، مرزا موصوف نے حبیب شاہ کو حسب دستور طلب کیا اتفاقاً شاہ حبیب خود بھی بیمار تھے گھر سے باہر نکلنے کے قابل نہ تھے۔ مرزا نے باپ کے بجائے بیٹے کو ساتھ لیا۔ شاہ بھٹائی جب مرزا کے حرم خانہ میں داخل ہوئے تو اُنہوں نے ایک لڑکی کو کپڑوں میں لپٹا ہوا بستر پر دیکھا۔ اس عجیب نظارہ نے شاہ صاحب کو بیحد متاثر کیا لڑکی کی انگلی اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا

" جس کی انگلی سید کے ہاتھ میں ہو اس کو نہ کوئی خوف نہ خطرہ۔ " [۳]

غیور مغل اس سادہ فقرہ کا مفہوم نہ سمجھ سکا اور بہت بگڑا۔ اس کو اپنی بڑی اہانت سمجھا، لیکن "خود کردہ را علاج نیست" اس وقت تو شاہ بھٹائی کو خوشی خوشی رخصت کردیا، مگر بعد میں اس کے سینہ میں انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ شاہ حبیب کے یہاں اپنا آنا جانا بند کردیا۔ اور رفتہ رفتہ ان کی گذشتہ عقیدت اور محبت عداوت اور نفرت میں تبدیل ہوگئی۔ ہمسایہ زمیندار اور رئیس بھی مغل بیگ کے خوف سے شاہ حبیب سے دور دور رہنے

۱۔ تذکرہ لطفی حصہ اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۷۸۔

۲۔ شاہ اُمی تھے یا خواندہ مقالہ مقالہ نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔ شاعرن جو سرتاج مرتب بیگم خدیجہ دائود پوتہ۔

۳۔ مقدمہ "شاہ کا رسالہ" مرتب ڈاکٹر گربخشانی صفحہ ۱۸

لگے یہ حالت دیکھ کر شاہ صاحب نے مجبوراً کوٹڑی سے ہجرت کرنا ہی مناسب سمجھا اور کوٹڑی کے شمال کی طرف کچھ فاصلہ پر جا بسے۔

یہ ہے مختصر حقیقت شاہ عبداللطیف[2] کے عشقیہ رومان کی۔ جس کے متعلق مختلف مضمون نگاروں نے اپنے مضامین میں افسانہ نویسی کا رنگ بھر دیا ہے۔ صحیح حقائق کو اگر ہم سامنے رکھکر دیکھیں گے تو شاہ عبداللطیف نے اس عصمت مآب لڑکی کو کبھی دیکھا تک نہ تھا، نہ ہی اس واقعہ کے بعد کسی راہ رسم کے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اُن کا سادہ سا فقرہ جس سے ارغون رئیس بگڑ اُٹھا تھا، وہ محض ایک دعائیہ کلمہ تھا، جس کو وہ منچلا نوجوان رئیس سمجھ نہ سکا اور اس کے بیہودہ عذر نے ایک معمولی سے واقعہ کو افسانہ بنا دیا۔

یہ عجیب حقیقت ہے کہ شاہ صاحب نے ایام شباب میں کسی لیلیٰ کے محمل کی گرد کو اپنے آنکھوں کا سرمہ بنایا تھا۔ خواجہ حافظ شیرازی[2] اور شاخ نبات کی وہی داستان کی طرح ہمارے شاہ صاحب کو بھی رنگین مزاج بنا کر یاروں نے زبردستی میدان تعشق میں لائے تھے۔ ورنہ ایک مادر زاد مست الست کو اِن چیزوں سے کیا نسبت۔ شاہ صاحب نے پوری زندگی بے داغ گذاری خود فرماتے ہیں:

کاک بھی صادق خدا پرستوں کو روک نہ سکی

نہ ہی دنیاوی مال و دولت اپنی فریب میں مبتلا کر سکے

اگرچہ آزاد ماہ سیمائوں نے بہتیری کوشش کی

لیکن وہ لاہوتی، آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔

مولانا جلال الدین رومی[2] نے بھی ایسے خدا آگاہ گروہ کی محبت اور عشق پر تبصرہ فرمایا ہے، جس کو پڑھکر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان ارباب حق کے یہاں عشق محبت سے کیا مراد ہے۔

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جدا ست

عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست۔

محبت الٰہی کی چنگاری جس دل میں شعلہ ریز ہوتی ہے، وہ مادی دنیا کے حسن اور صورت پر فریفتہ ہو نہیں سکتا، اُس کی محبت کی اصل بنیاد تجلیاتِ الٰہی کا روشن ہونا ہے۔ شاخ کے فرضی داستان کے ہیرو خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں:-

فرد اکہ پیشگاہ حقیقت شود پدید

شرمندہ رہروے کہ نظر بر مجاز کرد

مجاز اسرار الٰہی کے جاننے والوں کیلئے ایک زبون شکار ہے۔ وہ ہستی جو اپنی عہد طفلی میں رموز حق پرست کے نکتوں کو سمجھ سکتی ہیں شباب میں اگر اُس نعمت علمی کو سرِ راہ لٹادے یہ ایک حق پرست کا قیاس، اس کو قبول نہیں کر سکتا بہرحال، ایک عظیم الشان شخصیت کے متعلق ایسی لایقنی باتوں کا انبار رکھنا دنیا کا قدیم رواج ہے، اس لیئے ہمارے شاہ بھٹائی[2] کے گرد بھی ایسی روایتوں کا حلقہ بن جائے تو یہ چنداں تعجب خیز نہیں۔

رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی[2] میں اسطرح شعر آتا ہے:-

ھاءِ نہ جھليا ھا پٽڙي، مو ميا ھنن نہ مال

سُو ڏيون سجائي ويا، ڀھڙا جنھين حال

جي چوُرين ڏنا چال، تب لاھوتي لنگھي ويا

* کاک سندھ کے جنوبی حصہ میں ایک مکان تھا، جہاں مینڈھرو (رانو) کی محبوبہ مومل سکونت رکھتی تھی، سندھ میں یہ المیہ افسانہ مشہور ہے، شاہ بھٹائی کے عظیم کا یہ مشہور حصہ ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کی سیر و سیاحت

شاہ بھٹائیؒ کے بچپن کی تنہا پسندی آخر رنگ لائی۔ کچھ مغلوں کی بڑھتی ہوئی عداوت سے تنگ آکر، کچھ فطری اور طبعی رجحان کے باعث اپنے وطن عزیز کو الوداع کہکر، سیر و سیاحت کیلئے نکل پڑے۔ راہ میں انہیں ہندو جوگی فقیروں کا ایک گشتی گروہ مل گیا۔ اُن کی صحبت میں وہ سندھ اور بیرونِ سندھ کے مختلف شہروں میں پھرتے رہے۔ سندھ کے مشہور ادیب آنجہانی بھیرومل مہرچند آڈوانی نے شاہ بھٹائی کی سیر و سیاحت پر ایک دلچسپ مستقل کتاب لکھی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق آپ نے اپنے وطن کو خیرباد کہکر، جوگیوں کی صحبت میں اول گنجے پہاڑ (حیدرآباد) گئے۔ اس سفر کا ذکر آپ اپنے ابیات کے سر کھاموڑی میں تفصیل سے کیا ہے۔

گنجے پہاڑ پر جن جوگی فقیروں سے ملاقات ہوئی تھی، انکو ہروقت نانی (ھنگلاج) کی طرف نظر تھی، اسی طرف جانے کے لئے بیتاب تھے، کیوں کہ شاہ صاحب کو فطری سیر و سفر کا شوق دامنگیر تھا، اور جوگیوں کے اصرار پر ھنگلاج کا سفر اختیار کیا، کیوں کہ یہ آسان سفر نہ تھا، پھر بھی شاہ صاحب ان جوگیوں کی صحبت میں منزل بہ منزل سفر جاری رکھا، راستہ میں کینجھر جھیل سے ہوکر ٹھٹھ پہنچے، کینجھر جھیل کا علاقہ سندھ کے مشہور حاکم جام تماچی اور نوری کا داستان سے مشہور رہے۔ ٹھٹہ سے ہوکر شہر بھنبھور میں پہنچے تھے، اس شہر میں سسئی پنوں کی مشہور داستان ہوکر گذری ہیں۔ سسئی اپنے محبوب پنوں کو ڈھونڈنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا، اُسی راستہ سے شاہ صاحب کراچی کی طرف گئے تھے۔ اس زمانہ میں کراچی ایک چھوٹی سی بستی تھی، جب ندی کراچی سے سات میل مغرب کی طرف ہے ھنگلاج جانے کے لئے حب ندی کو عبور کرنا پڑتا ہے، جہاں سے بلکل تنگ راستوں سے گذرنا پڑتا ہے، وندر کے ناکے، ھاڑھو جبل (پہاڑ) سے گذر کر ھنگلاج پہنچے۔ ھنگلاج سے واپسی پر جوگیوں کے ساتھ لس بیلہ کی راہ لکپت (کچھ) اور گرنار (ریاست جوناگڑہ) تک گئے، جہاں سے واپس ہوکر جیسلمیر سے ہوتے ہوئے تھر پہنچے، تھر میں بھالوا بستی میں مارئی کے آبائی وطن کو دیکھا، شاہ صاحب نے مارئی کے متعلق جو ابیات نظم لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تھر کی جغرافیائی حالات اور وہاں کے رہنے والوں کی رسم و رواج سے بخوبی واقف تھے۔ تھر سے اپنے آبائی وطن واپس ہوئے، لیکن، لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد پھر گھر سے نکلے اور ھالار جبل کے کوہستانی سلسلہ عبور کرکے لاھوت، ھنگلاج اور لس بیلہ، سیوہن کے تاریخی مقامات کی زیارت کی ایک ضعیف روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کابل اور قندھار بھی گئے تھے، لیکن جس طرح یہ روایت پیش کی گئی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت عقیدتمندوں کی اختراع اور ایجاد ہے۔ ھنگلاج کے مقام پر آپ اپنے ساتھی جوگیوں سے ناراض ہوکر کیچ مکران کی راہ سے کراچی کی طرف روانہ ہوئے۔ روایت ہے کہ اس سفر میں جب آپ ھالار کے پہاڑوں کو طے کر رہے تھے، ایک جگہ الھناک آواز سنی سراسیمہ ہو کر اس صدائے دردناک کی طرف روانہ ہوئے، چند قدموں کے فاصلے پر آپ کو ایک تنگ و تاریک غار میں ایک شخص یہ شعر کی مصرعہ دہرا رہے تھے۔

ھيڪلائي ميل، پورہندس پنھونءَ ڏي

اس دفعہ پنھوں کے طرف تنہا ہی چلونگی۔

آپ اُس دردمند انسان کی طرف بڑے خاطر اور مدارات کے بعد پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے، اُس غمزدہ شخص نے جواب دیا کہ میں ذات کا جت ہوں، میں اور میرے دو رفیق اُونٹوں پر تجارت کا سامان لاد کر جا رہے تھے، جب ھالا کے نزدیک آئے تو ایک مقام پر سماع کی محفل منعقد تھی گانے والا بڑے سوز سے یہی مصرعہ گا کر دہرا رہے تھے، مجھے یہ مصرعہ انتہا پسند آیا، اور اپنا کل اسباب چھوڑ کر اور تارک بنکر وہی مصرعہ گاتا ہوا یہاں

۱۔ اس زمانہ میں حیدرآباد کو "نیرن کوٹ" کہتے تھے قلعہ ۱۷۶۸ء میں میاں غلام شاہ نے بنوایا تھا۔ شاہ صاحب نے ۱۷۵۲ء میں وفات کی تھی۔

۲۔ کراچی شہر، سیٹھ ناؤمل ہوتچند نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۷۲۹ء میں آباد ہوا اور شاہ صاحب کی ولادت سنہ ۱۶۸۹ء میں ہوئی تھی۔

پہنچا ہوں۔ شاہ بھٹائی نے قرینہ سے معلوم کیا کہ وہ شاہد محبت کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ اس سے کہا کہ اگر تیری خواہش ہو تو اس مصرعہ کو میں بیت کی صورت میں مکمل کردوں۔ جت اس بات پر بہت خوش ہوا۔ اور شاہ صاحب سے عرض کیا اس مصرعہ کو مکمل کردیجیے شاہ بھٹائی نے جت کی بیتابی کی قدر کی اور فرمایا:۔

"آڏا ڏونگر ڏاکڙا، سوري سڄڻ سيل"

میرے سامنے، جبل اور دقیق راستے، سولی اور کانٹے نظر آرہے ہیں

شاہ بھٹائی رح کے اس مصرعہ کو سنتے ہی، جت پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی، اور شاہ صاحب کو منت کی کہ شعر کو جلد ختم کردیجیے شاہ بھٹائی نے فرمایا

تہ کر ھيلي آھن ھيل، سور پريان جا ساڻ مون۔

تو حبیب کے دیئے ہوئے رنج و عتاب ہی میرے رفیق اور غمگسار ہیں۔

شاہ بھٹائی کے بیت ختم کرنے پر جت بیہوش ہوکر گرپڑا شاہ صاحب اس کی حالت سے بہت متعجب ہوئے آگے بڑھ کر جو دیکھا تو وہ کشتۂ محبت جان جان آفرین کے سپرد کرچکا تھا۔ آپ نے وہیں اسے دفن کیا۔ اور اکثر فرماتے تھے کہ اس جت جیسا صادق اور سوختہ دل انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس کشتۂ محبت کی قبر آج بھی ھنگلاج اور ٹھٹھ کی راہ پر چلنے والوں کو دور سے نظر آتی ہے۔

اس قسم کی روایات ہمیں عرب کے عشقیہ تذکروں میں افراط سے ملتی ہیں۔ ڈاکٹر زکی المبارک نے اپنی تصنیف "التصوف الاسلامی" میں اس کا علیحدہ باب قائم کیا ہے اس قبیل کی ایک حکایت وہ عرب کے ایک مشہور ادیب اور نقاد اصمعی سے یوں منسوب کرتا ہے

بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک شہر آباد ہے، اس شہر میں ایک صوفی کسی مکان کے نیچے سے گذر رہا تھا، جب وہ وہاں سے گزرا تو اُس نے اس شعر کو بڑے سوز سے گاتے ہوئے سنا تو ٹھہر کر رہ گیا۔

کل یوم تتلون غیر ھذا بک احسن

کل یوم تتحول غیر ھذا بک اجمل

تو ہر روز رنگ بدلتا ہے، اور اس سے تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔

تو ہر دن ہی تبدیل ہوتا ہے، اور اس کے سوا بھی تو مجھے بہت خوب لگتا ہے۔

دیکھا تو یہ مکان ایک امیر کا ہے اور اس کی لونڈی گا کر اپنے آقا کو خوش کر رہی تھی، درویش نے اُس کی طرف گردن اُٹھا کر کہا تجھے خدا کی قسم، اِس شعر کو پھر سے سنادو اور ساقی جاؤ، چنانچہ جب اس نے تین چار مرتبہ اُس کی تکرار کی تو درویش مست ہوکر رقص کرنے لگا۔ ناگہاں بلند آواز سے ایک نعرہ لگایا اور جان بحق تسلیم ہوا۔

شاہ اس سیر و سیاحت میں کم و بیش تین سال اپنے گھر سے باہر رہے اس سیاحت کے زمانہ میں آپ نے نہ فقط صوفیوں، فقیروں کے راہ و رسم سے حاصل کئے بلکہ سندھ اور اس کے ملحقہ علاقوں کے قصہ اور کہانیوں، معاشرہ اور دیگر روایات کا بھی بغور مطالعہ کیا جس سے آپ کی معلومات کا دائرہ وسیع ہوگیا جس سے اپنے کلام میں وہ نقش نگاری کی ہے اس کا نظیر دنیا کے شعراء نے پیش نہیں کیا ہے، ایک مختاط نگار کی طرح کسی معمولی سے بات کا ذکر کیا ہے تو اس میں وہ رنگ بھر دیا ہے جو رسالہ اس حقیقت افروز معلومات اور مشاہدات کا ایک غیرفانی مجموعہ ہے۔

شاہ بھٹائی کی جدائی میں آپ کے والد بزرگوار سید حبیب شاہ کی حالت پریشانی اور بیقراری حد سے تجاوز کرگئی تھی، روزانہ ہالا تشریف لے جاتے تھے، اور حضرت نوح رحمت اللہ علیہ کی درگاہ پر اپنے یوسف کے لوٹ آنے لئے دعائیں مانگتے تھے، آخر آپ کی دعائیں مستجاب ہوئیں اور ایک دن شاہ بھٹائی اچانک گھر پہنچ گئے۔ آپ کے والد اپنے بیٹے کو صحیح و سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

باب پنجم

مرزا مغل بیگ کی شہادت اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شادی

شاہ صاحب سفر سے واپس آکر اپنے چھوٹے سے گاؤں میں دستور کے مطابق عبادت الہٰی اور والدین کی خدمت میں آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے بظاہر مرزا مغل بیگ کی دشمنی کم ہوگئی تھی، اگرچہ ٹوٹے ہوئے تعلقات میں پھر استواری نہ آسکی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرزا مغل بیگ میں وہ جوش اور غضب باقی نہ رہا تھا روایت ہے کہ ایک دن جب مرزا موصوف اپنے گھر سے باہر کسی ضروری کام کے لئے گئے ہوئے تھے، اُن کی غیر حاضری میں "دَل" قوم کے چند لٹیرے آپ کی حویلی میں گھس آئے۔ مستورات میں وہ طاقت نہ تھی، کہ لٹیروں کا مقابلہ کرسکیں، وہ اپنی دل جمعی سے نقد، زیورات اور اسباب جو کچھ وہاں ہاتھ آیا لوٹ کر روانہ ہوگئے، مرزا جب گھر واپس لوٹے تو ان کو اس سانحہ کی خبر ملی تو بہت غصے میں آگئے اور اپنے مددگاروں اور ملازموں کا ایک جم غفیر لے کر ان لٹیروں کے پیچھے رواں ہوئے۔ شاہ صاحب کو بھی اس واقعے کی خبر ملی، آپ بھی اپنے فقیروں کو ساتھ لے کر اُن کی امداد کے لئے روانہ ہوئے۔ شاہ بھٹائیؒ کو بھی مرزا راہ میں ملے، مغرور مرزا نے شاہ بھٹائیؒ کی امداد کو ٹھکرا دیا۔ شاہ صاحب نے اگرچہ بہت سمجھایا اپنی بریت کی صفائی پیش کردی، اور ہمسائیگی کے فرائض کو یاد دلایا۔ لیکن مغرور مرزا نے ان کی مہربانی کو مسترد کیا، شاہ صاحب مرزا کے اس رویہ پر بڑے مرنجیدہ ہوئے اور آپ نے جلال میں آکر فرمایا:۔

بیگ تنھنجي بیگي، کوٽڙيءَ ۾ عان
آھر آس اللہ ۾، ڏَل مارينيئي مان

بیگ یہ تیری بیگی کوٹڑی میں باقی نہ رہیگی
امید ہے اللہ میں دَل تجھ کو مارینگے کہیں۔

یہ پہلی اور آخری بددعا تھی جو ہمارے عظیم شاعر کی زبان سے نکلی، شاید یہ اقتضائے فطرت تھا۔ لٹیرے بڑے آرام سے جا رہے تھے۔ اتنے میں بیگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُن کے سر پر جا پہنچے۔ سخت مقابلہ ہوا، مغل بیگ اور اس کے ساتھی بڑی بہادری سے لڑے، قضائی کار مرزا دشمن کی زد میں آگئے اور شہید ہوگئے مرزا کے شہید ہوتے ہی لٹیرے خانخانہ نکل گئے۔ عوام نے مرزا کی شہادت کی اطلاع پاکر، شاہ بھٹائیؒ کی بددعا کو بڑی اہمیت دی اور خود حرم کی مستورات بھی بڑی حد تک متاثر ہوگئیں۔ شاہ صاحب کے ارادتمندوں سے کسی نے شہید مرزا کے شہادت کا مادۂ تاریخ کہا "بود خبیث" شاہ صاحب نے فوراً یہ متبادل تاریخ پیش کی فرمایا "یک مغل بہ بود" ایک اُمی کے زبان سے یہ مادۂ تاریخ صحیح شعری صورت میں آنا ایک غیر معمولی اعجاز شمار کیا جاتا ہے۔[1]

سندھ کے اکثر مصنفین نے شاہ لطیفؒ[2] کے اس فی البدیہ مادۂ تاریخ کے کہنے کو اُن کے فارسی دانی پر محمول کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس مختصر مادہ تاریخ کے علاوہ شاہ لطیف کے کلام میں اور فارسی شعر نظر نہیں آتا۔ اگرچہ آپکی فارسی زبان پر واقعی عبور ہوتا تو آپ کی طبع فارسی شاعری کی طرف ضرور رجوع ہوتی، تاہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے محبوب دوست مخدوم محمد معین ٹھٹوی، سندھی اور فارسی شاعری کے باکمال شاعر تھے کم از کم مخدوم موصوف کی صحبت کے اثر سے کچھ نہ کچھ فارسی زبان زبان میں اپنی یادگار چھوڑ جاتے۔ البتہ ایک فارسی مصرعہ جو کہ شاہ عنایت صوفی شہید کی ایک فارسی غزل سے اپنے کلام میں تضمین کی طور پر استعمال کی ہے۔ جو اسطرح ہے

---

[1] میر علی شیر قانع اپنی تصنیف تحفۃ الکرام میں اس مادۂ کے متعلق اسطرح لکھتے ہیں۔

بود خبیث آن عارف کامل شنیدہ بربدیہہ فرمود چنین نباید بگوئید کہ "یک مغل بہ بودہ" چوں حساب کردند درست تاریخ ہمان سال دہست آمد الحق از شخص امی وقوع این حال جز خوارق نیست۔ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۱۵۲

"سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد۔ وصل اهوئی ونگ"۔[1]

لیکن ان سب باتوں کے باوجود شاہ لطیف کو اپنی زبان اور ثقافت زیادہ عزیز تھی، جس کی وجہ سے سندھی زبان میں اپنا کلام پیش کیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

مرزا مغل بیگ کی شہادت کے حادثہ کے بعد، اُس کا ایک صغیر سن لڑکا مرزا گولو "حویلی" میں باقی رہ گیا تھا، مرزا موصوف کی مستورات نے اپنے خاندان کی تباہی کو شاہ لطیف کی ناراضگی اور بددعا کا نتیجہ سمجھتے ہوئے گذشتہ روئیداد کے کفارہ کے لئے، شاہ لطیف کو مرزا کی پاکدامن صاحبزادی سیدہ بیگم کے ساتھ شادی کی دعوت دی، شاہ صاحب نے بطیب خاطر، اس پیش کش کو قبول فرمایا، شاہ بھٹائی کا نکاح خوش اسلوبی سے ہوگیا، اور بی بی سیدہ بیگم اپنے چھوٹے بھائی مرزا گولو کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں، مرزا گولو شاہ لطیف کی یہاں بڑے آرام سے رہا، لیکن موت نے اس کو زیادہ جینے کی مہلت نہ دی، اور چھوٹی عمر میں ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔ شاہ صاحب کے بعض سوانح نگاروں نے مرزا کے بوقت وفات کے واقعہ پر لکھتے کہ شاہ لطیف نے اس وقت فرمایا تھا۔ "مئو گولو لتھو پولو" یعنی "گولا مرگیا اور خطرہ ٹل گیا"

شاہ لطیف جیسے بلند اخلاق اور خدا رسیدہ بزرگ سے ایک معصوم بچہ کی موت پر اس قسم کے کلمہ کی توقع رکھنا، آپ کے عالی اخلاق کے منافی ہے حیرت ہے کہ اُن سوانح نگار حضرات نے کبھی اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ آخر مرزا گولو نے وہ کونسا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں شاہ لطیف سنجیدہ بزرگ اس قسم کا کلمہ ارشاد فرماتے۔ بغض وعناد تو شاہ صاحب کو مرزا مغل بیگ سے بھی نہ تھا، ان کی حین حیات میں بھی مرزا موصوف کی دلجوئی کی کوشش کرتے رہے، اب جب کہ اس کا صغیر سن لڑکا آپ کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا، اس کے المناک موت پر ایک فقرہ کہکر اپنے اطمینان کا اظہار کرنا کہاں کی انسانیت اور سنجیدگی ہے، حقیقت میں ان غلط واقعات کا ازالہ آپ خود اپنے کلام میں صوفی کے مشرب عالی کے متعلق فرماتے ہیں۔

صوفي لاکوفي، ڪين پا ٿينہ ڪير
جنين سان ويرِ، تني، تنين جو واهر

فرقہ بندی سے پرے صوفی کی ہے یہ زندگی۔[2]
دشمنوں کے ساتھ بھی، ان کی عیاں ہو دوستی۔

ایک اور باکمال صوفی شاعر نے نیز اس طرح فرمایا ہے۔

کفر است در طریقت ماکینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن۔

بہرحال شاہ لطیف کے غلط گو سوانح نگاروں نے سوقیانہ اور عامیانہ باتوں کو بھی بلا کسی استدلال کے اپنی تصنیفات میں داخل کر دیا ہے، اور اس رطب ویابس نے سندھ کے اس مفکر کی پاکیزہ حیات کو داغدار بنا دیا ہے، شادی کے بعد شاہ صاحب کی زندگی بہت خوشگوار بن گئی، جناب سیدہ بیگم، جن کو عقیدتمند "تاج المخدرات" کے لقب سے یاد کرتے ہیں بڑی عابدہ اور صالح تھی، عبادالہیٰ میں وہ اپنے پاکباز شوہر سے کسی طرح کم نہ تھی، تلاوت

---

[1] رسالہ شاہ بھٹائی کے سُر معذی کی داستان اول کا گیارھواں بیت ہے:۔ گھڙي گھڙي ڏوٿ ڪري، ڀڃوُن ڀڃاري ڀنگ
سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد، وصل اهوئي ونگ۔
رات جنين جو رنگ الاَسي اُڪارين

شہید عنایت صوفی کا پورا شعر اسطرح ہے:۔ سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد۔ این بار گران بود ادا شد چہ بجا شد۔

[2] مترجم مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔

قرآن پاک ان کا خاص مشغلہ تھا، اور گھر کے سب کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیا کرتی تھیں شاہ لطیفؒ کو کوئی اولاد نہ ہوئی، روایت ہے کہ جب بی بی صاحبہ حاملہ ہوئی، تو ایک دن پلّہ (سندھی روایتی مچھلی) کے کھانے کی خواہش ظاہر کی ایک عقیدتمند مرید نے بی بی صاحبہ کی خواہش کی تکمیل کیلئے دور دراز فاصلہ پر پلّہ کی جستجو کے لئے روانہ ہوا، پلّہ کے حاصل کرنے کے بعد وہ دوڑتا اور ہانپتا ہوا منزل مقصود کے قریب پہنچ گیا، اتفاقاً شاہ بھٹائیؒ کی نظر اس مرید پر پڑ گئی۔ آپ نے اس سے اس پریشانی اور عجلت کا سبب پوچھا مرید نے سادگی سے بی بی صاحبہ کی پلّہ کھانے کے لئے خواہش کی حقیقت بیان کی آپ نے یہ سنکر بہت رنجیدہ ہوئے۔ اور فرمایا "خدا مجھے وہ اولاد ہی نہ دے جس سے میرے فقیروں کو زحمت پہنچے میرے لئے یہ فقیر کافی ہیں"

شاہ بھٹائی کی یہ دعا مستجاب ہوئی۔ اور بی بی صاحبہ کا حمل ساقط ہوگیا، اور پھر کبھی حاملہ نہ ہوئی، اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ نہ کرنا چاہیئے کہ شاہ صاحب کو اپنے حرم سے کوئی دلبستگی نہ تھی، چونکہ وہ ایک عالی خاندان کی لڑکی تھی، شاہ بھٹائی ہمیشہ اس کی عزت کرتے تھے، اُن کے ناز اٹھاتے اور بڑی خاطر و مدارت کرتے تھے۔ بی بی صاحبہ کی زندگی بڑے سکون سے گذری۔ بی بی صاحبہ نے شاہ صاحب کی زندگی میں ہی وفات کی۔ آپ کی وفات کے بعد شاہ صاحب نے دوسری شادی نہ کی اور بقیہ حیات تجرد کی حالت میں بسر کی۔

بھٹ شاہ کی تعمیر :-

اکثر مورخین کی یہ رائے ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بڑھتے ہوئے روحانی اقتدار کو دیکھکر ہمسایہ پیر آپ سے دشمنی کرنے لگے تھے، اُن حضرات میں سید عبدالواسع سجادہ نشین درگاہ شاہ عبدالکریم بلڑیؒ اور پیر محمد سجادہ نشین درگاہ حضرت مخدوم نوحؒ جن کو پیر پنج پاک اور میر پیر بھی کہتے ہیں۔ ان بزرگوں کی عداوت سے شاہ صاحب کو نقل مکانی کی ضرورت پڑی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے مورث اعلیٰ شاہ عبدالکریمؒ کی مزار پر ایک عالی شان قبہ کی تعمیر کا کام اپنے ذمے لیا، قبہ کے لئے جو کچھ صرف ہو رہا تھا، شاہ صاحب نے اپنے جیب سے کر رہے تھے، شاہ صاحب کاشی کی اینٹوں (TILES) کے خرید لینے کیلئے خود ملتان تشریف لے گئے تھے اور قبہ کی تعمیر خیر خوبی سے سرانجام ہوگئی، کام کی تکمیل کے بعد شاہ بھٹائی نے گنبذ کے ایک کونے پر "لطیف" کے نام ایک اینٹ یادگار کے طور پر لگا دی، اس اینٹ کو دیکھکر سجادہ نشین صاحب بہت بگڑے اور اینٹ کو دیوار سے علیحدہ کر دیا، شاہ صاحب کو جب یہ خبر ہوئی تو فرمایا "لطیف" تو اللہ کا پیارا نام ہے، اس واقعہ سے ہم آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ شاہ صاحب سے اس زمانے کے اکثر صاحب اقتدار لوگوں کا اختلاف رہتا تھا، اس حسد کا سبب فقط آپ کی بڑھتی ہوئی شہرت تھی، یہی حالت پیر پنج پاک کی تھی، ان حضرات کے علاوہ متعلوی (مٹیاری) کے سید بھی آپ کے کم مخالف نہ تھے، اس مخالفت کی بنا پر شاہ صاحب نے مجبوراً کوٹڑی سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا، رشد و ہدایت کا یہ مرکز اب کوٹڑی سے منتقل ہو کر ریت کے تودوں میں آنے والا تھا، یہ بھی ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے آباد اجداد متعلوی (مٹیاری) کے رہنے والے تھے، آپ کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ عبدالکریم مٹیاری سے ہجرت فرما کر بلڑی میں جا کر مقیم ہوئے تھے شاہ صاحب کے والد بزرگوار زمانہ کی ستم ظریفیوں سے پہلے ہجہ پور اور بعد میں کوٹڑی میں جا کر بسے۔ اس نقل مکانی کی روایت کو زندہ رکھنے کیلئے شاید شاہ بھٹائی نے بھی کوٹڑی سے بھٹ پر آنے کا فیصلہ کیا ہو بہرحال آپ نے اپنے سیر و سیاحت کے دوران کوٹڑی سے بھٹ پر آنے کے لئے کوٹڑی سے کچھ فاصلہ پر ہالا سے چار میل دور ایک خاموش جگہ کو عبادت اور ریاضت کے لئے انتخاب کی، جس کے گرد ایک گھنا جنگل تھا، جہاں ببول اور پیلو کے لاتعداد جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ ریت کے بڑے ٹیلے تھے، ان ریت کے ٹیلوں کے قریب ایک چھوٹی جھیل تھی جس کو شاہ صاحب نے اپنے کلام میں کراڑ کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ اُسی ریت کے ٹیلوں کو "بھٹ" کہا جاتا ہے اور بھٹ کی معنیٰ سندھی زبان میں ریت کا ٹیلہ ہے۔ شاہ بھٹائی نے اس منتخب شدہ زمین کو آئندہ اپنی سکونت کیلئے انتخاب کیا۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ بھٹائی کے دادا حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی، اور حضرت مخدوم نوحؒ کے مابین دوستانہ تعلقات تھے، شاہ عبدالکریم اکثر مخدوم موصوف کی ملاقات کے لئے ہالا جاتے رہتے تھے، ایک مرتبہ آپ کا اُسی بھٹ کے زمین سے گذر ہوا آپ

وہاں اُتر پڑے۔ اس جگہ پر کچھ وقت قیام فرمایا۔ اور اپنے خدام کو کہا کہ اس زمین کو خاروخس سے پاک کردیں۔ جب وہ زمین صاف ہوگئی تو آپ نے وہاں نماز ادا کی اور دعا فرمائی۔ ارادتمندوں کے استفسار پر فرمایا کہ میری اولاد سے ایک مرد خدا پیدا ہوگا۔ اور ان کا قیام یہاں ہوگا بہرحال یہ اس بزرگ کی دعا کا اثر تھا جو شاہ بھٹائی نے بڑے اشتیاق سے بھٹ کے بسانے کا ارادہ کیا۔ اس عزم کے پختہ ہونے کے بعد۔ آپ اپنے ارادتمندوں اور خدام کو لے کر ریت کے ٹیلہ کو ہموار کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ دور دور سے آپ کے خدام اور بہ نفس نفیس مٹی کی ٹوکریاں لے کر ریت پر ڈال کر جما رہے تھے۔ یہ بہت مشکل کام تھا۔ لیکن

بہرکارکہ ہمت بستہ گردد اگر خارے بود گلدستہ گردد

روایت ہے کہ ایک دن شاہ لطیف اور آپ کے مرید حسب معمول کام میں مشغول تھے۔ تو مخدوم پیر پنج پاک وہاں سے گزرے اس عجیب بندوبست کو دیکھ کر بطور طعنہ کہا "پيٽ ڏيندي ٽٽ" یعنی "بھٹ گوز دے گی" شاہ صاحب نے اطلاع پاکر فرمایا کہ پیر صاحب دعا فرما گئے ہیں۔ گوز بو کچھ نہیں دیتے۔ پیٹ بھر کر کھانے والے ہی دیتے ہیں۔

جب بھٹ کی ریت جم گئی تو آپ نے اپنے ارادتمندوں کو رہنے کیلئے جگہ تقسیم کی اور اپنے لئے مختصر سی جھونپڑی بنادی۔ اس جھونپڑی کے نزدیک آپ نے ایک مسجد کے بنانے کا اہتمام کیا۔ روایت ہے کہ ایک دن آپ مسجد کی زمین کو ہموار کر رہے تھے اور ایک کلھاڑی سے پتھر توڑ رہے تھے۔ تو دور کا ایک مرید آپ کی خدمت میں آیا اور ایک پتھر نذرانہ کی طور پر پیش کیا آپ نے مرید سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا چیز ہے؟ مرید نے عرض کیا کہ حضور یہ پارس پتھر ہے۔ آپ اُس پتھر کو بغور دیکھ رہے تھے کہ پتھر گر کر آپ کی کلھاڑی پر جا لگا۔ اور وہ سونا بن گیا۔ شاہ صاحب کو اس تبدیلی پر تعجب ہوا اور آپ اپنے کام میں لگ گئے کلھاڑی سونے کے باعث کام کی نہ رہی۔ شاہ صاحب کو بہت غصہ آیا۔ پتھر اور کلھاڑی کو مسجد کے کونے میں پھینک کر فرمایا کہ دنیا کے لوگ مدد کرنے کے بجائے ہمارے کام میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ وہ مرید شرمندہ ہو کر پتھر اور کلھاڑی لے کر واپس چلا گیا۔ بھٹ پر تعمیر کا کام جاری تھا، کہ ایک عظیم حادثہ نے آپ کو پریشان کردیا۔

حضرت شاہ حبیب کی وفات:۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی بھٹ کے تعمیر میں ہمہ تن مصروف تھے۔ تعمیر کا کام خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا کہ ایک دن اچانک آپ کے والد بزرگوار سید حبیب شاہ کی طرف سے ایک قاصد یہ پیغام لایا کہ بڑے سائیں (شاہ حبیب) بہت علیل ہوگئے ہیں۔ شاہ لطیف کو آپ کی علالت کا پیغام اس شعر کی صورت میں ملا:۔

ڪنهن جنهن نيهه ڪنداهه، جي موٽ واجهائيندي نه وڃو
جيڪي مٺي ڪنداهه، سو جانب ڪريو جيئري

کس شوق نے آپ کو پابند کیا، کہ تم دیکھنے بھی نہ آئے۔
دوستا جو کچھ مرنے کے بعد کرنا چاہتے ہو، وہ جیتے جی آکر کرو۔

شاہ لطیف کو جب یہ پیغام ملا تو اُسے بہت ملال ہوا۔ اپنے مرشد اور والد محترم کے جدا ہو جانے سے بہت رنجیدہ ہوئے اور آپ نے اپنا جواب قاصد کو اس طرح دیا:۔

متان ٿيڻ ملول، ڪي آڳاهون آهيان۔
ڏسڻ ۾ ڪر ڏور، حد هڪڙي جي هڪڙي۔

آپ غمگین نہ ہوں کہ میں آپ سے دور ہوں
دیکھنے میں تو دوری ہے لیکن منزل دونوں کی ایک ہے۔

قاصد کو مزید یہ بھی کہا کہ میں اپنے مرشد اور والد کی وفات کا یہ المیہ اپنی آنکھوں سے کس طرح دیکھ سکوں گا، کیونکہ میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا ہے کہ مصیبت کے وقت میں ہر چیز کو صبر و تحمل سے برداشت کرونگا۔ اگر میں والد صاحب کے سامنے جاؤنگا تو اُن کی جدائی کے غم کو برداشت نہ کر سکوں گا، میرا وہ وعدہ ٹوٹ جائے گا۔ والد محترم کو کہنا کہ آپ کی اور میری منزل وہی ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کے پیچھے آ رہا ہوں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ والد صاحب کو غسل دے کر محمود فقیر[1] کے سرہانے دفن کرنے کے لئے لحد بنائی جائے۔ اور میری جگہ محمود فقیر کے پاؤں کی طرف ہوگی۔

شاہ لطیف کے ایک عقیدتمند مخدوم صادق نقشبندی نے آپ کے والد سیّد حبیب شاہ کی تاریخ لکھی ہے جو اس عربی شعر سے نکلتی ہے:۔

" اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلیٰ لِقَاءِ الْحَبِیْبِ "

موت ایک پل ہے، جو ایک دوست کو دوسرے کی لقاء تک پہنچا دیتی ہے۔

اس حدیث سے ابجد کے حساب سے آپ کی تاریخ وفات ۱۱۵۵ھ ہجری مطابق ۱۷۴۲ء نکلتی ہے۔ شاہ لطیف اپنے والد بزرگوار کا جسد مبارک کوٹڑی سے لاکر بھٹ شاہ میں دفن کیا اور ایک مدت تک اپنے والد محترم کے غم میں سیاہ پوش رہے۔ اس دوران اپنے خاندان کے دیگر افراد کو لے کر "بھٹ" پر مستقل رہائش اختیار کی۔ شاہ صاحب کی باقی ماندہ زندگی بڑے سکون سے ریت کے ٹیلوں اور کرار جھیل کی نواح میں گذری۔ آپ کی زندگی میں یہ ایک بڑا حادثہ گذرا۔ اپنے والد کی مزار مبارک کو شاہ صاحب نے محمود فقیر کے سرہانے بنا دیا۔ جو کہ شاہ صاحب کی قبر کے سرہانے جنوب کی طرف واقع ہے۔ اور مزار کے اوپر ایک خوبصورت چبوترہ بنا ہوا ہے۔

سندھ ملک اس وقت عجیب انقلابوں سے گذر رہا تھا۔ لیکن آپ کی گوشہ نشینی اور پرسکون زندگی پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور میاں نور محمد کلہوڑہ:۔

شاہ بھٹائی نے اپنے خاندان کے ساتھ جب مستقل طور پر کوٹڑی سے ہجرت کرکے بھٹ پر سکونت اختیار کی تو دور دراز جگہوں سے بہت سے لوگ آپ کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہونے لگے اس بستی کے گرد و نوح میں عرصہ دراز سے پیر اور دیگر خاندان رہتے تھے۔ میاں نور محمد خان کلہوڑہ سندھ کا حاکم تھا، اسکا دار الحکومت خدا آباد تھا۔ یہ خاندان پیری مریدی سے ہی اس منزل پر پہنچا تھا، اور یہ لوگ سہروردی طریقہ کے مرشد تھے۔ مریدوں کے متحدہ طاقت سے حکومت قائم کی تھی یہ خاندان اپنے نزدیک کسی اور پیر یا فقیر کو طاقت ور بنتے نہیں دیکھتے تھے، جس کی مثال شاہ عنایت صوفی شہید کی شہادت ایک تھی، یہ حکومت کی چال تھی، جو کہ ان کی طرف سے عمل میں آئی تھی۔ اس طرح شاہ صاحب کو چاروں طرف سے مخالفین گھیرے ہوئے تھے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنے جد امجد حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی کی مزار مبارک وقتاً فوقتاً زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ اپنے مورث اعلیٰ کے مزار کا از سر نو تعمیر کا کام اپنے ذمہ لیا تھا۔ اس لئے کاشی کی اینٹوں کے خریدنے کیلئے خود ملتان تشریف لے گئے تھے۔ سب سامان خریدنے کے بعد دریاء سندھ کے راستہ کشتیوں میں پورا سامان لاد کر وطن واپس ہوئے۔ جب سندھ میں دار الحکومت خدا آباد میں پہنچے تو سستانے کے لئے آپ نے اپنی کشتی کو وہیں روکا۔ شہریوں کو جب شاہ لطیف کی آمد کا علم ہوا تو بڑے خلوص سے جوق در جوق زیارت کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ میاں نور محمد کو جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے اپنے خدام کے ہاتھوں ایک ڈبیا موتیوں کے معجون کی آپ کی خدمت میں نذرانہ کی طور پر بھجوادی

---

[1] محمود فقیر بڑا زمیندار اور امیر شخص تھا، شاہ صاحب کی صحبت اور فیض کی بدولت اپنی پوری دولت، مال ملکیت کو چھوڑ کر صرف ایک کوزا پانی کا ساتھ لیکر شاہ لطیف کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہوکر بڑا فیض حاصل کیا اور اپنے دور کا بڑا کامل درویش بنا۔ شاہ لطیفؒ اس بزرگ مرید کی بڑی عزت کرتے تھے۔ محمود فقیر شاہ بھٹائی کی زندگی میں ہی "بھٹ شاہ" میں وفات پاگئے تھے، اور وہیں دفن کئے گئے۔

[2] تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف نے لکھا ہے

فرمودی نشیندم تاریخ واقعہ ایں منکلام مخدوم محمد صادق نقشبندی ایں حدیث است، "الموت جسر یوصل الحبیب الی لقاء الحبیب"

شاہ لطیف رحؒ نے یہ تحفہ شکریہ کے ساتھ قبول فرمایا۔ اور ڈبی ناخدا کے ہاتھ میں دیکر فرمایا، اس کو دریا میں پھینک دو۔ میاں کے آدمیوں نے حیران ہوکر کہا، آپ نے ایک بے بہا اور مفید چیز کو اس طرح دریا میں کیوں پھنکوادیا" کہتے ہیں کہ جس کسی بدنصیب انسان نے وہاں سے پانی پیا وہ وہیں مرگیا یا زندگی بھر بیماری میں مبتلا رہا۔ دراصل یہ معجون ایک قاتل زہر تھی، جو کہ میاں نے شاہ صاحب کو نقصان پہنچانے کے لئے بھیجی تھی۔ شاہ لطیف نے قاصد سے میاں نور محمد کو یہ کہلاکے بھیجا کہ میاں صاحب کو میرے سلام کہنے کے بعد کہئے گا۔ "آپ کا بھیجا ہوا تحفہ ملا، وہ صرف میرے کھانے سے مجھے فائدہ ہوتا، لیکن اب تو میں چاہتا ہوں کہ اس بے بہا چیز سے سب لوگ مستفیض ہوجائیں"[۱]

دوسری روایت ہے، ایک دن میاں نور محمد کلہوڑہ نے شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ملاقات کرنے کا شوق ظاہر کیا اور شاہ صاحب کو دعوت پر مدعو کیا۔ شاہ لطیف نے دعوت قبول کرلی مقرر دن پر میاں نے آپ کو بلوایا۔ کھانے کے اہتمام کے بعد جب شاہ بھٹائی رخصت لینے لگے تو میاں نے دل میں دغا رکھتے ہوئے، ایک سرکش اور طاقتور گھوڑی شاہ لطیف کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کی تاکہ شاہ لطیف رحؒ کو دولتیاں مارکر، یا کاٹ کر تکلیف پہنچائے۔ شاہ صاحب نے اس کی چال کو اچھی طرح سمجھا، اور تحفہ قبول کرکے گھوڑی پر سوار ہوگئے، کیونکہ یہی نور محمد خان کی منشا تھی۔ شاہ بھٹائی نے اس سرکش گھوڑی پر سوار ہوکر لغام کو بھی چھوڑ دیا۔ گھوڑی چونکہ تیز رفتار تھی، ایک پلک جھپکنے میں نظر سے اوجھل ہوگئی۔ بہت سے آدمی اُن کے پیچھے دوڑے لیکن وہ اس وقت تک نکل چکی تھی۔ ایک ساعت کے بعد شاہ بھٹائی گھوڑی پر سلامتی سے نور محمد خان کے آگے آکر رُکے یہ ماجرا دیکھکر میاں بہت شرمندہ ہوئے، اور شاہ بھٹائی رحؒ سے معافی مانگ لی۔ میاں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ اس سرکش گھوڑی پر بغیر کسی جھجک کے سوار ہوئے اور لغام کو بھی چھوڑ دیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا آپ نہیں سمجھے جب کہ میری توکل ربّ پر ہے، اور میری زندگی کی باگ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، تب میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ گھوڑی کی باگ کو تھام لوں۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا۔ اس واقعہ کے بعد میاں نور محمد کلہوڑہ نے دشمنی چھوڑ کر دوست بن گیا۔[۲]

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست۔

روایت ہے کہ میاں نور محمد کلہوڑہ کے بیٹے میاں غلام شاہ کلہوڑہ[۳] شاہ لطیف رحؒ کی دعا سے پیدا ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب کی خدمت میں ایک حسین و جمیل نوجوان طوائف دعا کے لئے حاضر ہوئی تھی، اور شاہ بھٹائی رحؒ سے کہہ رہی تھی، کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کی درگاہ عالی میں دعا فرمائیں کہ میری زندگی خیر و عزت سے گذرے، اس طوائف نے شاہ بھٹائی رحؒ کی محفل کو اپنی خوش الحانی سے پُر نور بنا دیا تھا، شاہ صاحب اس سے بہت خوش ہوئے تھے، "گلان" نے اس موقعے کو غنیمت جان کر شاہ بھٹائی کی خدمت میں دعا کے لئے عرض کر رہی تھی۔ کہ اس غلط کاروبار سے نجات ملے اور حلال کی روزی نصیب ہو۔ اور باقی زندگی آرام و سکون سے کٹ جائیں شاہ لطیف نے فرمایا۔ تیری شادی سندھ کے بادشاہ سے ہوگی اور تیرے بطن سے ایک ایسا بیٹا پیدا ہوگا جو سندھ کا مشہور اور مدبر بادشاہ بنے گا۔ اور اپنے والد سے زیادہ نیک نام ثابت ہوگا۔ اس محفل کا کسی منافق آدمی نے جاکر میاں کو شکایت کی اور کہا ایک طرف شاہ لطیف اپنے آپ کو درویش کہتا ہے، تو دوسری طرف طوائفوں سے سماع کی محفلیں گرم کرتا ہے، یہ بات صوفیوں اور درویشوں کے شایانِ شان نہیں۔ میاں نور محمد خان نے فوراً یہ حکم دیا کہ اگر ایسی حالت ہے تو اس کو دیکھا جائے اور اپنے آدمی کو شاہ بھٹائی کی طرف بھیج دیا، اور کہا اگر ایسی کوئی عورت موجود ہو تو، اُسے زبردستی یہاں لے آؤ۔ قضا اور قدرت کو بھی یہی منظور تھا۔ اس وقت "گلان" شاہ صاحب سے رخصت لے رہی تھی، تو شاہ بھٹائی نے اُسے فرمایا تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ تیرا کام ہو رہا ہے۔ اس گفتگو کے دوران

۱۔ تاریخ ادبیات سندھ (تذکرہ لطفی) جلد اول تیسری ایڈیشن۔ مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۲۹۵۔

۲۔ شاہ کا رسالہ مقدمہ مصنف اجمالی پروفیسر ہوتچند مولچند گربخشانی صفحہ ۲۱

۳۔ احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی مصنف مرحوم مرزا قلیچ بیگ صفحہ ۲۳۔

۴۔ ایضاً " " صفحہ ۳۵۔

میاں کے آدمی وہاں پہنچ گئے، اور گلاں کو وہاں موجود دیکھکر اُسے زبردستی گھسیٹ کر میاں کے آگے پیش کیا۔ میاں "گلاں" کے حسن اور جوانی، گلفامی اور نازک اندامی کو دیکھکر فریفتہ ہوگئے۔ "گلاں" نے میاں سے کہا اگر آپ مجھے اپنے نکاح میں لینگے تو میں آپ کی ہوجاؤنگی۔ لیکن بغیر نکاح کے ہاتھ بھی لگانے نہ دونگی۔ میاں نے عشق کی آتش سے مجبور ہوکر قاضی کو بلوا کر نکاح پڑھوایا۔ اُسی "گلاں" سے ایک فرزند تولد ہوا جس کا نام غلام شاہ رکھا، جو سندھ کا بڑا مدبر اور مشہور بادشاہ بنا۔ غلام شاہ کلہوڑہ بھی شاہ لطیف بھٹائی رح کے خاص عقیدتمندوں میں سے ایک تھا۔ شاہ بھٹائی رح کی وفات کے بعد میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے شاہ صاحب کی مزار مبارک پر موجودہ شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کی وفات

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے والد بزرگوار کی وفات کے بعد، آپ کی زندگی عجیب کیفیت اور استغراق کی حالت میں گذرتی تھی، آپ کی زندگی کے اس دور میں سندھ عجیب انقلابوں سے گذر رہا تھا، لیکن آپ کی گوشہ نشینی اور پرسکون زندگی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ "بھٹ" میں سکونت اختیار کرنے کے بعد دنیا کے جھوٹے بندھن کو ترک کرکے تارک الدنیا بن کر یاد الہیٰ اور قناعت کی زندگی بسر کرنے لگے اس اثناء میں آپ کا نام دور دراز شہروں تک مشہور ہوگیا۔ اس مرنجاں مرنج شخصیت اور شریفانہ زندگی نے آخر عوام کو اُن کا گرویدہ بنا دیا۔ ان کی ہردلعزیزی رفتہ رفتہ بڑھتی رہی۔ آپ کی خداترسی اور پاکیزہ صفات نے عقیدتمندوں کا ایک گروہ آپ کے گرد جمع کردیا شاہ لطیف کا یہ باطنی تصرف تھا یا قدرتی امر تھا، کہ شاہ صاحب کی نئی اقامت گاہ اس حسن سے مالامال تھی۔ کہ مریدوں کے گروہ کے گروہ وہاں آکے بسے آپ کے اسوۂ حسنہ سے فیض یاب ہوئے تھے۔

اب شاہ بھٹائی رح کی زندگی عبادت الہیٰ کے شغل میں بسر ہوتی تھی، یہاں تک کہ آپ کی زندگی کے آخری دن آ پہنچے، ایک دن آپ کی مجلس میں حضرت امام حسین شہداء کربلا رضی اللہ تعالیٰ کا ذکر مبارک ہو رہا تھا۔ اس وقت سے شہداء کرام کی محبت کا اتنا غلبہ طاری ہوا کہ آپ کو کربلا معلیٰ کی زیارت کا شوق دامنگیر ہوا۔ اور کربلا کے سفر کے لئے "بھٹ" سے گجرات کے بندرگاہ جانے کے لئے روانہ ہوئے، جس کے لئے آپ کو بیابان کچھ کو پار کرنا تھا۔ راستہ میں آپ "ونگہ ولر" کے ایک گاؤں میں منزل انداز ہوئے۔ جہاں آپ کے قریبی عزیز رہتے تھے۔ خصوصاً آپ کے بھتیجے کے بیٹے سید جمال شاہ نے بڑی خلوص سے خدمت کی۔ شاہ صاحب اس سے اتنے خوش ہوئے کہ اُن کو اشارتاً فرمایا "تم میرے بعد تم ہی میرے جانشین ہوگے" شاہ صاحب اُنکے سے بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا "بیٹے جس طرح آج ہم یہاں اکٹھے ہیں اس طرح آخری جگہ میں بھی اکٹھے ہونگے۔

شاہ بھٹائی رح نے وہ رات وہیں بسر کی اور صبح کو منزل کی طرف کوچ فرمایا۔ راستہ میں آپ کو ایک خاص مرید ملا جس نے سفر کی وجہ دریافت کی آپ نے کربلا معلیٰ جانے کا ارادہ بتایا۔ اس مرید نے عرض کیا قبلہ آپ کا ارشاد تھا کہ آپ کا مدفن "بھٹ" پر ہوگا۔ آپ اپنی آخری عمر میں ایک دور دراز سفر جا رہے ہیں۔ شاہ بھٹائی پر ان الفاظ کا بڑا اثر ہوا اور آپ اُسی مقام سے لوٹ کر واپس "بھٹ" پہنچے وہاں آکر آپ نے حضرت امام حسین رض کی یاد میں ابیات موزوں فرمائے جو کہ آپ کے رسالے میں "سُر کیڈارو" کے موضوع سے موجود ہے۔ جو کہ آپ کا آخری کلام ہے

روایت ہے کہ آپ اکیس دن خلوت میں رہے اور یاد الہیٰ میں گذارے، اس دوران آپ نے کسی سے نہ بات کی اور نہ ہی اتنا کھایا۔ بائیسویں دن آپ نے غسل فرمایا۔ اور چادر اوڑھ کر مراقبہ میں بیٹھ گئے۔ فقیروں نے بدستور سماع کیا۔ کہتے ہیں۔ کہ تین دن سماع ہوتا رہا۔ ایک عجیب اُداسی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ آخر کار جب سماع ختم ہوا۔ اور مریدوں نے شاہ صاحب کے نزدیک جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ اس طرح ایک کامل ولی، عظیم انسان معجز بیان شاعر اور مفکر اس فانی جہان سے رحلت فرماگئے۔

ہر کہ زاد بناچار بایدش نوشید۔

زجام دہر کل من علیھا فان

آپ کی وفات تاریخ چودھویں صفر سنہ ۱۱۶۵ ہجری مطابق ۲۔ جنوری سنہ ۱۷۵۲ع کے دن کو ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک ۶۳ سال کی تھی۔

آپ کے وصال پر ایک مرید جو اپنے دور کے فارسی زبان کے بڑے شاعر محمد پناہ رجّا ٹھٹوی نے تاریخ وفات ابجد کے حساب سے اس طرح لکھی ہے۔

گفت این رجّا مرید، سنہ ارتحال پیر

گردیدہ محو عشق، وجود لطیف میر

اس شعر کی دوسری مصرعہ سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ آپ کی درگاہ کے اندرونی دروازہ کی طرف ایک، اور شعر لکھا ہوا نظر آتا ہے

جس سے بھی آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے جو غالباً محمد پناہ رجّا کے موزوں کئے ہوئے ہیں:

زد نعرہ در فراق و دگی کردہ سینہ چاک

شد محو در مراقبہ جسم لطیف پاک

۱۱۶۵ھ

ایک اور قطعہ روضہ کے جنوب میں مسجد کی دیوار پر کندہ ہے جس سے بھی آپ کی تاریخ وصال سنہ ۱۱۶۵ ہجری نکلتی ہے جو قطعہ کے آخر میں دو حروف

"رضوان حق" سے نکلتی ہے۔

شاہ صاحب ذوالمناقب سید عبداللطیف

آنکہ قطب وقت خود بواست در مردان حق

چون زجام از جوئ مخمور نوش وصل شد۔

گفت ملہم غیب سال رحلتش رضوان حق

۱۱۶۵ ہجری

آپ کے ایک معتقد شاعر شیریں کلام مرحوم سید غلام محمد شاہ گدا نے آپ کی تاریخ ولادت اس طرح موزون کی ہے۔

گدا سال تولید سلطان "بحث"

شنیدم ز ہاتف عنایت شعار

۱۱۰۲ ہجری

آپ کے جسم مبارک کو آپ کی وصیعت کے مطابق "بھٹ" پر دفنایا گیا۔ یہ مقام مستقبل کے لئے مرجع عام وخاص بن گیا۔ آپ نے سچ فرمایا ہے

ساري رات سبحان جاڳي جن ياد ڪيو.

اُن جي عبداللطيف چئي مٽيءَ لڌو مان،

عرش ۾ سلام آڇيو آسڻ اُن جي.

ساری رات جاگے اور سبحان رکھا جنہوں نے سانس میں

اُن کی مٹی عبداللطیف کہے پایا عزو شان

آکر کرے سلام صدہا ان مقام پر۔

۱؎ تذکرہ لطفی "تاریخ ادبیات سندہ" مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی جلد اول صفحہ ۲۹۴۔

۲؎ شاہ لطیف (انگریزی) مصنف لیلارام وطن مل لالوانی۔ صفحہ ۲ پر لکھتے ہیں۔

Over the same door, side by side with the above couplet, there is an other couplet.

۳؎ قاضی ابراہیم ہالائی "لطائف لطیف" (فارسی) مصنف میر عبدالحسین خان سانگی صفحہ ۲۰۵ اور تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع صفحہ ۱۵۳

۴؎ "لطائف اللطیف" مصنف میر عبدالحسین خان سانگی، صفحہ ۱۳۔ جناب کرامت مآب سید عبداللطیف نور اللہ ولادت مکان قریہ ہٹی پور سنہ ۱۱۰۲ ہجری مطابق سنہ ۱۶۹۰ء۔

آپ کی وفات پر صاحب تحفۃ الکرام نے لکھا ہے

روزے کہ ازین سرا نقل فرمودہ در ماتمش جمعی از مریدان جان داد نہ مزار متبرکہ اس بران ہیئت عجیب جائی با روح وصفا است گنبد عالی بر قبرش بنا یافتہ و راجہ جیسلمیر نوبت نذر نمودہ صبح و شام در گاہش بجیب روح و سرور وح و غریب صفا و حضور دارد الکنون سید جمال شاہ قائم مقام مخصوص بکرامات خفی وجلی است و سلسلہ فقرا چند خلیفہ نامدار دارد.

"جس روز شاہ صاحب نے اس دنیا سے رحلت فرمائی، اُس دن اس عظیم سانحہ کے ماتم میں کئی مریدوں نے جانیں دے دیں، آپ کے مزار مبارک پر عالیشان گنبذ بنایا گیا ہے. آپ کی مرقد مبارک معتبرک اور عجیب جگہ ہے جو روح و صفا سے معمور ہے. راجہ جیسلمیر نے بھی نقارے نذر کئے تھے جو صبح و شام بجائے جاتے ہیں، آپ کی درگاہ پر صبح و شام عجیب روپرور کیفیت رہتی ہے. اب سید جمال شاہ کرامات ولی کے سجادہ نشین ہے شاہ صاحب کے سلسلہ فقراء میں چند نامور خلفا بھی ہیں."

آپ کے درگاہ کی عمارت اور قبہ، میاں غلام شاہ کلہوڑہ والی سندھ کے حکم سے سنہ ۱۷۵۴ء میں تعمیر کی گئی. لیلارام وطن مل اپنی تصنیف "شاہ لطیف" میں درگاہ کی عمارت کے مکمل ہونے کی تاریخ کتبہ کی صورت میں لکھی ہے جس سے ابجد کے حساب سے تاریخ سنہ ۱۱۶۷ ہجری مطابق سنہ ۱۷۵۴ء نکلتی ہے. "IDAN" عیدن نامی کاریگر نے اس عالیشان قبہ پر کام کیا تھا، جو سید جمال شاہ سجادہ نشین کے زیر نگرانی تعمیر ہوا.

سندھ کے بادشاہ غلام شاہ کلہوڑہ نے قبہ کو اتنا بلند بنوایا تھا، جو اپنے مرشد کے قبہ کا دیدار دور سے اپنی تخت گاہ سے کر سکیں، اس قبہ پر کاشی کی اینٹوں اور سنگمرمر سے کام کیا ہوا ہے. اس کے ساتھ عالیشان مسجد بھی بنائی گئی، جس پر بھی قبہ کی طرح خوبصورت کاشی اور سنگمرمر کا کام کیا ہوا ہے. قبہ کے مکمل ہونے کی تاریخ کا کتبہ اس طرح ہے.

چون ز دست حضرت سیّد جمال
شد بنائی روضۂ شاہِ لطیف.
زائر آنجا جلوۂ حق دید و گفت
مرقد پور نور درگاہ لطیف.

ٹالپروں کے دور حکومت میں میر صاحبان نے بھی شاہ صاحب کی مزار مبارک کی مزید توضیع کرادی، خصوصاً میر نصیر محمد خان نے قبہ اور مسجد کی مرمت اپنے زیر نظر کرادی تھی، آپ کا ارادہ تھا، کہ مزار کے چاروں طرف پکی دیواریں بنائی جائیں، اور چاروں کونوں پر مینار بنوائے جائیں، لیکن یہ کام مکمل نہ ہو سکا. اس کے علاوہ میر نور محمد خان ٹالپر نے قبہ کے سامنے ایک کنواں پانی کی فراوانی کے لئے بنایا. آپ کے چچازاد بھائی میر محمد خان نے درگاہ کا اندرونی دروازہ چاندی کا بنوایا، جو آج تک موجود ہے. دروازہ پر بہت سے فارسی اشعار کندہ کئے گئے ہیں.

تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع صفحہ ۱۵۳ جلد سوم.

A well Known mason named "Idan" whose name appears there in legible character "SHAH LATIF" by Lilaram Lalwani Page - 3.

کلہوڑہ کے دار سلطنت مراد آباد تھی، لیکن دریائے سندھ کے گھیرنے سے یہ شہر برباد ہو گیا. غلام شاہ نے محمد آباد نام دیکر آباد کیا. تاریخ سندھ مرتب غلام رسول مہر صفحہ ۵۹۳

شاہ لطیف مرتب لیلا رام لالوانی.

باب ششم

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شخصیت

(صورت، سیرت اور مذھب)

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی پاکیزہ زندگی پر نظر ڈالنے سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف باکمال شاعر اور مفکر تھے بلکہ ایک اعلیٰ انسان بھی تھے۔ آپ کا ہر فعل آپ کے قول کے مطابق تھا، آپ کے کلام میں جو ذرّے بھا موجود ہیں، اُن کے ہر جلوہ سے انسانیت کی برتری نمایاں ہوتی ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ ایک شاعر کا کلام اُس کی زندگی کی تفسیر ہے تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ شاہ لطیف "انسانی زندگی" کے اعلیٰ شارح تھے۔ آپ کے عظیم کردار کا اہم پہلو انسانیت کا احترام تھا۔

شاہ لطیفؒ کے سبھی ھمعصر مورخ، اس حقیقت کو نمایاں طور پر لکھتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے باکمال انسان تھے۔ آپ کے دل پر انوار الٰہی نے وہ نور پیدا کیا تھا جو ایک پیغام کی صورت میں آپ کے قلب کی گہرائیوں سے نکلا اور اُنہیں زندہ جاوید بنا تا گیا۔ انسانیت کا احترام کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

جنهين سودو سچ جو، وکر وهايو،
بحر لحم البشرا جو، اُنھين ئي آيو
تن کي لالن لنگهايو، سانڍارو سمونڊ جو

سودا سلف سچ کا، جنھوں نے کیا تھا۔
لحم البشرا، اُن کو حاصل حال ہوا
محبوب لے گیا، پار سمندر اُن کو۔

شاہ صاحب کے نزدیک انسانیت کا احترام مقصد اولین ہے۔ آپ نے حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرح بنی نوع انسان کو تصوف کی شاہراہ پر لیے جانا چاہا۔ جو انسان کو امن و سلامتی، عشق اور محبت، دلسوزی اور جذبہ اصلاح کو کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ اُنہوں نے انسانی تخلیق سے مراد، اپنے خالق سے وابستگی کو لیا ہے اور اس میں بے حد پختگی سے فرماتے ہیں:۔

اِي نہ مارن ريت، جئين سيڻ مٽائين سون تي.
اچي عمر کوٽ ۾ ڪندس ڪانہ ڪريت
پکن جي پريت، ماڙين سين نہ مٽيان.

یہ میرے عزیزوں کا رواج نہیں ہے کہ، وہ اپنوں کو سونے پر بیچدیں
ای عمر میں عمرکوٹ میں آکر یہ گندہ رواج قائم کرنا نہیں چاہتی۔
میں اپنی آبائی جھونپڑی کو تمہارے محل سے نہیں بدلوں گی۔

شاہ بھٹائیؒ نے ماروی کی تمثیل میں اس دنیا کی افتادگی کو نہایت عارفانہ انداز میں بیان فرمایا ہے، عمرکوٹ کو اس دنیا سے مشابہت دی ہے جہاں ماروی قید ہے، عارفوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ یہ دنیا "سجن المومنین" ہے، دنیا کے اندر آکر اپنے خالق کی بخشی ہوئی زینت وزیب کو مٹانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا رہتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ انسانی کے حقیقی حسن کو اس طرح عبرتناک الفاظ میں بیان فرماتے ہیں

سوڻ وڃايم سومرا، ميرو منهن ٿيوم

وڃڻ تت پيوم، جت هلڻ ناه حُسن ري

سومرہ، یہاں میں نے اپنے حسن کو پامال کیا ہے، میری صورت بگڑ گئی۔

مجھ تو اس جگہ جانا ہے جہاں، حسن کے بغیر چلنا مشکل ہے۔

قرآن پاک کا بھی یہی ارشاد عالی ہے "لقد خلقنا الانسان فی احسنِ تقویم، ثم رددناہ اسفل السافلین" ہم نے انسان کو نہایت عمدہ طریقہ سے خلق فرمایا ہے لیکن وہ انتہائی پستی میں جا گرا" حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی نے بھی انسانیت کی اس حقیقت کو پیش کیا ہے، جس میں ان کی شخصیت نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ حقیقت کتنی صحیح ہے کہ جہاں حسن کے بغیر چلنا مشکل ہے، اور ایک انسان کو نیک اعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، جہاں گندی صورت کے ساتھ جانا بڑی معیوب بات ہے۔ دنیا میں وہ انسان کامیاب ہے جس کی عاقبت بالخیر ہو جائے، اس دوران زندگی کے لئے عمل کی ضرورت ہے، اس عمل کی تلقین اور مکافات کے ذکر سے پورا رسالہ بھرا ہوا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ٻيڙا ايتا ٻيئي تو نہ ٿيندءِ ٻيون ڳالهيون

سڃيون راتيون سمهين، پو سُکان ڏيئي.

ميان سيٽي، پار پڇندءِ خبرون.

اے ناخدا تجھے یہ دونوں باتیں کہاں نصیب ہونگی کہ پتوار (سکان) کے نزدیک پوری رات آرام سے سوئیں اور کنارے پر سلامتی سے پہنچنے کی امید رکھیں۔ جب تک تم بیدار نہیں ہوگے تب تک تمھارا منزل پر پہنچنا مشکل ہے۔

علامہ اقبال نے بھی اس قبیل میں فرمایا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی۔

یہ خاکی اپنی فطرت سے، نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

وہ انسانیت سے پیار کرنے والے تھے صلح کل کا پیغام دیتے تھے، اور دشمن سے بھی نیکی کرنے کی ترغیب دیتے تھے، فرماتے ہیں۔

هُو چوي تون م چؤ، وائون وڙائي.

اڳ اڳرائي جو ڪري، خطا سو کائي.

پاند ۾ پائي، ويو ڪيني وارو ڪينڪي.

اگر کوئی تجھے برا کہے تو، اس کے بدلے میں تو برا نہ کہہ

جو شروعات کرے گا، وہی خطا کھائے گا

جس کے دل میں کبر و کینہ ہوگا، اس کا وجود نہ ہوگا۔

کتنی عملی تعلیم ہے، یہی عملی اسباق اس بے مثل سخنور سے حاصل ہوتے ہیں۔ آپ کے کلام میں واردات قلبی کا ذکر بکثرت موجود ہے، جس میں انسانی احترام بڑی سادگی سے پیش کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کے کلام کا مطالعہ کرنے والا آپ کے روحانی فیضان میں گم ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

روزا ۽ نماز، اِي پڻ چڱو ڪم

اُو ڪو ٻيو فهم، جنهن سان پسڻ پرين کي.

یہ ابہام و تفہیم انسانیت کا احترام ہے۔ اس کے حاصل ہونے سے انسان قرب الٰہی کے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ علم الاخلاق کے رہبروں نے انسانیت کے لافانی کردار کو دیکھا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے سچ فرمایا ہے:۔

عبادت بجز خدمت خلق نیست

بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

یہ وہ زندہ جاوید پیغام ہے جس کے باعث شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اس زمین کے ہر باشندہ کے دل و دماغ پر بلا کسی مذہبی تفریق و امتیاز کے چھائے ہوئے ہیں اور ہمیشہ چھائے رہیں گے، جب کسی کے دل میں احترام انسانی جاگزیں ہوجاتا ہے تو اس میں وہ سب صلاحیتیں خود بخود آجاتی ہیں، جو ایک صالح معاشرہ کے لئے ضروری ہے۔ یہ شخص صلح کل بن جاتا ہے یہی خصوصیتیں شاہ لطیف بھٹائیؒ کے عظیم کردار میں غالب نظر آتی ہیں فرماتے ہیں:۔

کم کمندن کیتو ھارایو ھوڙن .

چکیو نا چوندن ، موجو ساءُ صبر جو .

صبر کرنے والا جیتا ، اور جلد باز نے ہارا

اور وہ صبر کی لذت سے واقف نہ ہو سکا .

انسان کو انسان سے نفرت اور حقارت کو دیکھکر کر اس طرح تلقین فرماتا ہے:۔

ڏ ڪِرڪيو وتن ، پرت نہ ڇڻن پاڻ ۾ .

پسو پکيئڙن ، ماڻهوان ميٺ گهڻو .

پرندوں کی محبت کو دیکھ، وہ کس طرح آپس میں محبت سے رہتے ہیں

ان میں انسانوں سے زیادہ محبت پائی جاتی ہیں .

اپنے ناصحانہ انداز میں شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں نصیحتیں موجود ہیں۔ وہ خود صلح کل تھے۔ اور خود اس پر عامل تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اس دنیا کے رہنے والوں کو نفرت کینہ کے پرخار وادیوں سے نکال کر امن و سلامتی کی راہ پر لے جائیں جو اسلام کا زرین اصول ہے، وہ وقت دور نہیں کہ شاہ صاحب کی عظمت کا آفاق اثر پوری دنیا کو اپنے آغوش میں لے لیگا، حافظ شیرازیؒ نے صحیح فرماتے ہیں:۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما.

آپ کی زندگی کا پورا کردار اپنے آپ کے اصلاح کا نشان دیتا ہے۔ تواضع اور خاکساری اگرچہ دیکھنے میں نہایت کٹھن ہے اور برداشت کرنے کے قابل ہیں لیکن ایک سچے مرد مومن کے مردانگی کی یہ نشانیاں ہیں۔ یہی سبب ہے کہ شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں انسانیت کی بہتری کا پیغام ملتا ہے جو کہ آپ کی زندگی کا پورا آئینہ ہے فرماتے ہیں:۔

اندر آئينو ڪري ، پرين سو پسيج .

انهيءَ راهہ رهيج ، تہ مشاهدو ماڻين .

اندر آئینہ کی مانند کر تو اس محبوب کا دیدار ہو .

اس راہ پر چلوگے تو ان کا مشاہدہ پاؤ گے .

شاہ صاحب کی زندگی بیحد سادگی سے گذری، ان کی نشست و برخاست بھی سادہ تھی، خداتعالیٰ کی عبادت و ریاضت آپکی زندگی کا بہترین مشغلہ تھا۔ شاہ بھٹائیؒ ایک پاکباز اور عبادت گذار انسان تھے، مردانہ حسن کے پیکر، موزوں قد کے شکیل و جمیل شخصیت کے مالک تھے، پاکبازی

اور ریاضت سے اُن کے حسن میں خدائی جلوہ کا نور شامل ہوگیا تھا۔ قوت اور ہمت والے تھے۔ خلیق نرم دل، پر محبت و شیریں گفتار تھے۔ آپ کی آنکھیں عشق الہٰی کے نشے سے سرشار اور مخمور رہتی تھیں آپ کی پیشانی ہر وقت درخشاں رہتی تھی۔ جو کشادہ تھی۔ جس پر متانت تھی۔ معلوم یوں ہوتا تھا کہ کسی عمیق خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور جس سے عظمت و فضیلت کی مرغوب کن کیفیت، جو برگزیدہ انسانوں میں ہوتی ہے۔ وہ نمایاں تھی۔ خلق خدا کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے۔ کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی۔ آپ کے مزاج میں سوز و گداز تھا۔ دکھی اور غمزدہ انسان کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتے تھے کسی کی تکلیف کو برداشت نہ کرتے تھے۔ جاہ و جلال شان و شوکت سے دور رہتے تھے۔ بلکہ اس سے نفرت کرتے تھے۔ سر آسا میں اس کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں۔

سرمو سياهي جو تہ نين کي سرهاءِ

ڪاني ڪالاٽي جي، متن ٿي ڪ پاءِ

اکين ۾ اتڪاءِ، لالائي لالن جي.

سُرمہ کی سیاہی، عورتوں کی آنکھوں میں جچتی ہے

مرد ہو کر آنکھوں میں، سرمہ کی کالی سلائی مت لگا

اپنی آنکھوں میں حقیقی محبوب کی سرخی پیدا کر۔

آپ کا سینہ کشادہ اور بازو سڈول اور مضبوط تھے۔ ریش مبارک ترشیدہ اور بھری ہوئی تھی۔ جسم مبارک ہمیشہ خوف خدا سے گرم رہتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت، اکثر اوقات گیروئے رنگ کی کفنی پہنتے تھے، سر پر صوفیانہ وضع کی ایک لمبی ٹوپی اوڑھتے تھے، ہاتھ میں عصا رہتا تھا۔ آپ کے پاس ایک موٹی دانوں والی تسبیح ہوا کرتی تھی۔ جس سے ذکر خدا میں مشغول رہتے تھے۔ فقیروں کی نشانی ایک کشکول بھی تھا۔ یہ سب چیزیں اب بھی بھٹ شاہ میں محفوظ ہیں جن کو "گنج" کہتے ہیں۔ آپ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ زہد و تقویٰ آپ کی زندگی کا عین مقصد تھا۔ دراصل شاہ لطیف کو بچپن سے ہی ایسا ماحول نصیب ہوا تھا۔ اور اپنے حال میں مستغرق رہتے تھے۔ دوسرے بچوں کے برعکس کھیل کود سے کنارہ کش رہتے تھے۔ شاہ بھٹائی کی شخصیت اور فکر پر اس ماحول کا بڑا اثر ہوا تھا۔ بزرگی، عزت اور عظمت آپ کے خاندان سے ہی حصہ میں تھی۔ عظیم المرتبت خاندان سادات کے رکن تھے۔ آپ کے جد امجد حضرت شاہ عبد الکریم بلڑی سندھ کی شاعری کے علم بردار تھے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب ایک صوفی درویش تھے۔ فارغ البالی ہونے کے باوجود کثر نفس مزاج رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بڑی نیک سیرت تھی۔ وہ سندھ کے ایک برگزیدہ ہستی مخدوم عربی دیانی کے خاندان میں سے تھی۔ مخدوم عربی دیانی بقول مصنف "لطف اللطیف" حضرت مخدوم نوح کے استاد اور ہمعصر تھے۔ آپکا مزار ہالا میں واقع ہے۔ شاہ لطیف کا بچپن اپنی والدہ ماجدہ کی پر شفقت آغوش میں اعلیٰ گاؤں میں گذرا۔ آپ کو والدہ کی نیک صحبت سے اخلاق اور نیکی، علم و تحمل، عزت و شرافت، حب الوطنی، اور خلق خدا سے ہمدردی کے پاکیزہ اسباق ملے جس کی وجہ سے آپ کی شخصیت کو انسانیت کے معراج پر پہنچایا۔ شاہ لطیف کا کلام آپ کی سیرت کا آئینہ ہے۔ آپ اپنے کلام کے مجسمہ تھے۔ آپ کا اصول ہر حال میں تواضع اور خاکساری تھا۔ فرماتے ہیں۔

سونُ ڪنهن شيءِ ۾، جيڪي منجھ تراب

جو کچھ خاک میں موجود ہے، وہ کسی اور چیز میں نہیں ہے۔

شاہ صاحب نہ صرف خود سادگی سے رہتے تھے بلکہ اپنے عقیدتمندوں اور مریدوں کو بھی سادگی سے زندگی بسر کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ خدا تعالیٰ کی ذات اقدس اور اس کی حقیقت کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے جس راہ عمل کو اپنایا۔ اس میں کامیابی سے پار ہوئے۔ اپنی فقیرانہ زندگی میں وہ کچھ حاصل کیا جو اس وقت بادشاہوں کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج صدیاں گذرنے کے بعد بھی لوگ اُنکے نام سے عقیدت رکھتے ہیں۔

اور ریاضت سے اُن کے حسن میں خدائی جلوہ کا نور شامل ہوگیا تھا۔ قوت اور ہمت والے تھے خلیق نرم دل، پر محبت وشیریں گفتار تھے۔ آپ کی آنکھیں عشقِ الٰہی کے نشے سے سرشار اور مخمور رہتی تھیں آپ کی پیشانی ہر وقت درخشاں رہتی تھی، جو کشادہ تھی، جس پر متانت تھی، معلوم یوں ہوتا تھا کہ کسی عمیق خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور جس سے عظمت و فضیلت کی مرغوب کن کیفیت، جو برگزیدہ انسانوں میں ہوتی ہے، وہ نمایاں تھی، خلقِ خدا کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتے تھے، کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائی، آپ کے مزاج میں سوز و گداز تھا، دکھی اور غمزدہ انسان کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتے تھے کسی کی تکلیف کو برداشت نہ کرتے تھے، جاہ وجلال شان و شوکت سے دور رہتے تھے، بلکہ اس سے نفرت کرتے تھے، سر آسا میں اس کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں۔

سرمو سياهيءَ جو، ٿَنِنِ کي سُهاءِ

ڪاني ڪاڻ اُن ٿي، مڙس ٿي مَ پاءِ

اکين ۾ انڪاءِ، لالائي لالن جي.

سرمہ کی سیاہی، عورتوں کی آنکھوں میں جچتی ہے

مرد ہو کر آنکھوں میں، سرمہ کی کالی سلائی مت لگا

اپنی آنکھوں میں حقیقی محبوب کی سرخی پیدا کر۔

آپ کا سینہ کشادہ اور بازو سڈول اور مضبوط تھے۔ ریش مبارک تراشیدہ اور بھری ہوئی تھی، جسم مبارک ہمیشہ خوفِ خدا سے گرم رہتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے حد محبت، اکثر اوقات گیروے رنگ کی کفنی پہنتے تھے، سر پر صوفیانہ وضع کی ایک لمبی ٹوپی اوڑھتے تھے، ہاتھ میں عصا رہتا تھا، آپ کے پاس ایک موٹی دانوں والی تسبیح ہوا کرتی تھی، جس سے ذکرِ خدا میں مشغول رہتے تھے۔ فقیروں کی نشانی ایک کشکول بھی تھا، یہ سب چیزیں اب بھی بھٹ شاہ میں محفوظ ہیں، ان کو "گنج" کہتے ہیں۔ آپ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، زہد و تقویٰ آپ کی زندگی کا عین مقصد تھا، دراصل شاہ لطیف کو بچپن سے ہی ایسا ماحول نصیب ہوا تھا، اور اپنے حال میں مستغرق رہتے تھے، دوسرے بچوں کے برعکس کھیل کود سے کنارہ کش رہتے تھے، شاہ بھٹائی" کی شخصیت اور فکر پر اس ماحول کا بڑا اثر ہوا تھا، بزرگی، عزت اور عظمت آپ کے خاندان سے ورثے میں ملی، عظیم المرتبت خاندانِ سادات کے رکن تھے، آپ کے جدِ امجد حضرت شاہ عبد الکریم بلڑی سندھ کی شاعری کے علم بردار تھے، آپ کے والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب ایک صوفی درویش تھے، فارغ البالی ہونے کے باوجود کثر نفس مزاج رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ بڑی نیک سیرت تھی، وہ سندھ کے ایک برگزیدہ ہستی مخدوم عربی دیانی کے خاندان میں سے تھی۔ مخدوم عربی دیانی بقول مصنف "لطف اللطیف" حضرت مخدوم نوح کے استاد اور ہمعصر تھے۔ آپکا مزار ہالا میں واقع ہے۔ شاہ لطیف" کا بچپن اپنی والدہ ماجدہ کی پر شفقت آغوش میں اعلیٰ گاؤں میں گذرا، آپ کو والدہ کی نیک صحبت سے اخلاق اور نیکی، علم و تحمل، عزت و شرافت، حب الوطنی، اور خلقِ خدا سے ہمدردی کے پاکیزہ اسباق ملے جس کی وجہ سے آپ کی شخصیت کو انسانیت کے معراج پر پہنچایا۔ شاہ لطیف کا کلام آپ کی سیرت کا آئینہ ہے، آپ اپنے کلام کے مجسمہ تھے، آپ کا اصول ہر حال میں تواضع اور خاکساری تھا، فرماتے ہیں۔

سو نڪنھن شيءِ ۾، جيڪي منجهہ تراب

جو کچھ خاک میں موجود ہے، وہ کسی اور چیز میں نہیں ہے۔

شاہ صاحب نہ صرف خود سادگی سے رہتے تھے بلکہ اپنے عقیدتمندوں اور مریدوں کو بھی سادگی سے زندگی بسر کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ خدا تعالیٰ کی ذاتِ اقدس اور اس کی حقیقت کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے جس راہ عمل کو اپنایا، اس میں کامیابی سے پار ہوئے۔ اپنی فقیرانہ زندگی میں وہ کچھ حاصل کیا جو اس وقت بادشاہوں کو حاصل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج صدیاں گذرنے کے بعد بھی لوگ اُنکے نام سے عقیدت رکھتے ہیں۔

مذھب

انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے ابتدائی آفرینش سے بنی نوع انسان نے جو طریقے آج تک اختیار کئے ہیں ان میں مذھب کو بڑی اھمیت حاصل ہے۔ مذھب کی وجہ سے انسان میں اتحاد اور ترقی کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ مذھب کے ذریعے انسان معراج پر پہنچتا ہے۔ اور اس کی عدم موجودگی میں پستی میں جا گرتا ہے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مذھب بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ جسے ھر شخص اپنی اپنی بصیرت کے مطابق دیکھتا ہے۔ اسی قبیل میں فرماتے ہیں۔

کوڙين عيائون، تنهن جون لکن لک هزار
جيئ سيکندن جيئ سين، درشن ڌاروں ڌار
پريم تنهنجا پار، ڪهڙا اچئي ڪهڙا چوان.

تیری عظمت و شان کی تعریف ھزاروں انسان لاکھوں طریقوں سے کرتے ہیں۔
ھر ایک نے تیرا دیدار مختلف طریقوں سے کیا ہے۔
اے میرے محبوب تیری نشانیوں کی تعریف کس کس طرح کروں۔

شاہ لطیف رح مذھب اسلام پر سختی سے پابند تھے۔ آپ کی پوری زندگی یاد الٰہی میں گذری۔ آپ کے حالات زندگی اور کلام سے ایسی کسی بھی بات کا اشارہ یا ذکر نہیں ملتا کہ آپ جسے دنیاداری میں پھنس کر غلط راہوں پر چلے گئے ہوں۔ آپ اپنے بزرگوں کے طرائق یعنی مسلک اہل سنت کے پیرو تھے اگرچہ آپ کے مذھبی خیالات پر کوئی اپنی طرف سے رائے قائم کرتا ہے تو یہ بعید از قیاس ہوگی۔ آخر شاہ صاحب کس بنا پر اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلنے سے گریز کرتے۔ جب کہ آپ نے اپنے والد حضرت سید حبیب شاہ کے ہاتھ پر بیعت فرمائی تھی۔ شاہ صاحب پر تحقیق کرنے والوں نے آپ کے مذھبی عقیدت کے متعلق کافی چھان بین کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ آپ سُنی العقیدہ تھے۔ اور عاشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ شاہ بھٹائی رح کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ اور قابل قدر وصف، جذبہ عشق رسول صلعم ہے۔ ذات رسالت مآب کے ساتھ عشق جنون کی حد تک تھا۔ آپ کے کلام میں جذبات کی شدت اور رقت طاری ہونے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ جس طریقے سے آپ نے حضور صلعم کا ذکر کیا ہے۔ اس کو پڑھنے سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ عشق رسول صلعم کے ذکر سے آپ کا پورا رسالہ بھرپور ہے۔ فرماتے ہیں۔

ڪئي نيڻ خمار مان، جان ڪيائون ناز نظر.
سورج شاھون جهڪيون ڪماڻو قمر.
تارا ڪتيون تائب ٿيا ڏيکيندي دلبر.
جڳ کو ٿيو جوهر، جانب جي جمال سين.

جب میرے محبوب نے اپنی خمار آلودہ نگاہوں کو اٹھا کر دیکھا۔ تو سورج نے اپنی روشنی بوجہ شرمندگی چھپالی اور چاند کی روشنی بھی مدھم پڑگئی۔
ستارے بھی میرے محبوب کو دیکھکر تائب ہوگئے۔ اس جہاں کا جوھر میرے محبوب کے حسن و جمال سے جھک گیا۔

دوسری جگہ اپنی عقیدت اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

وَحدَهٗ لاشريڪ لهٗ، جان تو چئين اين
تان مڃ محمدؐ ڪارڻي، نرتون منجهان نيه
تان تون وڃئون ڪين ناڻين سر پين کي.

ترجمہ

وَحْدَہٗ لاشریکَ لہٗ، اگر یہ کہتے ہو تو

اس جہان کو پیدا کرنے کا سبب محمدؐ سلم کو دل کی گہرائیوں سے مانِ

تو پھر تو کس طرح غیر کے آگے اپنا سر جھکائے گا۔

جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنے مخمور تھے، تو کیا، آپ حضورؐ کے ہر قول مبارک کے پیرو نہ ہونگے۔ حضور صلعم سے نسبت کی سبب آپ اصحاب کرام سے بھی بیحد محبت رکھتے تھے، اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

جوڙي جوڙ جهان جي، پاڻ ڪيائين پرواز.

حامي، هادي، هاشمي، سردارن سردار

سُنهي صحابن سڱ ۾، منجهه مسجد مٿيادار

چارئي چڱا چوڌار، هُئا، سڄڻ ڏي حبيب سين.

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس جہان کے جنجال کو پیدا کیا، اور اس پر خود پرواز کیا۔

یعنی، حامی، ھادی، ھاشمی، اور سرداروں کے سردار کو، دیا۔

آپ مسجد کے اندر اپنے اصحاب کے ساتھ بہت اچھے لگتے ہیں۔

چاروں اچھے دوست اپنے حبیب کے گرد رہتے تھے۔

طالب حق اور عاشق رسول کو حضور صلعم کے دوستوں سے محبت، ایمان کی نشانی سمجھتے ہیں، جس نے آپ کے دوستوں سے عداوت رکھی اُس کے ایمان میں خلل ہے کیوں کہ محبوب کے دوست بھی محبوب ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے اصحاب کی پیروی کرو، ارشاد ہے۔

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔

میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جنکی بھی پیروی کروگے تو ھدایات پاؤگے۔

قرآن حکیم کے بعد دوسرا درجہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت واحادیث کا ہے، آپ نے خدائی حقائق کو آشکار فرمایا، ورنہ شاید ربوبیت کے راز سے کبھی بھی پردہ نہ ہٹتا۔ ارشاد ربانی ہے۔

کنت کنزاً مخفیاً فاحبت ان اُعرف فخلقت الخلق لاعرف۔

"میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، خواہش ہوئی کہ اپنے آپ کو ظاہر کروں اسلئے میں نے مخلوق کو پیدا کیا"

حدیث میں آتا ہے کہ

"علیکم بسنتی وسنت الخلفاء الراشدین من بعدی۔"

"میرے طریقہ اور میرے خلفاء الراشدین کے طریقہ کی پیروی کرو۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مذھب کے متعلق مرزا قلیچ بیگ نے اپنی تصنیف "احوال شاہ عبداللطیف" میں لکھا ہے کہ شاہ صاحب کا مذھب کیا تھا یہ پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا تو بھی اُن کو پسند تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذھب کی معنیٰ ہی پیچیدگیوں سے پاک۔ مذھب تو رشد اور ھدایات کا واحد طریقہ ہے پھر اس میں پیچیدگی کا

۱۔ تیسیر الباری صحیح البخاری مترجم جناب مولانا مولوی وحید الزمان صاحب، ملک سراج الدین اینڈ سنز۔

۲۔ احوال شاہ عبداللطیف مرتب شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم

کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوفیوں کا مذہب تو "اظہر من الشمس" کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن کسی الجھن کی وجہ سے یہ ثابت کرتا ہے کہ شاہ صاحب کا مذہب صوفیانہ اور عام خاص کی سمجھ بالا ہے

مولانا دین محمد وفائی لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا مذہب صوفیانہ تھا۔ وہ نہ متعصب رنگ کے سخت گیر مذہبی تھے۔ اور نہ ہی مذہبی اصولوں سے بے پرواہ تھے۔ اور اس طرح لکھتے ہیں

"روایت ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی چاروں اصحاب اور پنج تن پاک کے ماننے والے تھے"

ڈاکٹر گربخشانی اس بات سے انکار نہیں کرتے۔ اپنی تصنیف مقدمہ الطیفی میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

روایت ہے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اپنے آباؤ اجداد کی طرح سنی مذہب کے تھے۔ لیکن بعض باتوں میں آپ کی روش شیعوں جیسی تھی۔ آل رسول صلعم سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ اپنے کلام میں حضرت علی کرم اللہ وجہ اور امام پاک کی طرف خاص اشارہ کئے ہیں۔ "سر کیڈارو" تو پورا کا پورا امامین کی شہادت کے ذکر سے بھرپور ہے۔

ڈاکٹر گربخشانی ھندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کو مذہب السلام کے عقائد سے اتنی واقفیت نہ تھی۔ کسی مسلمان کو امامین سے محبت رکھنے کی وجہ سے اُسے مذہب سے خارج سمجھا جائے یا اُسے اہل تشیع میں سے خیال کیا جائے یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ اہل تشیع کی طرح اہل سنت وجماعت کے یہاں بھی امامین صابرین کی محبت ایمان کا ایک رکن ہے۔ امامین صابرین، دین اسلام پر قربان ہوئے تھے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس عظیم سانحہ پر شہداء کربلا کا ذکر رنج وغم کے ساتھ کریں اور آنسو بہائیں۔ مگر ذکر اہلبیت افسوس کے ساتھ کرنا یا "سر کیڈارو" میں شہداء کربلا کا ذکر کرنا یا مرثیہ کہنے سے اُن کو شیعہ کہدینا غلط ہے شاہ صاحب عاشق رسول صلعم اور اصحابہ کرام کے سچے دل سے معترف تھے تحقیق کے مطابق شاہ بھٹائی نماز پنجگانہ اور تہجد پابندی سے ادا کرتے تھے۔ اور بکثرت وظیفہ پڑھتے تھے۔ آپ قائم الصوم تھے۔ سال بھر روزے رکھتے تھے تسبیح وتہلیل آپکا معمول تھا۔ یہ روایت ہے کہ قرآن پاک ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا تھا۔ جسے اکثر اوقات میں تلاوت فرماتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے نے بھی لکھا ہے کہ شاہ بھٹائی اہل تشیع سے تھے کیونکہ اُنہوں نے "سر کیڈارو" لکھا ہے۔ اور آخری عمر میں کربلا معلی جانے والے تھے۔ اور بڑہ بات یہ ہے کہ آپ کی اولاد اب تک شیعہ مسلک پر کاربند ہیں۔ ڈاکٹر سورلے نے ڈاکٹر گربخشانی کی تتبع میں یہ خیال آرائی کی ہے۔ سر کیڈارو کے متعلق علماء کے درمیان بڑی بحث چلی تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ یہ ابیات شاہ لطیف بھٹائی کی نہیں ہیں۔ علامہ آئی آئی۔ قاضی مرحوم نے تو اس سر کو اپنے تالیف کردہ رسالے سے نکال دیا ہے۔ عام طرح یہ کہا جاتا ہے کہ سر کیڈارو کے ابیات کسی اور شاعر کے ہیں۔ غالباً "احسان لانگاہ" نے لکھے ہیں۔ لیکن اس پر بڑی تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ "سر کیڈارو" شاہ صاحب کا کلام ہے ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کی رائے موجب یہ ابیات شاہ بھٹائی کے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر گربخشانی نے اپنی تحقیق کی بنیاد پر سر کیڈارو کو شاہ صاحب کا کلام تسلیم کرتے ہیں اور اُسے اپنے رسالہ میں شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ کربلا کے واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے۔

اس بحث پر سندھ کے فاضل ادیب مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سر کیڈارو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا کلام ہے۔ احسان لانگاہ کا کلام اپنی جگہ پر ہے اور شاہ صاحب کا کلام اپنی جگہ پر ہر ایک میں اپنی فکر کی علیحدہ ندرت موجود ہے۔ سر کیڈارو کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ شعر کی مشہور صنف کو کمال پر پہنچایا ہے بہادروں کا مقابلہ، جنگ کے میدان کا نظارا، شہیدوں کا انتظار، یہ وہ مناظر ہیں جن کو ہمارے مفکر شاعر نے اس سوز وگداز اور جوش سے بیان کیا ہے۔ کہ وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ احسان لانگاہ کا تخیل اس بلندی تک ہی پہنچ نہیں سکتا۔ عربی کا مشہور قول ہے۔

"خذما صفا ودع ما کدر" ہم نے صفائی کو لیا ہے، کدورت کو چھوڑ دیا ہے"

لطف اللطیف مرتب مولوی دین محمد وفائی مرحوم

مقدمہ لطیفی ڈاکٹر گربخشانی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ کے مرید :-

شاہ بھٹائی ؒ کے روحانی فیض نے پورے سندھ کو عموماً اور اُنکے ارادتمندوں کو خصوصاً آپنے رنگ میں رنگلیا تھا۔ ان میں سے اکثر مرید باکمال بزرگ و شاعر تھے جن کی سخن فہمی کی خوشبو سے پوری سندھ کی فضا معطر ہوگئی تھی۔ آپ کے مریدوں کا سلسلہ بہت طویل تھا، جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔

شروع جوانی کے زمانے میں آپ نے اپنا وقت سیر و سیاحت میں گذارا، وطن واپس ہونے کے بعد "بھٹ" کو آباد کیا۔ اسی وقت سے آپکے مریدوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ بھٹ شاہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد ہزاروں لوگ شاہ لطیف بھٹائی ؒ سے باطنی صفائی اور ظاہری پاکی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوجاتے تھے۔ اور فیض حاصل کرنے کے بعد آپ کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی نیا مرید آپ کے عقیدتمندوں میں داخل ہوجاتا تھا تو پہلے آپ اُن کو ایک مصلیٰ اور پانی کا کوزہ دیتے تھے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہتا تھا۔ اگر وہ شخص آپ کی کسوٹی پر مکمل طور پر پورا اُترتا تھا تب وہ مریدوں کے حلقے میں داخل ہوجاتا تھا۔ اس طرح آپ کا فیض عام ہوتا گیا۔ آپ ہمیشہ یہ تلقین فرماتے تھے۔ تھوڑا کھانا، کم سونا، کم بولنا، اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہنا، دوسروں سے بھلائی کا برتاؤ کرنا، ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنا۔

شروع میں مریدوں کو اپنے قادریہ کریمیہ طریقہ کے وظائف پڑھنے کی ہدایات فرماتے تھے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تھا، جو کہ آدھی رات کو مرید اُٹھ کر کیا کرتے تھے۔ وظیفہ کی ترتیب تھی، اللہ ہو، اللہ۔ اللہ۔ ہو۔ ہو۔ یہ وظیفہ آپ نے جد امجد حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی کا دیا ہوا تھا جو آپ نے بھی قائم رکھا تھا۔ کبھی بے خودی کے عالم میں مریدوں کی استدعا پر ان کو اس طرح تلقین فرماتے تھے: تاکہ اپنے دل کے آئینہ کو صاف کریں۔ ان میں خود بخود حسن ازلی یا نور الٰہی کی تجلی کا پرتو حاصل کرو گے۔ اللہ تعالیٰ جانتا اور دیکھتا ہے۔ اپنے بندے کی نیت سے واقف ہے اور وہ کبھی بھی ناامید نہیں لوٹاتا۔ اکثر مرید آپ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے جن کا ذکر اسطرح ہے۔

<u>محبت فقیر</u> :- آپ کے حلقۂ مریدی میں سب سے زیادہ قریب محبت فقیر تھے، جنہوں نے شاہ بھٹائی کی زندگی کو اچھی طرح دیکھا۔ وفات کے بعد شاہ صاحب کے کپڑے اور دیگر چیزیں ان کے پاس رہتی تھی، جن کو شاہ بھٹائی ؒ نے استعمال کیا تھا۔ شاہ صاحب کے سجادہ نشین کے مقرر کرنے اور اُن کو شاہ صاحب کی خلعت پہنانے کا شرف ان کو ہی نصیب ہوا۔

<u>مخدوم نور محمد وائی</u> :- وہ بزرگ تھے جو شاہ صاحب کے پہلے استاد تھے۔ جنہوں نے آپ کو شروع میں "الف۔ ب" پڑھائی تھی، جس سے شاہ بھٹائی نے "ب" کہنے سے انکار کیا تھا۔ یہ صاحب حال کے بھٹی بزرگوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جو وائی کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ جہاں سے ہجرت کرکے بھٹ شاہ میں سکونت اختیار کی تھی، اور شاہ صاحب کے ارادتمندوں میں شامل ہوگئے تھے۔ آپ کی اولاد میں سے ایک بزرگ میاں احمد وائی اپنے وقت کے بڑے صوفی اور عارف تھے۔

<u>اٹل اور چنچل</u> یہ دونوں مشہور ماہر موسیقی تھے جو دہلی شہر کے مشہور موسیقار کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور شاہ صاحب کے خاص مصاحبین کی حیثیت سے رہا کرتے تھے۔ یہ موسیقار ہندستان سے میاں نور محمد کلہوڑہ کے دربار کی تعریف سن کر آئے تھے لیکن شاہ بھٹائی ؒ کی صحبت میں رہکر ہمیشہ آپکے گرویدہ ہوگئے تھے۔ شاہ لطیف ؒ کے دربار میں سماع کی محفلیں جمتی رہیں۔ سندھی موسیقی کے ساتھ، ساتھ ہندی اور فارسی موسیقی کی جھلکیاں بھی پیش کرتے تھے جس کی وجہ سے شاہ بھٹائی ہندی موسیقی سے بہت متاثر ہوگئے تھے۔ شاہ لطیف بھٹائی ؒ کے رسالہ میں، ہندی موسیقی کے مطابق سر نظر آتے ہیں۔ جو یہ ہیں۔ سر سورٹھ، سر کلیان، سر یمن کلیان، سر حسینی، سر دیسی، سر بلاول وغیرہ ہندی موسیقی کی علم الاصنام کے موجب دیپک راگ ہے۔ اور سُر ملار بھی موجود ہے۔ شاہ صاحب ان دونوں موسیقار کی عزت کرتے تھے، یہ دونوں ہمیشہ شاہ لطیف بھٹائی ؒ کی خدمت میں رہتے تھے۔ اور شاہ صاحب کے آخری دم تک ساتھ دیا۔

لطف اللطیف مرتبہ مرحوم مولوی دین محمد وفائی صفحہ ۲۱۔

ایضاً " " "

۳۔ شرح اللطیفی مصنف مرحوم محمد بخش واصف۔

فقیر محمود شاہ :- فقیر محمود شاہ کا درجہ سب مریدوں میں افضل تھا۔ یہ درویش شاہ بھٹائی کے محبوب مریدوں میں سے تھے۔ وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے اپنی پوری ملکیت کو چھوڑ کر تارک الدنیا بن کر ایک کوزا پانی کا لے کر آپ کی مریدی میں شامل ہوگیا۔ شاہ بھٹائی کے دل میں اُن کے لئے بڑی عزت تھی۔ انہوں نے شاہ صاحب کی زندگی میں وفات کی تھی۔ جس پر شاہ صاحب کو بیحد صدمہ ہوا تھا۔ بھٹ شاہ میں اُنہیں دفن کیا گیا۔ شاہ صاحب نے وصیت فرمائی تھی۔ کہ میری لحد درویش محمود شاہ کے پاؤں کی طرف کریں۔

میاں محمد عالم شاہ :- یہ درویش شاہ بھٹائی کی والدہ صاحبہ کا بھتیجا تھا۔ اور شاہ صاحب کو بیحد عزیز تھا۔ شاہ بھٹائی ہمیشہ اُن کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ شاہ بھٹائی کی وفات کے بعد مسند نشین کا سوال پیدا ہوا تو اُس نے بھی سید جمال شاہ کی سجادہ نشینی پر دیگر سیدوں کی طرح مخالفت کی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کو بہت تکلیفیں دی گئی تھی۔

دریو فقیر :- دریو فقیر اپنی ظرافت کی وجہ سے مشہور تھے۔ شاہ صاحب نے دریو فقیر کا ذکر اپنے کلام "سر بلاول" میں کیا ہے۔ یہ ایک سیلانی شخص تھا۔ کبھی کبھی آپ کی بارگاہ سے مہینوں غائب رہتے تھے۔ پھر گھوم پھر کر یکایک مرشد کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تھے۔

شاہ صاحب کے مریدوں میں، جن کو آپ کی صحبت سے بڑا فیض حاصل ہوا تھا۔ اور شاہ صاحب کے کلام سے متاثر ہوئے، جن کا کلام ہمیں دستیاب ہو سکا ہے وہ تھے تمر فقیر - صالح فقیر - اور عنایت اللہ جوڈھو فقیر وغیرہ۔

تمر فقیر :-

شاہ صاحب کے مریدوں میں تمر فقیر کو بڑا رتبہ حاصل ہوا۔ جنہیں آج تک لوگ یاد کرتے ہیں۔ افسوس کہ اس عبادت گذار اور پاکباز شخصیت کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات معلوم ہو نہیں سکی۔ آن کی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ معلومات حاصل نہیں ہو سکی۔ بڑی تلاش کے بعد بھی آپ کے والدین کے ناموں کا کوئی سراغ مل نہ سکا۔

نواز فقیر سے روایت ہے کہ تمر فقیر اپنی والدہ کے بطن میں تھے، تو اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی والدہ اپنے دیور محبت فقیر سالاری اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ جانے سے پہلے شاہ بھٹائی ؒ کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوئے۔ شاہ صاحب نے ان کی دعا خیر کی اور ارشاد کیا۔ "آپ کے یہاں بیٹا تولد ہوگا جو بڑا نیک اور صالح ہوگا۔" جب یہ جماعت حج کرنے کے بعد مدینہ منورہ پہنچی تو اس حاملہ عورت نے فدک کے باغ میں ایک نخل کے درخت کے نیچے فرزند کو جنم دیا، جسکا نام علی رکھا، لیکن ان کو تمر کے نام سے پکارا گیا۔ تمر کی معنیٰ کھجور ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد جب وطن واپس لوٹے تب اس یتیم بچہ کو شاہ بھٹائی ؒ کی خدمت میں پیش کیا اور اسطرح وہ بچہ شاہ بھٹائی کے مریدوں میں داخل ہوئے اور دائمی رفاقت اختیار کرلی۔ اس معصوم بچہ نے شاہ صاحب کی خدمت اور صحبت میں رہ کر روحانیت کے مقامات طے کرلئے۔ ان کو شاہ صاحب کا کلام یاد تھا۔ جسے بڑی خوش الحانی سے گاتے تھے۔ شاہ بھٹائی ؒ اُن کو بڑی شفقت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ علامہ مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ نے ان کے کمال محویت کی ایک عجیب مثال بیان فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب نے تمر فقیر سے کہا میں چھپ جاتا ہوں، تو مجھے تلاش کرو۔ اتنے میں شاہ صاحب نظر سے غائب ہوگئے۔ تمر فقیر نے کائنات کے ہر کونے میں ڈھونڈا۔ آخر کار شاہ صاحب کو اعلیٰ علیین میں پایا۔ شاہ صاحب نے تمر فقیر سے کہا اب تو چھپ جا اور میں تجھے ڈھونڈوں جب وہ چھپا، تو شاہ بھٹائی نے ارض وسما کے اطراف کی تلاش کی۔ مگر کہیں بھی نظر نہ آئے، آخر شاہ صاحب تھک گئے۔ تب تمر فقیر آپ کے سر مبارک کے بالوں میں سے جوں کی صورت میں ظاہر ہوکر آپ کے قدموں پر گر کر معذرت کی۔ شاہ صاحب نے اُسے کہا۔ تو، تو مجھ میں چھپا تھا؟ تمر فقیر نے جواب دیا قبلہ آپ کے بغیر میرے لئے دوسری جگہ کہاں ہوگی۔

تمر فقیر مقالہ نگار علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم رسالہ نئیں زندگی ماہ نومبر ۱۹۵۵ع

تمر فقیر ابھی جوانی میں قدم رکھا تھا تو شاہ بھٹائی نے رحلت فرمائی ۔ شاہ صاحب نے وفات سے پہلے ایک بزرگ مخدوم محکم الدین سیلانی سے تمر فقیر کے لئے سفارش کی تھی جو ایک جلیل القدر اولیاء اور وجد و حال صوفی تھے ۔ شاہ بھٹائی نے فرمایا ، میری وفات کے بعد تمر فقیر کو صوفیانہ اسرار و رموز سے بہرہ ور کریں ۔

تمر فقیر بڑے اہل دل درویش تھے ، ہمیشہ درگاہ میں رہکر فقیروں کی خدمت کرتے تھے ۔ مسجد کی خدمت کے ساتھ پیش امام بھی تھے ۔ اپنے چچا محبت فقیر سالاری کی وفات کے بعد سید جمال شاہ سجادہ نشین کے کچھ وقت کے لئے خلیفہ بنے ، لیکن اکثر مریدوں کو تمر فقیر کی طرف رجوع دیکھکر سید جمال شاہ کے دل میں اس بات کا خدشہ رہتا تھا ، کہ کہیں تمر فقیر آگے نہ نکل جائیں ۔ لیکن تمر فقیر تو اپنے مرشد کی طرح فقیر و تارک الدنیا تھے ، مرشد کے جانشین کو ناراض کرنے کے بجائے اس میں بہتری سمجھی کہ "بھٹ شاہ" کو چھوڑ کر خاموشی سے چند رفیقوں کے ساتھ "کچھ بھج" کی طرف جاکر سکونت اختیار کی ۔

کچھ کی طرف جاتے ہوئے ، پہلی منزل دائرہ شریف (اڈیرو لعل) کے سیدوں کے یہاں ہوئی ، جہاں اپنے مرشد و آقا حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا قلمی نسخہ "گنج" بطور امانت چھوڑا ۔ کچھ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ان کی کرامتوں کو دیکھکر بڑی تعداد میں لوگ آکر مرید ہوئے ۔ خاص طور پر وہاں کا راجہ گھن راء جو بغیر اولاد تھے ، تمر فقیر کی دعا سے اُن کو اولاد نرینہ ہوئی ۔ روایت ہے جب اُن کی وفات کا وقت قریب ہوا تو ، ایک تیز رفتار اُونٹ پر سوار ہوکر "بھٹ شاہ" کو روانہ ہوئے ۔ لیکن بھٹ شاہ کے قریب راہ میں وفات پاگئے ان کی میت کو لاکر شاہ بھٹائی کی مزار کے جنوب میں ~~طرف~~ دفنایا گیا ۔ مزار پر یہ کتبہ لکھا ہوا ہے :۔

هوالباقی

وصال مرحوم مغفور میان

زنغلی اللسطیغ تمر شد سمر علیه الرحمت ۔

بقول علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم ، اس مصرعہ کو صحیح طور اس طرح پڑھا جائے گا "زنغل الطیفی تمر شد شمر" تمر فقیر ایک قادر الکلام شاعر تھے ۔ شاہ صاحب کا روحانی فیضان براہ راست اُن تک پہنچا تھا ، اس لئے کلام میں بھی سوز و گداز افراط سے موجود ہے جس کی ایک مثال یہ ہے ۔

منهنجو من منجهائيو، جتن جي جمال

وڌو سور سرير ۾، ڪيڇين جي ڪمال

هوت نه پائي حال، ميتَ نه ٿيا معذور جا .

جتوں کے جمال نے میرے قلب میں خلش پیدا کردی ہے ،

کیچ والوں کے کمال نے میرے تن و بدن میں درد بھر دیا ہے

وہ ہوت میرے حال جانے نہ ہوئے ، اور اس لاچار و مجبور کے عزیز بن نہ سکے ۔

__صالح فقیر__ :۔ صالح فقیر کا شاہ صاحب کے ارادتمندوں میں خاص رتبہ تھا ۔ فقیر صالح بھی شاعر تھے ۔ ان کے کلام کا کوئی علیحدہ مجموعہ نہیں ہے ، لیکن جزوی کلام شاہ صاحب کے رسالے میں موجود ہے ، جو شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے ترتیب دیا ہے ۔ سر حضاسری میں کچھ ابیات موجود ہیں ، جن میں فقیر صاحب نے اپنے مرشد کی دل کھول کر تعریف کی ہے ۔ یہ بیت ان سے منسوب ہے جس سے ان کے کلام کی پختگی اور روانی معلوم ہوتی ہے :۔

مَنھن ماروئڙن جي، عمر ھيءَ اماڻ

تون حاکم، حکومت ٻي پورا کر نه پاڻ

پوندءِ ڪم ڪريم سان، تون هت نه هوندين ماڻ

ٻ سوار سڄاڻ، ڪي بنديائي بند مان .

تذکرہ لطفی مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی ۔ جلد اول صفحہ ۵۸۷ ۔

مہر بادشاہ مجھے ماروئں کی جھونپڑی میں واپس بھیجدیں ،

تو حاکم ہے ، اپنی حکومت پر ، اتنا نازاں نہ ہو ۔

آخر اس کریم سے تیرا کام ہوگا ، تو ہمیشہ یہاں نہ رہےگا ۔

کچھ عقل سے کام لے ، اس قید میں پڑی ہوئی کو نجات دے ۔

یہ باکمال شخصیت ، شاہ لطیف کے مریدوں میں سے تھے ، فقیر صاحب کا اسم گرامی عزت کا مستحق ہے ۔ ان کے والد کا نام میاں پیر محمد چوڈھو تھا ، مرحوم مرزا قلیچ بیگ اور ڈاکٹر گربخشانی نے اُن کا نام جانی ڈیرو لکھا ہے ، لیکن اُن کے کلام کے جامع عبداللہ خان نے پیر محمد چوڈھو لکھا ہے ۔ مذکور کتاب سنہ ۱۸۹۲ء میں سکھر کے ایک مشہور کتب فروش ھریسنگھ نے شایع کی تھی ، فقیر عنایت اللہ کے کلام کا موضوع مرشد کی تعریف ہے بعض ابیات میں اتنا غلو نظر آتا ہے ، جو وہ ناقابل برداشت بن جاتے ہیں ، بعض کو ساری کائنات سمجھ کر کہتا ہے :

احمد ، اللہ ، لطیف مکو ہا ڈیج ھیک ۔

احمد اللہ ، لطیف ، مکہ کو ایک ہی سمجھیں ۔

عشق کے اس عجیب انداز اور منفرد مقام سے الگ ، آپ کے کلام میں ناصحانہ رنگ موجود ہے ، جو کہ بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے ، مثال ہے ۔

ماڻ مونتي حق ٿيو ، پھچڻ پنھون ڏس

ڏونگر من ڏکي کي ، ڏس پرباه جو ڏس

من طلب شڏيا ، جڏ وجد ، گڏان انھي گس

آريءَ عنايت چئي ، لوڙي آه لهندي

اتي نا رسنديس ، جيڏيون پنھنجي جت ريءَ ۔

میرا محبوب کی طرف چلنا واجب ہے میرے یہاں پہنچنا پنھوں کے بس میں ہے ، اے پہاڑ اس دکھی کو اپنے دوست کا کھوج تو نشان بتا دے

جس چیز کی طلب کی جاتی ہے ، وہ مل جاتی ہے ، اس کی راہ پر چل رہی ہوں ، عنایت کہتا ہے میں اپنے محبوب کو ڈھونڈھ کر حاصل کرونگی ۔

میں یہاں اپنے حبیب کے بغیر اے میری ہم جھولیاں رہ نہیں سکتی ۔

شاہ لطیف بھٹائی کے رسالہ میں ایسے شعراء کا کلام ملتا ہے جو اُس دور کے اچھے شاعر تھے ، لیکن ان کے حالات زندگی کا پتہ نہیں جو گوشہ گمنامی میں ہیں ۔ اور کلام دستبرد زمانہ سے ضائع ہوگیا ہے ۔ نہایت قلیل انداز میں اُن کا کلام شاہ بھٹائی رحہ کے قدیم رسالوں میں موجود ہے ۔ جن کے اسماء گرامی یہ ہیں

شیخ بکھرائی ، قطب فقیر ، سید بلاول شاہ ، بڈھو فقیر ، قاسم فقیر ، لطف اللہ فقیر ، لکو جونیجو ، حبیب فقیر ، کون فقیر ، منگیل فقیر اور سید شاہ حسین

اس کے علاوہ شاہ بھٹائی کے بہت سے مرید تھے جو آپ کی گرد رہکر خدا کی مخلوق کی خدمت کرتے تھے ، جن میں ، میاں عبدالواسع ، اسماعیل فقیر ، احمد سمہ ، عنایت وسائی ، عبدالجلیل ، اس فقیر کے ذمے مہمانوں کے انتظام کا بندوبست کرنا تھا ، و سیو فقیر ، رحموں فقیر ، عارف کمبو ، ان کے ذمے یہ تھا کہ جب کوئی نیا مرید آجاتا تھا ، اُسکو نماز اور دوسرے ظاہری اسلامی عقائد بتادیں ۔ عرس فقیر کو شاہ بھٹائی رحہ کا پورا کلام یاد تھا ، جسے وہ بہت خوش الحانی سے گاتا تھا ۔

حصۂ دوم

باب اوّل

اسلامی تصوف

(تصوف کی تاریخ)

اسلام میں تصوف کی تاریخ بڑی طویل ہے۔ جن کے سمجھنے کے لئے اہلِ فکر کا ایک بڑا گروہ صدیوں سے اس کے مسائل پر غور وفکر کرتا چلا آرہا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اسلام کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ظاہری اور باطنی زندگی میں یکسانیت ہو۔ ذکر اور عمل کی حد قائم ہو۔ وہ ایمان اور عمل دونوں کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ فکر اور عمل کی اس تحریک نے اسلام میں تصوف کی بنیاد رکھی۔

تصوف خود عہدِ رسالت اور اصحابِ اکرام کے زمانے میں موجود تھا۔ اگرچہ اس کا نام یہ نہ تھا۔ نہ ہی اس کی صورت و شکل یہ تھی۔ جو کہ دو صدیوں کے بعد مرتب ہوئی لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اوائل اسلامی دور میں وہ کس صورت میں موجود تھا۔ اس لئے سب سے پہلے اس بابرکت و مقدس ہستی کا ذکر کرنا ہے جن کی ذاتِ گرامی دینِ اسلام اور اس جہان کے وجود میں آنے کا سبب بنی۔ آپ کی مقدس حیات میں دینِ اسلام کا آغاز اور اس کی تکمیل ہوئی۔ اس لئے تصوف کی بنیادی صورت کسی نہ کسی طرح عملی طور پر آپ کی حیاتِ مبارک میں موجود تھی۔

نبوت سے قبل مکہ معظمہ میں اکثر شہر سے دور، دنیاوی شور وغل سے نکل کر غارِ حرا میں تنہا یادِ الٰہی اور قدرتِ خداوندی پر غور وفکر میں مشغول رہتے تھے۔ اس طرح آپ کی پاکیزہ زندگی کے چالیس سال طے ہو چکے۔ ایک روز حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ سے کہا پڑھ! اس طرح تین مرتبہ کہنے کے بعد کہا[1]

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ

"پڑھ اللہ کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو گوشت اور جمے ہوئے خون سے۔ پڑھو! تمہارا رب تو بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم دیا۔ اس نے انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جو سب سے پہلے وحی کے ذریعہ اس وقت اُتریں جب آنحضرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں تشریف فرما تھے۔ ان آیاتِ کریمہ سے دینِ اسلام کو بڑی تقویت سب سے پہلے ملی۔ منصبِ نبوت پر فائز ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کبھی استغراق کی کیفیت[2] رہتی تھی۔ مروی ہے[3] ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس وقت آپ پر استغراق کی کیفیت طاری تھی آپ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دیکھکر فرمایا تو کون ہو؟

عائشہ

عائشہ کون؟

ابوبکرؓ کی بیٹی

---

1. آسان تفسیر تیسواں پارہ قرآن پاک ابو سلیم محمد عبد الحی صفحہ ۳۸۲۔ شایع کردہ مکتبہ الحسنات رامپور (یوپی)
2. اسلامی تصوف اور اقبال مصنف ابو سعید نور الدین صفحہ ۵۴
3. تاریخ تصوف اسلام مصنف مصطفیٰ حلیمی پاشا مترجم رئیس احمد جعفری صفحہ ۲۱

ابوبکر کون ؟

محمدؐ صلعم کے دوست

محمدؐ کون ؟

اس کے جواب میں حضرت عائشہ رضہ خاموش ہوگئیں، اور سمجھ گئیں کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور حالت میں ہیں، آپ پر کوئی خاص کیفیت طاری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کے علاوہ ہم اگر آپ کے اصحاب کرام رضہ کی حیات پر نگاہ ڈالینگے تو ہمیں ان کے اقوال و اعمال میں بھی تصوف کی حقیقت نظر آئیگی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضہ آنحضرت کے سچے دوست تھے، اور پہلے خلیفۃ المسلمین ہوئے آپ کی زندگی، صدق، تقویٰ اور زہد میں گذری، آپ کے ایثار کی مثال دنیا، اب تک پیش کر نہ سکی۔ جب جنگ تبوک کے موقع پر آنحضرت صلعم نے امداد کے لئے امر فرمایا، تو اس اعلان سے تمام مسلمان اپنی مرضی کے مطابق مال وجنس لائے، لیکن آپ نے گھر میں جو کچھ تھا، سب لاکر آنحضرت صلعم کی خدمت میں پیش کیا، حضور صلعم نے پوچھا، اہل وعیال کے لئے کیا چھوڑا، جواب دیا اللہ اور اس کا رسولؐ، اُن کے لئے کافی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور محبت میں محو رہتے تھے، مشاغل دنیاوی نے کبھی اس کی محبت میں فرق آنے نہ دیا، جو شخص معرفت الہیٰ میں مست اور ان کی محبت کا مزا چکھ لیتا ہے، تو وہ دنیا سے کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ یہ ہی تصوف کی سب سے بڑی علامت ہے۔ حضرت عمر فاروق رضہ، حضرت ابوبکر رضہ کے وصال کے بعد دوسرے خلیفۃ المسلمین منتخب ہوئے، اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی، آپ سادہ زندگی کو بہت پسند فرماتے تھے، خلافت کے فرض پر فائز ہونے کے بعد تو آپ کی زندگی میں اور بھی سادگی آگئی تھی، مقررہ وظیفہ سے زائد کبھی نہ لیا، کپڑے پھٹ جاتے تھے، تو ان میں پیوند لگاتے تھے، آپ ہمیشہ دنیا سے بیزاری کرتے تھے۔

حضرت عثمان غنی ذی النورین رضہ حضرت فاروق رضہ کی شہادت کے بعد خلیفۃ المسلمین ہوئے، آپ صبر و حیاء کے مجسمہ تھے، بڑے بڑے مصائب میں بھی صبر و شکیب میں رہے، آپ کو جام شہادت نصیب ہوئی آپ کو قرآن پاک سے بیحد محبت تھی، شہادت کے وقت آپ قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ تھے، آپ کی زندگی کے مختلف پہلو سے ہمیں تصوف کی بنیادی حقائق معلوم ہوتے ہیں بلکہ صوفیائے کرام کے اکثر سلسلے آپ پر ختم ہوتے ہیں۔ آپ بڑے عالم تھے، دین کا فہم قدرت کی طرف سے آپ کو عطا ہوا تھا، آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا تھا

" انا مدینۃ العلم و علی بابہا " "میں علم کا شہر ہوں اور علی رضہ اس کا دروازہ ہے"

حضرت ابن عباس رضہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا، کہ آپ برادر عمزادہ کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ جواب دیا میرے اور ان کے علم میں وہی نسبت ہے جو بارش کے ایک قطرہ کو بحر بیکراں سے ہوتی ہے۔ [1] ابن ابی الحدید نے ایک جگہ لکھا ہے۔

طریقت، حقیقت اور احوال تصوف بھی علم ہی کی اقسام میں داخل ہے۔ اس فن میں درک رکھنے والے ہر اسلامی ملک میں پائے جاتے ہیں، ان سب کا سلسلہ حضرت علی رضہ پر جاکر ختم ہوجاتا ہے۔ اس کی تصریح شبلی، حضرت جنید بغدادی، حضرت سری سقطی حضرت بایزید بسطامی اور کرخی نے کی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس علم سے تعلق رکھنے والوں کا آج تک یہی شعار ہے، کہ وہ اس کو سنداً متواتر حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچاتے ہیں

حضرت امام محمدؒ غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے تصوف کی حقیقت کا بیان اور خلاصہ اس طرح کیا ہے، کہ تصوف شریعت میں بخلاف اُسکے عمل کے بعد علم پیدا ہوتا ہے فرماتے ہیں

---

[1] حضرت علی شخصیت اور کردار مصنف عباس محمود العقاد مترجم منہاج الدین اصلاحی صفحہ ۶۱۔

انسان کو اشیاء کا جو ادراک ہوتا ہے، اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ اقتباس استدلال تعلیم سے حاصل ہوتا ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غور وفکر کے بغیر ایک چیز کا ادراک ہوتا ہے، اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں سے ہوا، جس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان پہلے تمام دنیاوی تعلقات سے کنارہ کش ہو جائے، یعنی اولاد، اہل عیال دوست و احباب، دولت و ملکیت کسی چیز سے واسطہ نہ ہو اور ایک گوشہ میں بیٹھکر خدا تعالیٰ کی طرف، اس طرح متوجہ ہوکر کسی چیز کا دل میں خیال نہ آئے، اُس کے ساتھ زبان سے اللہ، اللہ کہنا چاہئے، رفتہ رفتہ یہ مشق اس قدر بڑھ کر زبان کو حرکت نہ ہو، اور تصور میں زبان سے اللہ تعالیٰ کا لفظ نکلتا جائے، پھر یہ تصور اس حد تک پہنچے کہ صرف حرف اور اس کی صورت کا خیال جاتا رہے اور اللہ تعالیٰ کا تصور دل میں اس طرح اثر کر جائے کہ کسی وقت بھی جدا نہ ہونے پائے، جب یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو مکاشفہ شروع ہوگا، ابتدا میں برق خاطف کی طرح نکل جائے گا آہستہ آہستہ ترقی ہوتی جائے گی اور اثبات ودوام حاصل ہوگا۔[1]

اسلام کی دو حیثیتیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی، ظاہری حیثیت کا تعلق عمل اور حکم پر ہے اور باطنی کا نیکی اور طاعت پر، جو دل میں معنوی کیفیت جگاتی ہے، اُسی باطنی حیثیت کو عمل اور حکم سے وابستگی ہوتی ہے، جو اصحاب کرام میں 'احسان' کے نام سے مشہور ہوا۔ آگے چل کر تصوف کے نام سے موسوم ہوا۔ تصوف کے لغوی معنیٰ پشم کا لباس پہننا ہے کیونکہ یہ ماخوذ ہے صوف (بضم صاد) سے جس کی معنیٰ اُون اور پشم کی ہے، حضرت امام ابو القاسم عبد الکریم القشیری رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے۔[2]

خبر نہیں کہ صوفی کس طرح بنا، کیونکہ قیاس اور لغت کے لحاظ سے اس کے اشتقاق کا قاعدہ نہیں ملتا، میری رائے یہ ہے کہ صوفی لفظ صوف "پشم" سے نکلا ہوا ہے، کیونکہ فرقہ (گروہ) کے افراد عام لوگوں کے خلاف اچھے کپڑے پہننے کے بجائے سادی اُونی کپڑے پہنتے تھے۔

ایک صوفی سے روایت[3] ہے کہ میں حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس گیا، تھوڑی دیر میں ایک اور شخص آکر بیٹھ گیا، اس وقت حضرت جنید بغدادیؒ خاموشی سے سر نیچے جھکائے ہوئے تھے، اس شخص نے سانس لی اور الا اللہ الا اللہ کہا۔ اس پر حضرت جنیدؒ نے غصے سے اس شخص کی طرف دیکھا اور فرمایا، اے شخص! یا تو، تو اُدھر موجود ہے یا میرے پاس، اگر تو وہاں ہے تو تیرا الا اللہ کہنا بے حرمتی ہے کیونکہ جو شخص اپنے محبوب کے پاس موجود ہو، جس کا وہ ذکر کر رہا ہے، تو واصل ہونے کی صورت ذکر کا کوئی مطلب نہیں، اور اگر تو ہمارے پاس ہے تو تیرا یہ قول غیبت ہے اس لئے کہ تو نے غائب کا ذکر کیا ہے، اس پر کسی نے سوال کیا، تصوف کیا ہے؟ فرمایا، تصوف یہ ہے کہ تو مخلوق کے ساتھ بغیر نفس کے زندگی گزار اور اللہ کے ساتھ دل سے کسی صوفی سے دریافت کیا گیا کہ صوفی کا کیا مطلب ہے؟ جواب دیا:

صوفی میں چار حرف ہیں، اور ہر حرف میں اشارہ پایا جاتا ہے چنانچہ "ص" سے مراد صوفی کی سیر مع اللہ ہے جو اللہ کے ساتھ مجالست کے ذریعہ سے ہوتی ہے نیز یہ اللہ کی طرف کان کا لگاتا ہے، اور اللہ کی طرف سے آنے والی باتوں کو سمجھتا ہے، اپنے تمام ارادوں کو اللہ پر وقف کر دیتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی کے ساتھ وجد کی قوت ہے، اس لئے کہا جاتا ہے[4]

ما صبر حتی یعجز الصبر من صبری واتلف من طول الاقامۃ فی صدری
مخافۃ ان یشکو ضمیری صبابتی الی دمعتی سراً فتجری ولا ادری

---

1. کیمیائے سعادت امام غزالی صفحہ ۳۹۔
2. الرسائل القشیریہ، تالیف حضرت ابی القاسم عبد الکریم بن هوازن القشیری
3. رسالہ صوفی
4. الرسائل القشیریہ تالیف ابی القاسم عبد الکریم بن هوزان القشیری فصل ۵ صفحہ ۵۷

میں اس قدر صبر کروں گا کہ صبر بھی میرے سے عاجز آجائے گا اور

سینہ میں اسکے قیام کی زیادتی سے میں ہلاک ہو جاؤں گا۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:-[1]

تصوف کثرت صوم وصلوٰۃ کا نام نہیں ہے، بلکہ تصوف سینہ کی سلامتی اور نفس کی سخاوت کا نام ہے۔

علامہ ابن خلدون نے اپنی کتاب مقدمہ ابن خلدون میں علم تصوف پر بحث کی ہے۔ امام ابوالقاسم القشیریؒ سے لفظ صوفی کے متعلق اس طرح نقل کرتے ہیں

"کسی بھی قیاس اور مشاہدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام لغت عربی سے لیا ہوا ہے ظاہرتا میں ایک لقب ہے جس کو

لفظ "صفا" سے لیا ہے، تو کسی نے لفظ صفت سے مشتق بتایا ہے، یہ سب قیاس علم لغت کے اعتبار سے گرے ہوئے ہیں اور یہ عام

قیاس کیا جاتا ہے کہ لفظ "صوف" یعنی اونی کپڑے سے لیا ہے جو کہ درست نہیں ہے، کیونکہ صوفیوں کے کپڑوں میں صوف کی کوئی خصوصیت نہ تھی"

بعض علماء نے لفظ صوفی کو صفا اور اصلاح سے صفائی سے مشتق خیال کیا ہے یعنی صوفی وہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے صفائی قلب سے نوازا ہے اور

قلب کی صفائی اور اصلاح سے ظاہر ہے کہ سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور تمام اعمال درست ہو جاتے ہیں یعنی:

"ان الصفا صفۃ الصدیق ان اردت صوفیا علی التحقیق"

(صفا صدیق کا وصف ہے اگر صوفی واقعی صوفی ہو)

بعض علماء کی رائے ہے کہ صوفی لفظ "صف" سے مشتق ہے یعنی صوفیہ حضور حق ہیں، اپنے قلوب کے ساتھ صف اول میں حاضر ہوئے تھے یہاں پر معنی

کے لحاظ سے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن لغت کے اعتبار سے "صف" کی طرف نسبت ہو تو صفی حاصل ہوگا نہ کہ صوفی:

اصحاب صفہ وہ لوگ تھے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب بندے تھے، انہوں نے اپنی جانیں راہ خدا میں سونپ دی تھیں، اہل عیال

زن وفرزند، مال ودولت اور گھر بار سب کو خیرباد کہہ کر آنحضرت صلعم کے دامن میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ آنحضرت صلعم نے ان کے لئے مسجد نبوی

کے پاس ایک چبوترہ بنوا دیا تھا، جس کو عربی میں صفہ کہتے ہیں، یہ لوگ اس صفہ پر رہ کر شب وروز غربت وتنگدستی کی حالت

میں عبادت، ریاضت اور مجاہدہ نفس میں گذارتے تھے، ان کو اپنی زندگی میں دو کپڑے کبھی نصیب نہ ہوئے۔ صرف ایک کپڑے سے بدن

کو ڈھانپ لیتے تھے[2]

سید سادات الحسینی ملتان جو سہروردی طریقہ کے ایک نامور شیخ گذرے ہیں اپنی تصنیف "کنز الرموز" میں لکھتے ہیں

علم تحقیق از دل آگاہ گیر   شارع شرع حبیب اللہ گیر،

چون کلیم اللہ درین رہ شوف باصفائی سرفرد، پوشیدہ صوف۔

حقیقت کا علم دل سے حاصل کر اور شریعت کی راہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر

اس راہ میں کلیم اللہ (حضرت موسیٰؑ) کی طرح چلتا رہ اور صفائی کے ساتھ اپنی پوشیدگی کو اونی کپڑے سے ڈھانپ۔"

"اصحاب صفہ" جسکا ذکر اوپر آچکا ہے، جو کہ ایک اونی کپڑے میں زندگی بسر کرتے تھے (جن کی تعداد ستر بتائی جاتی ہے)۔ صوفیہ کو بھی انہی اوصاف کی

بنا پر اہل صفہ کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، مگر لفظ صوفی کو "صفہ" سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ حضور صلعم کے دور مبارک سے خیرالقرون کے زمانے تک

---

[1] الرسائل القشیریہ تالیف ابی القاسم عبدالکریم بن ہوزان القشیری فصل ۵ صفحہ ۵۲

[2] مقدمہ ابن خلدون مولفہ حضرت علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون المغربی۔ مترجم مولانا سعد حسن خان یوسفی صفحہ ۴۸۶ فصل ۱۱۔

یعنی ایک سو ہجری تک لفظ صوفی کا استعمال نہ ہوا۔ عبادت گذار عارف کو عابد اور زاہد کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک رائے کے مطابق تصوف کا لفظ "سین" سے تھا اور اس کا مادہ "سوف" تھا جس کی یونانی میں معنی حکمت نکلتی ہے۔ دوسری صدی ہجری میں جب یونانی کتابیں عربی زبان میں لکھی گئیں تو یہ لفظ سوفی یعنی حکیم لکھنا شروع ہوا رفتہ رفتہ سوفی سے صوفی ہو گیا[1] بہرحال اصطلاح میں اس سے مراد ہے خواہش نفسانی سے پاک ہونا۔ چنانچہ ان صفات کے لوگ کے اعمال و افعال کو مجازاً تصوف کہنے لگے۔ تصوف کی تعریف ہے "التخلق باخلاق الالٰھیہ" یعنی خدائی اخلاق اپنے اندر پیدا کرنا۔ خرقہ تصوف وہ ہے جو مرید اپنے شیخ کے ہاتھوں سے پہنتا ہے۔ جبکی ارادت کے حلقہ میں داخل ہوتا ہے، اور اُسکے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے اور تقوےٰ کا لباس پہنتا ہے۔ فرمود ربانی ہے

"ولباس التقویٰ ذالک خیر"

"تقوےٰ کا لباس اچھا ہے"

تصوف سے مراد ہے کہ ظاہر میں ادب شرعیہ کی ایسی پابندی اختیار کی جائے کہ اسکا حکم باطن سے ظاہر میں بھی پایا جائے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں پابندیوں کو اختیار کرنے والے کو کمال حاصل ہو جائے۔ بعض کہتے ہیں تصوف روحانیت پیدا کرتا ہے اور علوم حقیقت سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی[2] نے فرمایا ہے[3] "شریعت را سہ جزو است علم و عمل و اخلاق"۔ شریعت کے تین جز ہیں، علم، عمل اور اخلاق تصوف علم باطن ہے جس کو علم لدنی، کشف، علم غیب کہتے ہیں۔ یہ علم انبیائے علیہ السلام میں نہایت کامل اور فطری ہوتا ہے۔ جو مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہیں۔ لیکن اولیاء کرام کو ریاضت اور مجاہدات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جسکی تشریح اکثر صوفیائے کرام کی کتابوں میں ملتی ہے۔

تصوف کی ارتقائی منازل پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں اہل کمال کے ایک گروہ میں اس قسم کا رجحان پیدا ہوا جو شریعت کی پابندی کے ساتھ باطنی نشو نما کو بھی حاصل کر سکیں[3]۔ اس گروہ میں امام غزالی[2]، حضرت حسن بصری[4]، حضرت سفیان ثوری[2] اور حضرت بی بی رابعہ بصری[8] بلند مقام کے حامل تھے۔ ان صوفیوں پر علم کی طلب زیادہ غالب نہ تھی، مگر تقدس، دنیا سے بے تعلق اور خدا تعالیٰ اور رسول اکرم صلعم سے محبت بے پناہ تھی، ان بزرگوں کے خلوص اور محبت کے جذب کو دیکھکر عوام دن بہ دن ان کی طرف رجوع ہونے گئے۔

تیسری صدی ہجری میں صوفیائے کرام کا دوسرا گروہ پیدا ہوا جس میں حضرت ذوالنون مصری[7]، حضرت بایزید بسطامی[8]، حضرت جنید بغدادی اور منصور حلاج یہ وہ صوفی تھے، جنہوں نے تصوف میں حقیقی فکر اور اجتہاد کو قائم رکھا، حضرت جنید بغدادی[2] حقیقی معنی میں صوفیوں کے سردار تھے، اور آپ کو "سید الطائفہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت جنید بغدادی کا قول ہے کہ ہمارا علم تصوف سنت کے اندر قید ہے، لیکن اس وقت کے صوفیوں کی تحریک میں کچھ ایسی باتیں آگئی تھی جو پہلے دور کے صوفیوں میں موجود نہ تھی۔ صوفیاء کرام کے خاص طبقے میں بڑی بڑی ریاضتوں کا وجود نظر آتا ہے۔ وہ اس دنیا سے مکمل طور پر قطع تعلق کر کے مستقل طور پر ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے۔ اس وجہ سے تعلق باللہ کی کیفیت پیدا ہو گئی، یہ بزرگ مدتوں تک مراقبے میں رہتے تھے اور ان حالات میں وجد اور رقص کی حالت طاری رہتی تھی۔ انسان کو دنیا میں سب سے نزدیک جو چیز نظر آتی ہے، وہ ہے اسکا وجود، قرآن پاک میں ہے:

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسکم افلا تبصرون

دکھا دیں گے اُنھیں (تفحص کرنے والے کو) اپنی نشانیوں کو جو کہ اس جہان کی قدرتی نظاروں میں ہیں، وہی نشانیاں آپ کے وجود میں بھی موجود ہیں۔

---

[1] اسلامی تصوف اور اقبال مصنف ڈاکٹر ابو سعید نور الدین صفحہ ۱۷ - [3] مکتوب امام ربانی مجدد الف ثانی مترجم مولوی عالم الدین صفحہ ۳۲۹

[2] خزینۃ الاصفیا جلد دوم من تصنیف و تالیف مفتی غلام سرور صاحب لاہوری مطبع منشی نول کشور رام صفحہ ۲۲۵

[3] تصوف مصنف میر صفی الحیدر صفحہ ۴۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

صوفی اس پر عمل کرتے ہیں۔ اپنے وجود اور اس جہان کے قدرتی نظاروں میں فکر کرتے ہیں جس سے محبوب حقیقی کا وصل نصیب ہوتا ہے وہ کہتے ہیں :[1]

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ

"جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پا لیا"

صوفی کے نزدیک مذہب میں شریعت کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ شریعت پر قائم رہنے سے روح کو روشنی حاصل ہوتی ہے جو کہ تھوڑے سے عرصہ میں کثیف جسم سے نکل کر لطیف جسم میں آ جاتی ہے، جس کو طریقت کہتے ہیں جہاں سے ترقی کر کے، ان دونوں حالتوں میں آتا ہے، جو حقیقت سے معرفت تک پہنچ جاتی ہے

صوفی کا قول ہے کہ رب پاک سے ملنے کے لئے شریعت پر لازماً قائم رہنا ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت کا بانی اور بڑا سمجھا جاتا ہے۔

شیخ سعدی علیہ رحمت بوستان[2] کے پہلے باب میں فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ شریعت کی طاقت اس طرح ہے :

بہ حکم شرع آب خوردن خطا است

وگر خون بفتوای، بریزی رواست۔

"شریعت کے حکم کے بغیر پانی پینا بھی جائز نہیں ہے، اگر شریعت کے حکم سے خون کیا جائے ہوتا ہے"

صوفیوں کا خاص عقیدہ ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں پہنچ جائیں تب فقیروں اور درویشوں سے صحبت ضروری ہے کیونکہ ان کی صحبت سے روح کی ترقی ہوتی ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں

یک زمانی صحبتی با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بی ریا۔

دنیا میں جس وقت تک صوفی حیات ہیں وہ تمام وقت ایک حالت میں نہیں رہتے کبھی آسمان پر پرواز کرتے ہیں تو کبھی اپنے پاؤں کی ایڑی پر نظر کر نہیں سکتے جسکو نزول کہتے ہیں اور پرواز کو عروج کہتے ہیں اس حالت میں اس کی زبان سے بے ساختہ ایسے کلمات نکلتے ہیں جن پر اعتراضات وارد ہوئے، جیسے حضرت بایزید بسطامیؒ کہنے لگے، "سبحانی ما اعظم شانی" منصور حلاج نے کہا "انا الحق"، اور شمس تبریز نے کہا "قم باذنی"

اسلامی تصوف کی ابتدائی تاریخ متضاد روایتوں سے بھرپور ہیں انکے قدیم ماخذ جو کہ ہم تک پہنچتے ہیں، ان کی روایتوں پر صدیاں گذرنے کے بعد بھی آج وہی اعتراض پیش کیا جاتا ہے تصوف کی تاریخ کے قدیم ماخذوں میں مندرجہ ذیل ممتاز تصانیف شمار کی جاتی ہیں :

۱۔ کتاب اللمع ۔ مصنف حضرت شیخ ابونصر سراج ۔ ۲۔ فتوح الغیب ۔ مصنف ۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ۔

۳۔ کشف المحجوب " حضرت شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ ۔ ۴ الرسائل القشیریہ ۔ تالیف ۔ حضرت امام ابی القاسم عبدالکریم القشیریؒ ۵۔ عوارف المعارف ۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

صوفیوں کے متاخر گروہ میں ذیل کے بزرگوں کی تصانیف کو امتیاز حاصل ہے :۔

۱۔ تذکرۃ الاولیا ۔ مصنف ۔ حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ ۔ ۲۔ سیرۃ الاولیا مصنف حضرت محمد مبارک العلوی ۔ ۳۔ نفحات الانس ۔ مصنف حضرت مولانا نور الدین عبدالرحمان جامیؒ

۴۔ اخبار الاخیار ۔ " حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ۔ ۵۔ الطبقات الکبریٰ ۔ مصنف ۔ حضرت علامہ عبدالوہاب الشعرانیؒ ۔ ۶۔ سفینۃ الاولیا مصنف ۔ شہزادہ دارا شکوہ ۔

ان تصانیف کے علاوہ علامہ ابن خلدون نے اپنی مشہور تصنیفات، کتاب العبر، دیوان المبتدا والخبر کے مقدمہ میں تصوف کی تاریخ اور صوفیائے کرام کی واردات قلبی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسلامی دنیا کے اس مشہور مورخ کی تصنیفات کو بڑی توقیر سے دیکھا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے :[3]

۱۔ تمدن عرب مصنف ڈاکٹر گستاؤلی بان مترجم شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی صفحہ ۳۸۸

۲۔ گلستان شیخ سعدیؒ

۳۔ سیرۃ الاولیا من تصنیف مولانا سید محمد مبارک العلوی الکرمانی صفحہ ۳۶۔

اولیاء اللہ خداتعالیٰ کی رضامندی اور اسکی خوشنودی کے لئے باہم ایک دوسرے کو دنیا میں دوست رکھتے ہیں بخدا قیامت کے دن انکے چہرے روشن، ماہتاب سے زیادہ درخشاں ہونگے، اور نور کے منبروں پر میدان محشر میں۔ جسوقت لوگوں کو خوف پیش آئیگی تو وہ اس خوف سے امن و آمان میں رہینگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت مبارک پڑھی:-

اَلَا اِنَّ اَولِیَاءَ اللہِ لَا خَوفٌ عَلَیھِم وَلَا ھُم یَحزَنُونَ

آگاہ ہو کہ خدا کے دوستوں پر کبھی خوف و غم طاری نہ ہوگا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ وہ اندھیرے کے چراغ، اور ہدایت و رشد کے سرچشمہ ہیں، اخلاق میں تکلف اور ریا کرنے سے بچتے ہیں، اولیاء کی یہ مدح وثنا اس برکت کے سبب سے ہے، جب آنحضرت صلعم نے معراج مبارک کی رات میں خرقہ فقر کے خلعت سے مشرف و ممتاز ہوئے، جسے اپنے عمر میں سر مبارک سے اوتار کر خلفاء راشدین کے خاتم، رسول اکرم صلعم وصی جناب امیر المومنین حضرت اسد اللہ الغالب علی بن ابیطالب کرم اللہ وجہہ کو عنایت فرمایا جس سے اولیاء، نامدار اور مشائخ کبار تک سلسلہ اور ہاتھوں ہاتھ پونہچتا رہا، جن کا مختصر ذکر یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ حسن بصری: منقول ہے کہ حضرت خواجہ حسن بصریؒ نے ارادت کا خرقہ حضرت امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پہنا، اِن بزرگ کے فضائل بے شمار ہیں، آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی ابی الحسن ابو سعید، حضرت زید بن ثابت کے آزاد کردہ تھے، خواجہ حسن رضؓ مدینہ عالیہ میں اس وقت تولد ہوئے تھے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت میں دو سال باقی رہ گئے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے اپنے دست مبارک سے ان کی تحنیک[1] فرمائی تھی۔ حضرت خواجہ حسن کی والدہ، اُم المومنین حضرت بیبی ام سلمہ رضؓ کی خادم تھی، ایکدن وہ کسی کام سے باہر چلی گئی تو حضرت خواجہ رونے لگے۔ حضرت بیبی ام سلمہ رضؓ نے اس ہونہار بچے کو اپنی چھاتی مبارک کو مونھ میں دی، خدا کی شان سے فوراً دودھ اُتر آیا اور چند قطرہ خواجہ صاحب کے پیٹ میں اُوتر گئے[2] خواجہ صاحب سے جو بعد برکتیں اور کرامتیں ظہور میں آئیں، ان کا سبب وہی دو باتیں ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضؓ ہمیشہ خواجہ حسن رضؓ کے حق میں دعا کرتی تھی، اور فرماتی تھی خداوند تعالیٰ اُسے خلق کا مقتدا اور پیشوا بنا[3]

حضرت خواجہ حسن بصریؒ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ کی شہادت کے بعد بصرہ چلے گئے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بصرہ میں ملاقات کی تھی بہت سے صحابہ کرام، جن میں ابو عمر بن علاء، ابو موسیٰ، انس بن مالک، حضرت ابن عباس نے حدیث شریف روایت کی ہیں۔ آپ ہر فن اور علم زہد اور پرہیزگاری، عبادت و ریاضت میں وقت کے امام تھے۔ ابو عمر علاء کہتے ہیں کہ میں نے حضرت خواجہ حسن بصری اور حجاج بن یوسف ثقفی سے زیادہ فصیح کوئی نہیں دیکھا، آپ نے ماہ رجب ۱۱ ہجری میں وفات فرمائی، آپ کی مزار مبارک بصرہ میں ہے۔

حضرت بیبی رابعہ عدویہ بصریؒ: دنیائے اسلام کی مشہور عاشق الٰہی اور صوفی خاتون حضرت بی بی رابعہ بصریؒ کے والد کا نام اسمٰعیل تھا، جو بصرہ کے رہنے والے تھے حضرت رابعہ اپنے والدین کی چوتھی بیٹی تھی، اس لئے رابعہ نام رکھا گیا تھا۔ آپ کے والد بیحد غریب شخص تھے، اور صبر و تحمل سے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے جس شب کو رابعہ کی ولادت ہو رہی تھی، اسی وقت ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا، آپ کی بیوی کو اچانک دردزہ شروع ہوا، تو اپنے شوہر کو کہا کسی پڑوسی سے تیل لے آئیں، لیکن اس غیرتمند شخص نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے اپنے آپ کو روکا، ہمسایوں کے گھر تک گئے لیکن خالی ہاتھ واپس ہوئے بیوی کو احساس ہوا کہ میرا شوہر تہی دست ہے۔ غریب اپنی مجبوری پر افسوس کرتے ہوئے سو گئے، خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا، آنحضرت

---

[1] تحنیک، پیدا ہونے کے وقت بچے کے منھ میں کھجور چبا کر دینے کو کہتے ہیں، جیسے حضور صلعم نے اپنے مونھ مبارک سے کھجور چبا کر حضرت امام حسن رضؓ کے مونھ میں دی تھی۔

[2] اکمال فی اسماءُ الرجال مصنف محمّد بن عبید اللہ بن محمّد عرف شیخ ولی الدین (عربی) صفحہ ۳۴۔

[3] سیرۃ الاولیا مصنف حضرت سیّد محمد مبارک العلوی الکرمانی صفحہ ۲۷۔

صلی اللہ علیہ سلم فرما رہے تھے "غم نہ کر یہ لڑکی خدا تعالیٰ کی مقبول اور برگزیدہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ تو امیر بصرہ کے پاس جا۔ اور اس سے کہہ دو کہ وہ روزانہ سو بار رات کو اور چار سو بار دن کو درود بھیجتا ہے۔ مگر گذشتہ جمعہ کو کیوں یہ عمل نہ کیا۔ لہذا اس کے عیوض چار سو دینار اس متوکل کو قاصد دیدے" صبح کو انہوں نے حکم نبی صلعم کی تعمیل کی اور دربار میں پہنچے، امیر بصرہ کو "پیغام نبوی" کہہ سنایا، تو اس امیر کو کمال خوشی ہوئی کہ اسکا درود حضور کی دربار عالی میں قبول کی گئی۔ امیر نے دس ہزار درہم مسکینوں میں تقسیم کئے اور اس پاکباز قاصد کو چار سو دینار پیش کیئے۔ بہرحال یہ بچی اس حالت میں تولد ہوئی اور اپنی تین بہنوں کے ساتھ بڑی ہو کر والدین سے دین عفت اور قناعت کی باتیں سیکھیں۔ اس دوران والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس زمانے میں بصرہ فتنہ اور فساد سے محفوظ نہ تھا یہ شہر برباد کر دیا گیا، رابعہ اور ان کی بہنیں بھی بچ نہ سکی وہ بھوک سے تنگ ہو کر سوکھے ٹکڑوں کی تلاش میں گھر سے نکلی، چوروں نے اُنہیں پکڑ کر فروخت کر دیا۔ رابعہ ایک تاجر کے ہاتھ فروخت ہو گئی۔ تاجر نے اُسے آگے اور شخص کو بیچ دی جس نے اُسے کنیز بنا کر گھر کے کام میں لگا دیا۔ رابعہ نہایت فرمانبرداری اور خاموشی سے اپنے مالک کی خدمت کرتی رہی، جو بڑا سنگدل تھا، اس لئے اُس سے رات دن کام لیتا تھا، جب بھی رابعہ کو فرصت ملتی تھی تو نماز میں مشغول ہو جاتی تھی، رو رو کر پروردگار سے کہتی تھی۔ "اے میرے خدا! میں یتیم، مصیبت کی ماری غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں، اس کے باوجود میں تیری رضا کی طالب ہوں" ایک مرتبہ حسب معمول آپ عبادت الہیٰ میں مشغول تھی۔ اس دوران ان کا مالک نیند سے بیدار ہوا اور دیکھتا ہے کہ رابعہ مناجات میں مشغول ہے اور کہہ رہی ہے "اے میرے خدا! دل کا حال تجھ پر روشن ہے میرے دل کی تمنا صرف یہ کہ میں تیری دائمی فرمانبردار ہوں تیری حضور میں دیر سے حاضر ہوئی ہوں۔ میرے مالک مجھے صرف تیری رضا چاہتی ہوں" خواجہ نے جب آپ کو اس حالت میں دیکھا تو بہت متاثر ہوا۔ دوسرے دن صبح کو ان کے پاس آ کر کہا آپ کی عبادت نے میرے قلب پر بڑا اثر کیا ہے۔ میں آپ کو آزاد کرتا ہوں۔ رابعہ نے آزادی حاصل کر کے راہ فلاح و بہبود کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ اور خدا والوں کی زندگی بسر کرنے لگی اور دن رات میں ہزار رکعتیں نماز و نوافل پڑھتی تھی اور پانی سے روزہ افطار کرتی تھی۔ ان کو زیادہ وقت گریہ وزاری میں گزرتا تھا۔

حضرت رابعہ کی یہاں حضرت سفیان ثوری اکثر رہتے تھے، جنہوں نے اس کو عدویہ کا لقب دیا تھا۔ ایک زاہد نے بیان کیا وہ رابعہ کے ساتھ یاد الہیٰ میں مشغول رہا دونوں میں معرفت الہیٰ کی باتیں ہونے لگی بڑی دیر تک اسرار و خودی پر گفتگو جاری رہی حتیٰ کہ زاہد یہ بات بالکل بھول گیا کہ وہ مرد ہے اور رابعہ عورت جب گفتگو ختم ہوئی تو اس شخص نے محسوس کیا کہ وہ بالکل تہی دست ہے اور حضرت رابعہ معرفت و اخلاق سے مالا مال ہے۔

بی بی رابعہ بصری نے کئی حج کئے تھے۔ پہلی بار جب وہ مکہ معظم کے قریب پہنچی تو چشم پرنم سے کہا۔ اے خدا! میرا دل ٹوٹا پھوٹا، اور غم سے بھرا ہوا ہے مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ میں مٹی کی مورت ہوں اور کعبہ پتھر کا، لیکن میں تو تیرے مشاہدے کی شیدا ہوں۔ فوراً الہام ہوا۔ اے رابعہ کیا تجھے موسیٰ علیہ وسلام کا واقعہ یاد نہیں کہ کوہ طور پر خدا کے انوار کی معمولی جھلک پڑی تو پہاڑ زیرہ زیرہ ہو گیا۔ تو مجھے ان ظاہر انکھوں سے دیکھنے کی تمنا نہ کر۔ جب مکہ معظمہ پہنچے تو کیا دیکھتی ہے کہ کعبہ آپ کے استقبال کو آرہا ہے۔ اسے دیکھ کر کہا کعبہ لیکر کیا کرونگی مجھے رب چاہئیے کعبہ کے مشاہدے سے خوش نہیں ہو سکتی۔ البتہ جمال محبوب سے مسرور ہونگی[2] جہاں تک تصوف کا تعلق ہے، بی بی رابعہ کے وقت میں اس کی ابتدا تھی، اور اس نے اختیار کیا، اس لئے آپ کا شمار اولین صوفیوں میں سے ہے۔ قرآنی آیات دعائیں اور اشعار بلند آواز سے مخصوص صوفیانہ رنگ میں پڑھا کرتی تھی، جس سے عشق الہیٰ پیدا ہوتا تھا۔ رابعہ کا آخری وقت بیماری میں گذرا، اور گوشہ نشینی اختیار کرلی اور اپنے حجرہ میں سے باہر نہ نکلی۔ لوگوں نے ایک ندا سنی[3]۔ "یا ایھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک"۔ اے آرام یافتہ نفس اپنے رب کی طرف رجوع ہو" لوگوں نے دروازہ پر کھڑے ہو کر سنا۔ جب ان کی روح خالق اکبر سے جا ملی اور وہ کلمہ شہادت پڑھ رہی تھی۔ یہ واقعہ ۱۸۵ھ ہجری میں ہوا، آپ کا مزار بصرہ میں ہے۔

۱۔ سفینۃ الاولیاء مصنف شہزادہ داراشکوہ ترجمہ محمد علی لطفی نفیس اکیڈمی کراچی صفحہ ۲۶۰ ۔ رابعہ بصری مصنف وداد اللہ کالینی مترجم عبدالصمد الازہری

۲۔ حیات ابدی مصنف ام عسامیہ خاتون صفحہ ۱۱۔

۳۔ تذکرۃ الاولیاء مصنف شیخ فرید الدین عطار مطبوعہ بمبئی صفحہ ۴۸۔

حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ آپ جلیل القدر مشائخ طریقت میں تھے۔ تجلیات کے حرم اور اسرارِ حق کے مظہر تھے۔ اور تبع تابعین کا شرف حاصل تھا۔ محدث تھے حضرت شیخ جنید بغدادیؒ فرماتے تھے۔ "ابو یزید منا بمنزلۃ جبرئیل من الملائکۃ" "ہم میں بایزیدؒ کا مقام ایسا ہے۔ جیسا کہ جبرئیل کا فرشتوں میں"

آپ نے بہت سے علمائے دین کی خدمت کی تھی خصوصاً حضرت امام جعفر صادقؓ حضرت ابو حفص یحییٰ۔ اور شفیق بلخی اور ان سے علم کی تحصیل بھی کی۔ علم تصوف کے حقائق سے استنباط کمال ان سے زیادہ کسی اور کو حاصل نہ تھا۔ وہ ہر حال میں علم دوست اور شریعت کی تنظیم کرنے والے تھے۔ ایک مشہور روایت ہے

ایک مرتبہ آپ مکہ معظمہ گئے اور محض خانہ کعبہ کو دیکھا، کہا حج قبول نہ ہوا، کیونکہ اس نوع کے پتھر تو بکثرت دیکھیں ہیں۔ دوسری مرتبہ گیا تو خانہ کعبہ اور صاحب خانہ کعبہ کو دیکھا، کہا ابھی توحید کی حقیقت سے بہرہ ور نہیں ہوا، تیسری مرتبہ گیا تو صاحب خانہ کعبہ (خدا) کو دیکھا۔ اور کعبہ کو نہ دیکھا، آواز آئی اے بایزیدؒ! اگر تو اپنے آپکو نہ دیکھتا اور ساری دنیا کو دیکھتا تو مشرک نہ ہوتا۔ تو نے تو اپنے آپ کو دیکھا ہے تو مشرک ہے، اس وقت میں نے اپنے آپ دیکھنے سے توبہ کی۔[۱]

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ پر استغراق کی حالت تھی اور بار بار کہنے لگے "سبحانی ما اعظم شانی۔ "تعریف میرے لئے ہے میری شان کتنی اعلیٰ ہے" آپ کے مریدوں نے اس بات کی شکایت کی۔ آپ نے کہا پھر اگر ایسے کلمات سنو تو ایک دم مجھے خنجر سے ہلاک کردینا۔ کچھ عرصے کے بعد وہی کلمات سن کر ایک مرید نے فوراً خنجر نکال کر اپنے مرشد پر وار کیا۔ لیکن بایزید کو کچھ بھی نہ ہوا، اس کے برعکس خنجر چلانے والا زخمی ہوگیا، اور مرگیا۔ جب بعد میں روئداد سنادی گئی، تو جواب میں کہا وجد کی حالت میں میرا سینہ آئینہ کے مانند ہوگیا۔ جس میں اس مرید نے اپنا عکس دیکھا۔ اس نے تو خنجر اپنے جسم میں لگایا۔ اکثر کہتے تھے کہ جب میں اپنے آپ سے دور نظر کی تب مجھے تینوں چیزیں ایک دکھائی دی۔ یعنی عاشق، معشوق، اور عشق۔

حضرت شیخ جنید بغدادیؒ آپ تبع تابعین میں سے تھے۔ طریقت میں شیخ اور شریعت میں امام تھے۔ آپ کا اسم گرامی ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید البغدادی تھا آپ کا لقب قواریری اور زجاج وخزاز تھا۔ آپ کے والد شیشہ بیچتے تھے اور آپ ریشم کا کام کرتے تھے۔ حضرت سفیان ثوریؒ آپ کے مصاحب تھے۔ حضرت جنیدؒ بچپن میں سری سقطیؒ جو اپنے وقت کے بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ اپ کی زیرِ نظر تعلیم حاصل کی کیونکہ حضرت سری سقطیؒ آپ کے ماموں تھے، اور ان کی توجہ اور تعلیم سے حضرت جنید کو درجہ ملا۔ حضرت جنیدؒ نے تیس سال مسلسل سخت مجاہدے کیئے جس سے روحانیت اس درجہ تک پہنچی کہ بعض اوقات خود مرشد حضرت سری سقطیؒ مقامات سلوک میں رائے لیتے تھے۔ حضرت سری سقطیؒ سے لوگوں نے پوچھا، کیا کسی مرید کا درجہ اپنے مرشد سے اونچا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا ہاں، اس کی دلیل ظاہر ہے جنیدؒ کا درجہ مجھ سے زیادہ ہے۔ یہ مشہور ہے کہ حضرت سری سقطیؒ کی زندگی میں مریدوں نے حضرت جنیدؒ سے عرض کی کہ ہمیں ایسی نصیحت فرمائیے جس سے ہمارے دل راحت ہو جائیں، انہوں عرض قبول نہ کی اور فرمایا میرے مرشد کے ہوتے ہوئے کوئی نصیحت کر نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ ایک رات انہوں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیدار کیا۔ آنحضرت صلعم فرماتے تھے، اے جنید! لوگوں کو واعظ نصیحت کر خدا تعالیٰ نے تمہارے کلام کو ایک دنیا کی نجات کا سبب قرار دیا ہے۔ جب وہ بیدار ہوئے تو دل میں خیال کیا، میرا درجہ حضرت سری سقطی سے بڑھ گیا ہے۔ اس لئے تو حضور صلعم کا ارشاد ہوا ہے۔ صبح ہوئی تو حضرت سری سقطیؒ نے ایک مرید بھیجا اور کہا جنید سے کہو کہ مریدوں کی درخواست پر تم نے کوئی نصیحت نہ کی مشائخ بغداد کی سفارش بھی نہ مانی۔ اب حضور صلعم نے فرمایا ہے، آپ کے حکم کی تعمیل ضرور کرنی ہے۔ حضرت جنید نے فرمایا شیخ کے ارشاد سے میرا وہ خیال دماغ سے نکل گیا۔ سمجھ لیا کہ حضرت سری سقطی پر میرا تمام حال آئینہ ہے، چنانچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر توبہ کی، اور کہا میرا یہ حال کیوں کر جان گیا۔ آپ نے فرمایا میں نے خدا تعالیٰ کو خواب میں دیکھا، فرمان ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے کہ جنید سے کہیں کہ وہ وعظ و نصیحت کریں تاکہ اہل بغداد کی امید بر آئے۔

---

[۱] سفینۃ الاولیا۔ مصنف دارا شکوہ صفحہ ۱۰۵۔ [۲] انوار اصفیا مرتب ادارہ تصنیف و تالیف۔

[۳] ،، ایضاً ،، ،، ،، [۴] نفحات الانس مصنف حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ۔

حسین بن منصور حلاج منصور حلاج کا نام حسین بن تھا۔ ان کے والد نو مسلم تھے۔ جو ایران کی ایک بستی بیضا کے رہنے والے تھے، وہیں حسین بھی پیدا ہوئے۔ منصور اپنے اہل و عیال سے ہجرت کر کے سوشتر کے شہر میں سکونت اختیار کی۔ وہاں حسین حضرت سہیل بن عبداللہؒ کے شاگرد ہوئے اٹھارہ سال کی عمر تک انکی خدمت میں رہ کر ظاہری علوم کی تحصیل کی۔ بعد میں عرب کی طرف چلے گئے وہاں اس وقت تصوف نے اپنا نیا رنگ دکھانا شروع کیا تھا۔ جس میں وقت کے بڑے عالم شریک ہو رہے تھے۔ حسین بھی اس نئی تحریک میں شامل ہو گئے۔ شروع میں حضرت ابوالحسین نوریؒ[1] اور حضرت جنید بغدادیؒ جیسے بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ ان سے علم تصوف میں بہت کچھ سیکھا۔ وہاں سے بصرہ گئے جہاں حضرت عمروؒ[2] بن عثمان مکیؒ کی خدمت میں رہ کر ان پر عجیب رنگ چڑھنا شروع ہوا۔ حضرت عمرو بن عثمان نے تصوف پر بہت سی کتابیں لکھی تھی، جن کو اکثر اپنے ساتھ رکھتے تھے، بلکہ کسی کو بھی نہ دکھاتے تھے۔ کسی نہ کسی طرح ان کی ایک کتاب منصور کے ہاتھ لگ گئی۔ جسکے مطالع سے، ان پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ اور وہ باتیں جو ایک صوفی کو عوام کے سامنے کہنا خلاف مصلحت تھی، سر بازار کھڑے ہو کر لوگوں کو سنانے لگے۔ عوام اس اسرار و رموز کی باتیں کیسے سمجھ سکتے تھے، انکی باتوں سے خلاف ہو گئے۔ یہ حالات دیکھکر مرشد بھی بیزار ہو گئے۔ منصور نے بصرہ کو چھوڑ کر بغداد میں جا کر حضرت جنیدؒ سے ملے اور یہاں بھی وہی باتیں کرنے لگے۔ اور حضرت جنید سے عجیب سوالات کیئے۔ آپ نے جواب میں فرمایا، "منصور وہ وقت دور نہیں کہ جب لکڑی کا سرا تیرے خون سے لال ہوگا۔" منصور نے کہا "آپ بھی اپنا لباس اس سے پہلے تبدیل کرینگے۔" بغداد کو چھوڑ کر اپنے شہر سوشتر چلے گئے۔ وہاں طبیعت اعتدال پر آ گئی۔ اور عالمانہ شان سے رہنے لگے۔ لوگ آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ لیکن پھر وہی جوش پیدا ہوا۔ اور سب کچھ چھوڑ کر سیاحت اختیار کرلی جہاں بھی گئے لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔ اس کے بعد مکہ چلے گئے۔ اس سفر میں چار سو معتقد ساتھ تھے حج سے فارغ ہو کر سب کو رخصت کیا اور خود کعبۃ اللہ کے سامنے ننگے پاؤں کھڑے ہو کر سال بھر ریاضت کی سخت جاڑے اور سخت گرمی میں سال پورا کیا، حتیٰ کہ ان کی کھال اُکھڑنے لگی اور چربی پگھل کر بہنے لگی، دن میں صرف ایک روٹی غیب سے ملجاتی تھی، اس سے دن رات کا روزہ افطار کرتا تھا۔ دوسرا حج ادا کر کے مراجعت کو نکلے، عجیب استغراق کی حالت طاری رہتی تھی، عوام تو خیر خود بڑے بڑے عالم بھی ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہو گئے۔ حضرت شبلیؒ[3] سے ملے، جنہوں نے سمجھایا کہ دوست کے راز کو چھپانا چاہئے۔ ان کی باتوں کا اثر تو ہوا لیکن اس ضبط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایکدن انا الحق کا نعرہ لگانا شروع کیا۔ علماء نے اس کفر کے کلمے سے روکا، لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ کیفیت دن بہ دن بڑھتی گئی۔ ایک دن یہ قطعہ کہی:

أَنَا مَن أَهوىٰ وَمَن أَهوىٰ أَنَا　　نَحنُ رُوحَينِ حَلَلنا أَبَدًا نَا

فَاذِ ابصرتنی، ابصرتہ　　وَاذِ ابصرتہٗ ابصرتنا

میں وہی ہوں جسے میں چاہتا ہوں، اور جسکو میں چاہتا ہوں وہ میں ہوں ہم دونوں دو روحیں ہیں

جو ایک قالب میں، اس لئے جب وہ مجھے دیکھتا ہے تو میں بھی اُسے دیکھتا ہوں۔

لوگوں نے علمائے ظاہر سے جا کر شکایت کی علماء نے صوفیہ علماء سے مشورہ کیا، آخر منصور پر کفر کا فتوا لگایا گیا۔ لیکن منصور اپنی حالت میں مست تھے، حق حق، انا الحق

---

[1] حضرت شیخ ابوالحسن نوری اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ نور کے رہنے والے تھے۔ آپ کا قول ہے "تمام لذات نفس کو ترک کرنے کا نام تصوف ہے"۔ آپ نے فرمایا ہے "من لم یعرف اللہ تعالیٰ فی الدنیا لم یعرفہ فی الاخرۃ" جس نے خدا تعالیٰ کو دنیا میں نہیں پہچانا، وہ آخرت میں اس کو نہ پہچان سکے گا۔

[2] حضرت شیخ عمرو بن عثمان مکی الصوفی، سید الطائفہ کے مرید تھے، حسین بن منصور حلاج کے استاد تھے، آپکا کلام زیادہ باریک ہوتا تھا لوگوں نے آپ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ مکہ سے باہر کر دیا تھا۔ حسین بن منصور پر جو کچھ ہوا وہ آپ کی دعا کے اثر سے۔ کیونکہ منصور نے انکو رنج پہنچایا تھا۔ ان کی وفات بغداد میں ہوئی

[3] حضرت ابوبکر شبلیؒ تبع تابعین میں سے تھے، آپ بڑے بزرگ اور مشائخ میں سے تھے، حضرت شبلیؒ نے منصور کے متعلق فرمایا ہے انا والحلاج فی شئی واحد مخلص جنونی واہلک عقلہ (میں اور حلاج ایک ہی حال میں ہیں پس مجھے میرے جنون نے چھوڑ دیا لیکن ان کے عقل نے انہیں ہلاک کر دیا۔)

کہنے رہے۔ یہاں تک کہ قتل کا فتویٰ صادر کردیا گیا۔ مخالفین کی بڑی کوشش ہوئی کہ کسی بھی طرح منصور کو سزا ملے لوگ خلیفہ مقتدر باللہ کے وزیر حامد بن عباس سے جاکر ملے اور اس بات کو سیاسی رنگ دیکر بتایا۔ وزیر بھی منصور کے درپے ہوگئے اور علماء سے انکے قتل کی فتویٰ طلب کی، جو کہ یکا یک قتل کا فتویٰ دینے پر تیار نہ تھے، لیکن مخالفت کی آگ بڑھی ہوئی تھی، آخر منصور کی ایک ایسی تصنیف ڈھونڈ کر لائے جس میں کچھ باتیں شریعت کے خلاف لکی ہوئی تھی۔ جسے دیکھکر علماء متفق ہوگئے۔ وزیر نے قاضی پر زور دیا کہ وہ قتل کی فتویٰ لکھدیں۔ قاضی نے وزیر کی ناراضگی کا خیال کرتے ہوئے فتویٰ لکھدیں جس پر حاضر علماء نے دستخط کردی۔ وزیر نے منصور کو قید میں بند کردیا۔ اور قتل کے لئے کل روئیداد خلیفہ کے سامنے پیش کی خلیفہ نے جواب دیا، جب تک شیخ جنید بغدادی واجب القتل نہ لکھدیں میں کوئی حکم نہ کرونگا۔ حضرت جنید[2] نے علماء دین کی فتویٰ دیکھا حالانکہ خود اس معاملے میں آنا نہیں چاہتے تھے۔ مجبوراً صوفیانہ لباس اُتار کر عالمانہ لباس پہنا۔ اور اس طرح لکھا۔" ظاہر کے لحاظ سے قتل کا فتویٰ دیا جاتا ہے لیکن باطن کا حال رب جانتا ہے۔ خلیفہ نے پورا ایک سال اس معاملے کو روکے رکھا۔ آخر تاریخ ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۳۰۹ ہجری میں منصور کو قتل گاہ میں لایا گیا، جس دن سولی دی جا رہی تھی، اُس دن بغداد میں اتنی خلقت جمع ہوگئی تھی کہ اسکا اندازِ بیان قیاس سے باہر ہے۔ وزیر نے جلاد سے ایک ہزار کوڑے لگائے، اگر اُس سے دم نہ نکلے تو ایک ہزار اور کوڑے لگائے چنانچہ دو ہزار کوڑے لگائے گئے لیکن اس عاشقِ خدا نے اف تک نہ کی۔ بلکہ خلقت کو دیکھکر نعرہ لگایا حق۔حق اناالحق ایک فقیر نے آگے بڑھ کر سوال کیا اے منصور عشق کسے کہتے ہیں، جواب دیا، آج، کل اور پرسوں دیکھ لوگے۔ آج عاشق کو سولی دیجائے گی۔ کل اسکو جلایا جائیگا، اور پرسوں اسکی خاک اُڑائی جائے گی۔ ایک شخص نے پوچھا منصور تم نے یہ کیا کیا ہے جواب دیا سچے بادشاہ کی حضور میں جانے کے لئے یہی روش کی جاتی ہے۔ حضرت شبلی[2] نے پوچھا اے منصور تصوف کیا ہے، جواب جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہو وہ تو تصوف کا ایک جز ہے۔ شبلی[2] نے پوچھا اسکا اعلیٰ جز کیا ہے، جواب وہ تیری پہنچ سے باہر ہے منصور پر لوگوں نے پتھر برسانے لگے، جب ان کے ہاتھ کاٹے گئے تو کہا، اس قیدی کے ہاتھ کاٹنا تو آسان ہے، لیکن وہ ہاتھ جو حق کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں ان کو کاٹنا آسان نہیں ہے" ان کے پاؤں کاٹے جانے لگے کہا، ان پاؤں سے میں دنیا کی سیر کرتا تھا، لیکن میرے پاس اور بھی پاؤں ہیں جن سے دونوں جہانوں کی سیر کرسکتا ہوں، اُن کو بھی کاٹ ڈالو اگر طاقت ہے" منصور زمین پر گر پڑے اور اپنی کلائیوں سے جو خون بہ رہا تھا، اپنے منہ پر ملنے لگا۔ لوگوں کے پوچھنے پر جواب دیا کہیں تم لوگ یہ نہ سمجھیں کہ ذرہ برابر خون دینے سے زرد ہوگیا ہے۔ پھر منصور کی آنکھیں کھینچ کر نکالی گیئں۔ تب لوگوں میں زبردست کہرام مچ گیا۔ جب ان کی زبان کاٹنے کے لئے نزدیک آئے تو کہا صبر کرو، اور کہا

زاہد بخیالِ خویش مستم داند   کافر بگماں خدا پرستم داند

مردم غلط فہمیے مردم مردم   اے کاش کسے ہر انچہ ہستم داند

اسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہا، یا اللہ ان تکلیفوں اور عقوبتوں کے صدقے، ان لوگوں پر رحم فرما! دیکھ میں اس سولی پر تیرا مشاہدہ کررہا ہوں۔ زبان کاٹنے کے بعد اُن کا سرتن سے جدا کیا گیا۔ خون جو اُنکے جسم سے نکل رہا تھا، زمین پر ہر قطرہ سے اناالحق کا نقش بن جاتا تھا۔ جلانے سے پہلے انکا ایک ایک رونگٹے سے اناالحق کی صدا آتی رہی۔ جب اس کے جسم کی خاک کو دریا دجلہ میں ڈالا گیا تو دجلہ میں ایسا سخت طوفان آیا کہ شہر ڈوبنے لگا۔

منصور حلاج نے نعرہ اناالحق لگایا، تو اُن کے بعد صوفیوں نے اس نعرہ کو علمی جامہ پہنایا۔ اور تصوف بدلکر خالص عشق عرفاں کا مت بن گیا۔ منصور بڑے زاہد اور عالم وفاضل تھے۔ معارفت اور شریعت پر بڑی دقیق کتابیں لکھی تھی، اور ان کے نہایت فصیح وبلیغ اقوال زریں موجود ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"ترک دنیا نفس کا زہد ہے ترک آخرت دل کا زہد ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان صرف دو قدم کا فاصلہ ہے، ایک قدم دنیا سے اُٹھالو اور دوسرا عقبیٰ سے پھر مولا سے مل جاؤگے۔ صوفی اوصاف ہیں۔ صوفی واحد فی الذات ہے"

حافظ شیرازی[2] نے اُن کی عقیدت میں فرمایا ہے

چوں منصور از مراد آنا کہ برادرند برد ارند

کہ با ایں درد اگر دربند درمانند ھرمانند۔

حضرت ذوالنون مصری قدس سرہ

آپ تبع تابعین، علماء و مشائخ میں سے تھے۔ آپ کا اسم گرامی ثوبان بن ابراہیم، اور ثوبی نسل میں سے تھے۔ ابوالفیض ذوالنون لقب تھا، آپ کی ولادت ۲۴۵ ہجری کو مصر میں ہوئی۔ آپ نے اپنی زندگی گوشہ نشینی میں گذاری۔ جب تک زندہ تھے تو لوگ آپ کے منکر تھے۔ جس رات انتقال فرما رہے تھے اس رات کو ستر آدمیوں کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضور صلعم فرما رہے تھے۔ خدا کا دوست ذوالنون آرہا ہے میں اس کے خیر مقدم کو آیا ہوں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو لوگوں نے ان کی پیشانی پر یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی۔ "ھذا حبیب اللہ مات فی حب اللہ قتیل اللہ" (یہ خدا کے دوست ہیں انہوں نے خدا کی عشق میں وفات پائی خدا کے شہید ہیں) اسلامی تصوف کی تاریخ پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ پہلے بزرگ ہیں جن کی طرف نظریہ "وحدت الوجود" خیالات منسوب کئے جاتے ہیں۔ تصوف میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ جب آپ نے وفات فرمائی اور جنازہ اٹھایا تو ایک بڑا پرندوں کا غول جنہوں نے اپنے پروں سے پر ملا کر آپ کے جنازہ پر سایہ کرکے اُڑ رہے تھے راہ میں مؤذن کی آذان سنائی دی، اور کلمہ شہادت پر آپ کی انگلی اُٹھی۔ لوگوں نے یہ حالت دیکھ کر شور کیا کہ شاید وہ زندہ ہے چنانچہ جنازہ رکھا گیا۔ لیکن دیکھا کہ کوئی جان نہیں ہے، لیکن انگلی نیچے نہ ہوئی اسی حالت میں اُن کو دفن کیا گیا، مصر کے لوگوں نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنی ناروا حرکات پر نہایت پشیمان ہوئے۔

آپ نے فرمایا تھا جب کبھی میں نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا تو کوئی نہ کوئی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی یا قصد کیا۔ آپ کی مزار مصر میں ہے۔ اور اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے جو کسی انسان کی لکھی ہوئی تحریر نہیں ہے "ذوالنون حبیب اللہ من الشوق قتیل اللہ"

امام ابوالقاسم القشیری رح

امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ھوازن القشیری رح خراسان میں ربیع الاول ۳۷۶ ہجری میں تولد ہوئے۔ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم ابوالقاسم سیانی سے حاصل کی جو عربی زبان کے نامور استاد تھے۔ خدارسی کی شوق میں شیخ ابوعلی دقاق کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تھوڑے عرصہ میں اُن کی دختر نیک سے نکاح ہوا۔ ابوعلی کی وفات کے بعد شیخ عبدالرحمان سلمی (صاحب طبقات الصوفیاء) سے مستفیض ہوئے۔ اپنے دور کے فاضل اور مشائخ میں سے تھے۔ اور کثیر تصانیف لکھی جن میں اکثر تصوف پر ہیں۔ آپ کی مشہور تصنیف "رسالۃ القشیری فی علم التصوف" جو ۴۳۷ ہجری میں عالم اسلام کی جماعت صوفیہ کو خطاب کرکے لکھی تھی۔ امام القشیری ۱۶ ربیع الثانی ۴۶۵ ہجری میں وفات پائی اس وقت آپ عمر ۸۹ سال تھی۔ امام موصوف نے رسالۃ القشیری میں علم تصوف اور طریقہ تصوف کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے جسے حضرت مولانا جامی رح نے اپنی تصنیف نفحات الانس میں لفظ بلفظ نقل کیا ہے۔ امام القشیری نے تصوف کی اصلی ماہیت کو بیان کرتے ہوئے حضرت بشر حافی کا ایک واقعہ درج کیا ہے۔

قال رأیت النبی صلعم فی المنام، فقال لی یا بشر قدری لم رفعک اللہ من بین اقرانک لا یا رسول اللہ قال باتبا

عک سنتی و خدمت الصالحین و نصیحتک لاخوانک، وحب بیتی، ھو الذی، بلغک منازل لابرار

حضرت بشر حافی، خواب میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی دولت زیارت سے مشرف ہوئے، ارشاد ہوا، بشر تجھے معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے تجھے تیرے معاصرین میں اتنا معزز کیوں فرمایا ہے۔ عرض کیا معلوم نہیں، ارشاد ہوا کہ تونے میری سنت کی پیروی کی اور صالحین کی خدمت اپنی بھائیوں کی خیر اندیشی کی اور میرے اصحاب اور اھل بیت سے محبت، یہ سب چیزیں تھی جن کی بدولت تو ابرار کے درجہ پر پہنچے۔

نفحات الانس مصنف مولانا نورالدین محمد عبدالرحمان جامی رح صفحہ ۳۶

شیخ ابوعلی دقاق کا اسم گرامی حسن محمد دقاق ہے۔ آپ کا وطن نیشاپور تھا، اپنے وقت کے امام تھے، نصرآبادی کے مرید تھے، اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گذارا، آخری وقت میں نیشاپور میں گذرا، امام القشیری رح سے روایت ہے کہ آپ زندگی کے آخری ایام میں ہر شام کو مکان کے بالائی حصہ پر چڑھ کر سورج کی طرف رخ کرکے کہتے تھے، اے جہاں کے راہرو آج تیری کیسے گذری کہاں کہاں غمزدہ کے اوپر چمکے کچھ نیچے رہنے والوں کی بھی تونے خبر رکھی کہ ان پر کیا گذری (نفحات الانس مصنف مولانا عبدالرحمان جامی رح صفحہ ۳۲۲)

سیدنا حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ ۔ عالم اسلام میں اولیائے کرام کے سردار اور مقدس و مظہر ہستی ہیں۔ آپ اپنے وقت کے بڑے صوفی تھے۔ اپنی روحانی قوت اور نورانیت سے دین اسلام کی خدمت کر کے سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو زندہ اور روشن کیا۔ آپ کی بے مثال زندگی و سیرت بنی نوع انسان کے لئے قابل تقلید ہے۔ آپ کا اسم گرامی سیدنا عبد القادر لقب محی الدین کنیت ابو محمد اور غوث اعظم دستگیر ہے۔ آپ کی ولادت ۴۷۰ھ ہجری ایران کے ایک گاؤں گیلان میں ہوئی۔ اسی گیلان کی نسبت آپ کو گیلانی کہتے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سید ابو صالح موسیٰ جنگی تھا۔ اور والدہ ماجدہ ام الخیر امۃ الجبار بیبی فاطمہ تھا۔ آپ کے والد حسنی اور والدہ حسینی سیدہ تھی۔ آپ جب سات برس کے ہوئے تو والد بزرگوار کا انتقال ہوا۔ آپ کی پوری نگھداشت والدہ کے ذمہ ہوئی آپ جب سترہ برس کے ہوئے تو علم کی تحصیل کے لئے بغداد کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ اس زمانے میں بغداد علم کا گہوارہ تھا۔ بغداد پہنچ کر آپ نے ابو طالب بن یوسف[1] سے قرآن مجید حفظ کیا۔ اور بڑے بڑے علماء کرام سے علم شریعت اور فقہ میں تحصیل حاصل کی۔ اور دن رات عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ پچیس سال اس عالم میں گذارنے کے بعد آپ کو یہ درجہ حاصل ہوا۔ شیخ ابو سعید مخزومی رح کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اس بزرگ نے آپ کو خرقہ ولایت بھی عطا کیا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عنایت فرمایا تھا۔ جو حضرت خواجہ حسن بصری رح کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پہنایا تھا جن سے دست بدست شیخ ابو سعید مخزومی رح سے آپ کو ملا۔ اس خرقہ کے پہنچنے کے بعد حضرت غوث اعظم پر برکات و تجلیات الٰہی کا ظہور ہوا۔ آپ کا زمانہ خلفائے عباسیہ کا دور تھا۔ لوگ بدعیات اور نفس کی ہر برائی میں مستغرق تھے۔ دین اسلام میں فتنے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس وقت حضرت غوث اعظم نے واعظ درس و نصیحت کلمۃ الحق سے خلق کی اصلاح میں کوشاں ہوئے جو کہ حضور پاک کے روحانی حکم سے لوگوں رشد و ہدایت میں لگ گئے آپ کے ہاتھ پر پانچ ہزار یہودی و نصاریٰ نے اسلام قبول کیا۔ اور ایک لاکھ سے زائد گنہگاروں نے آپ کے دست مبارک پر توبہ کی۔ آپ کا وجود اسلام کا زندہ معجزہ تھا۔ شیخ حارث بن عثمان فرماتے ہیں۔ حضرت غوث الثقلین زہد و تقویٰ اور کمالات معرفت میں یگانہ روزگار اور عبادت و ریاضت میں بے مثل تھے۔ آپ صاحب کرامات تھے۔ جن کا کوئی حساب نہیں ہے آپ کی وفات دن کے غروب ہونے کے وقت پیر کے دن تاریخ گیارھویں ماہ ربیع الثانی ۵۶۱ھ ہجری میں ہوئی۔ آپ کی عمر ۹۱ سال تھی۔ آپ کی مرقد مبارک بغداد میں ہے۔

آپ کا طریقہ عالیہ قادریہ ہے۔ جو کہ آپ کے اسم گرامی کی مناسبت سے یہ سلسلہ قادریہ کہلاتا ہے۔ آپ نے روحانی طور پر خاص حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے روح مبارک سے باطنی تعلیم حاصل کی۔ آپ نے چار شادیاں کی تھیں آپ کے جانشین بڑے صاحبزادے حضرت شیخ عبد الوہاب تھے۔ آپ کی تصنیفات میں تین مشہور ہیں ۱۔ غنیۃ الطالبین

۲۔ فتوح الغیب :۔ یہ آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جس میں تصوف اور معارفت پر کلمات اور مقالات موجود ہیں۔ اس کتاب کو شاہ عبد الحق محدث دہلوی رح نے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

۳۔ فتح ربانی :۔ اس کتاب میں ۶۲ خطبات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قصیدہ غوثیہ جو غوث اعظم رحمۃ نے اپنے متعلق فرمایا تھا۔ کل عربی میں اکیس اشعار ہیں۔ چند مثالیں نقل کرتا ہوں[3]

بسم اللہ الرحمان الرحیم

سَقَانِی اَلحُبُّ کَاسَاتِ الوِصَالِ فَقُلْتُ لِخَمرَتِی نَحوِی تَعَالِی

سَعَت وَمَشَت لِنَحوِی فِی کُئُوسٍ فَھِمتُ بِسَکرَتِی بَینَ المَوَالِی

اَنَا الحَسَنِی والمِخدَعُ مَقَامِی وَاَقدَامِی عَلیٰ عُنُقِ الرِجَالِ

وعبد القادر المشھور اِسمِی وَجَدِّی صَاحِبُ عَینِ الکَمَالِی

چہل کاف :۔ یہ تین اشعار ہیں جو کہ آپ سے منسوب کئے جاتے ہیں۔[4]

کفاک ربک یکفیک وکفۃ کفا کافھا ککمین کان لککک تکرکرا ککرالکرفی کبدہ تحکی متکشکۃ ککلکپ لککک

کفاک مالی کفاک الکاف کربتہ یا کوکبا کان یحکی کوکب الفلک۔

۱؎ غوث اعظم مرتب امان اللہ خان ارمان (قلائد الجواہر) صفحہ ۵۰ ۲؎ رسالہ بہار اخلاق ربیع الآخر سنہ ۱۳۲۵ ہجری

۳؎ قصیدہ غوثیہ میاں نور محمد نور خالدی نقشبندی ۴؎ چہل کاف ۔ بیاض خادی قلمی نسخہ جامع مخدومی حاجی امام بخش خادم شکارپوری سندہ

امام محمد الغزالیؒ | حجۃ الاسلام حضرت امام محمد بن محمد الغزالی الطوسیؒ، اپنے وقت کے بڑے عالم و محدث تھے۔ وہ علمی دنیا میں ایک مجمع البحرین تھے۔[1] آپ کی کنیت ابو حامد لقب زین الدین طوس کے رہنے والے تھے۔ آپ اپنے زمانہ کے جید عالم تھے، کیونکہ بیک وقت ایک جلیل القدر فقیہ تھے۔ اور بہت بڑے صوفی تھے۔ آپ وہ شخصیت ہیں، جس نے علم تصوف کو علمی حیثیت سے ترتیب دیا۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں[2]

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں دونوں طریقوں کو اکٹھا کیا ہے۔ اس ارباب عالی کے آداب اور طریقے بتائے ہیں اور صوفی و صوفیا نے اصطلاحوں کی شرح لکھی ہے۔ جس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ تصوف بھی ایک باقاعدہ علم بن گیا۔

آپ نے پہلے علوم ظاہر کی باقاعدہ تحصیل کرنے کے بعد، بغداد کے مدرسۂ نظامیہ کے صدر مدرس مقرر ہوئے، چار سال تک اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، لیکن اس دوران آپ کی طبیعت ظاہری علوم سے اکتا گئی۔ روحانی تشنگی کو مٹانے کے غرض سے انہوں نے تصوف کی طرف متوجہ ہوئے[3]، اس علم کو بحیثیت عملی طور پر حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور دمشق پہنچ کر مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہوئے۔ اس طرح آپ کی شخصیت عالم اسلام میں بڑی موثر ثابت ہوئی۔ آپ نے اصطلاحوں میں اضافہ کیا۔ آپ کی تصانیف میں سفر، سالک، شطح، فنا، بقا، محو، اثبات، محاضرہ، اور مکاشفہ وغیرہ کا ذکر تفصیل سے موجود ہے۔ تصانیف میں تفسیر یاقوت، احیاء العلوم، جواہر القرآن، اور کیمیائے سعادت مشہور ہیں۔ آپ نے ۵۰۵ھ ہجری میں وفات فرمائی اس وقت عمر ۵۴ سال کی تھی۔ آپ کی مرقد مبارک بغداد میں ہے۔

حضرت محی الدین ابن عربیؒ | حضرت شیخ محی الدین اکبر ابن علی بن العربی قدس سرہ اپنے زمانے کے اکمل الکاملین میں سے تھے۔ جس قدر رموز تصوف آپ نے بیان فرمائے ہیں، کسی اور بزرگ نے بیان نہیں کیے۔ وحدت الوجود کے قائلین کے امام تھے۔ آپ سے کرامات اور خوارق عادات لاتعداد میں صادر ہوئے آپ کی تصانیف میں جو رموز اور مطالب بیان ہیں ان کا مطالعہ کرنا حق تعالیٰ سے قربت حاصل کرنا ہے۔ آپ نے ۵۶۰ھ ہجری مطابق ۱۱۶۵ء میں اندلس (اسپانیہ) بمقام مرسیہ میں ولادت پائی، مگر بعد میں شام جا کر مقیم ہوئے۔ اور دمشق میں زندگی کے آخری ایام گذارے۔ حضرت فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں:

"امام محی الدین ابن العربیؒ بہت بڑے جلیل القدر ولی اور اپنے زمانے کے قطب الاقطاب تھے"

شیخ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں: "شیخ اکبر عارفوں کے مربی تھے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بہ قدم چلنے والے تھے۔"[2] انہوں نے حضرت شیخ اکبر کے منکروں کے جواب میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام تنبیہ الغبی فی تبریہ ابن العربی ہے۔[4] بقاعیؒ نے لکھا ہے۔

امام ابن سعد یافعی کہتے تھے کہ حضرت شیخ اکبرؒ کو ولایت عظمیٰ حاصل تھی۔ فتوحات مکی کے باب میں شیخ اکبرؒ نے اپنے ایک مکاشفہ کا ذکر فرمایا ہے۔[5]

ایک مرتبہ، عالم واقعہ میں حضرت ادریس علیہ السلام سے ملا اور ابتدائے عالم کے متعلق کچھ پوچھا، آپ نے فرمایا، مجھے مدت عالم ابتدا کا حال معلوم نہیں، اور نہ یہ جانتا ہوں کہ مخلوقات کس حد تک پیدا ہوتی رہیں گے، کیونکہ ہر نفس کے ساتھ ایک نئی خلقت پیدا ہوتی ہے اور اللہ جل شانہ کی صفت خلق ابدی ہے، ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی، اور دنیا و آخرت ہمیشہ رہیگی، میںنے کہا، یا نبی اللہ قیامت کی کوئی علامت مجھے سے فرمائے، ارشاد ہوا، "جد آدم قریب کا وجود اس کی بڑی علامت تھی"، میںنے کہا کہ حضرت! دنیا کے بعد بھی کوئی دار اس کے سوا ہے۔ فرمایا کہ یہاں ایک دار وجود میں ہے اور دنیا تمہیں لوگوں کے سبب ہی دنیا ہوئی

۱۔ اسلامی تصوف اور اقبال مصنف ڈاکٹر ابو سعید نور الدین صفحہ ۱۱۴۔

۲۔ مقدمہ ابن خلدون مولف علامہ عبد الرحمان ابن خلدون صفحہ ۴۸۸

۳۔ الغزالی مصنف شبلی نعمانیؒ صفحہ ... ۲۵

۴۔ نفحات الانس مصنف حضرت مولانا جامیؒ صفحہ ۵۸۲

۵۔ فتوحات مکہ مصنف حضرت محی الدین اکبرؒ معنف ملا محمد الدین صفحہ ۷

حافظ عبداللہ ذہبی، حضرت شیخ اکبرؒ کے نہایت مخالف تھے۔ ایک بار لوگوں نے ان سے پوچھا کہ امام محی الدین عربی نے "فصوص الحکم" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لکھا، تو انہوں نے باوجود سخت مخالفت کے جواب دیا، ایسا جھوٹ علامہ کبھی نہیں بول سکتے یہ سچ ہے۔[1]

حضرت شیخ اکبرؒ کو تصوف میں ایک واسطے سے حضرت شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ سے خرقہ ملا تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام سے بھی ایک واسطے میں علوم باطن حاصل ہوا۔ خود فرماتے ہیں[2]

"میں نے اس خرقہ کو شہر موصل کے باہر سنہ ۶۰۱ ہجری میں ابوالحسن علی بن عبداللہ بن جامع سے پہنا۔ اور ابن جامع نے حضرت خضر علیہ السلام سے"

حضرت شیخ اکبرؒ نے بہت بڑا تصانیف کا ذخیرہ چھوڑا تھا لیکن افسوس کہ اس زمانے میں بہت کم کا پتہ ملتا ہے۔ جن میں "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" مشہور ہیں۔ یہ دونوں کتابیں تصوف میں قابل قدر شمار کی جاتی ہیں۔

مولانا رومیؒ کا زمانہ حضرت محی الدین ابن العربی کی آخری عمر سے ملتا ہے۔ اور حضرت امام غزالیؒ شیخ اکبرؒ سے ۵۵ سال پیشتر گذرے تھے۔ آپ کی وفات ۲۲ ربیع الآخر سنہ ۶۳۸ ہجری مطابق ـــــ دمشق میں انتقال فرما گئے۔ آپ کی مزار مبارک جبل قاسیون کے دامن میں ہے جس کو صالحیہ کے نام سے پکارتے ہیں

باب دوم

پاک و ہند میں تصوف

پاک و ہند میں تصوّف کی ابتدا

پاک و ہند میں تصوف نے شروع کے زمانے سے اثر لیا ہے۔ کیونکہ فتح اسلام سے لے کر بارھویں صدی ہجری تک سندھ مشائخ، علماء اور صالحین کا گہوارہ رہا ہے۔ حالانکہ ان بزرگوں کے حالات کسی خاص کتاب میں تفصیل سے نہیں ملتے، لیکن کسی بیان کے ضمن میں ان قدیم و مشہور بزرگوں کا تذکرہ ملجاتا ہے سنہ ۵۰۰ ہجری کے بعد تصوف کو عملی اور علمی حیثیت ملی، جو آگے چل کر فلسفہ تصوف نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کی ان میں چار طریقے مشہور ہوئے

۱ نقشبندی:۔ اس کا بانی حضرت خواجہ محمّد اتالیسوی، متوفی سنہ ۵۶۲ ہجری مطابق سنہ ۱۱۶۶ء تھی۔ اس سلسلے کو اُن کے بعد خواجہ عبدالخالق غجدوانی متوفی سنہ ۵۷۵ ہجری نے فروغ دیا لیکن اس سلسلے کو جس بزرگ نے بام ترقی پر پہنچایا، وہ تھے حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی متوفی سنہ ۷۹۰ ہجری۔ رح

۲ قادریہ:۔ تاریخ کے نقطۂ نظر سے یہ سلسلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جن کے سربراہ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ تھے۔ بارھویں صدی عیسوی میں آپ کے خلفائے نے اس سلسلے کی ترویج اور ترقی میں دنیا کے اسلامی ممالک میں فروغ دیا۔ آپ سے اوپر یہ سلسلہ سیّد الطائف حضرت جنید بغدادی رح تک ملایا جاتا ہے ہندستان میں قادریہ سلسلہ کا دم قدم اور فروغ حضرت سیّد میاں میرؒ لاہوری قادری سے ہوا۔ آپ سنہ ۹۵۰ ہجری سیوان سندھ میں تولد ہوئے۔ ان کی والدہ بی بی فاطمہ سندھ کے مشہور بزرگ حضرت قاضی قاذن کی دختر تھیں لیکن حضرت شیخ محمد حسینی صاحب عظمت و کرامت قادریہ سلسلہ کے صحیح وارث تھے آپ نے اچ شریف میں سنہ ۸۹۴ ہجری وفات کی

۳ چشتیہ:۔ اس سلسلہ کے بانی حضرت ابو اسحاق شامی تھے۔ لیکن اس سلسلے کی توسیع و توقیر حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح نے کی۔ یہ سلسلہ چشتیہ کے سردار خواجہ احمد ابدال رح سے ہیں۔ جو حضرت شیخ ابو اسحٰق شامی رح کے مرید تھے۔

۴ سہروردیہ:۔ اس سلسلہ کا خاندان سب سے پہلے خوارزم سے ملتان میں آکر مقیم ہوا۔ اس خاندان کے قافلہ کے سالار حضرت کمال الدین علی شاہ قریشی تھے۔ جن کے تقویٰ کو دیکھکر ملتان کے لوگ جوق در جوق خدمت میں حاضر ہوکر مریدان باصفا میں داخل ہوتے رہے۔ اس زمانے میں ایک بڑے بزرگ مولانا حسام الدین ترمذی جو کوٹ کرور میں رہتا تھا۔ اپ کی شہرت سن کر حضرت کمال الدین سے راہ رسم پیدا کی آگے چل کر مولانا کی صاحبزادی کا حضرت کمال الدین کے فرزند شیخ وجیہ الدین سے نکاح ہوا۔ سنہ ۵۶۵ ہجری میں فرزند تولد ہوا۔ اس مولود مسعود کا نام شیخ بہاؤ الدین ذکریا رکھا گیا جنہوں نے ھندوستان میں سہروردی طریقے کی بنیاد رکھی۔ اور اس سلسلہ کو بڑا فروغ ملا۔ اس سلسلہ میں حضرت سید جلال الدین بخاری، حضرت شیخ افغانی، حضرت شیخ احمد، حضرت شیخ نظام الدین اور حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ اور آپ کے دو مشہور مرید حضرت قاضی حمید الدین ناگوری اور سیّد مبارک غزنوی رح جنہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔

سب سے پہلے ھندستان میں اسلام کے آفتاب کی روشنی اُمڈ کر آئی وہ سرزمین پاک سندھ میں مردان حق اور جلیل القدر بزرگوں نے جنم لیا جن کے فیضان حق سے اِس سرزمین کا چپہ چپہ اسلامی تصوف کا علمی و عملی نمونہ بن گیا۔ سب سے پہلے صوفی جنہوں نے ھندستان آنے کا قصد کیا وہ بھی پہلے سندھ کے مردم خیز زمین پر قدم رکھا وہ بزرگ تھے حاجی ابو تراب رح جو سنہ ۱۷۱ ہجری کو عہد بنو عباس میں یہاں تشریف لائے تھے۔ آپ تبع تابعین میں سے تھے۔ اس طرح سندھ میں شہر ٹھٹھہ کو بڑی اہمیت ہے جہاں سے ھندستان میں اسلام پھیلا۔ ان بزرگوں میں سے خاص خاص بزرگوں کے حالات دیئے جاتے ہیں جنہوں نے فلسفہ تصوف کے معرفت اسلام کو فروغ دیا۔

حضرت علی بن عثمان ھجویری داتا گنج بخش۔

آپ اپنے وقت کے یکتا روزگار، امام اور اپنے طریقے میں یگانہ تھے۔ اہل تصوف میں بہت بڑا درجہ رکھتے تھے، آپ کی ولادت سنہ ۴۰۰ ہجری کو غزنی کے قریب ایک گاؤں ھجویر میں ہوئی۔ آپ حضرت شیخ ابو الفضل بن حسن ختلی رح کے مرید تھے۔ اور علوم ظاہر و باطن میں کمال حاصل کیا۔ دیگر بڑے بڑے مشائخ کی صحبت میں رہکر فیض حاصل کیا

۱۔ رسالہ صوفی بعنوان "سہروردی ھندستان میں" مقالہ نگار حضرت خواجہ حسن نظامی صفحہ ۲۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۸ ہجری

۲۔ شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کا خاندان قدیم الایام سے سندھ میں مقیم تھے۔ ان کے بزرگ فاتح سندھ محمد قاسم کے ساتھ آئے تھے۔

۳۔ حاجی ابو تراب۔ تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۵۲ مصنف میر علی شیر قانع۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آپ کے مزار مبارک پر چلہ کیا تھا۔ جب اعتکاف ختم کرکے داتا کی مزار سے رخصت ہوئے تو یہ شعر پڑھا۔[1]

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما۔

اس کے بعد آپ کو گنج بخش کے لقب سے پکارا گیا۔ آپ مرشد کے حکم سے ہندوستان میں آئے اور لاہور میں سکونت اختیار کرلی آپ نے تصوف پر ایک کتاب "کشف المحجوب" تصنیف کی، جس تصوف کے اسرار و رموز بیان فرمائے ہیں۔ حضرت جہانگیر اشرف سمنانیؒ نے اپنی تصنیف لطائف اشرفی میں لکھتے ہیں:

"کشف المحجوب از کتب معتبرہ مشہور فن است و لطائف و حقائق درآں کتاب جمع کردہ است"

شہزادہ دارا شکوہ لکھتے ہیں:[2]

"حضرت ہجویری را تصنیف بسیار است کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچ کس را برآں سخن نیست شدی است کامل"

آپ کا مزار مبارک لاہور میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری چشتیؒ

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ المعروف خواجہ غریب نواز، ہندوستان میں چشتی سلسلہ کے بانی، اور طریقت کے شیخ، حقیقت کے اصل الاحوال، اسرار الٰہی کے حامل، حضور صلی اللہ علیہ و سلم کے ہند میں نائب اور اسلام کی روشنی کا نور پھیلانے والے ۵۳۶ھ ہجری میں سجستان[3] میں تولد ہوئے، آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ سے جا ملتا ہے، جب آپ بارہ برس کی عمر کو پہنچے، تو آپ کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا، آپ کو ورثے میں ایک باغ ملا جس کی نگہداشت خود کرتے تھے۔ اس باغ میں آپ کی ملاقات ایک مجذوب ابراہیم قلندر سے ہوئی۔ جس کی نظر سے متاثر ہوئے، اور سب کچھ چھوڑ کر ترک وطن ہوکر خدا تعالیٰ کی طلب میں نکل کر سمرقند جاکر کلام پاک حفظ کیا اور علوم ظاہری کی تعلیم میں مشغول ہوئے۔ تحصیل کے بعد سیر و سیاحت کے لئے نکلے، عراق کی ایک بستی ہارونؒ[4] میں حضرت شیخ عثمان ہارونی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور شرف بیعت حاصل کی بقول اخبار الاخیار[5]

"بہت سال در خدمت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہ بود، در سفر و حضر جامہ خواب خواجہ نگاہ داشتے"

کامل بیس سال مرشد کی خدمت میں رہکر ایک لمحہ بھی آرام نہ کیا۔ مرشد کے ساتھ مکہ اور مدینہ منورہ بھی گئے۔ مدینہ عالی میں بارگاہ رسالت سے ہندوستان جانے کی بشارت ملی۔ خواجہ ہارونیؒ کو اپنے مرید کے لئے بیحد عزت تھی۔ اور آپ خرقہ خلافت اور چار ترکی ٹوپیاں عطا کی تھیں، اور نصیحت فرمائی:

"کلاہ چار ترکی سے مراد ہے چار چیزوں کا ترک کرنا پہلا ترک دنیا، دوسرا ترک عقبیٰ، جس کا مقصد ہے خدا تعالیٰ کے سواء دوسرا مقصود نہ رکھنا، تیسرا ترک خورد و خواب، مگر اتنا جس سے زندگی کا رشتہ چل سکے، چوتھا، ترک خواہش، یعنی نفس جو کہے اسکی مخالفت کرتے رہنا، جو شخص ان چار چیزوں کو ترک کرتا ہے تو اُنکو چار ترکی ٹوپیاں پہننا سزاوار ہے۔"

آپ بغداد سے ہوتے ہوئے اصفہان، استرآباد، سبزوار اور غزنی سے ہوکر ہندوستان پہنچے، اور اجمیر میں سکونت فرمائی۔ اجمیر میں اس وقت ہندوؤں کے سواء کوئی ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ خواجہ صاحب نے جب اجمیر میں قدم رکھا تو بہت سے ہندو مسلمان ہوگئے۔ اسلام روز افزوں ترقی کرتا رہا، جس کی وجہ سے وہاں کا راجا پتھوار چوہان (پتھوراج) نے خواجہ صاحب کو شہر بدر کرنے کی دھمکی دی آپ نے فرمایا "پتھورا زندہ بہ مسلماں دادیم" "پتھوراج کو زندہ ہی مسلمانوں کو دیدیا"

یہ پیشگوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی، پتھوار، شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں میدان جنگ میں مارا گیا۔ خواجہ صاحب کے فیوض سے ہندوستان کی مرزمین اسلام کے نور سے منوّر ہوگئی۔ خواجہ صاحب کا لقب "وارث النبی فی الہند" مشہور ہوا۔ آپ سنہ ۶ رجب ۶۳۲ھ ہجری میں ۹۷ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔

---

[1] انوار اصفیا۔ مرتب ادارہ تصنیف و تالیف شیخ غلام علی سنز لاہور، صفحہ ۹۸۔ [2] سفینۃ الاولیاء مرتبہ شہزادہ دارا شکوہ صفحہ ۲۱۰

[3] سیستان کو سیاح سجستان اور سجزی بھی لکھتے ہیں۔ [4] ہارون نیشاپور میں ایک گاؤں ہے حضرت شیخ ہارونی (عثمان)ؒ شریعت، طریقت اور حقیقت کے علم میں اپنے وقت کے علامہ اور ابدال کے مقتدا تھے۔ خرقہ ارادت خواجہ حاجی شریف زندنیؒ کی خدمت میں سے حاصل کی تھی، آپ نے ۶۰۷ھ کو مکہ میں وفات پائی۔ [5] اخبار الاخیار مصنف شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ:-

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ اوسی اپنے وقت کے قطب الاقطاب بڑے جلیل القدر صوفی اور ولی تھے۔ تارک دنیا، فقر و فاقہ میں بے نظیر تھے۔ ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی غریب نوازؒ کے خاص مرید اور حضرت خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے مرشد تھے۔ آپکا اسم گرامی حضرت بختیار اور قطب الدین تھا۔ کاکی اس لیئے کہلاتے تھے کیوں کہ آپ کے مصلے کے نیچے غیب سے روٹیاں حاصل ہوتی تھیں۔ دو سال کی عمر میں والد کا انتقال ہوا۔ والدہ نے بڑی محنت سے تربیت دی اور اس وقت کے عالم حضرت مولانا ابو حفص سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ ان سے علوم ظاہر و باطن سیکھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اوش تشریف لائے تب ان سے بیعت کی اور بیس سال خدمت کرنے کے بعد، انہوں نے خرقہ خلافت دے دی۔

آپ کو سماع سے بڑی رغبت تھی۔ اکثر سماع کی مجلسیں منعقد ہوتی تھی۔ کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ علی سجستانی کی خانقاہ میں محفل سماع ہو رہی تھی، خواجہ صاحب بھی اس محفل میں موجود تھے۔ جب قوال نے شیخ احمد جام کا قصیدہ آپ نے سنا، اور اس کا یہ شعر سنتے ہی وجد طاری ہوا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

کتنی دن تک یہ حالت رہی آخر ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ ہجری میں وفات پائی۔

حضرت شیخ بہاءُ الدین ذکریاؒ:-

آپ کے جد بزرگوار حضرت کمال الدینؒ مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے خوارزم سے ملتان میں آکر مقیم ہوئے۔ ملتان میں ایک بزرگ مولانا حسام الدین ترمذیؒ نے اپنی بیٹی حضرت کمال الدین کے صاحبزادے حضرت شیخ وجیہ الدین کے نکاح میں دی۔ ۵۷۸ھ ہجری کو شیخ بہاءُ الدین ملتان میں تولد ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں اسقدر علم حاصل کیا جو کسی کو تیس برس میں بھی حاصل نہ ہوتا۔ اس دوران آپ کے والد کا انتقال ہوا تو خاندان پر بیکسی اور مصیبت چھاگئی۔ شیخ بہاءُ الدینؒ کا کوئی خبرگیراں نہ تھا۔ اس حالت میں بھی تعلیم کو جاری رکھا۔ ملتان سے سفر کرکے خراسان اور بخارا ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے۔ مدینہ منورہ جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی مجاوری کرتے رہے۔ وہاں شیخ کمال الدین محمد یمنی محدث سے حدیث کا درس لیتا رہا۔ بعد میں بغداد جاکر شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت سے فیض حاصل کرکے خلافت کا خرقہ حاصل کیا۔ حضرت شیخ سے حکم ہوا کہ ملتان میں جاکر اپنے وطن کے لوگوں کو ہدایت دیدو۔ اس طرح ملتان تشریف لے آئے۔ آپ کے ساتھ پیر بھائی حضرت شیخ جلال الدین تبریزی بھی آئے۔ آپ نے دو شادیاں کی تھی۔ ہندوستان کے عارف حضرت شیخ صدر الدین، پہلی زوجہ محترمہ سے تولد ہوا۔

آپ کی وفات بھی عجیب حالت میں ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو پیغام بھیجا تھا۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

ایک دن آپ اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے۔ کہ ایک شخص نورانی لباس پہنے ہوئے آئے۔ ایک لفافہ سربمہر آپ کے صاحبزادے حضرت شیخ صدر الدینؒ کو دیکر کہا۔ یہ نہایت ضروری کاغذ ہے۔ اسکو حضرت شیخ کی خدمت میں جلدی پہنچا دو۔ صاحبزادے حجرے میں گئے اور والد کو خط دے کر واپس چلے آئے۔ باہر آکر دیکھا، تو وہ شخص غائب تھا۔ اتنے میں حجرہ کے چاروں طرف سے ایک آواز آئی۔ جسکا مطلب تھا۔ دوست، دوست کے پاس چلے گئے۔ شیخ عارف یہ ہولناک صدا سنتے ہی حجرہ میں گئے۔ دیکھا تو والد بزرگوار عالم خارش سے عالم پاک چلے گئے۔ صرف جسم باقی ہے۔ یہ واقعہ ۶۶۶ھ ہجری تاریخ ۲۰ صفر کو ہوا۔

حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

ملتان کے ان اولیائے کرام میں سے ہیں، جن پر زمانہ ہمیشہ فخر کریگا۔ آپ کا اسم گرامی حضرت مسعود بن عزیز الدین محمود تھا۔ آپ کا نسب امیر المومنین

رسالہ صوفی ماہ شعبان المعظم ۱۳۲۰ھ ہجری صفحہ ۳۔ ۲ خزینۃ الاصفیا جلد سوم مصنف غلام سرور صفحہ 19

انوار الاصفیا صفحہ ۱۹۳۔ ۳ نفحات الانس صفحہ ۵۳۶۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے جاکر ملتا ہے۔ آپ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ایک دن مسجد میں بیٹھے کتاب نافع کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ایک درویش وہاں آئے اور آپ سے پوچھا۔ کیا یہ کتاب تمہیں کچھ نفع دیگی۔ جونہی حضرت کی اس درویش سے نظریں چار ہوئیں تو دل پر بڑا اثر ہوا، اور کھڑے ہوکر جواب دیا۔ جی نہیں مجھے تو آپ کی نظر کرم سے نفع ہوگا۔ اور فوراً اُن کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اور درویش سے باطنی رموز کے سوالات کیئے۔ پوچھا آپ کون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا میرا نام قطب الدین بختیار ہے۔ میں دہلی جا رہا ہوں۔ حضرت نے عرض کیا مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ دہلی میں جاکر فیض حاصل کیا۔ آپ اپنے وقت کے غوث اور قطب تھے۔ اور بیشمار خوارق و کرامات کا ظہور ہوا۔ آپ نے ۵ محرم ۶۶۴ھ کو وفات فرمائی۔ مزار مبارک پاک پٹن میں ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ :-

آپ ہندوستان کے مشاہیر و مشائخ میں سے تھے۔ اور محبوب الٰہی کے لقب سے یاد کیئے جاتے ہیں۔ شیخ فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ نے سلسلہ نظامیہ جاری کیا۔ آپ کا اسم گرامی سید محمد بن سید احمد بن سید عبد اللہ غلمی تھا۔ اور لقب سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء تھا۔ بچپن میں آپ کے والد بزرگوار کا انتقال ہوا۔ والدہ ماجدہ نے تعلیم کا بندوبست کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے شوق ارادت میں پاک پٹن پہنچے جہاں مرشد سے قرآن پاک، علم قرأت، اور بہت سے علوم حاصل کیئے۔ جب آپ کا مرتبہ کمال تک پہونچا تو شیخ نے اجازت دی کہ دہلی جاکر وہاں کے لوگوں کو تربیت اور ہدایت دیں۔ حضرت امیر خسرو اور حسن دہلوی آپ کے مرید تھے۔ آپ کے کرامات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں۔ "ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنا ضروری کاغذ کھو دیا تھا۔ وہ شخص پریشان ہوکر حضرت کی خدمت میں آکر اپنی مدعا پیش کی۔ شیخ نے اس کو ایک درم دیا۔ اور کہا۔ اس کا حلوہ خرید کر حضرت شیخ فرید الدینؒ کی روح کو بخشکر درویشوں کو کھلادو۔ جب اس شخص نے حلوائی سے حلوہ خرید لیا تو حلوائی نے حلوہ ایک کاغذ میں لپیٹ کر دیا۔ اس شخص غور سے جو دیکھا تو اُسے اپنا کھویا ہوا کاغذ نظر آیا" آپ کی وفات ۱۸ ربیع الاخر ۲۵ ھجری میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۹۲ سال تھی۔

حضرت بو علی قلندرؒ :-

حضرت بو علیؒ نے پانیپت شہر میں ولادت پائی۔ ظاہری علوم کی تکمیل بھی اُسی شہر میں ہوئی۔ آپ کے فیض و برکت سے اس علاقہ کے بہت سے ہندو، راجپوت مسلمان ہوئے۔ چالیس برس کی عمر میں دہلی تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ رحلت فرماگئے تھے اور آپ کو علماء دین نے دہلی کے مدرس اور مفتی کا عہدہ پیش کیا۔ جسے قبول کرکے بیس سال خدمت انجام دی۔ اتفاق سے ایک درویش کی صحبت میں رہکر درس و تدریس کو چھوڑکر قلندر بن گئے۔ اور آزادانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ آگے چل کر استغراق اور جذب کی حالت طاری رہتی تھی۔ اس جوش کی کیفیت میں شعر کہتے رہتے تھے۔ شاعری میں آپ کا دیوان موجود ہے۔ اور بہت سی مثنویاں بھی چھوڑیں۔ تصوف کے علوم کو سمجھنے کے بعد ریاضت اور مجاہدہ میں مشغول ہوئے۔ سب کتابوں کو دریا میں ڈال کر جنگل کی راہ لی۔ کرنال کے نواح بڈھا کھیڑ میں آخر عمر تک مقیم رہے۔ مستی کی حالت میں ایک مرتبہ مونچھیں شرعی حدود سے بہت بڑھ گئی تھیں اس وقت آپ کے ہمعصر بزرگ مولانا ضیاء الدین سنامی جو شریعت کا سختی سے پابند تھا۔ شیخ کی ریش مبارک پکڑکر مونچھوں کو شریعت کی حد کے مطابق تراش دی۔ جب وہ چلے گئے۔ تو شیخ نے اپنی داڑھی کو بار بار پکڑ کر کہتے رہے یہ ریش کیسی مبارک ریش ہے جو شرع محمدی کی راہ میں پکڑی گئی۔ آپ صاحب دل صوفی تھے۔ آپ کا کلام پاکیزہ اور لطیف خیالات سے بھرپور ہے۔ جسے بڑی عقیدت سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ نے سنہ ۲۴ ھجری میں پانیپت کے علاقہ میں وفات کی۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ :-

آپ کا اسم گرامی احمد لقب بدر الدین ابوالبرکات۔ قیوم زماں مجدد الف ثانی عرف امام ربانی۔ آپ کے والد بزرگوار مخدوم عبد الاحد تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب امیر المومنین سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کی ولادت بروز جمعہ ۱۴ شوال سنہ ۹۷۱ ھجری سرہند شہر میں ہوئی۔ بچپن میں عام بچوں کی طرح کبھی گریہ و زاری نہ فرماتے تھے۔ بلکہ ہر وقت خندہ پیشانی سے رہتے تھے۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار کے زیر نگرانی ہی کلام پاک حفظ کرنا شروع کیا اور ظاہری علوم کی تحصیل شروع کی۔ والد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انکی صحبت میں رہکر ریاضت اور عبادت

میں مشغول ہوئے۔ طریقہ نقشبندیہ کے فضائل بھی اپنے والد بزرگوار سے حاصل کیئے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کے مرید اور بڑے صاحب دل تھے۔ حضرت امام ربانیؒ اپنے والد کے انتقال کے بعد حج کے ارادہ سے دہلی تشریف لائے۔ وہاں حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ رحمت سے بیعت ہوگئے۔ حضرت باقی باللہ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ احمد ایک آفتاب ہیں۔ ہم جیسے ہزاروں ستارے اس کی روشنی میں گم ہو جائیں آسمان کے نیچے ان کی نظیر نہیں ہے۔ ان جیسے اس امت میں چند ہی آدمی گذرے ہیں۔ آپ کی وفات ۲۹ صفر سنہ ۱۰۳۴ ہجری میں ہوئی اور مزار مبارک سرہند میں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا اسم گرامی حضرت قطب الدین احمد اور مشہور نام عظیم الدین تھا۔ لیکن ولی اللہ محدث دہلوی مشہور کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۴ شوال سنہ ۱۱۱۴ ہجری مطابق سنہ ۱۷۰۳ء کو قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم پانچ سال کی عمر سے اپنے والد بزرگوار کے زیر نظر شروع ہوئی۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کرکے فارسی اور عربی تعلیم کا شوق پیدا ہوا پودہ سال سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ ہوکر شادی کرلی۔ اشغال مشائخ نقشبندی کی تعلیم حاصل کرکے تفسیر بیضاوی پڑھنا شروع کیا۔ اپنے والد حضرت شاہ عبد الرحیمؒ کے ہاتھ پر بیعت کی ۱۷ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہوا۔ تو والد کی مسند درس پر بیٹھا۔ ۱۱۴۳ھ میں حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضرت محمد افضل محدث سیالکوٹیؒ سے حدیث کی سند لی۔ دہلی میں درس تدریس اور اسلام کی تبلیغ فرماتے رہے۔ آخر عمر تک یہ فیض جاری رکھا۔ آپ نے ۲۹ محرم سنہ ۱۱۷۶ ہجری مطابق سنہ ۱۷۶۲ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کی اولاد میں چار صاحبزادے۔ شاہ عبد العزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبد القادر، اور شاہ عبد الغنی جو شاہ اسماعیل شہیدؒ کے والد تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنی زندگی میں عجیب انقلاب دیکھے اور مغل بادشاہوں کو دیکھا جن میں اورنگزیب عالمگیر، شاہ عالم، بہادر شاہ، معز الدین جہاندار شاہ، فرخ سیر سے عالم شاہ ثانی تک۔ اور ان کے سیاسی داؤ پیچ کو بھی دیکھا۔ اس وقت کے معاشرے کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا۔

شاہ صاحب نے اسلام کی بڑی خدمت کی۔ جمود کو توڑ کر عمل کی دعوت دی جو آپ کی کثیر تعداد تصانیف میں موجود ہے۔ آپ کی تصانیف میں فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن، قصص الانبیاء، مسوٰی، مصفیٰ، حجۃ اللہ البالغہ، کشف الغین، شرح الرباعتین، قصیدہ قصیدہ وحدت الوجود والشہود، مکتوبات۔

سرمد شہید

سرمد کی ابتدائی زندگی کے متعلق مستند حالات نہیں ملتے۔ لیکن تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ وہ ایران کے شہر کاشان کے رہنے والے تھے۔ اور قوم یہود سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں مسلمان ہوگئے تھے۔ حالانکہ اصل قومیت کے متعلق روایت نہیں ملتی۔ ان کا خاندان ارمنی اور یہودی تھا۔ لیکن سرمد فیضان الہٰی سے مشرب بالاسلام ہوئے۔ اسلام میں آنے کے بعد کیا نام اختیار کیا؟ بس سرمد نے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے اشعار اور نقطہ سنجی کو دیکھکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ علم وفضل شعر و شاعری اور عربی زبان میں کمال درجہ رکھتے تھے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ چونکہ اس زمانے میں ایران کے تاجر اپنا مال لے کر سندھ میں آتے رہتے تھے ٹھٹھ، علم، فضل اور تجارت کا مرکز تھا۔ سرمد بھی اپنا مال لے کر ٹھٹھ میں آئے۔ لیکن انہیں معلوم نہ تھا۔ کہ یہ تجارت انہیں ہمیشہ کے لئے اسیر کردیگی۔ سادہ لوح ایرانی تاجر نے دل کا سودا کرلیا اور ٹھٹھ میں قیام دوران ایک حسین و جمیل ہندو لڑکے ابھیچند کے حسن و جمال میں محو ہوگئے۔ اور اپنا پورا مال ومتاع لٹا دیا۔ دیوانگی کی حالت میں پہنچ گیا۔ رفتہ رفتہ وہ ہندو لڑکا بھی اپنی دولت اور عزیزوں کو چھوڑ کر سرمد کے رنگ سما گئے۔ سرمد بیگانہ ہوکر ریگستان میں مجنوں کی طرح خاک چھانتا پھرا۔ پھر ایک مستقر کی تلاش میں ایک جگہ بیٹھکر عشق کے آخری امتحان کا انتظار کرنے لگے۔ شاہجہاں بادشاہ کے آخری دور حکومت میں دہلی چلے گئے۔ لوگ آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ شہزادہ دارا شکوہ جو صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا۔ درویش اور فقیروں کے دوست تھے۔ سرمد کے خاص عقیدمند ہوگئے۔ اور اس کی صحبت میں اکثر رہتے تھے۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر سنہ ۱۰۶۹ ہجری میں تخت نشین ہوئے

تو وہ زمانہ دارا شکوہ اور اس کے ساتھیوں کے بہت تکلیف۔ لوگوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن سرمد اپنے حال میں مست تھا۔ انہیں تو عشق کی وہ آخری منزل طے کرنی تھی۔ سرمد کو دنیا سے کیا غرض تھی۔ دہلی کی گلیوں میں ننگے پھرا کرتے تھے۔ تذکرۃ الخیال میں لکھا ہے کہ برہنگی کی وجہ سے شہنشاہ اورنگزیب نے وقت عالم شیخ عبد القوی کی طرف رجوع کیا۔ جس نے سرمد کو بلا کر پوچھا کہ باوجود علم و فضل کے برہنہ رہنا کس عذر پر مبنی ہے۔ اور کہا "عریانی چرا می باشی" سرمد نے جواب دیا "شیطان قوی است۔" شیخ عبد القوی نے پوری کیفیت اورنگزیب سے کہی۔ شہنشاہ نے دور اندیشی سے کام لیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ سرمد کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے۔ علم و فضل کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ کے مالک تھے۔ اس معاملے کو عرصے تک ملتوی رکھا۔ آخر یہ طے ہوا کہ سرمد کو علماء کے مجمع میں طلب کیا جائے۔ چنانچہ علماء دین کی مجلس منعقد ہوئی جس میں سرمد کو بلایا گیا۔ سب سے پہلے اورنگزیب عالمگیر نے سوال کیا "تم دارا شکوہ کو مژدہ سلطنت دیا تھا۔ سرمد نے جواب دیا بیشک یہ درست ہے اسے ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ ایک عالم نے سوال کیا برہنگی شریعت کے خلاف ہے اور وہ بھی ایک صاحب عقل کے لئے جب سرمد کو لباس پہننے کے لئے کہا تو سرمد نے پہننے سے انکار کیا۔ شہنشاہ اورنگزیب نے علماء سے کہا صرف برہنگی وجہ قتل نہیں ہو سکتی۔ ایک۔ ایک عالم نے کہا جو علم تم نے حاصل کیا ہے۔ اس کا بھی خیال نہیں۔ سرمد نے کہا۔

ما آنچہ خواندہ ایم، فراموش کردہ ایم   الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم۔

(ہم نے جو کچھ پڑھا اسی فراموش کر دیا۔ صرف حدیث دوست یاد ہے اس کو بار بار پڑھتا ہوں۔)

ایک عالم جو ان کے عادات سے واقف تھا، اس نے سرمد کو کلمہ طیبہ پڑھنے کو کہا، تو سرمد نے اپنی عادت کے مطابق کلمہ پڑھا تو صرف "لا الہ" آگے نہ پڑھا یہ جز نفی ہے۔ اس علماء نے شور مچایا سرمد نے کہا ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں۔ اور اثبات تک نہیں پہنچا۔ الا اللہ کہوں تو جھوٹھ ہوگا۔ اور جو دل میں نہ ہو تو زبان پر کیسے آئے گا۔ علماء نے متفق ہو کر کہا ایسا کہنا صریحاً کفر ہے۔ اگر توبہ نہ کرو گے تو واجب قتل ہو جاؤ گے۔ ظاہر پرست کیا جانے کہ سرمد کس منزل پر پہنچا ہے۔ وہ تو قتل کی دھمکی سے مرعوب ہو جانے والے نہ تھے۔ سرمد نے توبہ سے بھی انکار کیا۔ علماء نے اسے فتویٰ سنادی۔ شریعت کی حد مقرر ہو گئی اور واجب القتل ہوئے۔ دوسرے دن سرمد کو مقتل میں لایا گیا۔ تو ایک درویش دوست نے سمجھایا۔ کہ اپنی حالات بدل دیں۔ یہ سن کر سرمد نے کہا

عمریست کہ آوازہ منصور کہن شد   من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را۔

سرمد کو قتلگاہ میں لایا گیا تو اتنا ہجوم اکٹھا ہو گیا کہ جس کا اندازہ کیا نہیں جا سکتا۔ جب جلاد تلوار لیکر قتل کے لئے آگے بڑھا تو سرمد نے کہا

سر جدا کرد از تنم شوخی کہ با ما یار بود   قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود۔

عاقل خان رازی اپنی مختصر تاریخ عالمگیری میں لکھا ہے۔ جب جلاد قتل کرنے لگا تو سرمد نہایت اطمینان سے سر جھکا کر بیٹھ گئے اور کہا۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم   دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم۔

جلاد نے ایک ہی وار سے اُن کا سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۰۷۱ ہجری میں ہوا بقول مولانا ابو الکلام آزاد نے خلیفہ ابراہیم سے راوی ہے کہ سرمد نے زندگی میں کلمہ طیبہ "لا الہ" سے زیادہ نہیں کہا۔ لیکن شہادت کے بعد لوگوں نے سنا کہ سر کشتہ سے تین بار "الا اللہ" کی صدا بلند ہوئی یہ حقیقت ہے کہ ان قربانیوں سے جن کے ہاتھ خون آلودہ ہوئے وہ خون ناحق ہونے کی جگہ ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔ لیکن میدان عشق بھی قربان گاہ بنتا ہے۔ سرمد شہید کا مزار جامع مسجد دہلی کے قریب ہے جہاں بڑی عقیدت سے لوگ پھول نچھاور کرتے ہیں۔ سرمد کے کلام کا مجموعہ رباعیات سنہ ۱۸۸۲ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔

۱؎ رباعیات سرمد   مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم صفحہ ۲۱

۲؎ نظام المشائخ جلد دوم محرم الحرام سرمد شہید از مولانا ابو الکلام آزاد۔

باب سوم
سندھ میں تصوّف کی ابتدا

سندھ میں اسلامی تصوف کے اولین نقش کا تعین کرنا اگرچہ تاریخ کی روشنی میں ایک امرِ عظیم ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتدائی طریقہ جو زھد وتقویٰ کا حامل تھا۔ اس سے سندھ کے رہنے والے مسلمان سب سے پہلے مستفیض ہوئے تھے۔ لیکن تصوف کی وہ شاہراہ جس نے آگے چل کر سندھ کے مسلمانوں نے اسلام اور اسلامی تعلیم میں اپنا جداگانہ مقام قائم کیا۔ اس کے ابتدائی مبلغین کا سراغ اس وقت ملنا مشکل ہے نفحات الانس میں مولانا جامیؒ نے صوفیوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اُن میں حضرت ابو علی سندھی رحمت اللہ علیہ کا بھی شامل ہے۔

حضرت ابوعلی سندھیؒ رُشد وھدایت کے سبب متقدمین اور مشائخین میں بلند مقام حاصل کیا تھا۔ یہ پہلے سندھی صوفی بزرگ ہیں جن کا نام صوفیاءِ کرام کے تذکروں میں ملتا ہے۔ نفحات الانس کے مصنف نے آپکا ذکر اس طرح کیا ہے[1]

"شرح شطحیات شیخ روزبہان بقلی میں مذکور ہے کہ حضرت ابو علی سندھی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کے استادوں میں سے تھے حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا ہے "میں ابو علی سے توحید میں فنا ہونے کا علم سیکھتا تھا۔ اور ابو علی مجھ سے الحمد اور قل ھو اللہ سیکھتے تھے"۔

تاریخ تحفۃ الکرام میں شیخ سندھی کا ذکر نفحات الانس کی عبارت سے لیا ہے میر علی شیر قانع نے آپ کو سندھ کے مشائخ اور علماء کے تحت دیا ہے[2]

"ذکر برخے وجوہ مشائخ وعلمائی سندھ کہ محقق مقر ومدفن شان کما ھو حقہ صورت نیافتہ"

بحرحال نفحات الانس کی روایت کے مطابق یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ موصوف حضرت بایزید بسطامیؒ کے زمانے میں تھے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ ۲۶۱ھ مطابق ۸۷۴ء میں رحلت فرمائی تھی۔ سندھی بزرگ بغداد اور اس کے قریب وجوار میں اپنے علم وفضل کے سبب مشہور تھے اور شیخ سندھی نے اپنے وطن سندھ کو الوداع کہکر بغداد پہنچے ہونگے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ جیسے عارف نے اُن کے روحانی مرتبے کا اعتراف کیا ہے۔ علم تصوف میں فنا اور بقا کا مسئلہ اتنا دقیق ہے جو اس کو بڑے سے بڑا رازدار صوفی بھی مشکل سے سمجھا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں ابوعلی سندھی کا ہونا اور سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں اس درجے کی شخصیت کا ہونا سندھ کے لئے حقیقی افتخار رہے۔ اس زمانے میں عراق میں صوفیانہ تحریکیں جن میں قادریہ اور سھروردیہ خاص تھی۔

سندھ میں اس وقت سے دو ڈھائی صدیوں تک سکوت کا عالم تھا اور تصوف کے متعلق کوئی خبر نہیں ملتی۔

مقدمہ تاریخ تصوف کی تمھید میں حبیبن سھروردی خواجہ حسن نظامیؒ کی وساطت سے لکھتے ہیں[4]

"سندھ کا صوبہ ھندوستان کے صوفیوں کا گہوارا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کے بقول سھروردی سلسلہ کے صوفی پہلے سندھ میں آئے یہ تحریک سندھ میں عرب فتوحات ۷۱۱ء سے پہلے آئی یہ حقیقت ہے کہ سندھ میں سھروردی طریقہ کی نشوونما حضرت بہاءالدین زکریا ملتانیؒ ۱۲۶۷ء کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔"

لیکن سندھ میں سھروردیہ طریقہ کا داغ وبیل شیخ الشیوخ حضرت نوح البکریؒ کی ذات گرامی سے ہوا جو شیخ شھاب الدین سھروردی ۱۲۳۵ء کے مرید تھے

1۔ نفحات الانس۔ مصنف حضرت مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ صفحہ ۶۵

2۔ تاریخ تحفۃ الکرام (فارسی) مصنف میر علی شیر قانع جلد سوم صفحہ ۱۶۸

3۔ اکثر تذکروں میں ان بزرگوں کے ذکر کو مختصر الفاظ میں لکھا ہے۔ جن میں ابو معشر سندھی اور اُن کے فرزند ابو عبدالملک محمد۔ امام اوزاعی۔ ابو نصر سندھی۔ حافظ ابوخلف بن سالم ابن علی سندھیؒ۔ ابو ضلع سندھی۔ کشاجم حضوریہ وغیرہ — 4۔ تاریخ تصوف۔ مصنف ارتھر جے اربری مقدمہ صفحہ VIII

سے تھا۔ سہروردیہ طریقہ حضرت شیخ الشیوخ بہاؤالدین زکریاؒ سے پہلے سندھ میں پہنچ چکا تھا۔ اس طرح حضرت نوح البکھرہ کا اسم گرامی متقدمین میں سے ہے تاریخ تحفۃ الکرام اور حدیقۃ الاولیا میں آپ کا ذکر موجود ہے۔

شیخ الشیوخ حضرت نوح بکھریؒ

"شیخ الشیوخ حضرت نوح بکھری سہروردی اجل اولیائی سندھ اکمل مرید حضرت شہاب الدین سہروردی ست در فرستہ کہ بکھر قدیم است سکونت داشتہ۔ نقل است کہ ہرگاہ غوث العالم شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی از خدمت شیخ شہاب الدین مرید شدہ سوئے ملتان رخصت یافت۔ شیخ فرمود کہ مریدے رشد از مریدان مادر فرستہ ہند است او و البتہ خواہی دید کہ او چراغ و فتیلہ دروغن از خود آوردہ بجرد باقتباس محتاج بود قضارا وقتی کہ شیخ بہاؤالدین زکریا بفرستہ رسید۔ شیخ نوحؒ کشتی عمردوان بطوفان اجل سوئے خود چنان کشیدہ بود......!"

"شیخ الشیوخ حضرت نوح بکھری، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے کامل اور اجل مریدوں میں سے تھے۔ فرستہ یعنی[1] بکھر قدیم میں رہتے تھے۔ نقل کرتے ہیں کہ جس وقت غوث عالم شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی شیخ شہاب الدین کے مرید ہوئے، اور آپ کو ملتان جانے کے لئے اجازت ملی تب شیخ نے آپ سے فرمایا کہ میرے لائق مریدوں میں فرستہ (سندھ) میں ہے۔ اُن کو جا کر دیکھنا، کیوں کہ وہ دیا ہے، تیل اور باٹ اپنی لائے تھے، اُن کو صرف روشنی کی ضرورت تھی، قضا سے شیخ بہاؤالدین ذکریا فرستہ میں اس وقت پہنچے، جب شیخ نوح بکھری وفات پا چکے تھے۔ آپ انکے تجہیز و تدفین میں شریک ہوئے۔"

تحفۃ الکرام کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بہاؤالدین ذکریاؒ تقریباً تیس سال کی عمر میں بیعت سے فارغ ہوکر بکھر پہنچے، گویا یہ زمانہ ۶۲۰ھ کے لگ بھگ شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں سندھ کے بادشاہ ناصرالدین قباچ کی حکومت تھی، اور بکھر براہ راست اسکے قبضہ میں تھا۔ جہاں اس کا فرزند علاؤالدین بہرام شاہ بطور نائب، حکومت کر رہا تھا۔ حضرت نوح بکھریؒ کی مزار بکھر میں ہے۔ سہروردی طریقہ کے پہلے داعی حضرت شیخ نوح بکھریؒ کے بعد شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ کا ذکر آتا ہے، جن کے فیض و کرم سے سندھ کا ذرہ ذرہ معمور ہو چکا تھا۔ تاریخ اور تذکروں سے معلوم ہوتا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری قدس سرہ بھی سندھ میں تشریف لائے تھے۔ اور سندھ میں چشتی سلسلہ کی داغ و بیل رکھی۔ دلیل العارفین کی چوتھی مجلس میں ذکر ہے کہ خواجہ صاحب اپنے مرشد کی معیت میں سیوستان "سندھ" میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ ایک دن خانقاہ میں گئے جس میں شیخ صدرالدین محمد احمد سیوستانی رہتے تھے شیخ صدرالدین سیوستانیؒ، جو یاد حق میں اُنکا استغراق حد سے زیادہ تھا۔ آپ کتنے دنوں تک اُنکی صحبت میں رہے آپ کی خدمت میں جو بھی آئے وہ محروم واپس نہ جاتے تھے، ان کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تھے اور فرماتے تھے۔ میرے حق میں دعائے خیر کریں کہ میں ایمان اپنا قبر تک سلامتی سے لے جاؤں۔ جب قبر اور موت کی سختی کا ذکر سنتے تھے تو بید کی طرح کانپ اُٹھتے تھے۔ روتے روتے ان کی آنکھوں سے خون بہنے لگتا تھا۔ بالکل اس طرح چشمے سے پانی بہتا ہے یہ رونا ہفتوں تک بند نہ ہوتا تھا۔ رونے سے فارغ ہونے کے بعد میری طرف دیکھکر فرماتے تھے۔

"اے عزیز جس پر موت آنے والی ہو اور اس کا حریف ملک الموت ہو تو اس کو سونے، ہنسنے اور خوش رہنے سے کیا کام"

اس کے بعد فرمانے لگے اے عزیز! اگر تمہیں ان لوگوں کے حال کا ذرہ بھی معلوم ہو جو مٹی کے نیچے ایسی کوٹھڑی میں سوتے ہیں۔ جس میں بچھو بھرے ہوئے

لہ سندھ میں تصوف اور صوفیانہ شاعری (مسودہ) مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی حصہ دوم صفحہ ۳۹

ٮہ حدیقۃ الاولیا۔ تالیف سید عبدالقادر بن سید ہاشم ٹھٹوی بتصحیح پیر حسام الدین شاہ راشدی

ٮہ فرستہ۔ قدیم بکھر کا نام تھا، "بلدہ بکر نام قدیش فرستہ است" تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۱۲۴۔

ہیں جو ڈنگ ماریں تو، اس طرح گل جائیں جسطرح پانی میں نمک گل جاتا ہے۔ بعد میں فرمانے لگے:

"ایک مرتبہ ایک کامل ولی کے ساتھ بصرہ کے ایک قبرستان میں بیٹھا تھا۔ نزدیک، ایک صاحب قبر پر عذاب ہو رہا تھا۔ اس بزرگ کو جب یہ معلوم ہوا تو زور سے نعرہ لگایا، اور زمین پر گر پڑا۔ میں ان کو اٹھانے کے لئے نزدیک گیا۔ دیکھا تو ان کی روح جسم سے پرواز کر چکی تھی، تھوڑے وقت میں اُنکا جسم پانی کی طرح بہہ گیا۔ اس دن سے مجھ پر قبر کی سختی اور ھیبت طاری رھتی ہے۔ اسلئے اے عزیز دنیا میں اتنا مشغول نہ رہو جو حق سے غافل رھجائیں۔"

دلیل العارفین سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عثمانؒ کے ساتھ خواجہ معین الدین چشتیؒ سیوستان سندھ میں آئے تھے، کب آئے تھے اس کا اندازہ ذرا مشکل ہے۔ شیخ صدر الدین سیوستانیؒ چھٹی صدی ہجری میں گذرے ہیں۔ تاریخ تحفۃ الکرام میں آپ کا ذکر لکھوی کے بزرگوں میں آتا ہے تحریر ہے

"سیّد صدر الدین عرف صدر بن سیّد محمد صاحب آیات باھر و کرامات ظاھری۔ ولی وقت و سر سیّد شیخ مشائخ روزگار فخر جامع سادات۔ جامع البرکات بود اولادش در سند نجابت دودمان و اصالت خاندان مقصف بعض اولادش ساکن سیوستان"

تحفۃ الکرام کی روایت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ نے سندھ کے بزرگ حضرت صدر الدینؒ سے ملاقات کی تھی۔

حضرت مخدوم آدم نقشبندیؒ

حضرت مخدوم آدمؒ سندھ میں مخدوم آدو کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم عبدالاحد تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ سے جا کر ملتا ہے۔ آپ اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل تھے۔ شہنشاہ اورنگزیب کے دور حکومت میں دہلی تشریف لے گئے تھے۔ جہاں آپ کی ملاقات حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندیؒ سے ہوئی۔ حضرت معصوم ان سے نہایت شفقت سے پیش آئے ایک دن قرآن پاک کی ایک آیت مبارک کی معنیٰ پوچھی وہ آیت یہ تھی۔ "والطور و کتاب مسطور فی رق منشور والبیت المعمور" مخدوم آدم نے نہایت توجہ اور وضاحت سے آیت کی معنیٰ بیان کی، عین اس وقت خواجہ معصومؒ نے اپنی توجہ باطنی سے ان پر عرفان و عقیدت کی راہیں روشن کردیں۔ اس اثر کے بعد مخدوم آدو نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور طویل عرصہ تک مرشد کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کیا۔ خلافت سے سرفراز ہو کر، مرشد کے ارشاد سے وطن واپس آئے۔ اور اپنے رشد و ھدایت سے سندھ کے لوگوں کو مستفیض کرتے رہے۔ آپ کی وفات ٹھٹہ میں ہوئی اور مکلی میں مدفون ہوئے۔

حضرت مخدوم ابو القاسم نقشبندیؒ

آپ کا اسم گرامی ابو القاسم اور لقب نور الدین تھا۔ آپ نے حضرت سیف الدین شاہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ جب سرھند سے خرقہ نقشبندی حاصل کر کے سندھ میں تشریف لائے، اس وقت سندھ میں قادریہ اور سھروردیہ طریقہ عام ہونے لگا۔ شروع میں آپ نے سندھ کے مشھور بزرگ حضرت شیخ مخدوم آدمؒ کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کیا۔ مخدوم آدم کے اشارے سے سرھند چلے گئے جہاں حضرت شاہ سیف الدین کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض حاصل کیا۔ شاہ صاحب حضرت امام ربانیؒ کے پوتے تھے۔ آپ کی ملاقات کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے حضرت سیف الدین اپنے جد امجد کی مزار مبارک کی طرف جا رہے تھے، اور اپنی پالکی کے انتظار میں تھے۔ کہ آپ کو دور سے دیکھکر فرمایا مخدومی جد بزرگوار نے آپ کی سفارش فرمائی ہے یہ سن کر آپ فوراً قدم بوس ہوئے اور بیعت کرلی۔ اپنے مرشد سے باطنی فیض حاصل کرلیا، پھر سندھ میں آکر حکم کے مطابق دین کی خدمت انجام دی۔ آپ کی ذات بابرکات سے سندھ کے عوام بہت مستفیض ہوئے۔ تاریخ تحفۃ الطاھری میں آپ کا ذکر اس طرح ہے۔۔

تاریخ تحفۃ الکرام   میر علی شیر قانع۔

تاریخ تحفۃ الطاھرین   صفحہ ۸۔

آن ذات ملک صفات خورشیدِ مرحمت بود کہ بر خلق می تافت و سحاب رحمت بود کہ عالم از رشح عنایتش فیض می یافت۔ ھزاراں مردم عین نظر فیض اثردی بمملک دل راہ بردند و بشغل ذکر خفی بدرجۂ تحقیق رسیدہ ند۔

صاحب تحفۃ الکرام رقمطراز ہیں:۔

"از اجل مشائخ صاحب وقال برامدہ۔ بفیض نکاثر رسانیدہ ھجرتش گم گشتگان بادیۂ خلافت راشاہراہ نجات فائز کرد بسار بزرگ از خدمتش بمقصد رسیدند"

یہ ایک حقیقت ہے کہ مخدوم ابوالقاسم سندھ میں علم و فضل کے علمبردار تھے۔ اور سندھ کے عظیم المرتبت عالم آپ سے بیحد عقیدت رکھتے تھے آپ نے شعبان سنہ ۱۱۳۷ ھجری کو وصال فرمایا کسی نے اس طرح تاریخ وصال نکالی ہے۔

بسال وصل او ہاتف بفرمود ابوالقاسم سراسر نور حق بود

۱۱۳۷ ھجری۔

حضرت مخدوم لعل شہباز قلندر قدس سرہ

حضرت مخدوم شہباز قلندر رح کی شخصیت کو سندھ میں بڑی عقیدت اور احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ کی پاکیزہ زندگی کے حالات اکثر تذکروں میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ آپ کا اسم گرامی سیّد عثمان ہے حسینی سادات میں سے تھے۔ آپ کا نسب[1] مبارک حضرت امام جعفر صادق رض سے ملتا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سیّد کبیرالدین شاہ رح تھا۔ آپ کا وطن مروند تھا، جو آذربائجان کے علاقہ میں ایک گاؤں ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ مروند کے سلطان کی دختر تھی۔

حضرت کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار کے زیر نظر ہوئی۔ قرآن پاک کو حفظ کیا۔ تھوڑے عرصے میں دین کے علوم پر عبور حاصل کر لیا۔ سن شعور کو پہنچ کر بابا ابراہیم ولی قدس سرہ کے معتقد ہوئے۔ جو حضرت جمال شاہ مجرد کے مرید تھے۔ حضرت شہباز قلندر رح نے آپ کی خدمت میں رہکر طریقت کی منزلیں طے فرمائیں اور خرقہ خلافت حاصل کرکے افغانستان کی راہ سے ھندوستان میں آئے۔ اور ملتان سے ہوتے ہوئے سندھ میں تشریف فرما ہوئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ - ۶۸۶ھ) کے دور حکومت میں ملتان پہنچے تھے۔ جہاں سلطان کے لائق فرزند سلطان محمد جس کو تاریخ میں خان شہید بھی لکھتے ہیں۔ وہ ملتان کا گورنر تھا، جو خود بھی ایک نیک سیرت شجاع، مدبر شاعر اور سخن شناس تھا۔ حضرت مخدوم کا بیحد معتقد تھا۔ تاریخ فرشتہ میں اسطرح ذکر ہے:۔

"اس وقت جب سلطان محمد ملتان میں تھے۔ حضرت عثمان مروندی[2] جو اپنے وقت کے بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ ملتان میں وارد ہوئے۔ شہزادہ نے آپ کے ساتھ بڑی تواضع سے پیش آئے۔ خدمت اقدس میں نذر گزاری اور بڑی کوشش کی کہ شیخ موصوف وہیں رہے۔ آپ کے لئے ایک خانقاہ بنانے کا بھی حکم دیا اور بہت سے گاؤں آپ کے نام پر وقف کیئے۔ مگر شیخ نے قبول نہ کیا اور اپنی منزل کی طرف کوچ کیا۔ روایت ہے کہ ایک دن شیخ عثمان مروندی رح کے اشعار سن کر مجلس میں موجود درویشوں پر وجد طاری ہوگیا۔ اور رقص کرنے لگے۔ شہزادہ سلطان محمد آپ کے آگے ہاتھ باندھکر کھڑے ہوگئے اور زار و قطار روتے رہے"

آپ کو علم غیبی سے ارشاد ہوا تھا کہ سندھ کی طرف جائیں۔ لہذا آپ سنہ ۶۶۹ ھجری میں سندھ میں تشریف فرما ہوئے۔ اور سیوستان (سیون) میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور اپنی برکت سے بگڑے ہوئے لوگوں کو سیدھا راستہ بتایا اور اسلام کا نور روشن کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مخدوم شہباز قلندر رح کی شخصیت نہایت بلند تھی۔ اگرچہ آپ میں جلال زیادہ تھا، لیکن آپ نہایت صابر اور شاکر تھے۔ خزینۃ الاصفیا[2] کے مصنف کی یہ زیادتی ہے کہ وہ لکھتے ہیں "شیخ عثمان مروندی رح اولامر ہی تھے۔" اور ملامتیہ مشرب کے تھے" لیکن یہ صریحاً غلط ہے۔ آپ احکام شریعت کے سختی سے پابند تھے، تھوڑے عرصہ میں ھزاروں

---

[1] مخدوم شہباز قلندر۔ مقالہ نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی رسالہ کامل قلندر صفحہ ۶۔

[2] خزینۃ الاصفیا مصنف غلام سرور لاھوری صفحہ ۴۶

حضرت عثمان مروندی رح بن سید کبیر شاہ۔ بن سیّد شمس الدین شاہ۔ بن سید نور شاہ۔ بن سیّد محمود شاہ۔ بن سیّد احمد شاہ۔ بن سیّد ھادی شاہ۔ بن سیّد مھدی شاہ۔ بن سید منتخب شاہ بن سیّد غالب شاہ۔ بن سید منصور شاہ۔ بن سید اسماعیل شاہ۔ بن سید امام محمد۔ بن حضرت امام جعفر صادق رض

انسان فیض حاصل کر کے روشن ضمیر ہوئے مخدوم صاحب عربی، فارسی زبانوں میں اجتہاد کی منزل رکھتے تھے، آپ اپنے وقت کے بڑے شاعر تھے، برٹن، تاریخ سندھ میں لکھتے ہیں[1]

"شہباز قلندر بڑے عالم اور لسانیات، اور صرف نحو کے ماہر تھے۔"

عربی صرف نحو کی کتابیں۔ برٹن کے زمانے میں مروج تھیں، ان میں میزان الصرف اور صرف صغیر مشہور تھیں"

حضرت قلندر لعل شہباز اپنے دور کے بڑے عارف، صاحب کرامات اور شاعر تھے، آپ سے بہت سے اشعار خاص طور پر فقیر قادر بخش بیدل روہڑوی نے منسوب کیئے ہیں جن میں سے چند اشعار نقل کیئے جاتے ہیں۔

ایں قدرت نگر، آن هست هر سو جلوه گر

زان هست عالم سر بسر در هر صفت یکتا بدان

یک نور دیدم در جهان، هم آشکار هم نهان

جر هستی حق سر بسر گز نیا مد در نظر

گاهی چنین گاهی چنان در هر صفت یکتا بدان

حقا چنین دارم خبر، در هر صفت یکتا بدان

قلندر شہباز کے ایک ارادتمند نے ایک قصیدہ بھی آپ سے منسوب کیا ہے جو کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شان میں ہے جس کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں۔

خدا است رب حکیم قدیرا — زالوار خود کرد نور نبی را

محمدؐ نور است سر جلی را — علی شاه عالم امام کبیرا

که بعد از محمدؐ بشیراً نذیراً

مقالات الشعراء میں آپ کے دو غزلیں نظر آتی ہیں جو مشہور ہیں۔

ز عشق دوست هر ساعت درون نار می رقصیم

گهی بر خاک می غلطم گهی بر خار می رقصیم،

بیا اے مطرب مجلس اسماع ذوق را در ده،

که من از شادی وصلش قلندر وار می رقصیم

شدم بدنام در عشقش بیا اے پارسا! اکنون،

نمی ترسم ز رسوائی. بهر بازار می رقصیم

صدا خلق گوید. گدا، چندین چه می رقصی،

بدل دارم اسرارے ازان اسرار می رقصیم.

منم عثمان مروندوی که یار خواجه منصورم

ملامت می کند خلقے و من بردار می رقصیم.

---

[1] تذکرہ صوفیاء سندھ مصنف اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۲۰۳

[2] تذکرہ لطفی "تاریخ ادبیات سندھ" مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۸۵۔ [3] مقالات الشعراء میر علی شیر قانع

دوسری غزل کی مطلع ہے۔

من ان درم کہ در بحر جلال اللہ بود ستم
بکوہ طور با موسیٰ کلیم اللہ بود ستم

اس عظیم شخصیت نے اپنی پوری زندگی تجرد میں گذاری اسلیئے اپ کو کوئی اولاد نہ ہوئی. آپ نے سال ۲۱ شعبان ۶۷۳ ہجری مطابق ۱۲۷۴ء کو وفات فرمائی. آپ کا مزار مبارک سیہون شریف میں ہے جہاں ہر سال ہزاروں کے تعداد میں لوگ بڑی عقیدت و احترام سے برسی مناتے ہیں. مولانا ضیائی سیوستانی آپ کی عقیدت میں لکھا ہے

نیست آزاسیب دوراں مرسیوستان را نہیب گرچہ آید زیر طوفان جملہ عالم فی المثل
کشتیٔ نوح ست گویا شاہ دو مے ہمچو نوح منکراں را تیرو چوب از دوری اہل دل است
غافلاں را میکند ہشیار از روز آزل.

زمانے کے مصائب سے سیوستان کو کوئی بھی خوف نہیں ہے. اگرچہ پورا جہان مثال کی طور پر کسی طوفان کے زد میں کیوں نہ آجائے. شاہ گویا نوح علیہ السلام کی طرح ہے اور سیہون حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ہے. منکر کو تیر اور لاٹھی سے شرمندہ اور دور رکھتا ہے. آپ کے نوبت کی اواز اہل دل کے لیئے بڑی معنیٰ رکھتی ہے. غافلوں کو روز ازل کا انجام یاد دلاتی ہے.

اپ کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکلتی ہے

چون عثمان ولی از دار دنیا
برفت وباب جنت شد برُو باز
ز مخدوم اجل جوۓ ارتحالش
بفرما عارف محبوب شہباز.

آپ کا روضہ مبارک فیروز شاہ کے عہد حکومت میں ملک رکن الدین والی سیوستان نے تعمیر کرایا تھا بہرحال سندھ کی پاک زمین کو یہ شرف ہے کہ ایسا کامل ولی، صوفی، اپنی زندگی کا آخری سال گذار کر ہمیشہ کے لئے سندھ کا ہوگیا

حضرت مخدوم نوح ہالائی[2]

آپکا اسم گرامی لطف اللہ، لقب مخدوم نوح[2] تھا. آپ کے والد بزرگوار حضرت مخدوم نعمت اللہ ہالاکنڈی کی مقدس شخصیت تھی. آپ کے اباؤ اجداد کوٹ کرور (ملتان) میں آباد ہوئے تھے. جن میں حضرت شیخ ابوبکر کتابی[2] اپنے وقت کے عظیم المرتبت صوفی اور درویش تھے. شیخ ابوبکر کتابی[2] کا سلسلہ نسب امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاکر ملتا ہے. بزرگ شیخ کے صاحبزادے مخدوم فخر الدین کبیر، سیر و سیاحت غرض سے سندھ میں سیوستان کے قریب[3] تشریف لائے تھے اور وہاں سکونت اختیار کرلی تھی. وہیں وفات پائی. آپ کے خاندان سے ایک اور بزرگ حضرت فخر الدین صغیر ہالا کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں نے بڑی عزت اور احترام کیا اور ان لوگوں کے اسرار پر ہالا میں مستقل سکونت اختیار کی. مخدوم صاحب کی کرامتوں کی بڑی تفصیل ہے، جس کا ذکر تحفۃ الکرام اور حدیقۃ الاولیا میں ملتا ہے.

---

[1] قلندر شہباز "مقالہ نگار" مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی رسالہ کامل قلندر صفحہ ۱۲.

[2] تذکرہ صوفیائے سندھ مرتب اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۲۸۵ [3] اس جگہ کو آج بھی بوبک کہتے ہیں.

مخدوم نوحؒ اپنے وقت کے بڑے صوفی اور بلند مرتبت عالم تھے، آپ نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا، جس کو ہندوستان میں اولیت کا شرف حاصل ہے. آپ سے پہلے شیخ سعدیؒ اور ملا حسن کاشفی نے فارسی زبان میں قرآن پاک کے ترجمہ کئے تھے. آپ کے بعد علامہ شہاب الدین دولت آبادی اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے فارسی میں ترجمہ اور تفسیر لکھا.

روایت ہے، آپ نے ابتدائی تعلیم اور قرآن پاک کی تعلیم مخدوم عربی دیانہؒ سے حاصل کی تھی. مخدوم جان محمدؒ سیوستانی نے بیان کیا ہے "ایک مرتبہ سید حیدر شاہ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد مسجد میں لیٹے ہوئے تھے کہ وہاں مخدوم نوحؒ تشریف فرما ہوئے. ان کو لیٹے ہوئے دیکھکر فرمایا "اقم الصلوۃ الذکری" (اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے کھڑے ہوجاؤ) سید حیدر شاہ نے آپ سے پوچھا "من علمک" (آپ کو کس نے تعلیم دی) آپ نے فرمایا "علمنی ربّی" (مجھے میرے رب نے سکھایا) دلیل الذاکرین میں یہ حقیقت واضح نظر آتی ہے، جس کی روایت حضرت جلال الدین. جلال محمدؒ نے کی ہے کہ حضرت نوحؒ سے سنا تھا کہ آپ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ نے مجھے چار چیزیں سکھائیں. ۱. کلمہ طیب "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" جس کی میں تلقین کرتا ہوں. ۲. قرآن مجید. جس کی میں معانی اور تفسیر بیان کرتا ہوں، تبری ۳. خواب کی تعبیر، مجھے عالم غیب سے خواب کی تعبیر کا علم بخشا. اس لئے کہتے ہیں کہ علوم باطنی میں حضرت نوح بظاہر کسی کے مرید نہیں تھے. ۴. علم حدیث عطا فرمایا.

تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ آپ بہت گریز فرماتے تھے پھر بھی آپ کے ملفوظات موجود ہیں جن میں آپ کے اقوال اور دلائل بڑی کثرت سے نقل کئے گئے ہیں. آپ کے سندھی زبان میں ابیات نظر آتے ہیں جس کا ذکر مخدومی پروفیسر لطف اللہ بدوی نے اپنی تصنیف تذکرہ لطیفی حصہ اول میں کیا ہے. جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو شعر و شاعری سے بھی کتنا شغف تھا.

حضرت مخدوم نوح ۸۸ سال کی عمر میں ۲۷ ذی القعدہ سنہ ۹۹۸ ہجری میں رحلت فرمائی حدیقۃ الاولیاء[1] میں آپ کی وفات کا ذکر اس طرح ملتا ہے

"حضرت مخدوم وقت روز پنجشنبہ وهفتم ماہ ذی القعدہ رحلت فرمودہ بودہ. حقیر و فقیر این لفظ در تاریخ وی گفتہ بود. "شیئی بنوح بود" در سنہ ۹۹۸ ہجری از خم خانہ وحدت ذوالجلال لقائی حضرت احدیہ برکف وبنوشید وبعشرت سرای بہجت رضوان، بجز امید و بقدوم مسرت الزوم روحانیا را مژدہ کافی رسانید."

آپ کا مزار مبارک ہالا میں مرجع خاص و عام ہے.

مخدوم عربی دیانہؒ

مخدوم عربی دیانہؒ اپنے وقت کے عالم اور صاحب کرامات بزرگ تھے، آپ کا ذکر تحفۃ الکرام[2] اور حدیقۃ اولایا میں ملتا ہے یہ بلند مرتبت شخصیت، مجذوب پیراسات کے بھائی تھے جو مخدوم جونپوری کے معتقد تھے. آپ بڑے عبادت گذار تھے. مخدوم عربیؒ زہد و تقویٰ میں بہت بلند مقام کے حامل تھے. میر علی شیر قانع لکھتے ہیں. کہ آپ کو تلاوت کلام پاک سے بڑی محبت تھی. ایک نشت میں چالیس مرتبہ قرآن پاک کے ختم پورے کرتے تھے. قدرت نے آپ کو خوش الحانی سے نوازا تھا، جب تلاوت فرماتے تھے، تو پرندے اُڑنا چھوڑ دیتے تھے اور پانی کا بہاؤ ٹھر جاتا تھا.

ایک دن کا ذکر ہے کہ آپ اپنی خانقاہ میں عبادت الٰہی میں مشغول تھے کہ آپ کے ہاتھ سمندر کی جھاگ سے تر ہوگئے اور اس سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے. ایک مرید جو اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر تھا، یہ دیکھکر حیران ہوا اور اس حقیقت کے متعلق عرض کیا، آپ نے فرمایا، میرا بیٹا بایزید میرے چند مریدوں کے ساتھ حجاز جبکہ سمندر میں ایک کشتی میں سوار تھے کہ اچانک بھنور میں پھنس کر کشتی ڈوبنے لگی. میرا بیٹا مجھ سے رجوع ہوئے چنانچہ اس کشتی کو بھنور سے نکال کر کنارے پر لگایا ہے. اس وجہ سے میرے ہاتھ سمندر کی جھاگ سے تر ہوئے. آپ نے سنہ ۹۸۰ ہجری کو ہالا میں وفات کی.

---

[1] حدیقۃ الاولیاء مصنف سید عبدالقادر بن سید ہاشم - صفحہ ۱۳۹ [2] تاریخ تحفۃ الکرام صفحہ ۱۵ جلد ۳

حضرت شاہ خیرالدین شاہ جیلانیؒ

حضرت شاہ خیرالدین شاہ جیلانی قدس سرہ، سیدنا حضرت غوث اعظم دستگیرؒ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حضرت احمد بغدادیؒ تھا۔ حضرت صاحب بغداد میں سنہ ۹۱۱ ہجری کو تولد ہوئے۔ بچپن میں بغداد سے مکہ کی طرف تشریف لے گئے۔ وہاں چودھاں سال رہکر علوم کی تحصیل کی۔ بعد میں وہاں سے سندھ میں تشریف لے آئے۔ اور مخدوم نوح بکھریؒ کی صحبت میں رہکر رشد و ہدایت حاصل کی سکھر میں ایک پہاڑی پر بیٹھکر عبادت الہی میں مشغول ہوئے۔ آپ کی کرامات اور عبادت کا چرچہ عام ہوا، ہزاروں کے تعداد میں لوگ آپ کے مرید ہوگئے جن میں اکثر صاحب کمال کے درجہ پر ہوگئے آپ کے مناقب، دلیل الذاکرین، اور مقولے مبارک پیر سید محمد راشد کے ملفوظات میں موجود ہیں۔ دلیل الذاکرین سے نقل ہے کہ ایک مرتبہ شاہ صاحب نے اپنے فرزند کو عبادت الہی کی تلقین کی جو برداشت کرنہ سکے اور رحلت کرگئے۔

آخری زندگی کے ایام میں اس پہاڑی سے اُتر کر اس جگہ آئے جہاں آپ کا مزار ہے۔ وہ زمین ترخان خاندان کے مغلوں کی تھی جو آپ کو نذرانہ کی طور پر دیدیگئی تھی آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ وہاں مقیم ہوئے۔ آپ نے ۲۷ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۰۲۷ ہجری میں رحلت فرمائی۔ آپ بڑے صاحب دل صوفی اور صاحب شریعت تھے۔ آپ کے خلفاء میں سید نصیرالدین متعلوی تھے جنہوں نے آپ کی وفات کے بعد حضرت نوح بکھری کے خلیفہ یحیٰی رانڈیہ کی صحبت میں رہکر فیض حاصل کیا۔ شاہ صاحب کی خدمت میں فقیر سدھو اور فقیر جمال الدین ہمیشہ رہتے تھے۔ آپ کی تاریخ وفات اس قطعہ کے آخری مصرع سے نکلتی ہے۔

شاہ خیرالدین مہ برج شرف
مقبل درگاہ ایزد سرمدی
سال تاریخ وصالش عقل گفت
مرشد کامل طریق احمدی
۱۰۲۷ ہجری

آپ کی درگاہ پرانے سکھر میں ہے جو مرجع خاص و عام ہے۔ پیاسے اپنی پیاس بجھانے آتے ہیں، ہر سال ۱۱ ربیع الاول پر بڑے احترام سے گیارھویں منائی جاتی ہے۔ آپ کے مزار پر نیلا گنبذ ہے جو دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس خوبصورت گنبذ کو سنہ ۱۱۷۴ ہجری میں آپ کے مرید لوہر مجاور کی کوشش سے تعمیر ہوا۔ سید اسد اللہ ساقی معصومی، جو میر محمد معصوم بکھری کے پوتے تھے، اس گنبذ کی تاریخ لکھی، جو اس طرح ہے۔[1]

شہ خیرالدین سرور سالکان
ولی خدا زبدہ عارفان
زہی روضہ آش مظہر نور حق
بیا بہر فیض زیارت کنان
رسیدش بنا روضہ نو نشان
چون ساقی طلب کرد تاریخ آن
بگفتا خرد درگہ فیض دان
۱۱۷۴ ہجری

قاضی قاذنؒ

قاضی قاذن بن ابوالخیر ابو سعید بن قاضی زین الدین سیہون سندھ کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد اور جد حضرت قاضی ابوالخیر اور قاضی زین الدین

[1] اخبار الوحید ازاد سندھ نمبر صفحہ ۱۲۹

بکھر کے رہنے والے تھے۔ جہاں سے ہجرت کرکے سیہون میں سکونت اختیار کی۔ قاضی قاذن کی ابتدائی تعلیم والد کے زیر سایہ ہوئی حفظ قرآن کے بعد علم منقول و معقول کی طرف رجوع ہوئے، بعد میں علم تصوف میں کمال حاصل کیا، آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سفر میں گذرا علمی شوق کے غرض سے سیہون سے ہجرت کرکے دربیلے اور بکھر آکر رہے، بکھر میں تھوڑے عرصے میں آپ کی علمی شہرت بڑھتی گئی۔ جس کی وجہ سے وقت کے حکام میں بھی عزت ہونے لگی۔ جوانی کے زمانہ میں سید میران محمدؒ شاہ مہدی جونپوری جو ہندوستان کے مشائخ میں سے تھے سندھ میں تشریف لے آئے تو قاضی صاحب ان کے ارادتمندوں میں داخل ہوگئے۔ سندھ کے اکثر علماءؔ قاضی قاذن سے اس بات پر ناراض رہے، لیکن وہ پوری زندگی مہدویہ طریقے کے مقلد رہے۔ جام نظام الدین سمہ (۸۶۴ھ - ۹۱۴ھ) کے زمانے میں بکھر کے قاضی مقرر ہوئے اور جام فیروز کے زمانہ تک اس عہدہ پر رہے۔ مرزا شاہ بیگ ارغون نے جب جام فیروز سے سندھ کے جنوبی حصہ کو فتح کرلیا، تب قاضی صاحب سے یہ عہدہ واپس لے لیا۔ شاہ بیگ ارغون کی وفات کے بعد جب ان کے فرزند شاہ حسین ارغون اور جام فیروز کے درمیان صلح ہوئی تو قاضی صاحب جام کی طرف سے مرزا کے یہاں ایلچی مقرر ہوئے۔ لیکن جلد ہی یہ صلح ختم ہوئی اور دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی جام شکست کھاکر گجرات چلے گئے اور قاضی بکھر میں جاکر مقیم ہوئے۔ شاہ حسین نے آپ اس عہدے کی پیش کش کی، لیکن قاضی صاحب نے بڑی عمر کی وجہ سے انکار کردیا۔

قاضی قاذنؒ اپنے دور کے نہ صرف عالم تھے بلکہ اہل طریقت بھی تھے۔ آپ کی منزل اور مرتبہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا کلام سندھ کے جید عالم صوفی حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی والے اپنی کتاب ملفوظات۔ بیان العارفین میں درج کیا ہے۔ آپ کے سندھی زبان میں صرف سات ابیات موجود ہیں۔ اسکے علاوہ بیان العارفین میں ایک روایت نظر آتی ہے جو اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتی ہے:-

شاہ عبدالکریم بلڑی والے فرماتے ہیں، ایک دن ایک ملامتی درویش قاضی صاحب کی مسجد میں محرابؔ کی طرف پاؤں پھیلا کر سوئے ہوئے تھے۔ قاضی صاحب کو جب ان کی اس حرکت کا پتہ چلا تو ایک ڈنڈا لے کر مسجد میں آیا، ان کی پاؤں کی طرف کھڑے ہوکر ڈنڈا مارنے کا قصد کیا تو پاؤں کی جگہ ان کا سر نظر آیا، اسطرح دو مرتبہ ڈنڈے مارنے کی کوشش کی لیکن وہی کیفیت رہی۔ قاضی صاحب نے یہ حالت دیکھکر بیحد پریشان ہوا۔ اس درویش نے قاضی صاحب کو کہا پاؤں جس طرح چاہو کرلو، مگر دل اپنے خالق کی طرف ہونا چاہئیے۔ یہ سنتے ہی قاضی صاحب کی آنکھیں کھل گیں۔

قاضی صاحب سندھ کے پہلے شاعر تھے جنہوں نے سندھی زبان میں شعر کی بنیاد رکھی اور تصوف کی باریکیوں کو پیش کیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

میں نے جو کچھ علم حاصل کیا، وہ میرے لئے بلائے جان بن گیا ہے   وہ حروف اور الفاظ بلائیں بنکر نگلنے کیلئے دوڑے آرہے ہیں۔

دوسری زبان کی طرح سندھی زبان کا تحریری اوائلی سرمایہ۔ شعر کی صورت میں موجود ہوا۔ یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ سندھی زبان کا بنیادی شعر قاضی قاذن سے شروع ہوا[1] آپ کے کلام میں خدا شناسی کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ سندھ کے ادیبوں نے آپ کا ذکر کیا ہے۔ قاضی فیض سومرو نے انگریزی زبان میں نہایت شستہ طریقے سے لکھا ہے[3]

---

[1] مہدوی تحریک، ہندوستان سے شروع ہوئی، اور تاریخ میں مہدویہ تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ جو اپنی اوائلی شکل میں مسلمانوں میں جرمن نو بیداری پیدا کرنے کے لئے ایک درویشانہ تحریک تھی۔ اس کے بانی سید میران محمد مہدی جونپوری تھے۔ ان کی ولادت جونپور ہندستان میں سنہ ۸۴۷ ہجری کو ہوئی تھی۔ سنہ ۸۷۰ ہجری سے ۲۳ سال دنیا کے مختلف حصوں میں سیاحت کرنے بعد سنہ ۹۱۰ ہجری کو قندھار کے نزدیک فراہ میں وفات کی۔ قندھار جانے سے پہلے سندھ میں بھی رہے اور ان کا قیام ٹھٹھہ اور ٹھٹی کے شہر میں ہوا قاضی قادن ان کے ارادتمند ہوئے۔

[2] تذکرہ لطفی جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۱۲۵۔

[3] Kazi Kazan of Sewhan was the first Sindhi poet, who introduced philosophy and mysticism in Sindhi poetry. His first seven verses are full of its. He has in his poetry laid great emphasis on the purity of Mind and the study of Self. In one of his verses he says. "Even if you master thoroughtly the great Arabic work QUDOOR and QAFIA you will only be like an Art sitting with in a well in limited enviroment knowing nothing of the world out side ....

Mysticism dominates Sindhi Poetry by
(Faiz Mahammed Soomro)

باب چہارم

تصوف اور شاہ عبداللطیف بھٹائی رح

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح سندھ کی وہ برگزیدہ شخصیت تھی جن کے کلام میں ہدایت کے سواء اور کچھ نظر نہیں آتا۔ حضرت سعد بن ہشام رض سے روایت ہے[1] ہیں۔ "ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رض کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، آنحضرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق کیا تھا؟ آپ نے فرمایا، تو قرآن پڑھتا ہے، میں نے جواب دیا ہاں، میں قرآن پڑھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا پورا قرآن کریم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق ہے۔ جو شخص قرآن پاک جیسی عظیم کتاب لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اس کو خود اس کا عملی نمونہ ہونا چاہئیے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلعم نے مکہ کے کفاروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"تحقیق میں نے آپ کے اندر، اس سے پہلے اپنی زندگی گذاری ہے۔ آپ اپنے عقل سے کام نہیں لیتے۔ اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہو سکتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے اور ان کے آیات کا انکار کرے، تحقیق وہ مجرم ہے اور کبھی بھی چھٹکارہ حاصل نہ کریگا۔"

اس حدیث مبارک کو پڑھتے ہوئے حق و باطل کی کسوٹی ہمارے سامنے آجاتی ہے، اور اپنے عقل سلیم سے اُمت مسلمہ بھی اسی طرح اپنے نبی ص کی تقلید کی۔ شاہ بھٹائی کی زندگی درویشانہ اور متوکلانہ بسر ہوئی تھی۔ اس کا ثبوت، آپ کے عظیم کلام سے ہمیں وضاحت سے ملتا ہے، اپنے کلام کے لئے خود فرماتے ہیں:-

جي تون بيت ڀانئين، سي آيتون آهين
نيو من لائين پريان، سندي پار ڏي.

(ان ابیات کو ابیات نہ سمجھ، یہ قرآن کی آیتیں ہیں جو دل کو محبوب (خدا تعالیٰ) کی طرف لے جاتی ہیں)

اس دعوے کا صحیح ہونا یا نہ ہونا، وہ کسوٹی آپ کا غیرفانی کلام ہے، کیوں کہ آپ کے متبرک کلام کا ہر ایک حرف، خدا تعالیٰ کی ذات میں سرشار نظر آتا ہے حافظ شیرازی علیہ رحمت فرماتے ہیں:-

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
ز ہرچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

میں اس شخص کی ہمت کا بندہ ہوں، جو اس آسمان کے نیچے ہر ایک ایسی بات سے جس میں کسی کے میلان سے قلب پر زنگ آجائے اور آزاد ہو۔

شاہ بھٹائی اس قبل میں فرماتے ہیں:-

صوفي سالم سي ويا، جي اکثر جن آڌبار
بازي بازندن کي، آهي اويسار
پرين سين پڪار، رندي رسائي ڪنا

(اس دنیا سے وہ صوفی سلامت گئے، جو کثرت سے لاتعلق رہے، محبت کے کھیل کھیلنے، اس رندی یعنی بے تعلق نے انکو عشق حقیقی کی آخری منزل پر پہنچایا۔)

---

[1] اسلامی تصوف اور بھٹائی رح (مقالہ) مقالہ نگار راقم حروف رسالہ نئیں زندگی (سندھی) ماہ اپریل ۱۹۷۱ء۔

اسلامی تصوف کا اصل حاصل کیا ہے؟ قرآن حکیم اور اُنکا عمل۔ حضور صلعم کی ذاتِ مقدس "والذین معہ" کا حسین کردار۔ حافظ شیرازی رح اسکا بیان یوں ادا کرتا ہے

صبح خیزی، و سلامت طلبی چون حافظ
ہرچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآن کردم۔

(صبح خیزی کی سلامتی کو جب تو طلب کرتا ہے حافظ۔ تو یہ جو تجھکو حاصل ہوا ہے وہ قرآن حکیم کے بدولت حاصل ہوا ہے۔)

شاہ لطیف فرماتے ہیں:-

جيئي ۾ جبار، جو کڻني خيمو ڪوٺ
جلي تون زبان سان، چارئي پهر چوءِ
فڪر سين فرقان ۾، اسم اعظم ڏور
ٻيا در وڃي مَ لوڙ، اِيءَ آمل آهئين سڀيئي.

{ اپنے دل میں رب جبار کا ذکر مخفی کرتا رہ۔ اپنی زبان سے بھی چاروں وقت ظاہری ذکر کر
قرآن پاک سے اپنی فکر سے اسم اعظم کو حاصل کر دوسرے دروازوں پر مت جا۔ یہ سب چیزیں ان سے ہی حاصل ہوگی۔ }

اسلامی تصوف کی بنیاد کو ان دونوں بزرگوں نے قرآن حکیم کو ہی سمجھا ہے جو اپنے شیریں کلام کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے کلام کا مطالع کرنے والا ان کے کلام کو الہامی کہتے ہیں۔ اگر یہ حقیقت صحیح ہے۔ تو ہمیں قرآن حکیم کو اسلامی تصوف کا بنیاد تصور کرنا چاہئے۔ کیوں کہ قرآن پاک میں شروع سے لے کر آخر تک "توحید" نظر آتی ہے۔ انکے پرجلال دعوے سے کون انکار کر سکتا ہے قرآن پاک کا ارشاد اعلیٰ ہے۔

کہدے یہ وہ راستہ ہے جو اللہ کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ پوری بصارت ہے۔ میں اور آپ انکے تابع ہیں
تعریف کے لائق ہے اللہ۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت پوری بصیرت ہے۔ قلب اور دماغ کی روشنی ہے۔ شیخ فرید الدین عطار رح فرماتے ہیں۔

ہرکہ نا دیدہ نام او رگوید شرک است اں فضول نا ہنجار

جو بن انکھ دیکھنے کے سوائے اُنکا نام لے۔ وہ شرک ہے فضول ہے اور ملامت کے لائق ہے۔

قادر کریم کا نظارہ کیا ہے؟ وہی ذکر و فکر کی دعوت جو بصیرت ہے۔ حضرت محی الدین ابن العربی رح مشہور صوفیوں کے رہنما کا قول ہے۔

لفی کل شیئٍ لہ آیۃ تدل علیٰ انہ واحد

"ہر چیز میں انکی شان موجود ہے، جو اس بات کی دلیل ہے وہ ایک ہے"

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کا مفہوم، حضرت محی الدین ابن العربی رح کے شعر سے واضع نظر آتا ہے۔ اس شعر کی اس سے زیادہ تشریح اور ہو نہیں سکتی، ہر چیز میں پالنے والے کی شان موجود ہے۔ جسے دیکھکر صرف خاموش اور استعجاب رہ جاتا ہے، اور آفاق کی پوری سیر، نفس کی سیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شاہ بھٹائی رح کے کلام میں ہمیں توحید کا مفہوم اتنا صاف نظر آتا ہے۔ جس کے بیان کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اُسکی حقیقت میں ہر چیز لاحد ہے۔ خود فرماتے ہیں:-

وحده لا شريڪ له، اِيءَ ميڪتائي حق.
ٻيائي کي ٻڪ، جن وڌو، سي ورشا.

اللہ تعالیٰ کی ذات واحد ہے۔ اُنکا کوئی شریک نہیں۔ یہ وحدانیت حق ہے   نفاق کو جس نے نفرت سے گرفت میں لیا۔ اس کو ہر چیز حاصل ہوئی۔

ایک کامل صوفی اور ارباب ہمت کی حیثیت میں تصوف کی بنیادی تعبیر میں شاہ بھٹائی نے اپنی غیرفانی تبلیغ کی وضاحت کر دی ہے۔ وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی توحید کا انکار کرتے ہیں وہ محروم اور گمراہ ہیں۔ تصوف والوں کے یہاں اس تعبیر کی تکمیل تب ہوتی ہے جب کہ توحید کے ساتھ رسالت کا بھی اقرار کرنا ضروری ہو۔ شاہ لطیفؒ "حقیقت محمدیؐ" کی تبلیغ اس طرح فرماتے ہیں:-

وحدہٗ لا شریک لہٗ، جڏهن چيو جن
تن مڃيو محمدؐ ڪارڻ، ميجان ساڻ جين
تڏهن منجهان تن، اوتڙ ڪنهن نه لوڙيو۔

اللہ کی ذات پاک، واحد ہے۔ اُسکا کوئی شریک نہیں ہے جنہوں نے یہ مانا۔ اُنہوں نے دل کی خوشی سے حضرت محمد صلعم کی ذات گرامی کو بھی مانا جن کی ذات پاک کے لئے جہان پیدا کیا۔ جس نے مانا اُنہوں نے منزل مقصود حاصل کی۔

علامہ نجم الدین محمود شبستری، جو اکابر صوفیوں میں سے تھے۔ یہ ہی حقیقت بیان فرمائی ہے:-

محقق راکہ از وحدت شہود است   نخستین چشم بر نورِ وجود است
ولے کز معرفت نورِ صفا دید،   زہر چیزے کہ دید اول خدا دید۔

وہ محقق جس نے وحدانیت کو دیکھا ہے۔ سب سے پہلے اُن کی آنکھ وجود کی نورانیت پر ہے لیکن جب اُنکو معرفت کے راستے، نور کی صفائی نظر آتی ہے تو وہ ہر چیز میں خدا کو دیکھتا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:-

صوفي صاف ڪيو، ڌوئي ورق وجود جو
تهان پوءِ ٿيو، جيئري پسڻ پرينءَ جو.

"صوفی نے اپنے وجود کے ورق کو دھو کر صاف کیا،   اس کے بعد اُن کو حیات میں محبوب کا دیدار نصیب ہوا۔"

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:-

آئینۂ دل چون شود صافی و پاک
نقشہا بینی برون از آب و خاک

دل کا آئینہ اگر صاف و پاک ہو جائے تو مٹی اور پانی والی چیز میں سے عجیب نقش نظر آنے لگتا ہے

مگر یہ وجود کا ورق کس طرح صاف ہو اور وہ تصوف کا مرحلہ کس طرح پورا ہو جائے اس کے لئے مشہور صوفی محمدؐ بن احمد العکری فرماتے ہیں، تصوف حق کی حالت پر استقامت اختیار کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے صوفی اپنے آپ کو ظاہری و باطنی طور پر دیکھتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اُن کو حق کا مشاہدہ ہو۔ رومیؒ کا تصور کتنا واضح ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ایک عظیم صوفی کی حیثیت سے اپنے کلام میں ہر منزل پر یہ تلقین فرماتے رہے ہیں کہ انسانی حرص جس بھی رنگ میں ہے وہ مذموم ہے۔ اُس سے عجیب عجیب برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر تو چاہتا ہے کہ ذات مطلق کے لئے تجھے مکمل طور سے علم ہو جائے تو سب سے پہلے اپنے وجود کو فنا کر دے۔

اعتبارات ہمہ اوہام اندر   تو عدم باش وجود این جا نیست۔

"اس عالم کا پورا اعتبار محض خیال ہے، تو اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھ کیوں کہ اس کے وجود کی کوئی بھی حقیقت نہیں ہے"

محبت الہی کے لئے سب سے پہلی چیز ہے "خود کو فنا کرنا" اس کے بعد ہی حال حاصل ہوگا. اِن دونوں چیزوں کو ہم بھٹائی رح کے کلام میں اوزاط سے دیکھتے

ہیں. وہ ہمیں ایک سالم صوفی نظر آتے ہیں. اور اُن کا پورا حال وقال نظر آتا ہے. بھٹائی رح حضرت مولانا رومی رح کے فکر سے متاثر ہیں. اس لئے آپ

کی آواز بھی وہی ہے. "قال را بگذار مرد حال شو" حضرت عبدالقدوس گنگوہی رح کے مطلق کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے فرزند کو سلوک

کی تعلیم دیتے ہوئے اُن کے سینہ کو اُنگلی سے مس کیا، فرزند نے عرض کیا، "میرے سینے میں قرآن پاک ہے" آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہے، میں

تیرے سینے سے یہ خیال نکالنا چاہتا ہوں، کہ تو قرآن کا حافظ ہے" اگر علم فخر اور غرور سکھاتا ہے تو، اس حرص کو پامال کرنا چاہیئے"

شاہ صاحب اس قبیل میں فرماتے ہیں:-

اکر پڑھ الف جو، ورق سب وسار

آندر تون اُجار، پنا پڑھند بن کیترا.

سبق پڑھ الف کا، اور دوسرے اوراق کو چھوڑ دے، اپنے سینے کو صاف کر، تو کتنے اوراق پڑھوگے.

مولانا جلال الدین رومی رح فرماتے ہیں:-

صد کتاب و صد ورق در نار کن

خفتہ دل را یک دمے بیدار کن.

شاہ بھٹائی رح فرماتے ہیں:-

تہ کھٹي کبو کوھ، جو رٺي رھيو نہ سپرين

کھٹنے کو کیا کرینگے، جب کہ میرا محبوب ہی نہ رہا.

اس رہنے کے لئے خاقانی رح کا قول ہے.

یک دم با خدا بودن بہ از ملکِ سلیمانی.

"ایک دم خدا تعالیٰ سے ہونا. حضرت سلیمان کے ملک سے بہتر ہے"

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح اسلامی تصوف کے بڑے عارف تھے علامہ قادر بخش بیدل روہڑوی (سندھ) نے شاہ لطیف رح

کے عظیم رتبے کی تعریف اپنی مشہور مثنوی "دلکشا"[1] میں اس طرح کی ہے.

آن سر آمد عارف و شاہِ عشق — رہبر عشاق حق در راہِ عشق،

موجہائے منطقش دریائے راز — بیت بیتش ساغر صہبائے راز.

بیت اُو نے بیت بل اقلیم وجد — مومنِ توحید را تسلیم وجد.

حرف حرفش سر صبر سوز و گداز — لفظ لفظ او حقیقت خوش مجاز

گر تو آری بر زبان اسم شریف

عبد را گردان معانی با لطیف

---

[1] مثنوی "دلکشا" مسودہ من تصنیف حضرت قادر بخش بیدل رح روہڑی سندھ

"وہ عارفوں کے پیشوا اور عشق کے شاہ، جو عشق کی راہ میں، حق کے عاشقوں کا رہبر ہے، آپ کی گفتگو کی موجیں راز الٰہی کے دریا میں سے ہیں، آپ کے کلام کی ہر ایک بیت میں راز الٰہی کی شراب کا پیالہ ہے، اُن کے ابیات، ابیات نہیں ہے بلکہ وجد کی ولایت ہے۔ توحید پر ایمان رکھنے والوں کے لئے تسلیم و رضا کا وجد پیدا کرنے والا ہے، آپ کا ہر ایک حرف مکمل سوز و گداز ہے اور آپ کا ہر لفظ انکی حقیقت ہے، اور پسند بدہ مجاز، اگر تو ان کا نام اپنی زبان پر لانا چاہتے ہو تو، عبد کو لطیف سے ملا دو، یعنی "عبد اللطیف"

شاہ لطیف وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی فکر کے قائل تھے جن کی مثال آپ کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ یہ فکر آپکو اپنے طریقہ سے حاصل ہوا، آپ کے کلام میں وحدت الوجود کے نکتے موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شعر و شاعری صرف اس حقیقت کی تبلیغ ہے، اور بس، ایک فارسی کے شاعر شوکت بخاری کہتے ہیں

غریق بحر وحدت، جلوۂ کثرت نمی بیند

زیر آب نتوان دید، موج آب دریا را۔

("وحدت کے سمندر کا غریق، کثرت کے جلوہ کو نہیں دیکھتا، کیوں کہ پانی نے نیچے پہنچنے کے بعد لہروں کو کس طرح دیکھے گا۔")

شاہ لطیف جس مرکز کے تابع تھے۔ وہ نظریہ وحدت الوجود تھا، جو کہ آپ کے یہاں کمال پر پہنچ گیا تھا، توحید کے لئے شاہ صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ وجود واحد ہے، وہی موجود ہے، اور مخلوقات کے وجود میں امتیاز کا قائل ہے، وہ اس حقیقت کے ادراک سے ناآشنا ہے جو خود اس کی ذات کے اندر موجود ہے۔

یہ جہان، حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے، لیکن خدا تعالیٰ کی صفات کا اظہار ہے، اس کے ہر ذرہ سے ان کا جمال عیاں ہے۔ ایسی جمیل چیز میں کسی فتنی کی ضرورت نہ تھی، لیکن ایک فتنی کے وجود کو بھی لایا گیا۔ اس کے بعد اس سے کنارہ کرنے کا حکم، کتنا پریشان کن ہے۔ اس کے متعلق شاعرانہ شوخی کے ساتھ کتنا عجز کا اظہار کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر خدا تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ رہتا تو انسان، اس دنیا کے فتنی سے کہاں تک بچ سکتا۔ شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں:

مون کي مون پرين بڌي وڌو پار ۾

مٿون آئين چون، تہ متان پانہ پسائين۔

(میرے محبوب نے مجھے باندھکر پانی میں ڈالا اُپر سے کہہ رہا ہی دیکھنا کہیں دامن نہ بھیگ جائے۔)

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٖ

بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش۔

شاہ بھٹائیؒ ابتدائی زندگی سے وحدت الوجود کے قائل تھے۔ بتدریج جیسے جیسے غور و فکر بڑھتا گیا، تو رنگ بھی پختہ ہوتا گیا، آپ حضرت مولانا رومیؒ کے مقلد تھے۔ اس لیئے وحدت الوجود کے رنگ سے کبھی آزاد ہو نہ سکے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے اس مسئلہ کو وضاحت سے پیش کیا ہے، فرمایا ہے۔

"وجود حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، اور عالم کا کوئی بھی وجود نہیں ہے"

آپ کے نزدیک "عالم" اور "خدا" کی نسبت "عینیت" کی نسبت ہے، اس "عینیت" کا اثبات یا تو "وجود عالم" کی نفی سے کرتے ہیں یا "خدا" کے اثبات سے

ابوالحسین نوریؒ فرماتے ہیں:۔ "تصوف نہ تو کوئی قانون ہے نہ کوئی اصول، لیکن یہ از خود موجود ہے"

تاریخ تصوف اسلام صفحہ ۳۰۷

شاہ لطیف کی صحبت صوفیوں سے ہوتی تھی جن سے وحدت الوجود کا زیادہ قائل ہوگیا تھا۔ ان میں حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی کابلِ ذکر ہیں۔ مخدوم موصوف وحدت الوجود کی فکر کے عامل تھے۔ اس مسئلہ پر مخدوم صاحب کی خط وکتابت شکارپور کے مشہور عالم وکامل، صوفی بزرگ حضرت فقیر اللہ صاحب علویؒ سے ہوتی رہتی تھی۔ یہ مکتوب حضرت علویؒ کی مشہور تصنیف "مکتوبات" میں محفوظ ہیں۔ جن میں شاہ بھٹائیؒ کے ہمہ اوست کے خیال کو مخفی طور پر دبا ہے جس کے قبیل شاہ بھٹائیؒ نے فرمایا ہے۔

ڪيڏانهن ڪاهيان ڪرهو؟ چوڌس چنائو،

منجهان ڪاڪ ڪڪوري، منجهين لڌائو،

ڌاتو ءِ ڌاتو، ري ڌاتي ٻيو نه ڪو.

کس طرف اپنے اونٹھ کو لے جاؤں (خاکی جسم) کیونکہ ہر طرف روشنی ہے جس سے ککوڑ (دنیا) اور وہ لڌاتو (وہ دنیا) اپنے وجود میں دیکھی ہے

دھاتو (خدا تعالیٰ) کے سواء کوئی اور چیز نظر نہیں آتی، کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں۔

دوسری جگہ پر فرماتے ہیں:۔

جهر ٿر ٻڪ تنوار، وڻ ٽڻ وائي هيڪڙي،

سڀئي شيئن ٿيا، سوريءَ سزاوار

سهه منصور هزار، ڪهڙا چاڙهيو چاڙهئين.

بحر وبر ہر پتی اور درخت کو ایک ہی بات ہے۔ اس جہان کی ہر چیز میں عشق الٰہی کی

جنبش اور جوش پیں ہیں۔ سب سولی کے لائق ہیں۔ ہزاروں منصور موجود ہیں

آپ کس کس کو سولی پر لٹکانا چاہتے ہو۔

شاہ بھٹائیؒ نے اپنے کلام میں تصوف کے پیچیدہ مسائل کو نہایت سادگی سے بیان فرمایا ہے۔

تون جنين جي تات، تن پڻ آهي تنهنجي

فاذڪروني اذڪرڪم، اِي پروڙ ج بات

هٿ ڪاتي ڳڙ وات، پڇڻ پر پرين جي.

جن کو تو یاد کرتا ہے، اُن کو تو بھی یاد ہے فاذکرونی اذکرکم کی بات کو سمجھو لے

ہاتھ میں کاتی ہے، زبان میں میٹھاس، اور پھر بھی محبوب کی طلب کرتا ہے

اس حقیقت کو مولانا جلال الدین رومیؒ اس طرح ظاہر فرماتا ہے۔

جملہ معشوق ست، عاشق پردۂ

زندہ معشوق ست۔ عاشق مردۂ

یہ جمالِ حقیقی ہے جو کہ زندہ رہے گا، اُنکے مست اور شیدائی پروانہ وار قربان ہونگے۔ شاہ لطیفؒ کے صوفیانہ ارشادات کو اکثر بزرگوں نے جمع کیا ہے اور اپنی سمجھ سے تشریح بیان کی ہے۔ مولانا غلام محمد خانزئی کا منہاج العاشقین اور علامہ قادر بخش بیدل روہڑی کا "سندہ الموحدین" پنج گنج مشہور ہے۔ جن کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا تصوف میں کتنا بڑا مقام تھا۔

اسلامی تصوف کا سب سے زیادہ ماحصل ہے باطن کی صفائی اور ان کے صفات کا لباس جو کہ تقوےٰ کا لباس ہے۔

قرآن پاک کا قول مبارک ہے۔

ولباس التقویٰ ذالک خیرٌ

(تقویٰ کا لباس اچھا ہے)

تصوف سے مراد یہ ہے کہ ظاہر میں آداب شریعت کی پابندی اختیار کی جائے جو اُن کا حکم باطن سے ظاہر ہو۔ ان دونوں پابندیوں کو اختیار کرنے والے کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تصوف سے روحانیت ہوتی ہے جو علم حقیقت سے تعلق رکھتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ میں وہ سبھی خصوصیات موجود تھیں یہاں پر شاہ لطیفؒ نے کلام سے جستہ جستہ استفادہ کیا ہے۔ حالانکہ آپ کا پورا کلام ان خصوصیات سے بھرپور ہے۔ انسانی حیات کے مقصد کو لیس الانسان الا ما سعیٰ کے رنگ میں اس طرح سادگی سے پیش کرتا ہے۔

ھيٺ ڀاڻا ھيٺي، تو نہ ڦيٿيون ڳالھيون۔

سجيون راتيون سمهي، پر سکان ڏيئي۔

سپان سيٺي، پار پڄنڊء خبر ون۔

اے ناخدا تجھے یہ دونوں باتیں کہاں نصیب ہونگی۔ ایک تو تم پتوار کے نزدیک پوری رات سو جاتے اور دوسرے کنارے پر بھی کامیابی سے پہنچنے کی خواہش کرتے ہو۔ جب تک تو بیدار نہیں ہوتا ہے۔ تب تک تیرا منزل مقصود پر پہنچنا مشکل ہے۔

انسان کی زندگی کی کامیابی انسانی کشمکش پر مدار رکھتی ہے۔ اس فلسفیانہ نکتہ کو نہایت سادگی سے بیان فرمایا ہے کہتے ہیں:۔

جان جيئين تان جل، ڪاڻي جاء جلڻ جي

تتي ٿڌي هل، ڪانهي جاء ويهڻ جي۔

"جب تک تو زندہ ہے۔ زندگی میں چلتا رہ۔ حالانکہ چلنے کی جگہ نہیں ہے گرمی ہو یا سردی۔ تو چلتا رہ کیونکہ یہ آرام کی جگہ نہیں ہے"

علامہ اقبالؒ اس قبیل میں فرماتے ہیں:۔

بدریا غلط با موجش در آویز — حیات جاودان اندر ستیز است۔

اس سے انکار نہیں کہ شاہ عبداللطیف کا کلام فکر کا ایک سمندر ہے۔ جو موج در موج۔ ایک سیلاب کی طرح مطالعہ کرنے والے پر چھا جاتا ہے۔

حضرت فقیر قادر بخش "بیدلؒ" روہڑوی نے اپنی تصنیف پنج گنج[1] میں ایک روایت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بزرگی کی شان میں بیان کی ہے اس عجیب روایت کو دیکھ کر شاہ لطیفؒ کے کامل ولی ہونے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس روایت کو مخدومی جناب مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی[2] نے بھی اپنی طرز تحریر سے لکھا ہے یہ واقعہ تاریخ کا ایک عجیب ورق ہے۔ بیدل لکھتے ہیں:۔

سنہ ۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ شہنشاہ افغانستان، ہندوستان کو فتح کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس وقت مغل سلطنت کا زوال تھا۔ محمد شاہ اپنے عیش و عشرت میں غرق تھا۔ پوری مملکہ کا نظام وزیروں کے ہاتھ میں تھا۔ جو اپنے اپنے اقتدار کی فکر میں تھے۔ فوجی نظام درہم برہم تھا۔ اس پرآشوب دور میں نادر شاہ بغیر کسی جنگ و جدل کے لاہور کو فتح کرکے دہلی میں داخل ہوا۔ محمد شاہ۔ اس سفاک بادشاہ

---

[1] پنج گنج مصنف علامہ حضرت قادر بخش بیدلؒ (مسودہ فارسی)

[2] بھٹائی اور بیدل مضمون نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی رسالہ نئیں زندگی ماہ مئی سنہ ۱۹۶۸ء

کی موجودگی کی وجہ سے ہراساں تھا۔ دہلی والوں کی بیوقوفی سے ایران کی فوج کے سپاہیوں کو قتل کیا گیا۔ سپاہیوں کے قتل ہونے سے نادر شاہ کا تیور بدل گیا جوش میں آکر قتل عام کا حکم دیا۔ تھوڑے وقت میں ہی دہلی کی گلیوں میں انسانی خون کی ندیاں بہنے لگیں حضرت بیدلؒ کی حکایت اس واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس مہیب خونریزی کے دوران ایک ایسا دردناک واقعہ رونما ہوا۔ جس کا تعلق سندھ کے زندہ جاوید بزرگ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ہے۔ جس سے انکی عظمت کا اندازہ نمایاں طور پر کیا جاتا ہے۔ علامہ بیدل لکھتے ہیں:-

دہلی کے اس قتل عام کے دوران ایران فوج کا ایک سپاہی دہلی کی گلیوں میں ننگی تلوار ہاتھ میں لیئے دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے سامنے جو آیا اُسے قتل کرتا گیا۔ اتفاق سے اس کے ہاتھوں ایک عارف، بیگناہ شہید ہوگیا۔ اس عارف کا جب سر تن سے جدا ہوا تو وہ سر بولا۔

”تونے اپنے سر پر خبر نہیں کتنے خون ناحق لیئے ہیں، لیکن یہ سر کوئی معمولی سر نہ تھا“

سپاہی اس شہید کے سر سے یہ بات سن کر ہیبت سے لرز گیا، اور اُس کے اوپر دہشت طاری ہوگئی، وہ توبہ توبہ کرکے لشکر سے نکل گیا۔ اس عارف کی شہادت کے بعد، وہ ایرانی اپنے گناہوں کی ندامت سے ملک در ملک بھٹکتا پھرا لیکن کوئی نجات کی راہ نظر نہ آئی۔ آخر اُسے اپنی نجات کا واحد وسیلہ یہ نظر آیا کہ مدینہ عالیہ جاکر بارگاہ رسالت صلعم کی چوکھٹ پکڑ کر اپنے مقصد کے لئے بیٹھ جائے۔ وہ بڑے افسوس کے ساتھ وہاں پہنچا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی درگاہ میں عاجزی سے روتا رہا۔ وقت گذرتا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ نا اُمید نہ ہوا ان کو یقین تھا۔

یارب تو کریمی و رسول تو کریم۔
صد شکر، فتادیم میانِ دو کریم۔

اس نے اپنی استقامت کا قدم حصول طلب کی راہ پر رکھا، اور کافی انتظار کے بعد اس خطاوار کو حضور صلی اللہ علیہ سلم کی درگاہ عالی سے بشارت ہوئی۔ ارشاد ہوا چونکہ یہ معاملہ نہایت سنگین ہے۔ اس لئے کسی برگزیدہ شخصیت کے معرفت کے بغیر اس سے چھٹکارا حاصل ہونا ناممکن ہے تجھکو سلطان العاشقیں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی طرف جانا چاہئے جو سندھ میں رہتے ہیں۔ حضور صلعم سے یہ بشارت سن کر اس سپاھی کی اضطراب میں سکون آگیا، اور اس کو امید پیدا ہوگئی کہ اب مشکل آسان ہونے میں وقت نہیں، اُس وقت عرب سے سندھ کے سفر پر نکلا سفر کی تکلیفوں کو سہتا ہوا سندھ میں وارد ہوا، اور اپنی منزل مقصود پر پہنچگیا، بھٹ پر پہنچ کر اُس پر سکون مقام کو دیکھکر حیران رہگیا، اور اس کے قلب کو سکون آگیا۔ شام کے وقت شاہ لطیفؒ کی خدمت میں حاضر ہوا جب تنہائی ہوئی تو سندھ کے عظیم مفکر اور رہبر نے اس سے حقیقت معلوم کی اس شخص نے اپنی سفاکی، بیتابی، اور پریشانی کا پورا واقعہ بیان کیا۔ شاہ بھٹائی نے اس شخص کو اطمینان دلایا، جس کے بعد وہ شخص نہایت سکون سے اپنا وقت بھٹ شاہ پر گذارنے لگا، اور اپنی اس سعادتمندی پر ناز کرنے لگا۔

ایک رات شاہ بھٹائیؒ نے اس شخص کو نیند سے بیدار کیا اور بشارت دی کہ اس عارف نے، جس کو تم نے بیگناہ شہید کیا تھا امت کے سردار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضور میں معاف کردیا۔ اس بشارت کے ملنے کے بعد وہ سپاہی مطمئن ہوکر وطن واپس ہوا۔

حضرت قادر بخش بیدلؒ کی یہ حکایت کوئی معمولی نہیں ہے۔ اس سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے عظیم مرتبے کی خبر ملتی ہے۔ اس سادہ برگزیدہ شخصیت کو اہمیت حاصل تھی۔ حضرت بیدل نے اس واقعہ کو اپنی تصنیف میں داخل کرکے مستند کردیا ہے۔ حضرت شاہ بھٹائیؒ اپنی زندگی کی ہر گھڑی فیض الٰہی کو حاصل کرنے اور تبلیغ کرنے میں بسر ہوئی۔ حضور صلعم کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ اور وہ منزل حاصل کی جس پر دوسرا کوئی پہنچ نہ سکا۔

باب پنجم

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اور شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے اکثر سوانح نگاروں نے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ آپ کے ساتھ سفر و حضر میں تین کتابیں رہتی تھیں۔ جن میں پہلی کتاب قرآن پاک، دوسری کتاب رسالہ شاہ عبد الکریم بلڑوی (آپ کے جد امجد) اور تیسری کتاب مثنوی مولانا رومیؒ۔ مثنوی کا یہ نسخہ سندھ کے علم دوست حکمران میاں نور محمد نے تحفہ کی طور پر دیا تھا، جو شاہ بھٹائیؒ کے مطالعے میں رہتی تھی۔ آپ کے کلام سے واضح ہوتا ہے کہ آپ پر مولانا رومیؒ کے کلام کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ان کے فکر و رموز سے استفادہ کیا ہے کیونکہ مثنوی اور شاہ کے رسالے پر نظر کرنے سے ہمیں اُن کے خیالات اور مضمون میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مولانا رومیؒ نے مثنوی میں مختلف حکایات بیان کرکے ایک ماہر غواص کی طرح اپنے مطالب کے موتی حاصل کیئے ہیں مولانا رومی نے کہانیوں کو ابتدا سے آخر تک بیان کرتا ہے۔ لیکن شاہ صاحب اپنے کلام میں کوئی حکایت بیان نہیں کرتے بلکہ کہانی کا ہر بیت داستان کی ابتدا بھی ہے تو انتہا بھی۔ ایک بیت میں پوری داستان سما جاتے ہیں۔ جس میں تصوف کے اہم اور باریک نکات کی بھی وضاحت فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا رومیؒ کے کلام کا اثر دنیا میں ہر دور کے شعرا پر ہوا ہے خصوصاً مشرق کے تمام شعرا پر۔ علامہ اقبال کو حضرت مولانا رومیؒ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے علامہ اپنے کلام میں ہر جگہ اُن کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کرتے ہیں جن کی چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ اسرار خودی فرماتے ہیں:-

باز برخوانم ز فیض پیر رومؒ — دفتر سربستہ اسرار علوم

جان او از شعلہ ہا سرمایہ دار — من فروغ یک نفس مثل شرار

پیر رومیؒ خاک را اکسیر کرد — از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد (الخ)

پیام مشرق میں مولانا رومیؒ کی عقیدت میں فرمایا ہے

مرشد رومی حکیم پاک زاد — سر مرگ و زندگی بر ما کشاد

اس طرح زبور عجم میں کہتے ہیں:-

راز معنی مرشد رومی کشود — فکر من بر آستانش در سجود

جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے پیر رومیؒ کی قیادت میں عالم افلاک کی سیر کی ہے یہ روحانی سیر تھی جس میں اُنہوں نے اپنا نام 'زندہ رود' تجویز کیا ہے۔ ایک اور جگہ اردو میں فرمایا ہے۔

"اُٹھا پھر کوئی رومیؒ عجم کی لالہ زاروں میں
وہی آب گِلِ ایران وہی تبریز ہے ساقی۔"

اسی طرح شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے کلام پر مولانا رومیؒ کے فکر اور شعر کا روحانی اثر نظر آتا ہے بلکہ صوری اور معنوی رابطہ یکساں نظر آتا ہے ان بزرگوں کا بھی خاص مقصد ہوتا ہے۔ وہ اپنے متاخرین کا ذکر کردیتے ہیں۔ مولانا رومیؒ شاہ لطیف بھٹائیؒ کے پیشرو تھے اور شاہ لطیف نے ان کے کلام اور پیغام کی ترجمانی کی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں "شاہ بود و شاہ حق آگاہ بود"

اسرار رموز علامہ اقبال صفحہ ۵۔ پیام مشرق صفحہ ۰۷۔ زبور عجم صفحہ ۲۵۲۔

…ی دیکھکر یہ گمان صحیح ہوتا ہے کہ شاید مولانا رومیؒ نے پیشنگوئی فرمائی تھی میرے پیغام کو شاہ بھٹائیؒ سندھی زبان میں فروغ دینگے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اصطلاح ھندیان را ھند مدح اصطلاح سندیان را سند مدح

ایک حقیقت ہے کہ جو کام مولانا رومیؒ نے ادھورا چھوڑا تھا، اس کام کو شاہ لطیف نے مکمل کردیا تھا۔ سندھی زبان میں شاہ لطیف نے مولانا رومیؒ کے پیغام

…پنے کلام کے ذریعہ عام کیا۔ چنانچہ مولانا کے حالات زندگی کو مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کا اسم گرامی محمد تھا، آپ کا لقب جلال الدین عرف مولانا روم تھا۔ آپ کی ولادت ۶ ربیع الاول سنہ ۶۰۴ ہجری

…ق ۳۰ ستمبر سنہ ۱۲۰۷ء کو خراسان کے شہر بلخ میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار کا نام حضرت بہاؤالدین محمد بن الحسین الخطیبی تھا۔ جو اپنے وقت کے بڑے جید

…تھے۔ اس لئے آپ کو سلطان العلماء کہتے تھے۔ جو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد مبارک میں سے تھے۔ آپ کے دادا حضرت حسین الخطیبی بلخی

…صوفی اور صاحب حال تھے، خلیفہ وقت محمد خوارزم شاہ نے اپنی صاحبزادی آپ کے نکاح میں دی تھی۔ جن کے بطن سے حضرت بہاؤالدین تولد ہوئے۔ مولانا

…ی کی ابتدائی تعلیم بھی اپنے والد کے زیر سایہ ہوئی۔ جن کی تعلیمات نے معتقدین کا دائرہ وسیع کردیا تھا۔ ان کی بڑھتی ہوئی شہرت، خلیفہ خوارزم کے مصاحب

…عالم فخرالدین رازی کو بہت کھٹکنے لگی تھی۔ ایکدن خلیفہ خوارزم نے مولانا بہاؤالدین کے پاس گیا۔ لاکھوں آدمیوں کا مجمع دیکھکر امام رازی سے کہا کس غضب کا

…مع ہے۔ امام صاحب کے کہنے پر خزانہ شاہی اور قلعہ کی چابیاں مولانا کے پاس بھیجدیں اور کہلا کے بھیجا کہ سلطنت کے اسباب میں صرف یہ چابیاں میرے پاس

…تی ہیں۔ وہ بھی حاضر ہیں۔ مولانا بات کو سمجھ گئے اور فرمایا جمعہ کو وعظ کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤنگا۔ اس کے بعد شہر سے نکلے تو مریدان خاص

…تین بڑے بھی ساتھ تھے۔ خوارزم شاہ کو جب یہ خبر ہوئی تو بہت پچھتائے۔ خدمت میں حاضر ہوکر بڑی منت کی لیکن وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آئے۔ اس وقت

…لانا رومیؒ کی عمر چھ برس تھی۔ یعنی وہ قافلہ ۶۱۰ھ ہجری کو نیشاپور پہنچا تھا۔ وہاں کے مشہور صوفی و شاعر شیخ فریدالدین عطارؒ آپ کے والد سے ملنے

…لئے آئے۔ نوجوان جلال الدین کی باتوں کو سن کر اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے شیخ بہاؤالدین سے کہا "اس جوہر قابل سے غافل نہ ہو" یہ کہکر اپنی مثنوی

…اسرارنامہ مولانا کو عنایت کی۔ جب یہ قافلہ نیشاپور سے نکل کر بغداد پہنچا تو، وہاں کے لوگوں کو پہلے اپنا منتظر پایا۔ کیونکہ بہاؤالدین کے علم و فضل

…کا چرچہ اور ان کی نیکی بہت سی منازل طے کرچکی تھی۔ بغداد میں مشہور عالم صوفی شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے آپ کا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ بغداد

…میں کچھ وقت ٹھہرنے کے بعد شام سے ہوتا ہوا یہ قافلہ مکہ شریف پہنچا، اور مقامات کی زیارتوں کے بعد زنجان کی راہ لارندہ پہنچے۔ اس وقت مولانا کی اٹھارہ

…سال ہوچکی تھی۔ اس موقعہ پر خواجہ لیلائی سمرقندی کی دختر گوہر خاتون کا رشتہ پیش کیا جو کہ مولانا بہاؤالدین نے مولانا کے لئے قبول کیا لارندہ میں قیام کے دوران

…قونیہ کے فرمانروا سلطان علاؤالدین کیقباد کا دعوت نامہ ملا کہ سرزمین روم کے لوگ آپ کے فیضان حق کے حصول کے لئے بے چین ہیں۔ چنانچہ یہ جماعت

سنہ ۱۲۲۶ء میں قونیہ پہنچے۔ اس سرزمین کی آب ہوا مولانا بہاؤالدین کو راس نہ آئی، اکثر اوقات علالت میں گزارا، دو سال کی لمبی بیماری کے بعد، اس

…فانی جہان سے رخصت ہوگئے، اس وقت مولانا کی عمر چالیس سال تھی۔ مولانا نے ظاہری و باطنی علوم کے رموز اپنے والد سے حاصل کیئے تھے۔ لیکن مزید علوم

…کی تحصیل اپنے والد کے شاگرد رشید اور معتقد برہان الدین محقق ترمذی سے حاصل کیا۔ جو مولانا کے والد کی وفات کی سن کر قونیہ آکر مولانا سے ملے تھے۔

…سید برہان الدین نے مولانا کا ظاہری علوم میں امتحان لیا، جس میں اُنھیں کامل پایا، اور کہا اب صرف علم باطن رہ گیا ہے یہ تمھارے والد کی امانت

…ہے جو میں تم کو دیتا ہوں، چنانچہ نو برس کے عرصہ میں طریقت اور روحانی مسلک کی تعلیم دیتے رہے۔ اس کے دوران مولانا ان کے مرید ہوگئے۔

مولانا ہر علم سے واقف ہوگئے تھے۔ لیکن ظاہری علوم کا رنگ ابھی تک باقی تھا، دینی علوم کا درس دیتے تھے، فتوےٰ لکھتے تھے: سماع سے سخت

…نفرت کرتے تھے، لیکن یکایک آپ کی زندگی میں تغیر پیدا ہوا جو شمس تبریز کی ملاقات کے بعد شروع ہوا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۴۴ء میں ہوا۔

ایک دن مولانا اپنے گھر میں طلبہ کو درس دے رہے تھے۔ چاروں طرف کتابیں رکھی تھیں۔ شمس تبریز آئے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔

مولانا کی طرف مخاطب ہو کر کتابوں کی طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کیا ہے۔ مولانا نے جواب دیا، یہ وہ چیز ہے جس کو تم نہیں جانتے۔ یہ کہنا تھا کہ کتابوں میں آگ لگ گئی مولانا بہت پریشان ہو کر اس سے کہا، یہ کیا ہے۔ مولانا کو انہیں جواب دیا یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے۔ یہ کہکر چلے گئے۔ لیکن مولانا کا بہت برا حال ہوا۔ اپنا گھربار چھوڑ کر ملک ملک کی خاک چھانتے رہے لیکن اس شخص کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ایک روایت ہے۔

شمس تبریز کی مولانا سے پہلی ملاقات اس طرح ہوئی تھی، جسکا ذکر شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے بھی کیا ہے جو اس طرح ہے۔

ایک دن مولانا رومیؒ ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، اور سامنے کچھ نایاب کتابیں رکھی ہوئی تھی۔ شمس تبریز نے آکر پوچھا یہ کیا ہے۔ مولانا نے جواب دیا یہ قیل وقال ہے۔ تم کو اس سے کیا غرض شمس تبریز نے کتابیں اٹھاکر حوض میں پھینک دیں۔ مولانا کو اس حال سے رنج ہوا اور ان سے کہا، اے درویش تم نے یہ کیا کیا، میری نایاب کتابیں ضایع کردیں جو اب ان کا ملنا بہت مشکل ہیں۔ شمس تبریز حوض میں ہاتھ ڈال کر تمام کتابیں ویسی ہی خشک نکال کر رکھدیں، مولانا یہ حال دیکھکر حیران ہوئے۔

کہتے ہیں کہ شمس تبریز سنہ ۶۲۲ ہجری مطابق سنہ ۱۲۲۶ء میں قونیہ آئے تھے، اور ایک سراء میں مقیم ہوئے تھے کچھ دنوں کے قیام کے بعد ایک دن سرائے کے دروازہ پر بیٹھے تھے کہ مولانا رومیؒ کی سواری بڑی شان سے گذری۔ شمس تبریز نے مولانا کو دیکھکر پہچانا، اور کہا یہ وہ شخص ہے جس سے ملاقات کی بشارت ہوئی تھی۔ شمس تبریز نے آگے بڑھ کر سواری کو روکا اور سوال کیا۔ بتاؤ خداتعالیٰ کے زیادہ خدمت گذار صالح بندے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، یا حضرت بایزید بسطامیؒ حالانکہ ایک طرف حضرت بایزید بسطامی کا یہ حال تھا کہ وہ تمام عمر اس خیال سے خربوزہ نہ کھایا کہ معلوم نہیں جناب رسول مقبول صلعم نے اس کو کس طرح کھایا تھا۔ دوسری طرف انہوں نے اپنے لئے کہا تھا، "سبحانی ما اعظم شانی" حالانکہ حضور نبی کریم صلعم فرمایا کرتے تھے۔ "ما عرفناک حق معرفتک" میں دن بھر ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں۔ مولانا نے جواب میں کہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بلاشبہ درجہ بلند ہے، اگرچہ بایزید بسطامیؒ بہت بڑے پایہ کے بزرگ تھے، لیکن ولایت میں وہ ایک خاص مقام پر ٹھہر گئے اور اس درجہ کی عظمت سے یہ الفاظ ان کی زبان سے نکل جاتے تھے، لیکن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم بہ قدم منازل پر چڑھتے جاتے تھے، جب نیچے سے بلندی پر جاتے تھے، تو پہلا پایہ پست نظر آتا تھا، اور اس سے استغفار فرماتے تھے۔

اس ملاقات کے بعد شمس تبریز غائب ہوگیا، کچھ دنوں کے بعد مل گیا، اور مولانا کے ساتھ صلاح الدین زرکوب کے حجرہ میں ایک سو بیس دن چلہ کشی کی۔ جب خلوت سے باہر آئے تو مولانا کی حالت میں عجیب تغیر پیدا ہوا سماع کے دلدادہ ہوگئے۔ درس وتدریس کو چھوڑ کر اپنے بیٹوں سے بے نیاز ہوگئے مریدوں کی طرف نظر بھی نہ اٹھاتے تھے۔ ہر وقت شمس تبریز کی خدمت میں رہتے تھے۔ شہر میں اس بات کا چرچا ہو گیا، کہ اس دیوانے نے مولانا پر سحر کردیا ہے۔ ایک شور برپا ہوگیا، آپ ان کی مخالفت ہونے لگی۔ شمس تبریز، مولانا کو ساتھ لے کر دمشق چلے گئے۔ اچانک شمس تبریز غائب ہوگئے، جس سے مولانا کو سخت افسوس ہوا۔ باہر نکل کر جذبانہ حرکتیں کرنے لگے۔ مولانا رومیؒ کی بیقراری حد سے بڑھ گئی جسے دیکھکر لوگوں کو ان پر ترس آیا، اور شمس تبریز کو واپس بلانے کی کوشش کردی۔ آخر مولانا کے بیٹے سلطان ولد اس مہم پر گئے۔ کسی نہ کسی طرح شمس تبریز کا پتہ حاصل کرکے ان سے ملا اور باادب تسلیم بجا لاکر مولانا کا خط پیش کیا۔ شمس تبریز نے مسکرا کر کہا "یہ دام و دانہ نگیرند مرغ دانا را" چند روز کے بعد قونیہ روانہ ہوئے سلطان ولد کمال ادب سے شمس تبریز کے رکاب کے ساتھ دمشق سے قونیہ

۱؎ شمس تبریز کے والد کا نام علاؤالدین تھا، وہ اسماعیلیہ فرقہ کے امام تھے۔ بلکہ ان کے دادا نورالدین حسن بن صباح کے پیرو اور حلقہ حشیش میں داخل تھے اور حسن بن صباح کے دست راست تھے۔ شمس تبریز نے اپنا خاندانی مذہب چھوڑ کر کمال الدین جندیدی کے مرید ہوئے۔ لیکن عام صوفیوں کی طرح پیری مریدی میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ سیاحت کرتے رہتے تھے، جہاں بھی جاتے تھے، تو کاروان سراء میں اتر کر مراقبہ میں بیٹھ جاتے تھے۔ سوانح مولانا رومیؒ مصنف مولانا شبلی صفحہ ۲۳

۲؎ سلطان ولد مولانا کے بڑے صاحبزادے تھے سنہ ۶۲۳ء میں تولد ہوئے تھے۔ یہ صحیح معنوں میں فرزند وارث ثابت ہوئے۔ والد کی مثنوی کو جمع کرکے دنیا کے سامنے پیش کی تھی

پیدل آئے۔ مولانا یہ خبر سن کر اپنے مریدوں اور شاگردوں کو لے کر انکے استقبال کو آئے۔ اور بڑی گرم جوشی سے ملے۔ مولانا اس ملاقات سے بہت خوش ہوئے۔ چند روز کے بعد شمس تبریز نے مولانا کی ایک پروردہ کے ساتھ شادی کرلی جسکا نام کیمیا[1] تھا مولانا نے مکان کے سامنے ایک خیمہ نصب کیا جس میں شمس تبریز رہنے لگے۔ مولانا کے صاحبزادے علاؤ الدین جو کبھی مولانا سے ملنے کے لئے آتے تھے تو شمس تبریز کے خیمہ سے گذر جاتے تھے۔ شمس تبریز کو یہ بات ناگوار گذرتی تھی۔ منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے۔ شمس تبریز کو بہت غصہ آیا اور اس مرتبہ عزم کہ اب جاکر واپس نہ آؤنگا چنانچہ وہ پھر سے غائب ہوگئے۔ مولانا نے چاروں طرف آدمی دوڑائے لیکن ان کا کہیں بھی پتہ نہ چلا۔ شمس تبریز کے جانے سے مولانا کو بہت رنج ہوا۔ "جواہر مضیہ"[2] میں آپ کے شاگرد سپہ سالار نے لکھا ہے کہ شمس تبریز رنجیدہ ہوکر کہیں چلے گئے۔ لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے متفق طور پر لکھا ہے کہ اسی وقت میں ہی مولانا کے مریدوں نے حسد کی وجہ سے انہیں قتل کردیا تھا

حضرت[3] مولانا جامی بھی لکھتے ہیں مولانا کے صاحبزادے علاؤ الدین نے شمس تبریز کو قتل کروا دیا تھا۔

مولانا کی حالت مدت تک شمس تبریز کی جدائی میں غیر رہی کبھی تو اضطرابی کیفیت میں گھر سے نکل جاتے تھے۔ ایک دن راستہ میں شیخ صدر الدین زرکوب کی دکان کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ جو چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے۔ ان کے ہتھوڑے کی آواز میں ایک قسم کی موسیقیت کا عنصر پیدا ہو رہا تھا۔ اس آواز کو سنتے ہی مولانا پر وجد طاری ہوگیا۔ اور ناچنے لگے۔ شیخ نے یہ دیکھکر اپنے ہاتھ نہ روکا اور ورق کوٹتے رہے یہاں تک بہت سی چاندی ضایع ہوگئی۔ جب شیخ تھک گئے تو باہر نکل آئے مولانا نے ان کو آغوش میں لے لیا اور جوش میں آکر یہ شعر کہا۔

یکے گنجے پدید آمد ازین دکان زرکوبی
زہے صورت زہے معنی، زہے خوبی، زہے خوبی۔

شیخ نے یہ شعر سن کر وہیں اپنی پوری دکان لٹادی اور مولانا کے ساتھ ہوگئے۔ شیخ صدر الدین حضرت سید برہان الدین کے شاگرد تھے اور مولانا کے مرشد بھائی تھے۔ مولانا کو ان کی صحبت میں بڑی تسلی ہوئی۔ ان تعلقات کی بنا پر مولانا نے شیخ صدر الدین کی صاحبزادی کا عقد اپنے بڑے صاحبزادے سلطان ولد سے کیا۔ اچانک ۶۶۲ ہجری میں شیخ صدر الدین بیمار ہوگئے۔ اور تین دن کی علالت کے بعد انتقال کرگئے۔ مولانا کو سخت صدمہ ہوا۔ شیخ صدر الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے حسام الدین چلپی کو ہمدم و ہمراز بنایا۔ حسام الدین ہی کی درخواست پر مولانا نے اپنی مثنوی لکھنی شروع کی تھی۔

کچھ عرصہ کے بعد مولانا کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ وفات سے پہلے عجیب واقعہ رونما ہوا ۶۷۲ ہجری کو قونیہ میں زبردست زلزلہ آیا جو چالیس دن تک قائم رہا۔ اس آفت ناگہانی سے لوگ بہت گھبرائے۔ حیران و پریشان مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے فرمایا زمین بھوکی ہوگئی ہے۔ اس کو لقمہ چاہیئے۔ انشاءاللہ کامیاب ہوگی۔ مولانا بیمار ہوگئے۔ اکمل الدین اور غضنفر نے مل کر آپ کا علاج کیا لیکن نبض کا یہ حال تھا کہ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا ہونے والا ہے۔ بیماری کی خبر عام ہوئی لوگ ہوئی لوگ دور دور سے آنے لگے۔ شام سے شیخ صدر الدین جو شیخ حضرت محی الدین ابن العربی کے مرید تھے۔ مولانا کی عیادت کو آئے مولانا کی حالت غیر دیکھکر بیقرار ہوئے۔ اور دعا کی کہ خدا تعالیٰ اپنی جلد صحت دے مولانا نے فرمایا۔ مجھے شفا نہیں چاہیئے میں بس ایک پیرہن کا پردہ باقی رہ گیا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ نہ اٹھے۔ شیخ روتے ہوئے اٹھ آئے۔ مولانا نے یہ شعر پڑھا۔

چہ دانی تو کہ در باطن، چہ شاہی ہمنشین دارم
رخ زرین من منگر کہ پائے آہنین دارم

۱؎ سوانح مولانا روم مرتب شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۱۲

۲؎ ایضاً ؍؍ ؍؍ ؍؍

۳؎ نفحات الانس مرتب حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی صفحہ ۴۸۷ (اردو ترجمہ)

مولانا نے اپنے ہمراز شیخ حسام الدین چلپی کو اپنا جانشین بنانے کے لئے وصیت فرمائی۔ جنازہ نماز کے لئے فرمایا۔ مولانا صدر الدین پڑھائینگے۔ اس کے بعد دنیا کی یہ عظیم شخصیت اور شیخ المشائخ یک شنبہ ۵ جمادالثانی ۶۷۲ھ ہجری کو غروب آفتاب کے وقت انتقال فرما گئے۔ آپ کے جنازہ کو دوسرے دن اٹھایا گیا۔ جس میں لاکھوں انسانوں نے ہر طبقے کے بلا کسی تفریق مذہب و ملت کے شامل ہوئے۔ مولانا کا مرقد مبارک قونیہ میں ہے۔ ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے مولانا کے مزار مبارک پر بڑا لنگر چلتا ہے۔ ملک الادباء بدر الدین نے حضرت مولانا کے لئے مرثیہ لکھا ہے۔ جس کے دو شعر نقل کرتا ہوں۔

کو دیدہ کہ در غم تو نمناک نشد ۔ یا حبیب کہ در ماتم تو چاک نشد ۔

سوگند بروی تو کہ از پست زمین ۔ بہتر ز توئی در شکم خاک نشد ۔

مولانا رومیؒ کی تین تصنیفات مشہور ہیں:۔[۱]

۱۔ فیہ ما فیہ:۔ یہ کتاب ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے معین الدین پروانہ کو لکھے تھے۔ سپہ سالار نے مختصر طور پر اس کا ذکر کیا ہے [۲]

اگر در آن ولایت من مانندم موافق طبع ایشان می زیستیم و آن میبور زیدیم که ایشان

خوش ندی مثل درس گفتن و تصنیف کتب و تذکیر و وعظ گفتن و زهد و عمل ظاهر ورزیدن۔

۲۔ دیوان شمس تبریز:۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں اندازاً پچاس ہزار اشعار موجود ہیں جو سب کی سب غزلیں ہیں۔ جن میں شمس تبریز کا نام بطور تخلص استعمال کیا تھا۔ عوام اس تصنیف کو شمس تبریز کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے ۷۵ غزلیں زرکوب کے نام سے بھی لکھی تھی۔ مولانا نے شمس تبریز کا نام اس طرح دیا ہے جیسے کوئی مرید اپنے پیر سے خطاب کر رہا ہو۔ یا پس غائبانہ اُن کے اوصاف بیان کرتا ہو

۳۔ مثنوی:۔ ایران کے ادب میں چار کتابیں مشہور ہیں۔ ۱۔ شاہ نامہ فردوسی۔ ۲۔ گلستان سعدی۔ ۳۔ دیوان حافظ۔ ۴۔ مثنوی مولانا رومؒ۔ ان کتابوں میں جتنی مقبولیت مثنوی کو حاصل ہے، وہ کسی دوسری کتاب کو نہیں ہے۔ جو اشعار مولانا نے وجد کی حالت میں کہے تھے۔ جو اس کی مقبولیت کا سبب بنے۔ مثنوی میں ایک طرف تو مختلف کہانیاں دی ہوئی ہیں جن سے ناصحانہ نکات حاصل ہوتے ہیں، دوسری طرف اعلیٰ علمی رموز اور دقیق مسائل، تشبیہات کے ذریعے سمجھائے گئے ہیں۔ مثنوی کے مضامین پر نظر کرنے سے ان میں علم کلام اور الاھیات کے مسائل پر مدلل بحث اور تصوف کے مسائل کے صحیح راستے نظر آتے ہیں مثنوی کی شان میں حضرت مولانا عبدالرحمان نور الدین جامیؒ نے فرمایا ہے

مثنوی مولوی معنوی ۔ هست قرآن در زبان پهلوی

مثنوی مارکان وحدت است ۔ وحدت اندر، وحدت اندر وحدت است

یہی کتاب ہے جن کی وجہ سے مولانا کا نام آج تک زندہ ہے اور آپ استاذ الشعراء مشہور ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے سلطان ولد نے مثنوی کو ترتیب دے کر دنیا کے علم ادب پر بڑا احسان کیا تھا۔ مثنوی کے کل مجموعی اشعار کی تعداد ۲۶۶۶ بتلائے جاتے ہیں۔ مثنوی کے متعلق دنیا کے عالموں نے اپنی راے دی ہے یہاں ایک مشہور مستشرق پروفیسر رینولڈ نکلسن اپنی کتاب رومی، صوفی اور شاعر میں اس طرح لکھا ہے:۔ [۳]

مثنوی کا مصنف وہی کے باطنی عمیق اور گہرائیوں کی معنوی سمجھانے کا دعوی کرتا ہے، وہ صحیح ہے لیکن کتاب کے کسی بھی صفحہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوگا کہ مثنوی کی اصول ترتیب، قصے، کہانیوں اور روایتوں میں ظہور پذیر ہونگے، اور قرون وسطیٰ کے مذہبی

۱۔ رسالہ فریدون ابن احمد سپہ سالار چاپ تہران صفحہ ۱۱۲۔ ۲۔ فیہ ما فیہ، چاپ دانشگاہ تہران صفحہ ۴۷، بین این عبارات را فریدون احمد سپہ سالار ۶۸

Rumi, Poet, & Mystic by Prof: Reynold Nicholson P. 24 ۔۳

۴۔ مناقب العارفین۔ افلاکی۔

خیالات اور زندگی کی وسیع منزل اپنے دائرے میں لیے آتے ہیں جو کہ مولانا کا عین مقصد تھا۔"

ان الفاظ سے مثنوی کی بہترین تشریح ہوتی ہے:- یہ کتاب مذہبی جذبہ کو عشق کے ذریعے پاکیزہ بنانے کی ایک اعلیٰ کوشش تھی۔ مثنوی ایک بحر بیکنار ہے جس کی معانی میں قوی النفس غواص نت نئے نکات کے جوہر نکالتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمت نے مثنوی میں مذہب اور اخلاق، فلسفہ اور تصوف سے متعلق کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ جدوجہد اور ان کے تعلقات وملحقات کے بیان کا مسلسل رشتہ کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ بات سے بات پیدا کرکے اپنی اصلی مدعا سے دور نکل جاتے ہیں۔ مگر تمام جہان گرد باد کرکے پھر اسی راہ پر آکر گامزن ہو جاتا ہے۔ مثنوی کی پہلی کہانی ایک بادشاہ، کنیز اور حکیم کے متعلق ہے جو ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے غور سے دیکھا جائے تو دکھائی فلسفہ جنگ وجہاد کی ایک ایسی دلیل ہے جو اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ مثنوی کا شعر گویا بانسری کا پیغام ہے یا فلسفہ جہاد کی تمصیب ہے بانسری اور روح کی آواز ہے جو اس قفس عنصری میں قید ہے فرماتے ہیں۔

بشنو از نے چون حکایت میکند — وز جدائیہا شکایت میکند۔

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق۔

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالان دبد حالاں شدم

ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درون من نہ جست اسرار من۔

مولانا رومیؒ مثنوی کے خود فرماتے ہیں:-"

اِجْتَهَدْتُ فِيْ تَطْوِيْلِ الْمَنْظُوْمِ الْمَثْنَوِيْ الْمُشْتَمِلِ عَلَى الْغَرَائِبِ وَالنَّوَادِرِ دُرَرِ الْمَقَالَاتِ

وَدُرَرُ الدَّلَالَاتِ وَطَرِيْقَةِ الزُّهَّادِ وَحَدِيْقَةِ الْعُبَّادِ قَصِيْرَةِ الْمَبَانِي كَثِيْرَةِ الْمَعَانِي

میں نے اس منظوم مثنوی کی تدوین میں کوشش کی، جو نایاب نکتوں روشن باتوں، ہدایات کے موتیوں پر اور زاہدوں کے طریقہ (زہد وتقویٰ) اور عابدوں کے گلستان پر مشتمل ہے جس کی بنادیں محدود مگر معانی غیر محدود ہیں"

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور حضرت مولانا رومیؒ رحمت اللہ علیہ۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کے معتقد تھے، شاہ بھٹائیؒ کے کلام پر نظر کرنے سے اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رسالے میں بہت سے ایسے ابیات نظر آتے ہیں جن میں شاہ بھٹائیؒ نے مولانا رومیؒ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ شاہ صاحب عقیدت میں فرماتے ہیں:-

طالب عشق سنہ تڑ، اي رومي جي رهاڻ

پھرين وڃائڻ پاڻ، پسڻ پوءِ پرين کي۔

(طالب، حق، حسن، رومی بے مثال، دور کر پردہ، منظر میں رکھ جمال)

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں اکثر مولانا رومیؒ کے کلام کا موازنہ بھی منظر آتا ہے۔ مثلاً مثنوی کا پہلا شعر ہے۔

بشنو از نے چوں شکایت می کند — واز جدائی ہا حکایت می کند۔

بانسری سے سن کیا حال سناتی ہے — اور وہ ہجر وفراق کی کیا شکایت کرتی ہے۔

مفتاح العلوم مثنوی مولانا روم دفتر اول مرتب حضرت مولانا مولوی مرزا محمد نذیر عرشی صفحہ ۲۰

شاہ بھٹائی نے فرماتے ہیں۔

وڍيل شي دايون ڪري ڪنل ڪوڪاري.

من پڻ، پنهنجا ساريا، مونهنجون موتن لاءِ هاري .

(بانسری (نیستان سے کاٹی جاتی ہے) فریاد کرتی ہے. اور اس کے سینے سے کوک اٹھتی ہے.

وہ تو اپنوں کو یاد کرکے درد و فراق میں روتی رہتی ہے.

ان دونوں ابیات میں خیال کی یکسانیت نظر آتی ہے. یعنی "کل شیٔ یرجع الی اصلہٖ" مولانا رومی رح اور شاہ صاحب کا عقیدہ، تعلیم و توحید ایک ہی معلوم ہوتی ہے. اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام پر سر بہ سجود نظر آتے ہیں. اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور عشق میں سرشار ہیں

سیّد و سرور محمد نور جان   بہتر و مہتر شفیع مجرمان

گر بگویم تا قیامت نعت او   ہیچ ان را مقطع غایت مجو .

شاہ لطیف فرماتے ہیں.

جوڙي جوڙ جهان جي پاڻ ڪيائين پرواز ،

حامي، هادي، هاشمي، سردارون سردار

سونهين صحابن سڀ ۾، منجهه مسجد مڙيادار

چاري چڱا چوڌار، مٺا ميڄا ننڍا حبيب سين .

اللہ تعالیٰ نے اس جہان کی تخلیق فرما کر خود ظہور کیا، یہ سب حضور نبی کریم صلعم کے لئے کیا . جو حامی ہے ہادی ہے

ہاشمی اور سرداروں کے سردار ہیں . اپنے اصحابوں کے ساتھ مسجد میں خوب اچھے لگتے ہیں، چاروں دوست ساتھ ساتھ اپنے حبیب کے رہتے ہیں .

جس طرح دنیا میں مثنوی ایک غیرفانی کتاب ہے، اس طرح شاہ کا رسالہ بھی غیرفانی ہے . دونوں کتابوں میں تصوف کے مسائل کی وضاحت، اخلاقیات، الٰہیات، عمرانیات، تشبیہات موجود ہے . مولانا رومی اپنے مثنوی کے لئے فرماتے ہیں .

ما ز قرآں مغز را برداشتیم   استخوان پیش سگاں انداختیم

دوسری جگہ اپنے کلام کے متعلق فرمایا ہے،

مثنوی او گان وحدت ست   وحدت اندر، وحدت اندر است .

من چہ گویم وصف ان عالیجاب   نیست پیغمبر ولی دارد کتاب .

شاہ صاحب نے اپنے کلام کے لئے فرماتے ہیں،

جي تون بيت ڀانئين سي آيتون آهين

نيو من لائين پريان، سندي پار ڏي .

جن ابیات کو تم ابیات سمجھے ہو وہ آیتیں ہیں . جو دل محبوب کی طرف لے جاتی ہیں .

صوفی ان کتابوں کو بڑی عزت سے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کے بعد سمجھتے ہیں . دونوں بزرگوں کو اہل نظر اولیاء میں شمار کیا جاتا ہے . ان کے ابیات میں روحانیت سمائی ہوئی ہے . دونوں بزرگوں نے قرآن پاک کی حقیقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی مبارک زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے

بعد اپنے آپ کو اس سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ وہ مقام حاصل کر لیا۔ جس کو فانی فی الرسول کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ شاہ بھٹائی ایسی صحبت حاصل کرنے کیلئے کہتے ہیں

صحبت سپرین جي هئي، پڻ وڏي ماجا

(محبوب کی صحبت ایک بڑا کام ہے)

اسطرح مولانا رومی" فرماتے ہیں۔

صحبت صالح ترا صالح کند   صحبت طالح ترا طالح کند

مولانا جلال الدین رومی ایک عظیم مفکر تھے۔ جن کے فقرے سے شاہ بھٹائی" متاثر تھے۔ شاہ صاحب نے ایک نئی راہ اور نیا اسلوب ایجاد کیا تھا۔ وہ سچے وطن کی ہر چیز سے محبت۔ چنانچہ اپنے کلام میں سندھ کے تمام تاریخی کہانیاں اور واقعات کو پیش نظر رکھکر اپنی مدعا حاصل کر لیا ہے۔ آپ کے کلام میں حب الوطنی کا عنصر دنیا کے کسی بھی دوسرے شاعروں میں نہیں ملتا، جس سے آپ کی عظمت بہت بڑھ گئی۔ شاہ بھٹائی" نے ہر چیز کو بڑی باریک بینی سے دیکھا

مولانا رومی صحبت بد سے کنارہ کرنے کے لئے ہمیشہ تلقین فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

پس بہ ہر دستے نباید داد دست۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

منهن ۾ موسيٰ جهڙو، اندر ۾ ابليس

اهڙو خام خبيث، ڪڏهن ڪو نه ڇڏئين.

ظاہری صورت موسیٰ علیہ السلام جیسی ہے، لیکن باطن میں ابلیس جیسا ہو، ایسے خام خبیث کو اپنے اندر سے کیوں نہیں نکالتے ہو۔

مولانا رومی" نے تقدیر کے مسئلے میں جبر و اختیار کے درمیان اپنے مسلک کو رکھا ہے فرماتے ہیں:

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

شاہ صاحب نے اس خیال کو یوں بیان کرتے ہیں۔

تاڪي ۾ تائين پڌ منهنجو ترهو.

اڌ ۾ آئين جونڊ ڏينڌو ڪو ٻيو.

تھوڑے پانی میں اپنے تیرنے کا سامان پیدا کر، جب گہرے پانی میں جاؤگے تو کوئی تجھے سہارا بھی نہ دیگا۔

مولانا فرماتے ہیں۔   ہرچہ از دوست مے رسد نیکو است۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں   پريان سندي پار ڀي مٺڙي مٺائي.

محبوب کی طرف سے جو بھی حاصل ہو وہ مٹھائی ہے

دونوں بزرگوں کے نظریات میں کتنی یکسانیت ہے۔ دونوں جامع الکمالات اور جامع العلوم تھے۔ اپنے کلام میں تصوف کے ساتھ ساتھ تاریخ کے واقعات قصص، وطن کی حب، حکایات، فلسفہ، منطق، ناصحانہ نکات، حکیمانہ و عارفانہ انداز بیان کو بڑے موثر طور پر پیش کیا ہے۔ دونوں بزرگوں نے وحدت الوجود کے دقیق مسئلہ کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کے کلام میں سوز و گداز، وجد و حال، اخلاق حسنہ، ریاضت، عبادت صبر و شکر، محویت اور استغراق کی کیفیت کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام میں رقیق القلبی زیادہ ہے۔ رقت انگیز

واقعات اور درد نغان کا دل و دماغ پر براہ راست اثر پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایچ۔ ٹی سورلے نے اپنی تصنیف شاہ عبداللطیف بھٹائی میں لکھتے ہیں [1]

"شاہ بھٹائی کی سادگی سے بھرپور موسیقی میں نہ تو رومی کے نظم ساز کو طاقت ہے نہ تو جامی کی موسیقی کی چادر میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے، اور نہ ہی حافظ شیرازی کی ترنم زیر نغمہ نوازی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ایک عجیب کرامت ہے کہ آپ کے کلام میں حقیقت کی خاموش جستجو اور ان نغموں کی سادگی کے طلسم میں ہر ایک اسیر ہے۔"

بقول مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی کے: [2]

"شاہ صاحب کے زمانے میں وحدت الوجود کا نظریہ فرسودہ ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ اس طریقہ میں مولانا رومی کے مقلد تھے، البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک کامل شاعر کے کلام کا دوسرے کامل شاعر پر اثر ضرور ہوتا ہے، چونکہ رومی متقدمین میں سے تھے، اسلئے شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس وجہ فکر سے اگر استفادہ کیا ہو تو اس سے انکار کی کوئی توجیہ نہیں ہوتی، جبکہ سفر اور حضر میں مثنوی کا نسخہ مطالعہ کے لئے آپ کا ایک محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی اپنے عظیم پیش رو حضرت مولانا جلال الدین رومی علیہ رحمت کے بعد شعر و فکر کی دنیا میں انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔

---

[1] شاہ عبداللطیف او بھٹ مرتب ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے (انگریزی)

[2] مفکر مہران مصنف اختر انصاری اکبر آبادی ناشر ڈائریکٹر محکمہ اطلاعات حیدرآباد سندھ صفحہ ۸۹

حصۂ سوم (باب اوّل)

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری

شاعری کا ارتقا

شاعری واردات قلب کے اظہار کا نام ہے۔ وہ واردات اندرونی کیوں نہ ہوں۔ شاعر کے لفظی معنی "صاحب شعور" کے ہیں "شعور" کو احساس (FEELING) کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ شخصیت ہے جس کا احساس قوی ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعر کے خمیر میں وہ عناصر عالم جاودانی سے ودیعت ہوتا ہے۔ انسان کی طبیعت پر خاص حالات طاری ہوتے ہیں۔ مثلاً ھنسنا، رونا۔ جب یہ حالات انسان پر غالب ہوتے ہیں تو اُن پر مختلف حرکات صادر ہوتی ہیں۔ رونے کے وقت آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ اور ھنسنے کے وقت ایک ایسی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جس سے مسرت کا اندازہ ہوتا ہے اس طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ شاعر کی طبیعت پر رنج، غصہ یا استعجاب طاری ہونے کے وقت ایک خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ جذبہ موزوں الفاظ کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے۔

ھر زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر پیدا کرتا ہے۔ جو اپنے زمانے کا مجسمہ ہوتا ہے۔ شاعری کی تاریخ کا یہ ایک ثبوت ہے کہ جب کسی قوم میں شجاعت اور جوانمردی کا جوہر کمال پر پھنچتا ہے۔ اس قوم کے افراد میدان جنگ کو عیش و نشاط کا ایوان سمجھتے ہوئے، شمشیر برہم کو ہلال عید کی تابانی پیدا کرتے ہیں، تو شاعر بھی نعرہ جنگ بلند کرتا ہے۔ جہاں قوم کی اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے تو شاعر اس قوم میں رُوح پھونکنے کے لئے صدا بلند کرتا ہے۔ لیکن بزرگ اور ولی عوام کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے روحانیت کا پیغام شعر کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ایسے شاعر کو جب اپنے فکر و نظر کا کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ تو اس کو داخلی شاعری کہا جاتا ہے اور شاعر کو صاحب پیغام شمار کیا جاتا ہے۔ اگر وہ واردات اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور بیرونی واقعات سے متاثر ہوکر کسی بات کو موزون طریقہ سے کہہ دیتا ہے، تو وہ خارجی شاعری کہلاتی ہے۔ ایسی شاعری اکثر قنوطی ہوتی ہے۔ اور پہلے قسم کی شاعری رجائی ہوتی ہے۔ کیونکہ پیغام کے لئے رجاؤ (امید سے ہونا ضروری ہے) ہو ورنہ پیغام والا پیغام پورے طور پر دوسروں تک پہنچا نہیں سکتا اور اگر پہنچا بھی دیگا تو اس کا اثر دیرپا نہ ہوگا۔

مولانا عبدالسلام ندوی اپنی تصنیف شعرالہند میں لکھتے ہیں[1]:۔

"شاعری صرف جذبات و احساسات کے اظہار کا نام ہے۔ اور اس لحاظ سے اگرچہ شاعری کے ہر ایک صنف محسوسات انسانی کا ایک ایسا آئینہ ہے۔ جس میں ہر شخص کو جذبات کی اندرونی تصویر نہایت نمایاں طور پر نظر آ سکتی ہے۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے کلام کو پیش کرنے سے پہلے شاعری کی ارتقائی منازل پر مختصراً بحث کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرت مولانا روقی رح کا قول ہے:۔

شاعری جزویست از پیغمبری   جاھلانش کفر دانند از خری۔

شاعر کو تلامیذ الرحمٰن بھی کہتے ہیں۔ شاعری کی زبان کو عرش الہیٰ کی چابیاں کہتے ہیں۔ اس لئے شاعری کے لئے ضروری ہے کہ وہ فطرتاً طبع کے سلیم ہو۔ ان کی فکر بلند ہو اور صحیح طبیعت کے مالک ہو۔ اُن کی نگاہ مشکل حقائق کو سمجھنے کی استعداد رکھتی ہو علم کو جاننے والا ہو کیوں کہ شعر میں ان کا ہر عمل اور فکر نمایاں ہوتا ہے۔ شاعر ہر معاشرہ سے واقف ہوتا ہے۔ اور ہر محاوری کو جانتا ہے۔ تاکہ اُن کے اشعار اس منزل پر پہنچ جائیں اور صدیوں تک زمانہ انکی قدر کرے اور شعر سے ان کی شخصیت کو بقا اور دوام حاصل ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس شاعر کا شعر، انکی حیاتی میں فوت ہو جائے گا۔ کیون کہ شعر کی جمالیاتی قدر بھی ایک سماجی قدر ہے جو کافی حد تک شاعری کے دوسرے قدروں پر منحصر ہیں۔ اُنکی ترتیب، اُسکی سماجی اہمیت کے مطابق ہونا چاہئیے وہ سماجی قدر ہے جو اجتماعی مفاد میں اضافہ کرتا ہے۔ اس لئے اُنکے دوسرے افادی قدروں سے جدا کیا نہیں جاتا۔ مختصراً مکمل طرح اچھا شعر وہ ہے جو صرف فن کے معیار کی

---

[1] شعرالہند حصہ دوم مصنف مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ ۱۸۴۔

کسوٹی پر نہیں۔ بلکہ زندگی کے معیار کی کسوٹی پر پورا اُترے۔

شاعری کی حقیقت پر سب سے پہلے ارسطو نے بحث کی ہے اور ایک کتاب بوطیقا (پوئٹری) Poetics لکھی تھی، اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا۔ ابن رشد نے اس کی تلخیص کی تھی، لیکن آگے چل کر عرب شعراء نے اس کا بنیادی طور پر اثر قبول کیا، ارسطو نے کتاب کی تحریر کے مقصد کا ذکر کیا ہے[1]

رزمیہ شاعری ٹریجڈی (المیہ) کامیڈی (طربیہ)۔ بھجن اور اس طرح بانسری اور چنگ سے راگ نکلتے ہیں

اگر آپ بالکل عام نقطہ نظر سے دیکھیں گے تو سب نقلیں ہیں۔ جن میں ڈرامائی روح موجود ہے۔

شاعری کو ادبی اصناف میں قدیم ترین مقام ہے قدیم شاعری کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ غنائی یا وجدانی۔ اس قسم کی شاعری میں شاعر اپنی طبیعت سے مدد لیتا ہے، اور اپنی قلبی واردات بیان کرتا ہے، اور اپنے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ۲۔ قصصی یا بیانیہ اس قسم کی شاعری میں شاعر لڑائیوں کے واقعات اور قوم کے بلند کارناموں کو قصہ کی شکل میں نظم کرتا ہے مثلاً ہومر کی ایلیڈ (ILIAD) اور اُوڈیسی ODYSSEY فردوسی کا شاہنامہ وغیرہ ۳۔ تمثیلی یا ڈرامائی۔ جس میں شاعر ایک واقعہ یا کہانی کو حسب حال افراد (کردار) اپنے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں شاعر دوسروں کو جاننے سے پہلے اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنے جذبات اور احساسات کو نظم کرتا ہے۔ عربی شاعری اُن قبگی واقعات سے خالی ہے جن سے قوم کے قابل قدر کارناموں کی یاد دائمی بقا حاصل کرتی ہے۔ جس طرح یونانیوں کے لئے ایلیڈ، رومیوں کے لئے لینیڈ، ھندوؤں کے لئے مہابھارت اور رامائن اور ایرانیوں کے لئے "شاھنامہ"

عرب میں شاعری کا آغاز کب ہوا اس کی تاریخ نہیں ملتی، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب شاعری کو تاریخ نے جانا، تو وہ نہایت اتنی محکم و مرتب شکل اختیار کر چکی تھی، جو کہ پختہ اور منظم صورت میں نمودار ہوئی۔ قبل اسلام کی شاعری کا میدان سنگلاخ اور صحرائی عرب تھا، کیونکہ عرب بدوی کی طبع میں آزادی اور صحرائی بودباش اس زمانہ کی شاعری میں نمایاں ہے۔ جس میں ایک عجیب اور پروقار شان ٹپکتا ہے، چونکہ بدوی فلسفی نہ تھے لہٰذا اس زمانے کے غیر ضروری تاویلات سے کنارہ اختیار کیا، انہوں نے آسان الفاظ اور عمدہ و سادہ تراکیب استعمال کیئے۔ وہ شاعری کھنڈرات اور ٹیلوں سے گذر کر خانہ بدوش زندگی میں سما گئی جسکی وجہ انہیں مخصوص انداز فکر بخشا، جب کوئی شاعر اس جگہ سے گذرتا جہاں مختلف قبائل خیمہ زن ہوتے ہیں تو ان کی طبیعت مچل جاتی تھی اور اظہار جذبات میں آجاتے تھے اور یاد ماضی آجاتی تھی۔ قدیم معاشقہ اور فرقت کے اندوھناک حالت ان کی زبان کو خاموش کر نہیں سکتی تھی۔ اور اظہار جذبات میں صبر کا دامن نہیں چھوڑا، اس دور کے مشہور جو گذرے ہیں ان میں امرؤ القیس[2] اپنے ایک قصیدہ کی ابتدا اس طرح کرتا ہے۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل　　بسقط اللوی بین الدخول فحومل

"اے میرے دوست ذرا ٹھہر تاکہ میں (مقام) دخول اور حومل کے درمیان سقط اللوی میں اپنے محبوب اور اس کے مکان کھنڈر" کی یاد میں رولوں"

عدی بن زید عبادی، دنیا کی بیثباتی کے لئے کہتا ہے

ابو الحضر اذ بناہ و اذ دجلة تجبی الیه و الخابور

ابو الحضر (قلعہ کا نام) کا مالک جس نے اس کو بنایا تھا، اب کہاں ہے، جس کے پاس دریا دجلہ اور خابور کا وصول جمع ہوتا ہے۔

---

[1] فن شاعری پہلا حصہ ارسطو مترجم عزیز احمد صفحہ ۲۱۔

ایلیڈ Iliad یونانی رزمیہ ہے جس میں ہومر نے ٹرائے کی جنگیوں کے واقعات کو نظم کیا، یہ کتاب یونان کی تمدن کا صحیح نمونہ ہے۔ لینیڈ، یہ لاطینی رزمیہ ہے جسے روم کے بلند پایہ شاعر ورجیل نے ۔ ۱۹ ق م نے نظم کیا اس رزمیہ میں ہومر کی ایلیڈ کی نہایت خوش اسلوبی سے پیروی کی ہے مہابھارت، ھندوستان میں رزمیہ شاعری کا شاہکار ہے جسے ھندوؤں کے مقدس گرو ویاس نے سنسکرت زبان میں قدم سے صدیوں قبل لکھی۔ شاھنامہ فارسی رزمیہ، جسکو حسن بن اسحٰق فردوسی نے شاہان ایران (اکاسرہ) کی تاریخ اور مابین جنگ کے واقعات کو نظم کیا تھا۔ جسکو فتح علی بغدادی اصفہانی نے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔

[2] مقدم تاریخ ادبیات عرب پروفیسر گب مترجم سید محمد اولاد علی گیلانی صفحہ ۲۵۲۔

شعر ایک ایسی چیز ہے جو شاعر کے سینے میں جوش مارتی ہے۔ اور زبان کی راہ سے باہر نکلتی ہے۔ نثر مسجع کو بھی شعر کہتے تھے۔ جس میں وجدانی اثر و خیال موجود ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے قرآن پاک کو شعر کہدیا تھا۔ عربوں نے آزاد نثر سے مسجع و مقفیٰ کی طرف بڑھکر ترقی کی ہوگی نثر مسجع سے رجز کی طرف اور اس سے قصیدہ کی طرف بڑھے ہونگے۔ باقلانی اپنی کتاب اعجاز القرآن میں لکھتے ہیں۔ عربوں نے سب سے پہلے زبان کی ابتدا نثر سے کی پھر بتدریج شاعری تک پہنچے جو حقیقت میں اتفاقاً امر ہوگا۔ لیکن جب انہیں شاعری اچھی اور مناسب معلوم ہوئی تو اس کا تتبع شروع کیا۔

صاحب بحر الفصاحت، بتوسل "مرأت آفتاب نما" اور "روضۃ الاحباب" سے حوالا دیتے ہیں کہ شعر کی ابتدا حضرت آدم نبی علیہ و السلام سے ہے جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو حضرت آدم صفی اللہ نے اسکے ماتم میں اشعار کہے تھے، جس کا ذکر یعرب بن قحطان کی کتاب روضۃ الصفا میں موجود ہیں[1]

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعراء کی تعریف فرما کر انکو خود امتیاز بخشا ہے، اور انکے نتائج طبع اور چکیدۂ قلم کو ملاحظ فرما کر خزانۂ فیض سے صرفۂ تحسین رحمت فرما۔ حضور صلعم نے فی البدیہ یہ مبارک جملے فرمائے تھے، صحیح بخاری و مسلم میں ابو اسحاق تابعی سے مروی ہے براء بن عازب صحابی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین میں دلدل سے اتر کر اللہ تعالیٰ سے فتح اور مدد کی دعا مانگی تھی اور فرمایا تھا۔

اَنا النبی لا کذب   انا بن عبد المطلب

"میں پیغمبر ہوں اس میں جھوٹ نہیں، میں بیٹا ہوں عبد المطلب کا"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دیوان مشہور ہے، جسکی شرح بڑے طول و بسط کے ساتھ قاضی حسین بن معین الدین یبندی نے لکھی ہے[2]

دَعْ ذِکرَ هُنَّ فما لهن وفاءٌ   ریحُ الصبا وعُهودُهنَّ سواءٌ

یکسِرْنَ قلبَکَ ثم لا یجبرنَه   وقلوبهنَّ مِنَ الوفاء خلاءٌ

چھوڑ ذکر انکا یعنی (عورت) کا اسلئے کہ ان میں وفا نہیں، ہوا کا جھونکا اور انکا عہد و پیمان برابر ہے

تیرا دل توڑینگی پھر نہ جوڑینگی، ان کے دل میں وفا نہیں، وہ وفا سے خالی ہے۔

عربی شعر کا موجد یعرب بن قحطان تھا۔ لوگ اسکے موزون سخن کو شعر کہتے تھے، پھر شدہ بشدہ لفظ شعر نے کلام موزون مقفیٰ پر یہاں تک پہنچا۔ اس طرح عرب میں بہترین شعراء پیدا ہوئے۔ عرب کے دیہات کی زبان مانی جاتی ہے۔ کیونکہ شہر میں ہر سال مختلف دنیا کے ملکوں سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور وہاں بہت سے باہر کے لوگوں نے سکونت اختیار کی ہے۔ دیہات میں خالص عرب النسل ہے تو وہاں کی زبان بھی صحیح ہے اور بدوی قوم کی گفتگو کو سند کرکے لیتے ہیں، پروفیسر گب لکھتے ہیں

اس دور کے شعرا و سخن پر غور کرتے وقت ہم اپنے آپ کو ایک مختلف ماحول میں پاتے ہیں۔ اسلام کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی نے پرانے قسم کی شاعری پر بہت برا اثر ڈالا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ مبارک بھی اس قسم کی شاعری کے سخت خلاف تھا، کیونکہ آپ کا مقصد بھی یہ تھا کہ کفر آمیز شاعری کی پشت پر جو مجلسی طاقت موجود ہے اسی بالکل تباہ کردیا جائے۔

فارسی شاعری بھی اس طرح قدیم ترین ہے حقیقتاً قدیم فارسی شاعری کی کیا صورت تھی وہ صحیح طور پر معلوم نہیں غالباً دو قسم کی تھی

تنقیدات طٰہٰ حسین۔ عبد الصمد صارم الازہری صفحہ ۹۲۔

بحر الفصاحت   مصنف مولانا محمد نجم الغنی مطبع منشی نول کشور لکھنو ۱۹۲۶ صفحہ ۱۱۔

ایضاً   "   "   "   "

علیؓ شخصیت اور کردار مصنف عباس محمود العقاد اصلاحی صفحہ ۲۵۶

۱. غنائیہ (BALLAD) ۲. رزمیہ (EPIC). ابتدائی اسلامی دو صدیوں میں فارسی شاعری کی تاریخ اکثر خالی نظر آتی ہے۔ اس طویل زمانے میں عربی زبان تنہا حکومت کرتی رہی، ایران کی شاعری کے اصولوں سے قطعی واقف نہ تھے، اس وجہ سے مسلمان مصنفین نے قدیم فارسی شاعری کو صحیح شاعری تسلیم کرنے میں تامل کرتے تھے۔ وہ خلیل بن احمد (۱۰۰ھ - ۱۷۰ھ) کے قائم کردہ علم عروض کے قوانین کی کسوٹی پر نہیں اتر سکتی۔ ایرانی شاعری ساسانی عہد میں خواہ سن ہجری کی ابتدائی دو صدیوں میں سادہ قسم کی تھی۔

بہرام گور جس کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ فارسی شاعری کا اولین موجد ہے جس کے دیوان سے عرفی نے بھی استفادہ کیا ہے۔ اُنہوں نے عربی اور فارسی اشعار جمع کئے تھے۔ لیکن اس کے مابعد تحقیق کے مطابق محمد بن واصف کی فارسی شعر میں ابتدائی کوشش تھی، جس نے فارسی زبان میں شعر لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ عرب فاتحین نے ان ایرانی منکر انسانوں کو سنوارنے کے بعد ایران میں بڑی تبدیلی ہوئی، اور ایرانی عربی زبان میں شعر لکھنے، اور عربی زبان سیکھنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ اس کے علاوہ، ایک اور سبب یہ بھی تھا۔ کہ عرب حاکموں کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے فارسی شعراء نے اپنی زبان میں تعریفی قصیدے لکھنے شروع کیئے، اس طرح ایرانی شعراء نے عربی زبان میں بڑا کمال حاصل کیا جو ان کے استادوں کو بھی نصیب نہ ہوا۔

سیّد المرسلین خاتم النبیین حضرت محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکات ذات مقدس نے عربوں کو آدمی بنایا، اور ان کے حواس درست کئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے:۔

رضینا قسمت الجبار فینا لنا علم و للجهال مال

ہم اپنی قسمت سے خوش ہیں، کیونکہ ہم کو علم ملا اور نادانوں کو دولت۔

آگے چل کر ایران کی سرزمین میں دنیا کے بہترین شعرا پیدا ہوئے، جو دنیا کے ادب پر چھا گئے، جن میں رودکی، محمد نخشبی، دقیقی، فردوسی، عمرخیام، انوری، نظامی گنجوی، مولانا جلال الدین رومیؔ، شیخ سعدیؒ، اور حافظ شمس الدین محمد حافظ شیرازی قابلِ ذکر ہیں۔

حافظ شیرازی اپنی سخن سنجی کے متعلق کہا ہے:۔

در آسمان چہ عجب گر زگفتۂ حافظ   سماع زہرہ برقص آورد مسیحا را

یہ کون سی عجیب بات ہے کہ حافظ کے سخن کو آسمان پر زہرہ سنتے ہی رقص میں اپنی مسیحا کو لے آئے

ایران کے قدیم بادشاہوں نے اکثر سندھ پر حملہ کرکے اُسے اپنے تسلط میں لیا تھا۔ تین ہزار برس کا طویل عرصہ سندھ ایرانی حکومت کے زیر رہی جس کی وجہ سے سندھ کی مقامی زبان پر ایرانی زبان کا اثر رہا۔ لیکن سکندر اعظم کی فتوحات تک کوئی تاریخ نہیں ملتی، لیکن عرب فتوحات کے بعد عرب مورخوں نے سندھ کی تاریخ کو محفوظ کیا۔ بہرحال سندھ کی تاریخ کا باقاعدہ سلسلہ راء گھرانے سے ملتا ہے۔ عرب سندھ میں چھٹی صدی عیسوی کی شروعات میں آئے اور اس دور سے سندھی زبان کی تشکیل ہوئی، فتح اسلام سے پہلے سندھی زبان کا کوئی نمونا موجود نہ تھا۔ لیکن اس دور میں عربی زبان کے سندھی بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے۔ جن میں ابو عطا سندھی (متوفی ۱۳۲ھ) عربی کا مانا ہوا شاعر تھا۔ ان کے علاوہ فرج السندھی، ابو الفرج سندھی

Introduction to the History of Arabic Literature by: Prof: H.A.R Gib - P 51

۱؎ غنائیہ شاعری، وہ ہے جو شعر جذبات سے بھرا ہوا ہو، اس گیت میں کیئی بند ہوتے ہیں، لے میں بڑے نام ساز کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔

۲؎ رزمیہ۔ جن میں کسی ایک یا چند بہادروں کے کارنامہ بیان کیئے جاتے ہیں

۳؎ بہرام گور فارسی شاعری کے موجد تھے، اُنہوں نے ایک روز شیر کا شکار کرکے بے ساختہ کہا منم آن پیل دمان و منم آن شیر یلہ (بحر الفصاحت)

اور ابوضلع السندھی مشہور شاعر گذرے ہیں۔ سندھ کے محدث، مورخ اور دیبل کے علماء کا ذکر ملتا ہے۔ منصورہ علم وادب کا مرکز بنا۔ سندھی اور عربی کو اہمیت حاصل ہوئی سندھ اور ایران کے تعلقات قدیم زمانے سے تھے۔ اس لئے فارسی زبان کا اثر بہت قدیم رہا ہے۔ فارسی زبان بحیثیت سرکاری زبان سمہ کے دور ۱۴۰۰ء میں ہوئی۔ تذکرہ لطفی کے مصنف[1] کی تحقیق کے مطابق سندھی شاعری کی شروعات چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی اور یہ سمہ کے کا ہی وقت تھا۔ جس میں صاف اور سادہ زندگی کی تصویر نظر آتی ہے سندھ کے نیم تاریخی داستان کی نشان دہی کرتی ہے۔ سندھ میں فارسی زبان کی اہمیت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کو درباری زبان کا شرف حاصل ہوا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فارسی شاعری کو سندھ کے شعراء نے بڑی ترقی دی یہ سلسلہ ارغون اور ترخان کے دور حکومت سے شروع ہوا، اور اس کا عروج کلہوڑہ اور تالپروں کی حکومت کا ہے

سندھی شاعری کی شروعات ۱۴۰۰ء سے ہوئی اور اسکے مکمل نشان نظر آتے ہیں۔ جس کا ذکر تاریخ تحفۃ الکرام میں کثرت سے ملتا ہے۔ جس میں شیخ حماد اپنے وقت کے بڑے بزرگ گذرے ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور اصحابی حضرت ابوہریرہؓ کی اولاد میں سے تھے اور آج کے مشہور بزرگ حضرت جھانیاں جہاں گشت کے استاد تھے۔ اسحاق آہنگر اور راجو درویش کا ذکر بھی حدیقۃ الاولیاء میں موجود ہے جو اپنے دور کے سندھی شاعر تھے۔ اسحاق کا ایک ایک شعر نظر آتا ہے[2]

ٿيان مان جهرڪ ويهان پرين جي ڇڄ تي ،

مان ڪرن ڊڪ ٻولي ٻاجهاري مون سين .

"میں چڑیا بن کر محبوب کے چھاج پر بیٹھ جاؤں اور وہ مجھے وہاں سے اڑانے کے لئے آواز دیں، اسی بہانے سے میں ان کی آواز سن لوں۔"

ماموئی درویشوں کے ابیات تاریخ میں ملتے ہیں، جو ہفت تن درویشوں کے سندھ کے مستقبل کے لئے پیشنگوئیاں ہیں یہ بھی سمہ دور حکومت میں گذرے۔ مخدوم احمد بھٹی، پیر محمد لکھوی، عثمان احسانی، لطف اللہ قادری وغیرہ ارغون کے دور حکومت کے شاعر تھے۔ حضرت شاہ عبدالکریم بلڑیؒ اور مخدوم نوح ہالائی کا تذکرہ پہلے صفحات پر ہو چکا ہے۔ حضرت شاہ عبدالکریم بلڑیؒ کی اولاد میں سے، ایک سو سال بعد سندھ کے عظیم بزرگ اور سرتاج شعراء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پیدا ہوئے جنہوں نے سندھ کی شاعری میں انقلاب پیدا کیا جو سندھی شاعری میں ایک عظیم پیغام کی حیثیت رکھتا ہے

دوہیڑے اور وائی

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے رسالے کے ابیات کو دوہیڑہ (دوھو) کہتے ہیں، دوھا قدیم شاعری کی صنف ہے۔ جس کا رواج وید کر کرتانوں اور دیوتاؤں کی توصیف میں تشبیہی اور تمثیلی شعر تھا۔ دوھوں کا رواج ھندی زبان کے برج بھاشا میں ملتا ہے۔ ھندی زبان کا اثر سندھی پر بہت پرانا اور قدیم ہے ھندی زبان کی طرح سندھی زبان میں بھی دوھے دو اشعار کا مرکب تھا۔ اس قسم کی شاعری سندھ کے قدیم شعراء قاضی قاذن، اسحاق آھنگر، پیر محمد لکھوی، حضرت مخدوم نوحؒ اور حضرت شاہ عبدالکریم بلڑیؒ بعد میں شاہ عنایت رضویؒ کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ مگر شاہ لطیفؒ نے دوھو کی صورت میں ایک نیا اسلوب اور نئی راہ ہموار کر دی جسکو "بیت" کہا گیا، مضمون وہی رہا۔ شاہ لطیفؒ کے دوھوں میں، مذہب، تصوف، اور پیغام کا رنگ آ گیا، جس کی وجہ سے عوام کے دلوں پر شاہ بھٹائیؒ کے ابیات کا گہرا اثر ہوا۔ شاہ لطیف نے دوھے کی صورت میں اضافہ کر کے، چار، اور چار سے آٹھ اور اس سے بھی زیادہ اشعار کہے۔ اور اس قدیم شاعری میں انقلاب

---

1. تذکرہ لطفی مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی
2. حدیقۃ الاولیاء

پیدا کیا، دوھوں میں وزن کی پابندی نہیں ہوتی، لیکن قافیہ کا ہونا ضروری ہے، وہ قافیہ صوتی ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ایسے اشعار کو رجز کہتے ہیں رجز عتیق زمانہ کی پیداوار ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ شعر کی شروعات رجز سے ہوئی تو بجا ہوگا۔ عرب عورتیں جنگ کے دوران بہادر سپاہیوں کو ہمت دلانے کے لئے رجز گایا کرتی تھیں۔ سندھ میں تھر کے علاقہ میں اونٹھ پر سواری کرتے ہیں، قافلہ میں سافری کے دوران، دوھے گاتے ہیں، ان ابیات کا نہ صرف انسانوں پر اثر ہوتا ہے، بلکہ ان جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ سر میں گانے سے ان ابیات میں اور بھی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اس تبدیلی کو دیکھ کر شاہ بھٹائیؒ نے ابیات کی صورت میں موسیقی کے لحاظ سے اضافہ کرکے "وائی" کی صورت ایجاد کی۔ پروفیسر محبوب علی چنہ[۱] لکھتے ہیں

"وائی" کسی بول چال کو کہتے ہیں، جو پراکرت لفظ "وایا" اور سنسکرت لفظ "ورات" سے نکلی ہے۔ سنسکرت میں "ورت" کی معنی [؟] ہے شاہ بھٹائیؒ وائی کا موجد تھا، جسکے لئے اکثر ادیب متفق ہیں، مگر سافت کے خیال سے وائی موسیقی میں ٹھمری، ھندی زبان کے زیر اثر پیدا ہوئی جسکے لئے مشہور ہے کہ شاہ لطیف بھٹائیؒ کے یہاں ھندوستان کے دو موسیقار اٹل اور چنچل، آخری عمر تک رہے جو اکثر امیر خسروؒ، میراں بائی، بھگت کبیر، گرونانک سنگھ اور دیگر ھندی شعراء کا کلام گایا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ شاہ بھٹائیؒ نے ان کے گائے ہوئے اشعار سے متاثر ہوا ہوگا، اور اپنی شاعرانہ طبیعت سے "وائی" کا ایجاد کیا ہوگا۔ "وائی" کی صنف جو آگے چل کر کافی کی صورت اختیار کی

مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ اپنی تصنیف "کافی" میں لکھتے ہیں:[۲]

"وائی سندھی لغت کا الفاظ ہے جسکی معنی ہے "کوئی بات" وائی داوا لفظ سے نکلی ہے جس میں سے وائی کا بنیاد نکلا"

مرحوم مرزا ھمایوں بیگ اپنے مقالہ "شاہ کے شعر میں خصوصیت" میں لکھتے ہیں:-

"شاہ بھٹائی کی وائی کو بھی دیکھنا چاہیے جو گائی جاتی ہے، یہ (بیج) خالص سندھی غزل ہے جس کی طرز پر کافی کا ایجاد ہوا"

وائی میں سب سے پہلے ایک بند ہوتا ہے جو دو اشعار کی مصرعہ ہوتی ہے، جس کے بعد وہی بند دہرایا جاتا ہے، وائی کو بھی کافی کی طرح گایا جاتا ہے۔

وائی کی ایک مثال شاہ بھٹائیؒ کے رسالے سے دی جاتی ہے۔ جو سر یمن کلیان سے ہے

اَچي سار لهيج، ساجن سُور تنهاري آئُون ماري!
سُور تنهاري جي سِران، تان مون ڏوھ نه ڏيج
ساجن سُور تنهاري آئُون ماري!
ڏبَنِ پَري هٿڙا، داروُن دوست ڪَريج
ساجن سُور تنهاري آئُون ماري!

میرے ساجن تو آکر میری خبر لے   میں تمہارے درد فراق میں مرتی ہوں
میرے ساجن تو آکر میری خبر لے۔
اگر تیرے درد فراق میں مرجاؤں، تو مجھے دوش نہ دینا، میری جان نثاری بے جا نہ سمجھنا۔
میرے ساجن تو آکر میری خبر لے
ہاتھوں میں دوا لے کر تو آکر میرا علاج کر
میں تمہارے درد فراق میں مرتی ہوں۔

مقالہ[۱] مقالہ نگار پروفیسر محبوب علی چنہ رسالہ نئین زندگی ماہ دسمبر ۱۹۵۸ء۔ [۲] کافی مصنف مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ

شاہ لطیف بھٹائیؒ کا کلام مقبول عام ہے۔ اسکا سب سے بڑا سبب آپ کے کلام میں موسیقیت موجود ہے۔ جس شعر میں موسیقی نہیں ہے اسکو شعر ہرگز نہیں کہا جائے گا۔ شاہ لطیفؒ نے سندھی زبان میں فن موسیقی کے نئے اسلوب کے بانی تھے۔ جس طرح ھندوستان میں حضرت امیر خسروؒ کی حیثیت تھی۔ امیر خسرو کی وفات سے چار سو سال بعد سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ سندھ کے عوام کا ہر دل عزیز شاعر کا ظہور ہوا۔ وہ ایک محب وطن اور صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے سندھی زبان کو پسند کیا۔ اس زمانے میں عربی فارسی موسیقی کا رواج تھا۔ آپ کے کلام کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فن موسیقی سے بڑی واقفیت رکھتے تھے۔ سندھ میں موسیقی کا رواج قدیم زمانے سے تھا۔ حضرت شاہ عبد الکریم بلڑیؒ اپنے خانقاہ میں خوش الحانی سے کلام کو پڑھتے تھے۔ لوگ خانقاہ کے باہر جمع ہوکر سنتے تھے۔ سندھ کے ایک اور بزرگ مخدوم احمد بھٹی ہالاکنڈی جو اپنے دور کے بڑے ولی ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی کے دلدادہ تھے جو اکثر سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ شاہ صاحب کے ہمعصر بزرگ شاعر، دوست مخدوم محمد محسن ٹھٹوی کو بھی موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اپنے کلام کا کچھ حصہ ھندوستانی موسیقی کے سروں میں کہا اور باقی کلام اپنے دیس کی موسیقی کے رنگ میں کہا ہے، اور خالص سندھی سر ایجاد کیئے، جن میں خاص طور پر سر کوھیاری، سر مومل رانو (رانو) سر ماری، سر کارایل، سر کھنبات، سر سریراگ اور سر کاموڈ وغیرہ۔ اسکے علاوہ سر سورٹھ، سر کیڈارو، سر ھنگو (سارنگ) سر آسا، سر رامکلی، سر دیسی، سر دناسری وغیرہ ھندوستانی راگنیاں ہیں شاہ بھٹائیؒ سندھ میں سب سے پہلے ایک نیا ساز ایجاد کیا جسکا نام "طنبورہ" ہے اس ساز میں تبدیلی پیدا کرکے پانچ تار والا بنایا۔ شاہ لطیفؒ کو فن موسیقی سے لگاؤ فطری تھا۔ جسکی وجہ سے آپ کے کلام میں موسیقیت کا بڑا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ شاہ لطیف بھٹائیؒ کا کلام صرف شاعری، تصوف، اخلاقیات، محاکات، اسلامی تبلیغ و حکمت کا گنج نہیں بلکہ سروں اور موسیقی کا بھی بے مثل خزانہ موجود ہے جو عوام میں مقبول ہے۔

شاہ لطیف اپنی شخصیت کی طرح اپنی شاعری میں بھی بڑی ندرت کے مالک تھے آپ ان عظیم بین الاقوامی قدر رکھنے والی شخصیوں میں سے ہیں جنہوں نے انسانی فلاح و بہبود، تعلیم و اصلاح کا کام اپنے عظیم پیغام میں دیا ہے۔ آپ کا پیغام دنیا کے بڑے شعراء مثلاً، حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ شیخ سعدیؒ۔ حافظ شیرازیؒ، سنائیؒ وغیرہ کے پیغاموں سے کم نہیں۔ اپنے اس پیغام کی عظمت کی وجہ سے وہ ان "معلمین عالم" میں شمار ہوتے ہیں جو اس دنیا میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں، اور جن کا پیغام غیر فانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے کے الفاظ ہیں:۔ "شاہ بھٹائی قرون وسطیٰ کے بڑے شعراء میں سے آخری بڑے شاعر تھے خصوصیت سے سندھ میں تنہا وہی ایسے بڑے شاعر ہیں جن کی عظمت غیر فانی ہے" حقیقت سے دیکھا جائے تو شاہ صاحب کا سندھی زبان پر بڑا احسان ہے کیونکہ آپ نے اس زبان کو اپنے تصورات کے اظہار کا ذریعہ بنا کر اپنی عظمت کا بڑا ثبوت دیا ہے یہی وجہ ہے کہ سندھ کے لوگوں نے انہیں اپنے دل میں سمو دیا ہے۔ آپ کے بعد کے شعراء سندھی زبان میں خود کو موجودہ دور کے رجحانات کے ترجمان کہتے ہیں۔ کیونکہ آج کی سندھی زبان شاہ بھٹائیؒ کے دور کی زبان سے زیادہ مہذب و مرتب زبان کہی جاتی ہے۔ لیکن وہ اب تک شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے تصورات و تخیلات تک پہنچ کر اپنا کوئی تاثر قائم کر نہ سکیں ہیں۔

باب دوم

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام

کلہوڑوں کے دور حکومت کو یہ فخر حاصل ہے۔ کہ اُس دور میں سندھی زبان کا عظیم المرتبت شاعر اور مفکر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی پیدا ہوا۔ اس عظیم ترین شاعر کے کلام پر نظر ڈالنے سے ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ بھٹائی کی شاعری داخلی اور پیغامی ہے۔ ان کے کلام سے بعض جگہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ آپ نے واقعات اور مناظر سے متاثر ہوکر بھی شعر کہا ہے۔ لیکن آپ کی شاعری کا سب سے بڑا رنگ رجائی اور پیغامی ہے۔ سب سے بڑا پیغام حسن ازل کے ساتھ عشق و محبت کا پیدا کرنا ہے جس میں خدا پرستی اور رسالت ماب کا صحیح جذبہ موجود ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ فکر و ادب میں کوئی ایسا شاعر مفکر حیات آفرین کا حل پیش کر سکا ہے۔

شاہ بھٹائی کی شاعری صرف ان کی زندگی کی ترجمان نہیں، بلکہ زندگی و کائنات کی ترجمان ہے۔ وہ زندگی جو کائنات کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان کے اشعار کی بنیاد ان دائمی قدروں پر استوار ہے جو غیر متزلزل اور آفاقی ہے۔ اس لیئے وہ کسی خاص زمانے کی پابند نہیں بلکہ ہر زمانے میں ایک حقیقت کی طور پر پیش کی جائی گی۔

شاہ لطیف کے کلام میں جذب، حسن یا شاعرانہ تخیل موجود ہے، جو آپ کے کلام کو ہر لحاظ سے حسن کا ایک شاہکار بنا دیتا ہے اس وجہ سے آپ کا کلام جذبات سے لبریز ہے۔ ان جذبات میں اکثر، غم، خوشی، حسرت، شکر، صبر، رغبت، قناعت، انصاف، توکل، رحم، امید، کبریائی اور انکساری موجود ہے۔ اپنے کلام کے لیئے خود فرماتے ہیں۔

جي تون بيت پائين، سي آيتون آهين،

نيو من لائين، پرين سندي پار ڏي،

(ان ابیات کو ابیات نہ سمجھو یہ قرآن کی آیتیں ہیں، جو دل کو محبوب کی طرف لے جاتے ہیں)

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کے لیئے بھی یہاں تک کہدیا گیا ہے

مثنوی مولوی معنوی — ہست قرآن در زبان پہلوی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مقدس ہستیوں کے لیئے شاعر کا لفظ موجب فخر ہو سکتا ہے؟ شاہ کا رسالہ یا مثنوی مولانا رومی محض تفریح طبع کے لیئے لکھی گئی تھی؟ ہرگز نہیں، ان بزرگوں کا کلام شاعری نہ تھا۔ جیسا کہ خود مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں[1]

من نعوانم فاعلاتن فاعلات — شعر گویم لیک چون ابحیات

اس طرح حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنے مریدوں سے اپنا جمع کیا ہوا کلام کرار جھیل میں پھینک دیا تھا۔ جس پر مریدوں میں بڑی بے چینی پھیل گئی تھی۔ ان بزرگوں کو بنی نوع انسان کی اصلاح اور خدا تعالیٰ کا صحیح راستہ بتانا تھا، جس کو قوت سے فعل میں لانے کیلئے شعر کی قوت کے تاثیر کو بہتر و کارآمد سمجھا۔ اس لئے لوگوں کو ایک شاعر کی حیثیت سے یاد کرنا اور اس کے اصل مقصد کو نظرانداز کر دینا ہے جو اس شاعر کے اندر پوشیدہ ہے شاہ عبداللطیف بھٹائی عام شعراء کی طرح اہل قال میں نہ تھے بلکہ آپ اہل حال میں سے بھی تھے۔ جب حال طاری ہوتا تو شعر کہتے تھے ورنہ ہر وقت فکر میں محو رہتے تھے۔ شاہ صاحب کا کلام اس وجہ سے مقبول عام ہے کیوں کہ آپ کا کلام اسلام کی تبلیغ ہے لیکن ولی کا انداز اور عشق کا سوز

---

[1] رسالہ نیرنگ خیال ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۸۴۔

ساز ہی رکھتے تھے کیوں کہ بھٹائی ؒ شاعر، ولی اور عاشق رسول تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت محمدی کی بے انداز محبت اور عزت و احترام کرتے تھے۔ اور شریعت کی حقیقت کے رموز کو ظاہر کرنے میں مانع تھے۔ شاہ بھٹائی ؒ کے کلام میں قلبی واردات کثرت سے موجود ہے جس میں انسانی احترام کی راہوں پر بڑی سادگی سے سوچا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے کلام کا مطالعہ کرنے والا آپ کے روحانی فیضان میں گم ہو جاتا ہے۔ خود فرماتے ہیں۔

روزہ ۽ نمازون اي پڻ چڱو ڪم۔

اُو ڪو ٻيو فهم جيسان پسڻ پرين جو۔

روزہ اور نمازیں یہ بھی بہتر کام ہے، لیکن وہ فہم اور ہے جس سے دوست کو دیکھیں"

یہ تفہیم اور افہام۔ انسانیت کا احترام ہے جس کے حاصل ہونے سے انسان قرب الٰہی کے اعلیٰ مقام کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ علم الاخلاق کے رہبروں نے انسانیت کے احترام اور اس کے لافانی کردار کو دیکھا ہے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی ؒ فرماتے ہیں۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست

یہ وہ زندہ جاوید پیغام ہے، جس کے باعث شاہ لطیف ؒ اس زمین کے ہر باشندہ کے دل و دماغ پر بلا کسی مذہبی تفریق و امتیاز کے چھایا ہوا ہے، اور ہمیشہ چھایا رہے گا۔ جب کسی کے دل میں احترام انسانی جاگزین ہو جاتا ہے تو، اُس میں وہ سب صلاحیتیں خود بخود موجود ہو جاتیں ہیں جو ایک صالح معاشرہ کے لئے ضروری ہیں۔ یہ شخص "صلح کل بن جاتا ہے" یہی خصوصیتیں ہیں جو شاہ لطیف کے عظیم کردار پر غالب ہیں۔ فرمایا ہے

ڪاري رات، ڪچو گهڙو، اٿئين اونداهي۔

ساهڙ ڪارڻ سهڻي، آدي ٿي آئي۔

اي عم الاهي، نا تہ ڪنهن ۾ ڪير گهڙي۔

تاریک رات ہے اور گھڑا خام ہے۔ تاریکی بھی اُنتیس کی ہے، چاند کے طلوع ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے، دریا میں شور ہے یہ خدا تعالیٰ کی مشیت تھی، ورنہ ایسے خطرناک قعر میں کون اُتر سکتا۔

سوہنی دریا کے جوش کو دیکھکر تھرتھرا جاتی ہے، لیکن جلد ہی خود کو تسلی دیکر آگے بڑھتی ہے:-

سڪڻ وارو سڄو، جي دهشت سان درياهہ

اوڙڪ اُنهن جو نہ رهي، ارمان آرواح

وينديي ساهڙ سامهون صدقو ڪنديون ساهہ۔

جن کي حب اُنهي آهہ، ساهڙ ساٿي تن جو۔

محبت والوں کے لئے، دریا کی دہشت بالکل آسان چیز ہے، اُن کے روح کی دلچسپی ہمیشہ دریا کی روانی سے ہی قائم ہے میہوال کے سامنے وہ جاتے ہوئے، اپنی جان کو قربان کر دیتی ہے۔ جن کو میہوال کے ساتھ محبت ہے اور وہ بھی ان کا مددگار ہے۔

سوہنی ڈوب گئی، اس کی لاش پانی پر تیرنے لگی، شاہ صاحب اس المناک منظر کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے۔

ڪانڌي ڪنگ ٿياس، وهڻ جنازو سهڻي۔

ٻگا جي ٻيٽن جا، ڪلها تن ڏناس

اکين مُرڪ ڏناس، تہ من ڪاڍو ميهار ڏي۔

(آب رواں پر سوہنی کا جنازہ جا رہا ہے، اُن کے گرد کلنگ جمع ہو گئے ہیں، جزیروں کے پرندے اُن کو گویا اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ موت کا فرشتہ سامنے ہے۔ لیکن دل کا طلب اب بھی میہوال کی طرف لگی ہوئی ہے

ماروی تھر کی دیہقانی لڑکی، اپنے وطن سے دور سندھ کے جابر حاکم عمر سومرہ کے قید میں گرفتار ہے، وہ اس قید میں سوچ رہی ہے کہ میری ہمجولیاں اپنے وطن میں شاید یہ سوچ رہی ہونگیں کہ میں یہاں عیش میں ہوں اور ان کو بھول گئی ہوں، لیکن اُنہیں کیا خبر کہ میں کس مشکل میں گرفتار ہوں۔ شاہ بھٹائی رح نے اس کیفیت کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ اپکے کلام کی ایک سادی سی جھلک ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

مون سين ماروئڙيون، کهڙي ريت رُسنديون

چوٽيءَ ۾ چيڙهو پيو، پيين رَتُ جيون،

نٽين ننڊ وڃِ تي، ساري سانڍيون.

مٿي جي ميون نه سُڌِ پوين سيل جي.

(میری ہم جولیاں مجھسے کیوں کر روٹھے گیں، میری چوٹی (بالوں) میں مٹی پڑگئی ہے اور جوئیں خون چوس رہی ہیں)

(تھر والیوں کو یاد کرکے، میری انکھوں سے نیند اُڑگئی ہیں، کاش! وہ یہاں ہوتیں، تو ان کو عصمت وعزت بچانے کی خبر پڑجاتی)

ماروی عمر کے قید میں بند ہے، اُن کو اس حالت میں اپنے وطن کی یاد آتی ہے، تو وہ چیخ اُٹھتی ہے، ماروی کی اس حالت کو بڑے فکرمند انداز میں بیان فرماتے ہیں۔

الله ائين نه ٿيءِ، جئين آءُ مران من بند ۾

جسو زنجيرن ۾ ماتو ڏينهان روءِ

پھرين وڃان لوءِ، پوءِ مر پڄنم ڏينهڙا.

(خدایا! اس طرح نہ ہو کہ میں اس قید وبند میں گھٹ کر مرجاؤں، میرا جسم زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور شب وروز رونا ہے)

میری یہ ارزو ہے کہ اول وطن پہنچ جاؤں، پھر اگر زندگی کے دن ختم ہوجائیں تو ہوجائیں

بظاہر شاہ بھٹائی نے ماروی کے نکتہ نگاہ سے حب الوطنی کا یہ منظر پیش کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی بے پناہ آرزو کو حب الوطنی کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی بھی اس قبیل میں فرماتے ہیں:[1]

خوشتر آن باشد کہ سیر دلبران

گفتہ آید در حدیث دیگران

شاہ بھٹائی رح کے کلام میں انوکھی محاکات موجود ہیں، چاند کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

چنڊ تنهنجي ذات، پاڙيان تان نه پرين سين.

تون اڃو منجهه رات، سڄڻ نت سوجهرو.

"اے چاند میں تجھے کس طرح اپنے دوست سے نسبت دوں، تو صرف رات کو روشن ہوتے ہو، لیکن میرا دوست ہمیشہ روشن روشن ہے"

اس دیئے ہوئے محاکات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چاند کی تعریف مقصد نہیں ہے بلکہ اپنے دوست کی تعریف مقصود ہے۔ فطرت کے مناظر کو پیش کرنے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ رانو مومل سے روٹھ کر چلا گیا، مومل حسب دستور اس کے آنے کا انتظار کرتی ہے، اس کی رات انتظار میں کٹتی ہے یہاں اس منظر کو بڑے جاذب انداز میں بیان کرتا ہے

---

[1] مثنوی مولانا روم ج ۲

ڇڏي ڪر موٽيا، تيهو اُڀا نيڻ،

راڻو رات نه آيو، ويل ٿيهي ويئي،

ڪه ساڪاڻي راتڙي، جا پسين ري پيئي،

مون کي ڏن ڏيئي، ڍولئو ڏيئي قراريو.

ثریا جھلملا کر مرگئی، پروین کے ستارے آسمان پر چڑھ آئے۔ پوری رات بیت چکی لیکن رانو نہ آیا، اس کے آنے کا وقت ٹل گیا۔ حیف ہے اس منحوس رات پر جو اپنے پیارے کے سوا گذر گئی۔ مجھے داغ دے کر، میرا محبوب اپنے وطن ڈھٹ جاکر آرامی ہوا۔

شاہ لطیف بھٹائی ؒ کے شاعری کا دور، سندھی شاعری کے عروج کا دور تھا، دراصل شاہ لطیف کی ہمگیر شخصیت کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ وہ عوامی شاعر تھے اپنے کلام میں سچے اور پاکیزہ عوامی جذبے کو پیش کیا ہے۔ عوامی شاعر ہمیشہ عام انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ وہ عوام سے اتنے قریب تر ہو جاتا ہے کہ ان کی دھڑکنوں میں رہتا ہے۔ شاہ بھٹائی نے اپنے کلام میں وطن عزیز کی تاریخ و تہذیب، معاشرتی زندگی، اور تمدن، کسان، مزدور، تاجر، غریب عوام کی ترجمانی کی ہے۔ اور ایک رہنما کی حیثیت سے بھی عوام کو بیدار کرنے کی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ یکجہتی کا سبق دیتے ہیں فرماتے ہیں

وڳر هيو وتن پرت نه ڇنن پاڻ ۾

پسو پکيئڙن ماڻهن ميٺ گھٽو.

(اکٹھے ہو کر اُڑتے ہیں، اور باہمی محبت نہیں چھوڑتے۔ پرندوں کو دیکھو، ان میں انسانوں سے زیادہ محبت ہے۔)

ایک جگہ خس و خاشاک اور گھاس کی متعلق غیرت اور قربانی کی جذبے کو اُجاگر کرکے فرماتے ہیں۔

ٻڏندي ٻوڙن کي ڪي هاتڪ هٿ وجهن،

پسو لطيف چئي ڪيڏي ڪک ڪڻن.

توڙي ڪنڌي ڪن نه ته ساڻ ملن سيرم.

(ڈوبنے والا تنکے کا بھی سہارا لیتا ہے سمجھدار اپنے آپ کو بچانے کے گھاس کو پکڑتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں ان تنکوں (دریا کے کنارے پر ہوتے ہیں) کی غیرت دیکھو۔ اگر اس میں طاقت ہوگی تو وہ اسے بچائینگے، ورنہ اس ڈوبنے والے کے ساتھ بہہ جائینگے

شاہ لطیفؒ کبھی صلح کل بن کر انسان کو تلقین فرماتے ہیں۔ صبر سے جو کام بنتا ہے وہ شور و شر سے نہیں بنتا، فرماتے ہیں۔

هو چوني تون م چوءُ، واتون وراڻي،

اڳي اڳرائي جو ڪري، خطا سو کائي

پاڻ م پاڻي، ڏيو ڪينڌي وارو هين کي.

(اگر کوئی تجھے برا کہے، تو اسکے بدلے میں کچھ نہ کہہ جو شروعات کرتا ہے، وہی سزا کا حقدار ہوتا ہے)

جس نے دغا و فریب دل میں رکھا اُسکا وجود نہ ہوگا۔

کتنی عملی تعلیم ہے جو لطیف سائیں نے دی ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد بھی یہی ہے۔ "الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس" "غصے پر صبر کرو اور انسان کے لئے عافیت بن جاؤ" یہ عملی اسباق ہیں جو ہمیں اس بیمثل سخنور سے حاصل ہوتے ہیں۔

شاہ بھٹائی ؒ کے کلام پر تنقیدی نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوگا کہ آپ کا کلام تصوف کے باریک نکتوں سے بھرا ہوا نظر آئے گا۔ انسانی کردار کے رموز و اسرار کو سمجھایا ہے۔ اور اپنے کلام میں گویا اپنی حقیقت کو نہایت لطیف انداز سے بیان کیا ہے۔ جیسے حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

خوشتر آن باشد کہ قصۂ دلبران   گفتہ آید در حدیث دیگران ۔

سرکنبھات، سرموئل رانہ اور سرپوربپ میں مجاز کا ذکر کیا ہے بقول مرحوم مرزا قلیچ بیگ

"ان سروں میں صرف عشق مجازی کا ذکر کیا ہے۔ اور اپ کے ابیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سچا عاشق کس کو کہتے ہیں، کس طرح محبت کے منازل طے کیئے جاتے ہیں"

مرزا صاحب کی رائے کس قدر محقق ہے یہ شاہ لطیف کے پاکیزہ سخن سے دیکھیں مجاز کی محبت کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

ساھ وڃي وٺين سپرين ڪري فراقي ۔

دلبر دل کسي وڃين ٻارا تين ياقي

جاڙ مون ضعيف سان تو جانب ڪئي جاڪي

ھت ٻت رھيو باقي، ساھ وڃي وٺين سپرين ۔

اے میرے محبوب تونے لٹیرا بن کر میری جان لوٹی، میرے دلبر میرا دل چھین کر بے وفا بن گئے ۔

تو نے اس ضعیف پر بڑے ظلم ڈھارے یہاں تو صرف خاکی جسم ہے، جان تو تونے لی ہے ۔

ان سروں میں شاہ بھٹائیؒ نے محبت، محبوب کا انتظار، عاشق کی بیقراری، وصل و فراق کے نقش نہایت عمدہ طرح ادا کیئے ہیں ۔

مونکي ماءِ مجاز، پچاري جان تنيو ۔

میری ماں عشق نے مجھے پنجیارے کی طرح تکلیف دی ہے ۔

جس طرح مشرق کے صوفی شعراء نے اکثر مجازی محبت کو عشق الٰہی کی بنیاد سمجھا ہے۔ اس طرح شاہ لطیف بھٹائیؒ نے بھی اس حقیقت سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن وہ اس منزل پر کھڑے نہیں رہے۔ حافظ شیرازیؒ کا قول ہے

فردا کہ پیشگاہ حقیقت شود پدید،

شرمندہ پروئے کہ نظر بر مجاز کرد ۔

کل جو خدا تعالیٰ کے سامنے تیری حقیقت ظاہر ہو گی

جس نے مجاز پر نظر رکھی ہو گی وہ کس قدر شرمندہ ہوگا ۔

حافظ شیرازی کی طرح سندھ کا یہ اولوالعزم شاعر بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں۔ آپ نے اُس حقیقت کا اظہار (حافظ شیرازی کے مقابلے میں) آسان طریقے سے کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

چاکي وڃي چو پيلي ٿين پين جو،

وسئ ڪنھجي ڪريم جي جڳ جو والي جو،

سو کو ھوندو سو، جنھن جو عشق الله سين

اے بندے تم کیوں دوسروں کے دوست بنتے ہو، تم کو تو خدا تعالیٰ کی باگ تھامنا چاہیئے جو پورے جہان کا والی ہے۔ وہ ہی خوش رہے گا، جسکا عشق اللہ تعالیٰ سے ہے ۔

سر برو و میں ان معارف اور حقائق کا مظہر ہے۔ مجاز اور حقیقت کی کشمکش کے بعد شاہ بھٹائی اپنے اصلی مقصد کو حاصل کرلیتے ہیں جو ایک عظیم الشان کامیابی ہے یہی انسان کی جدوجہد کا کمال ہے:

شاہ صاحب اپنے کلام میں سندھ کے معاشرتی حالت کا بیان فرمایا ہے، جس میں امیروں، فقیروں، اور عام انسانوں کے رسم و رواج،

رہنے سہنے، عبادات، بیوپار، سیر و سیاحت کا نقش کھینچا ہے۔ اس کے ساتھ سندھ کی تاریخ و جاگرافی کا بیان بھی آپ کے کلام میں نظر آتا ہے۔ شاہ بھٹائی نے اپنے کلام سندھ کے مغربی پہاڑوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ خود سیر سفر کے دوران، ان دشوار راہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ خود ہنگلاج اور لاہوت لامکان پر پہنچے، وہاں سے تھرپارکر کی طرف سفر اختیار کیا، گنجی پہاڑ (حیدرآباد) کی طرف بھی گئے۔ کیوں کہ غریب الوطن ہونے کے وقت راستے میں جوگی فقیروں کی ٹولی ملی تھی، جن کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے، گنجا پہاڑ ایک خاموش جگہ ہے۔ جہاں سکون اور خاموشی میسر ہوتی ہے یہ مکان کاہوڑی فقیروں کے لئے عبادت گاہ تھا۔ جس سے متاثر ہوکر شاہ صاحب نے فرمایا تھا۔

گنجي ڏونگر گام جي، جنين پيٺي سڌ،

بي ڇڏي ٻڌ، لوچي لاهوتي ٿيا.

"جن کو گنجی پہاڑ کے روحانی راستہ کی خبر ہوئی، انہیں دوسری راہ کو چھوڑ کر فقیری اختیار کی"

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف نے ایک بزرگ "بھریو نبیرن کوٹائی" کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جو اکثر گنج پہاڑ میں رہتا تھا، اس لئے اس پہاڑ کو فقیروں میں غیر معمولی شہرت تھی۔ اس روحانی خزانوں کے سبب شاہ بھٹائیؒ نے بھی اس پہاڑ کو بڑی اہمیت کا مقام سمجھا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے زمانے میں ایسے درویش وہاں رہتے ہونگے، جنکے فیض سے یہ سندھ کا محبوب فیض یاب ہوا ہو جن کے لئے فرماتے ہیں۔

جت نه پکيءَ پير، تت تمڪي باهڙي،

پيو پاريندو ڪير، کاهوڙڪي کيس ري.

اس ویران جگہ پر جہاں پرندے کو پر مارنے کی بھی طاقت نہیں ہے وہاں آگ سلگتی ہے

وہاں اور کون آگ جلا سکتا ہے سواء کاہوڑی فقیروں کے جو ان ویران بستی میں رہتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اس جگہ پر جہاں پرندے بھی پہنچ نہیں سکتے وہاں کاھوڑی پہنچتے تھے اور عبادت الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

شاہ لطیفؒ نے سر مارئی میں ایک وطن پرست کے صحیح جذبات کی ترجمانی کی ہے، اس سُر کی ابتدا اس مضبوط فکر سے کی ہے۔ مارئی کو اپنے وطن اور وطن والوں سے کوئی معمولی محبت نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جب اس جہان کی تخلیق فرمائی۔ اور روح عدم سے وجود میں آئے تب اس وقت روحوں نے خدا تعالیٰ کی خدائی کا اقرار کیا، اس وقت مارئی کو اپنے عزیزوں (ماروں) کی محبت امانت کی حیثیت سے حاصل ہوئی فرماتے ہیں:

الستُ بربكم، جڏهن ڪن پيوم

قالو بلیٰ قلب سين، تڏهن تت چيوم

تنهين ڏيو ڪيوم وچن وڻ ميڇن سين. (سر مارئي)

الستُ بربکم کی صدا جس وقت کان میں پڑی قالو بلیٰ قلب کی گہرائی سے کہہ دیا،

اُسی وقت میں نے اپنے عزیزوں سے وعدہ کیا کہ میں تیری ہوں۔

مارئی کی محبت کی ابتدا بھی یہی تھی تو انتہا یہ یہی تھی، عمر سومرہ بادشاہ کی سختی یا فریب، اس خدائی بندش کو کس طرح بھی توڑ نہ سکا۔ اس حقیقت کا اظہار شاہ صاحب نے بلند عزم سے کیا ہے:

جڏهن ڪن پيوڪون، مَن تڏهون ماڙيين

نون ڪين وڃين، تن ۾ سومره شڪون.

نعميون ڪون جاڙ جهڙي کي پاتيون. (سر مارئي)

جس وقت ربّ تعالیٰ نے کن فیکون فرمایا، اس وقت سے ماروی کا دل اپنے عزیزوں سے ملا ہوا تھا۔

اے عمر سومرو، تو کس طرح اُنکے دلوں میں ماروی کے لیئے شکوک پیدا کر رہے ہو

اے امیر تیری اس سختی نے میری جان اور جسم کو بڑی تکلیف پہنچائی ہے۔

الست بربکم کے آواز پر لبیک، ماروی کی محبت کی پختہ دلیل ہے۔ لیکن شاہ بھٹائی رح کا تخیل اس سے بھی بلند پرواز ہے۔ ظاہری زنجیر تو جسم کو قید کر سکتا ہے۔ لیکن قدوسی صفاتِ روح ان پابندیوں سے بہت بلند ہے۔ فرماتے ہیں :-

جِناکَ جِسمِي وَالفُؤادُ لَدَيکُمُ ، هيون ھُتِ سندوم

میرا جسم یہاں ہے، لیکن دل آپ کے پاس ہے

ماروی جب اپنے وطن سے علحدہ ہوئی تو وہ اس نا اُمید اور مایوسی کے عالم میں کہتی ہے۔

ڈریا ٿين ڏار جي وڍي وڻ جدا ڪيا ،

تن سڪن ڪھڙي سار ڪه اُتا مينھن ملير ۾ .

"شروع سے درخت کے تنے کو کاٹ کر جدا کیا جائے، تو اس سوکے ہوئے تنے کو کیا خبر کہ ملیر میں برسات ہوئی"۔

شاہ بھٹائی رح اسی جذبات کو اپنے شاعرانہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔

ري اعزا ٻين ھتِ گُهنگهر گهارڻ مون ٿيو.

بَکَتِ العَيْنَانِ فِي ھَوَاکَ دَمًا ، پچان ساڻ پرتِ

مَنَ اکيون تن تِپ ، جني ڄنَبُ جيڏ ييين .

میں اپنے غریب عزیزوں کے بغیر کو اپنا وقت بڑی پریشانی میں گذارتی ہوں

اے میرے محبوب میں تیری عشق میں دونوں انکھوں سے خون بہاتی ہوں۔ اپ سے آکر ملوں

میرا من اور انکھیں اس جگہ پر ہیں جہاں میںنے اپنی زندگی، ہم جولیوں سے گذاریں ہیں۔

وطن سے دور عمر کے کوٹ (قید) میں بہت تکلیف سے وقت گذارنے لگی، عزیزوں کی جدائی میں خون کے انسوں بہائے۔ حضرت مولانا جلال الدین رومی نے اس فراق کے فلسفی کو اس طرح بیان فرمایا ہے :-

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق ۔ تا بگویم شرح دردِ اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش ۔ باز جوید روزگارِ وصلِ خویش۔

جب فراق سینہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، تب تو درد اور اشتیاق کی تشریح ہو سکتی ہے

جو اپنے اصل سے دور ہو جاتا ہے، وہ اپنی اصلیت کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس صوفی شاعر کے کلام کی ان خصوصیات میں فن کی لطافتوں کا اتنا متوازن امتزاج بھی ہے، زبان نہ جاننے والے کے دل پر ترجمہ پڑھنے سے بھی گہرا اثر ہوتا ہے۔ سندھی معاشرتی زندگی کو جس اخلاقی نکات کو اشاروں اور کنایہ میں پیش کیا ہے اس سے پڑھنے والا ایک واضح ذہنی تصویر بنا

کن فیکون یہ حرف قرآن پاک میں تین جگہوں پر آیا ہے۔ سورۃ آلِ عمران۔ سورہ مریم۔ رسوۃ مومن، پوری آیت کریمہ اس طرح ہے۔
فَاِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُولُ لَهٗ كُنْ فَيَكُونُ۔ "جب اللہ تعالیٰ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے، تب صرف فرماتا ہے "ہوجا" تو وہ ہو جاتی ہے"

لیتا ہے اور تخیل کی نزاکت اور معنی میں محو ہو جاتا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کو سمجھنے اور ان کے شاعرانہ محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس چیز کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ شاہ بھٹائی صوفی شاعر ہیں اور تصوف آپ کی شاعری کا سب سے بڑا جز ہے۔ شعر میں آپ کی ذات اور شخصیت کا بڑا دخل ہے۔ شاہ بھٹائی صوفی شاعر ہونے کی وجہ سے عشق کا کردار بہت بلند ہے، جس میں حسن اور عشق کا نصب العین بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ حسن کی بلندی یہ ہے کہ وہ دنیا کے ہر حسن سے بہتر و برتر ہے۔ ایسے حسن کے لئے عشق بھی ایسا ہی بلند ہونا چاہئے۔ وہ محبوب کے حسن کا فریفتہ ہے۔ اس میں نیکیوں کے سواء کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اس کے دیئے ہوئے درد میں اُسے باقی ہر چیز سے زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے۔ ایک جگہ اپنے محبوب کے شانِ جمال کی تعریف اس طرح کرتا ہے کہ گویہ محبوب اس کائنات میں یکتا ہے ایسی مثال دنیا کے کسی اور زبان کی شاعری میں نظر نہیں آتی فرماتے ہیں:-

ناز منجھاں نکري، جڏهن پريں کري ٿو پنڌُ

پوئن پٽ "بسم الله" چئي، راهه چمي ٿي رندُ

اُپيون گهڻي ادب سين، حورون حيرت هندُ

سائينءَ جو سوڳندُ، ساجن سڀنئان سُهڻو.

جب میرا محبوب اپنی شان کے ساتھ خراماں ہوتا ہے، تو زمین بھی بسم اللہ پکار کر راہ کو چومتی ہے۔ حوریں بڑے ادب سے ایک جگہ کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میرا محبوب سب سے حسین ہے، میں رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔

شاہ لطیف کے کلام میں صوفیانہ تخیل چھایا ہوا ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے اُنہیں سندھ کے ہر طبقے کے لوگوں کا محبوب بنایا ہے۔ اس کا پس منظر وہ زندگی ہے جسے اُنہوں نے بہت قریب سے دیکھا، وہ احساس ہے جسکی دھڑکن اُنہوں نے دوسروں سے زیادہ خود سُنی، زندگی کے ان دشوار راہوں پر اُن کی گہری نظر تھی۔ لیکن اُنہوں نے اپنے شاعرانہ انتخاب سے پوری فضا میں سے وہ چیزیں حاصل کیں جو ان کے تخیل اور اخلاقی نصب العین کی وضاحت میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ان چیزوں کے درمیا اتنا صحیح امتزاج ہے کہ ایک چیز کے اثر اور مقصد کو زائل نہیں ہونے دیتا۔ شاہ بھٹائی گویہ شاعر بھی ہیں تو حکیم بھی نکتہ دان ہے تو نکتہ سنج بھی۔ آپ کی طبیعت میں عقل اور عشق کی ابدی کشمکش موجود تھی۔ دین اور اخلاق، تہذیب اور تمدن کا بیان، حسن کی کرشمہ سازی اور نقاشی بہ موجود ہے۔ شاہ صاحب نے حقیقت اور مجاز کی تصویر کو بے نقاب کیا ہے۔ کلام میں والہانہ انداز میں انسانی جذبات موجود ہے جسکی آپ نے ترجمانی کی ہے۔ اور قدم قدم پر تلقین فرماتے ہیں۔ اور اس مستعار زندگی کے قافلہ کو طوفان و ہجان کی منزل سے پار کرنے کے لئے ساربانی کرتا ہے۔ کبھی خدا تعالیٰ کی درگاہ عالی میں توبہ سے سمندر کے طوفان کی توانائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے سربسجود ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سيويو جن سبحان، وير نه وڙهي تن سين

توبه جي تاثير سين، ٽري ويا طوفان،

ڏيئي توڪل تڪيو اُڙ لنگهيا آسان،

حامل ڪشتيبان وچ پيو گذ ٻن واهرو

"جن نے خدا تعالیٰ کو یاد کیا، اُسے دریاہ کی مدوجزری کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، توبہ کے تاثیر سے بڑے بڑے طوفان ٹل جاتے ہیں۔ جن نے خدا تعالیٰ پر بھروسہ رکھکر طوفان سے گذرنا چاہا وہ آسانی سے پار ہو گیا۔ وہاں مرشد کامل ناخدا بن کر مدد کے لئے پہنچ جاتا ہے"

انسان کی زندگی میں نیکی اور بدی کے دو جز موجود ہوتے ہیں۔ یہ دونوں انسان کے عمال پر منحصر ہوتے ہیں۔ انسان کشمکش حیات میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس طرح زندگی کے گوناگوں پیچیدگیوں اور مختلف مسائل پر بڑی شائستگی سے بحث کی ہے۔ خاکی انسان جب زندگی کے بے پناہ جدوجہد سے مایوس ہوتا ہے تب اس کی حالت قابل رحم ہوجاتی ہے۔ وہ نہ صرف دنیا کی ہر چیز سے غافل ہوجاتا ہے بلکہ خود خداتعالیٰ کے قانون اور عالمگیر انصاف میں بھی یقین نہیں رکھتا وہ اعمال ہی ہیں جو انسان کی زندگی کو سنوارتا ہے ڈاکٹر اقبال نے فرمایا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

شاہ بھٹائی شریعت کے بڑے پابند تھے، اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ فرمایا ہے:۔

سارِي سِکُ سَبَقُ، شَريعت سَندو سِکُڻي

طريقتان ٻکوھي، حقيقت جو حق.

معرفت مَرڪ، اصل عاشقن کي.

معنی شریعت کا سبق سنبھل کر سیکھ اور سچی دیندار بنو طریقت سے تیز تر ہے حق تعالیٰ کی حقیقت

معرفت الٰہی اصل مدعا ہے سچے عشاقوں کی

جس طرح کلمہ طیب میں اقرار کرنا ضروری ہے، کہ سوائے رب تعالیٰ کے کوئی رب نہیں۔ اس لیئے بندے کو کسی اور کے آگے سر جھکانا کفر ہے۔ کلمہ طیب کے تین جز ہیں، پہلا "لا الا" کوئی رب نہیں ہے الاہ، دوسرا "الا اللہ" سواء اللہ تعالیٰ کے، تیسرا "محمد رسول اللہ" محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا رسول ہے۔ پہلے جز کو نفی دوسرے کو اثبات کہتے ہیں۔ نفی کی معنیٰ دوسرے معبودوں کو ترک کرنا اور اثبات کی معنیٰ ہے ایک خدا کی ہستی کو قائم کرنا۔ نفی اور اثبات کو ملاکر توحید کہتے ہیں، اور دوسرے حصہ کو رسالت کہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے وحدانیت کے ساتھ رسالت کا جو اقرار کیا ہے۔ اس میں رسالت کو وحدانیت کا ایک اہم جز قرار دیا ہے فرماتے ہیں۔

وَحْدَہٗ لَاشَرِيْڪَ لَہٗ، جان تو چئين اي

تان مَڃ محمّد ڪارڻي، نِرتون منجهان نيہ

تان تون وڃتو ڪيئن ناھين سر ٻئي کي.

خداتعالیٰ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے جب تو یہ کہتا ہے۔ تو صدق دل سے حضرت محمد صلعم کو بھی مان جن کے لئے یہ دنیا پیدا کی۔

پھر تو کس طرح غیر کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ شاہ لطیف بھٹائی نے سندھی زبان کو جس اوج اور کمال پر پہنچایا ہے۔ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی آپ کی شاعری اکتسابی نہ تھی، بلکہ الہامی ہے۔ فصاحت، بلاغت، سلاست جو مشرقی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ آپ کے کلام میں افراط سے موجود ہے۔ دنیا کے عظیم شعراء کی طرح آپ کا کلام بھی سادگی، شستگی اور روانی سے بھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وفات کو دو صدیوں سے زیادہ وقت گذر چکا ہے۔ لیکن آج بھی کلام میں وہی تازگی اور سوز گداز موجود ہے۔ جو آپ کے زمانہ میں موجود تھا۔ عام و خاص میں آپ کا کلام مقبول ہے۔ اور اسے الہامی کلام سمجھتے ہیں۔ یہ حقیقت محض عقیدت پر مبنی نہیں ہے، لیکن واقع آپ کی فصاحت اور سلاست قابل رشک ہے۔ شاہ بھٹائی کے کلام کو سندھی ادب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مجازی عشقیہ داستانوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ تمثیل اور تشبیہ کے استعمال سے حقیقت کے راز کو بڑے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے، جس سے پڑھنے والا ہمیشہ حیران رہتا ہے۔ شاہ لطیف کے کلام کو گہری نظر سے دیکھنے سے معلوم

ہوگا کہ ایک باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم مفکر بھی تھے۔ شاہ صاحب کے کلام کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ سندھ کے رومانی داستانوں کو بیان کریں۔ چونکہ اس دور میں یہ داستان سندھ میں مقبول عام تھے۔ اس میں عوام کے دماغی عیاشی کو ان کے ذہن سے پاک کرنا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب نے اُن داستانوں کے ذریعہ اپنا پیغام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب کے کلام میں تشبیہات زیادہ استعمال کی ہوئی ہیں۔ شاعر کو علم بیان کا جاننا نہایت ضروری ہے، کیونکہ تشبیہات سے کلام میں بڑی لطافت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ غیر معمولی تھی۔ اپنے دیش کی تشبیہات، استعاروں اور کنایہ کو لیا ہے جس میں مقامی رنگ سمایا ہوا ہے۔ جن کی مثال یہ ہے۔

جر تي ڦوتو جيئن ڦرين ٻگي اُتي تئي،

تون پڻ آهين تئين، دنيا مي ڪو ڏينهڙو.

جس طرح پانی کی سطح پر بلبلا ابھر کے گلنے سے ختم ہو جاتا ہے۔ اے انسان تو بھی اس دنیا میں کچھ دنوں کے لئے ہو۔

دوسری مثال ہے

نڪائين ڪان نينهن سڪ منهنجا سپرين.

سڙي سا ۽ ڏينهن پاهر باقي نه ڪري.

شاہ بھٹائی غزل گو شاعر نہ تھے، لیکن آپ کے کلام میں غزل کی روح باقی تھی۔ غزل کی صنف سے غیر واقف نہ تھے، کیونکہ فارسی زبان میں سندھ کے غزل گو شاعر موجود تھے، اس کے اثر سے آپ کے کلام میں تغزل کا عنصر موجود ہے۔ تغزل سے مراد ہے شعر میں ہر خیال کو حسن و محبت اور خوش اسلوبی سے بیان کیا جائے، جس میں ایک طرف محبت کے لطیف جذبات موجود ہوتے ہیں، تو دوسری طرف حسن کی شوخیاں، وصل کی امنگوں اور ارمان، جدائی کے داغ اور درد موجود ہیں۔ مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں [1]

شاہ لطیف اپنے کلام میں عاشقانہ مضمون کو بڑی وسعت سے بیان کیا ہے، لیکن شاہ لطیف غزل کی تنگدامنی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ غالب کی طرح اسکا احساس رکھتے تھے۔

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے۔

اس لئے آپ نے غزل کو اپنے خیالات کا مرکز نہ بنایا، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ شاعری کے حدود وسیع ہیں۔ شاعر اگر چاہے تو کائنات کے حسن، فطرت کے جمال کو اور زندگی کی بلندی و پستی کو نمایاں طور پر اپنے شعر میں ظاہر کر سکتا ہے۔

آنجہانی ڈاکٹر گربخشانی لکھتا ہے:- [2]

شاہ لطیفؒ کے عاشقانہ شعر کا مضمون فارسی غزل جیسا ہے لیکن شاہ بھٹائیؒ نے فارسی غزل کا کوئی تتبع نہیں کیا۔ فارسی غزل میں صبا، پیغام پہچانے کے لئے ہوتی ہے۔ تو شاہ بھٹائیؒ کا پیغام پہچانے والا قمریا زاغ ہے۔ فارسی شاعری میں شراب، ساقی، مطرب وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن شاہ بھٹائیؒ ان باتوں سے بڑی حد تک کنارہ کیا ہے۔

---

[1] شاہ لطیفؒ کے کلام میں تغزل (مقالہ) مقالہ نگار مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی رسالہ نئین زندگی ماہ سپتمبر سنہ ۱۹۵۶ء

[2] مقدمہ لطیفی۔ مصنف ڈاکٹر گربخشانی صفحہ ۱۳۳۔

شاہ لطیف کے زمانے میں اکثر سندھی زبان میں دوھی، ابیات، وائیاں کا رواج تھا۔ غزل کا رواج نہ تھا۔ اس لئے آپ نے اپنے دیس کی صنفوں دوھی وائی اور بیت کو اپنے کلام میں انتخاب کیا۔ جسطرح تغزل کا تعلق اسلوب بیان کے انداز سخن کے موضوع سے ہوتا ہے نہ کہ وزن یا بحر، ردیف یا قافیہ سے۔ اس لئے شاہ بھٹائیؒ کے یہاں تغزل اپنی اصلی حیثیت میں موجود ہے چونکہ شاہ بھٹائیؒ صوفی شاعر تھے اس لیئے ایک پاکیزہ شاعر ہونے کے علاوہ، آپ کے کلام میں وطن عزیز کا رنگ سمایا ہوا ہے۔ آپ یہاں فطرت حیا اور سنجیدگی کا عنصر موجود ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنے عشق کا اظہار محبوب کے حسن کی تعریف، اور جدائی کی تکلیف اور بیچنے کو سسئی، مارئی، مومل، سوھنی، لیلا، نوری اور سورٹھ کے زبانی بڑے سوز و درد سے پیش کرتا ہے۔ شاہ لطیفؒ کا یہ انداز بیان نہایت دلکش اور فطری ہے۔ ایک ونجارے کو اپنی وطن سے علاحدہ ہونے کے وقت بھرپور جذبات کو اس طرح پیش کرتا ہے۔

آج پڻ واپون ڪن وڻجارا وڃڻ جون
هلون هارا سپرين روشان تان نه رهن،
مون ڄليندي ڪيترو ايل سامونڊين
پڳه ڇوڙي جن وڃا پيڙا پار ڏي.

آج ونجارے سفر پر جانے کی باتیں کر رہے ہیں جانے والا میرا محبوب میرے زار و قطار رونے سے بھی نہیں رکتا۔
میری ماں سمندر کے اس مسافر کو میں کیسے روکوں۔ انہوں نے تو اپنے جہاز کے اٹھا کر سمندر میں سے لنگر تک اٹھا دیا ہے۔

ایک اور مثال ہے:- اَج پڻ اکڙين سڄڻ پنهنجا سارِيا،
ڳلن تان ڳوڙها جون ٻو نديون بس نه ڪن.
سنڌي سڪ پرين لوڪ ڏٺي نه لهي.

آج بھی میری آنکھوں نے اپنے پیارے کو یاد کیا ہے میرے گالوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں رکتی نہیں۔
اُن کی محبت دوسرے لوگوں کو دیکھنے سے ہرگز کم نہیں ہوتی۔

شاہ بھٹائیؒ سسئی کی زبانی اس کے درد کی صدا کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

سنجهي مون نه سنڀاليو، صبح سارِيم سور.
اڌ رات آڌ منو ڏين پلٽيو پور
جتن جي ضرور، مادر ا ماري آهيان.

شام کے وقت میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ اور صبح ہوتے ہی درد دامنگیر ہوا۔ آدھی رات کو مجھے رنج و فراق نے بہت تڑپایا۔
اے میری ماں! ان شتر سواروں کی محبت نے مجھے مردہ بنا دیا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں تغزل لطف اور ترنم کی ایسی ہم آہنگی موجود ہے جسکو سننے کے بعد روح کی گہرائیوں میں وہ کلام اُتر کر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتا ہے۔ شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں سادگی موجود ہے جو ایک مثالی نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں دوسری خوبی جوش ہے۔ جن واقعات یا تاثرات جذبات اور کیفیات کو بیان کیا ہے اُن کو بڑی دلسوزی اور جوش سے پیش کیا ہے۔ پورے واقعات اور جذبات کے اندر زندگی اور اضطراب کی کیفیت کو پیدا کیا ہے اور واقعات کی اَدائگی میں کمال مہارت حاصل تھی۔ سسئی فطرت کے ہر پہلو کو دشمن دیکھکر درد سے پکار اُٹھتی ہے اس کے ساتھ سسئی کے عزم اور ارادے کی پختگی دیکھئے۔

اٺ ويري اُوتار ويري، ويري ٽنٽرم ڏيس،

چوٿون ويري واءُ ٿيو، جنهن لڏائا پنهوءَ جا پير،

پنجون ويري سج ٿيو، جنهن اُڀي ڪئي اوير.

ڇهون ويري ڇپر ٿيو، جنهن سوان ڪيا نه سير،

ستون ويري چنڊ ٿيو، جو ڪڙيو نه وڏي دير،

واهيري ٻي ديرُ، ڇلون ڪريان ڇپرين.

عشق کہتی ہے اونٹھ دشمن اور شتربان دشمن تو میرے دیور بھی دشمن نکلے، چوتھا دشمن ہوا بنی جس نے میرے پنھوں کے پاؤں کو مٹایا.

پانچواں دشمن سورج بنا جس نے طلوع ہونے میں دیر کی، چھٹا دشمن پہاڑ ہے جس نے اپنے راستے سیدھے نہ کیئے.

ساتواں دشمن چاند بنا جو زیادہ دیر تک آسمان میں ٹھہر نہ سکا، شام کا وقت جب سبھی اپنے آشیانوں کی طرف جاتے ہیں مرف میں ہی ہوں جو پہاڑوں میں ہوں

شاہ لطیف کے کلام کی شروعات اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و توصیف سے ہوتی ہے، فرماتے ہیں:-

اوّل الله عليم، اعلي عالم جو ڌڻي،

قادر پنهنجي قدرت سين قائم آهِ قديم

والي واحِدُ وحدهُ، رازق رب رحيم،

سو ساراه سچو ڌڻي، چئي حمد حڪيم

ڪري پاڻ ڪريم، جوڙيون جوڙ جهان جي.

سب سے اول اللہ تعالیٰ، اعلیٰ علیم اور سارے عالم کا مالک اور رحیم ہے، قادر اپنی قدرت سے قائم اور قدیم ہے

وہ سب کے مالک واحد، رزاق، رب رحم کرنے والا ہے اس سچے رب پاک کی تعریف کر اور حمد و توصیف کرتے رہ

وہ کریم ہے اور وہی پورے جہاں کی امیدوں کو بر لانے والا ہے.

شاہ لطیف کے کلام میں ہر روحانی مرض کی دوا موجود ہے. اس روحانی شفایابی کے لیئے یہ دعائیہ کلمات فرماتے ہیں:-

تون حبيب تون طبيب، تون درد جي دَوا

جانب منهنجي جيءَ ۾ آزار جا انواع.

صاحب ڏج شفا ميان امريضن کي،

میرے رب پاک تو حبیب ہے، تو ہی طبیب ہے، تو ہی میرے درد و تکلیف کی دوا ہے، میرے مولا (محبوب) میرے جسم کے اندر بیماریوں

اور تکلیفوں کے اقسام ہیں، تو ہی شفا دینے والا ہے یا اللہ ان بیماریوں سے.

شاہ بھٹائیؒ دنیا کے ان چند شعراء میں سے ایک ہیں جنھوں نے شاعری کے ذریعہ ایک لازوال پیغام دیا ہے، جو کسی خاص قوم یا ملک یا ایک مقرر دور کے باشندوں کے لئے نہیں ہے. لیکن آپکا کلام کے لئے ہے. مذہب کائنات کی عظیم ترین حقیقت ہے شاہ بھٹائی کو اپنا مذہب سب چیزوں سے عزیز تھا. ایمان کی پختگی اور شریعت محمدی صلعم کے سختی سے پیرو تھے اپنے کلام مذہب کو کھول کر سمجھایا ہے. وہ بنی نوع انسان سے حقیقی محبت کا جذبہ رکھتے تھے. شاہ صاحب یقیناً ایک اہل دل بزرگ اور انسان ذات کا دوست تھا. بشریت کی نقطہ نگاہ سے اپنے وطن کی خوشحالی اور غریب عوام کے ہمدردی کو اعلیٰ وصف سمجھتے تھے. سر سارنگ میں فرماتے ہیں:-

سارنگ سار لهيج، الله لگ اڄن جو،

پاڻي پوءِ پٽن تي ارزان اَن ڪريج

وطن وسائيج تہ سنگهارن سک ٿئي.

اے بادل اللہ کے واسطے پیاسوں کی حالت پر رحم کرکے اُن کا خیال کرنا۔ برس کر زمینوں میں زیادہ پانی دینا اور اناج بھی سستا کرنا۔

میرے وطن پر برسنا، تاکہ سنگھارن (غریب عوام) خوشحال ہو جائیں۔

برسات برسنے کے بعد غریب عوام اور انکے مویشی خوش ہوتے ہیں۔ ان کی خوشحالی کو دیکھکر فرماتے ہیں۔

بروڻا، ترونا، ونيون ترايون

مکڻ پسهين دهترا، سنگهارون سايون

پاڻيون ۽ پايون پڪي سوڻن پنهنجي.

تیز برسات، بیابان اور تھر (ریگستان) اور نشیبی علاقہ میں برسی۔ تو غریب عوام بڑا خوش ہوا، اُن کی عورتوں کے ہاتھ مکھن سے بھرے ہوئے ہیں، وہ اب اپنی بھینسوں سے خوب دودھ حاصل کرتے ہیں۔ اب تو خادماؤں اور مالکن اپنے جھونپڑوں میں اچھی لگتی ہیں۔

شاہ بھٹائیؒ کے رسالے میں ہر جگہ ناصحانہ نقاط نظر آتے ہیں، کہیں انسان کی بے ثباتی زندگی کو یاد دلانے کے لئے غفلت سے بیدار کرتے ہیں فرماتے ہیں:

ڪڏهن گهوٽ ٿو گهوٽ، ڪڏهن مڙهہ مقام ۾

واريءَ سندو ڪوٽ، اڏي اڏيندي ڪيترو.

اے انسان کبھی تو دولھا بنتا ہے، تو کبھی قبر میں دفن ہوتے ہو

لیکن یہ ریت کا قلعہ کب تک بناتے رہو گے۔

کہیں لیلا (رانی) کا کردار پیش کرتا ہے جو نو لکھا ہیروں کی مالا پر اپنے (راجا) چنیسر کو بیچتی ہے۔ اس ایک بات کے بدلے اپنی زندگی کا سکون اور پیار کھو دیتی ہے۔ اس سے ایک باریک نکتہ کا مقصد اخذ کرتا ہے۔ لیلا سے مراد ایک سالک بندے کی ہے جسکو ایک بار خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، لیکن نفس پرستی میں پھنس کر وہ دور جا گرتا ہے جسکی وجہ سے حق تعالیٰ کی ذات، غیرت جنبش میں آتی ہے وہ بندہ فراق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے

"اِنَّ سَعْداً لَغَيُورٌ وَ اَنَا اَغْيَرُ مِنْ سَعْدٍ وَاللهُ اَغْيَرُ مِنِّيْ وَمِنْ غَيْرَتِهٖ حَرَّمَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ"

بیشک سعدؓ غیرتمند ہے، اور میں سعدؓ سے بھی زیادہ غیرتمند ہوں، لیکن خدا تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ غیرتمند ہے، اپنی غیرت سے ان سب ظاہر و باطن خرابیوں سے روک رکھا ہے۔

باب سوم

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام میں تضمیمات

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ آیات قرآنی کے مطابق ہے، آپ نے خداتعالیٰ اور انکے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کو اپنایا۔ جسکی نجات لابدی ہے۔ آپ کے کلام کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ بخوبی معلوم ہوگا کہ آپ کے کلام کا مرکز اور مقصد حضور صلعم اور کلام پاک ہے۔ اس دوان زندگی کی گمراہ کن حالت سے بچنے اور ھدایت حاصل کرنے کے لئے آقا حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سمجھنے اول عمل کرنے پر زور دیا ہے۔ قرآن پاک کو حکمت عملی اور مخزن رحمت کا منبع سمجھتا تھا۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرح بنی نوع انسان کو تصوف کی شاہراہ پر لے آنا چاہا، جس میں امن وسلامتی، عشق و محبت، دلسوزی اور جذبہ اصلاح کمال پر پہنچتا ہے۔ شاہ لطیفؒ نے انسانی تخلیق کی مراد اپنے خالق سے وابستگی کو لیا ہے جس میں بڑی پختگی موجود ہے۔ بھٹائیؒ نے سرمارئی کی تمثیل میں اس دنیا کی افتادگی کو نہایت عارفانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس حقیقت کا بار بار اعادہ کرتا ہے اس صرت بھری حالت کو قرآن پاک کی روشنی میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

سوڻن وڃائم سومرا، ميرو منهن ٿيوم

ديڄ تنڌ پيوم، جت هلڻ ناهه حسن ري۔

"اے عمر بادشاہ تیرے قید میں آکر اپنے حسن کو گنوادیا، میری صورت گندی ہو گئی ہے، مجھے تو اس جگہ پر جانا ہے۔ جہاں حسن کے بغیر چلنا معیوب ہے"

قرآن پاک کا اس قبیل میں ارشاد مبارک ہے:-

"لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین" (سورۃ التین ۵-۴)

"ہم نے انسان کی خلقت کو نہایت عمدہ طریقہ سے پیدا کیا، لیکن وہ نہایت پستی میں جا گرا"

شاہ بھٹائیؒ نے بھی قرآن پاک کی اس حقیقت کو پیش کیا، دنیا میں وہی شخص کامیاب ہے جسکی عاقبت بالخیر ہو۔ جس کے لئے عمل کی سخت ضرورت ہے اس عمل کی تلقین او مکافات کے ذکر سے پورا رسالہ بھرپور نظر آتا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ نے اپنے کلام میں قرآن پاک، حدیث مبارک اور عربی مقولے تضمین کے طور پر استعمال کئے ہیں اور ان تضمیمات کو اپنے عالمانہ د شاعرانہ انداز فکر سے اضافت فرمائی ہے۔ تضمیمات جو شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ میں موجود ہیں ان آیات، حدیث اور مقولوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جو مختلف سروں کے داستانوں میں موجود ہیں۔

سر کلیان:

داستان اول — أنا مولاک وأنتَ محبوبي. اي اُتائين

ڏکي ڏنائين. ٻئي سرائون سٽيه چيي.

میں تیرا ربّ ہوں اور تو میرا محبوب۔ اس طرح فرمایا، دونوں جہانوں کو اپنے نور سے روشن کر کے دیا۔

لا خوف علیھم ولاھم یحزنون سچن کونہ سور — سورہ یونس رکوع ۱۲ "قرآن پاک"

"ان کو نہ تو کوئی خوف ہوگا نہ کوئی انکو دکھ ہوگا"

داستان تیرا — سوئي راهه ڪري، سوئي رضاءِ — سورہ آل عمران رکوع ۳ (قرآن پاک)

وتعزّ من تشاء وتذلّ من تشاء = جسکو چاہی عزت والا کرے، جسکو چاہی رسوا کردے

سر کلیان ۔ داستان تیرا آخر والعصر جو ایھم آتائون .. = زمانہ شاهد ہے .. .. .. - سورۃ والعصر کے آخری حروف قرآن پاک

بیت ۸ .

بیت ۱۵ اَلَسْتُ بِرَبِّکُم .. .. .. = میں تیرا رب ہوں .. .. .. - سورۃ الاعراف ۲۲ رکوع قرآن پاک

بیت ۱۳ فاذکرونی اذکرکم ای پیورج بات = یاد کرو مجھے تو میں بھی تجھے یاد کروں، یہ بات سمجھو ۔ سورۃ البقرہ رکوع ۱۸ قرآن پاک

سر یمن کلیان :-

داستان پانچواں بیت ۱۸ - لا مقصود فی الدارین ان پر آتائون .. = سوا رب کے دونوں جہانوں میں اور کوئی مقصود نہیں ہے = مقالہ

داستان ۷ بیت ۲ - فاذکرونی اذکرکم تن جي آهاتات .... = مجھے یاد کرو تو میں تجھے یاد کروں، دل میں یہ بات ہے = سورۃ البقرہ رکوع ۱۸ قرآن پاک

سر بیراگ "وائی" واشکروالی ولا تکفرون کچ توں عواناً .... = میرا شکرانہ بجا لاؤ اور کفر نہ کرو .... = سورۃ البقرہ رکوع ۱۸ قرآن پاک

داستان ۲ بیت ۔ = اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ اي کنت کتیائون . گناہوں سے توبہ کرتا ہے، جیسا کہ اُسنے کوئی گناہ نہ کیا = حدیث (کمن لا ذنب لہٗ)

بیت ۸ - = بخو لھم البشریٰ جو انین لاء آیو ...... = دنیا و آخرت میں ان کے لئے بشارت ہے ...... = (فی الحیاۃ الدنیا وفی الآخرۃ) قرآن پاک ۱۰، ۶۴

"وائی" = کل نفس ذائقۃ الموت .. .. .. = ہر ایک نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے ...... سورۃ الاعمران رکوع ۱۹ - قرآن پاک

"وائی" = یوم یفر المرء من اخیہ .. .. = قیامت کے دن انسان اپنے بھائی سے بھی دور بھاگے گا ۔ سورہ ۸ ۳۴ - قرآن پاک

سر سوھنی

داستان ا بیت ۱۲ - واما من خاف مقام ربہ .. .. .. = وہ جو اپنے رب کے مقام کے آگے خوف کرتا ہے جنتی ہے = سورۃ النازعات قرآن پاک

،، ،، طالب المولیٰ مذکر "طالب الدنیا مونث وطالب العقبیٰ مخنث وطالب المولیٰ مذکر" حدیث

، ۲ بیت ۶ . واللہ بکل شئ محیط ای آریانی اصیاں = ہر چیز اللہ کے قبضہ میں ہے، میرے محبوب کی یہی نشان ہے = سورہ آل عمران ۱۲ رکوع ۳ قرآن پاک

، ۵ بیت ۵ . = من عرف نفسہ فقد عرف ربہ اصوئي اچاء = جس نے اپنے آپ کو سمجھا اُسنے اپنے رب کو پہچانا = حدیث .

داستان ۵ بیت ۶ خلق آدم علیٰ صورتہ ای وطن سنجھ ورونہ خدا تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت کے موافق پیدا کیا .

، ، ۹ الفراق اشد من الموت دتی نہ ھوند یاس . فراق موت سے بھی زیادہ سخت تر ہے . عربی مقولہ

۵ - ۱۱ . ما رأیت شیئاً الا ورأیت اللہ میں نے ایسی کوئی چیز نہ دیکھی جس میں اللہ کا جلوہ نہ دیکھا . عربی مقولہ

۵ - ۱۲ فی انفسکم افلا تبصرون سو ھی کر سپی خدا تعالیٰ کی قدرت کے نشان تیرے اندر ہیں . سورۃ الذاریات رکوع ۱۴ پارہ ۲۶ قرآن پاک

۵ - ۱۳ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید، تنھنو توھین سان میں تیرے گردن کے نسوں سے بھی قریب ہوں . سورۃ الذاریات رکوع ۱۴ - ۲۶ - قرآن پاک

داستان ۵ - بیت ۱۴ . اللہ بکل شئ محیط ای آریانی اُصیاں اللہ تعالیٰ ہر چیز میں موجود ہے آل عمران ۱۲ پارہ ۴ قرآن پاک

۵ ، ۱۵ . العشق نار اللہ الموقدۃ کوری جن کاٹی . العشق خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی آگ ہے . (العشق کے سوا) سورۃ الھمزۃ قرآن پاک

۵ ، ۱۷ . العشق حجاب بین العاشق والمعشوق عشق عاشق اور معشوق کے درمیان ایک پردا ہے عربی مقولہ

سر معذوری

داستان ا بیت ۹ . الدنیا جیفۃ وطلابھا کلاب ای میني سي لاءِ یہ دنیا مردار ہے اسکے طالب کتے ہیں یہ اپنے دل سے لگا . حدیث

سر دیسی

داستان ۲ بیت ا . ھیھات ھیھات لما توعدون سي ئي اوطاق - دور ہے دور ہے وہ بات جسکا تجھے خوف ہے
وہ اوطاق سونی ہو گئی . سورۃ المومنون رکوع ۳ پارہ ۱۸ قرآن پاک

داستان ۲۔ بیت ۲	اَلسّفرُ قِطْعَةٌ من النار۔ هاري موٺ نهتان	(مسافری) سفر دوزخ کی آگ ہے	عربی مقولہ
،، بیت ۳	من طَلَبَ شيئًا وَجَدَ وَجَدَ. اُنو علی شاہ	جو کوئی کسی چیز کی طلب کرتا ہے، وہ اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے	حضرت علیؓ کا قول مبارک
،، بیت ۴۔	مَنْ لاشيخ لَهُ فشيخهُ الشّيطانُ ان ري اُنداهي۔	جسکا کوئی مرشد نہیں ہے اسکا مرشد شیطان ہے۔	صوفی بزرگ کا قول۔
،، بیت ۴۔	بلا شَيْخٍ مَنْ يَمْشِيْ في الطّريْقِ امڙي آ واڻي.	جو مرشد کے بغیر چلتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو دریا میں ناؤ کے بغیر چلے	صوفی بزرگ کا قول
داستان ۳۔ بیت ۱۴	رَفِيعُ الدّرَجاتِ پرل پنهون ميڙين۔	بڑی شان والا خدا تعالیٰ ہے۔ پنھوں مجھ سے ملا دیں	

سر کوھیاری :۔

داستان ۲ وائی	لَا تَقْنَطُوا من رحمةِ اللهِ پرين چيو پاڻ	اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو یہ محبوب نے خود کہا ہے	سورۃ الزمر رکوع ۴ پارہ ۲۴ قرآن پاک
	ان الله يَغْفِرُ الذنوب جَمِيْعًا سچو اي پرباڻ.	تحقیق اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف کرتا ہے یہ سچی بات ہے	سورۃ الزمر رکوع ۴ پارہ ۲۴ قرآن پاک

سر لیلا چنیسر و مومل رانو

	كُلُّ نفسٍ ذَائِقَةُ الْموتِ سڀ اي صدا.	ہر نفس کو موت کی لذت چکھنی ہے یہ بھی صدا ہے	سورۃ آل عمران رکوع ۱۹ قرآن پاک

سر مارئی

داستان ۱۔ بیت ۱	الست بربكم	کیا میں تیرا رب ہوں	سورۃ الاعراف رکوع ۲۲ قرآن پاک
،، ،، ،،	كن فيكون	ہو جا	سورۃ مومن قرآن پاک
داستان ۱ بیت ۹۔	ونحن اَقْرَبُ اِلَيْهِ من حبل الوريد وٺن آءُ ويندياس	میں تیری گردن کی رگوں سے بھی قریب ہوں۔	سورۃ قٓ رکوع ۲ پارہ ۲۶ قرآن پاک
،، ،،	هناک جِسْمِيْ و الفوادُ لَدَيكم هيون هُتِ سندو	میرا جسم یہاں ہے مگر دل آپ کے پاس ہے۔	عربی مقولہ
۱۰	قيد الماء۔ قَيْدُ الماءِ اَشَدُّ مِنْ قيدِ الْحديدِ	پانی کا قید لوہے کے قید سے سخت ہے	
داستان ۱۔ بیت ۱۲	جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ وهي قلم وڻو	جو کچھ لکھنا تھا وہ لکھ کر قلم نے اپنی سیاہی خشک کردی	حدیث
،، ،، ۱۳	بَكَتِ العينان في هَوَاكَ دَمًا پچان سان پربٽ	تیرے عشق میں میری دونوں آنکھوں نے خون دیا ہے	شعر
داستان ۱ بیت ۱۴۔	كلّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلَى اَصْلِهِ ٿي ڄڄان ڄانگين ڪاڻ.	ہر چیز کو اپنی اصلیت کی طرف لوٹنا ہے	عربی مقولہ
داستان ۵۔ بیت ۱۱	قل لَنْ يُصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ الله اي معذرت ماگ	کہو کوئی بھی مصیبت ہم کو نہ ہوگی سوائے اُسکے جو رب نے ہمارے حق میں لکھی ہے	سورۃ التوبت رکوع ۷ پارہ ۱۰ قرآن
داستان ۸ بیت ۱۔	لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۔ مارئی کوہ کري	نہ کسی کو تولد کیا نہ کسی سے پیدا ہوا	سورۃ اخلاص قرآن پاک
،، ،، ،، ۳	ليس كَمِثْلِهِ شَيْءٌ پسڻ ناهه پرين.	کوئی بھی چیز خدا تعالیٰ جیسی نہیں ہے	سورۃ شوریٰ رکوع ۲ پارہ ۲۵ قرآن

سر سورٹھ

داستان ۲ بیت ۴	اَنا اَحْمَدُ بلا ميم سين مُنجي سائلُ	میں احمد ہوں بغیر میم کے۔	
،، بیت ۵	الْاِنسانُ سِرّي وَانا سِرّهُ ورتي اِهي واڻ	میں انسان کا راز ہوں انسان میرا راز	حدیث

سر کیڈارو

داستان ۵ بیت ۲	لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا جيڪا پچندم سا	(سورۃ البقرہ) اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی وسعت سے زیادہ سختی نہیں کرتا	سورۃ البقرہ پارہ ۳۔ قرآن پاک
،، ،،	الله نُوْرُ السماوات جلوہ زمیناس	اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کی روشنی (نور) ہے	سورۃ النور رکوع ۵ قرآن پاک
،، ،،	سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مُهَ پ مَڻ گتياس	ان کی صورت میں سجدے کے نشان ہیں (امام حسینؓ کی پیشانی میں سجدے کا نشان موتی شکل تھا)	سورۃ الفتح رکوع ۴ قرآن پاک

داستان ۶ بیت ۱۰	يجاهدُونَ فِي سبيلِ الله سر اهوئي هن	سچا مومن خدا کی راہ میں لڑتا ہے۔ یہی کام کرتے ہیں	سورۃ مائدہ ۸ پارہ ۶ قرآن
سر اسا	اِنَّ اللهَ وِترٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ مَنيئي پيا ٿي پاس	تحقیق خدا تعالیٰ ایک ہے اور وحدت کو پسند کرتا ہے	حدیث۔
داستان ۳ بیت ثانی	عَجِّلُوا بِالتَّوبَةِ قَبلَ الْمَوتِ۔ وڃه تون وير م لائي	مرنے سے پہلے توبہ کرنے میں عجلت کرو اس میں دیر نہ کرو	حدیث۔
داستان ۴ بیت ۴۴۔	اَلَّذِيْنَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ اِن پر آيا جي	وہ جنہوں نے ایمان لایا وہ پرہیزگار اور ڈرتا ہے	سورۃ یونس رکوع ۷ پ ۱۱ قرآن
۔ ثانی	اِنَّ اَولِيَائِيْ تَحتَ قَبَائِيْ پنهنجا پاڻ پراهي۔	تحقیق میرے اولیاء اور دوست میری قبا کے نیچے چھپے ہیں	حدیث۔
۔ ثانی	لَا يَعْرِفُهُمْ غَيرِي پر کي کين پسائي۔	میرے سواء اولیاء کو کوئی اور نہیں پہچانتا۔	حدیث۔

سر برو سندھی

داستان ۱ بیت ۱۲۔	وَتَوَاصَوا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوا بِالصَّبْرِ اين اٿائون۔	حق کا حکم اور صبر کی وصیت کرتے رہو اسطرح کہا	سورۃ العصر قرآن پاک
سر رامکلی	فَكَانَ قَابَ قَوسَينِ اَو اَدْنٰى تا نانگا اين نمن	حضور صلعم خدا تعالیٰ کے نزدیک دو کمان کے فاصلے جتنا نزدیک گئے	سورہ نجم رکوع ۲۷ قرآن
داستان ۵ بیت ۱	كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ باقي ڪين بچن۔	سب چیز فنا ہوگی کوئی چیز باقی نہیں رہیگی۔	سورۃ الرحمٰن قرآن پاک
۔ ۔	اَللهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّورِ	اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے انکو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔	سورۃ البقرہ پارہ ۳ قرآن پاک
۔ ۔	خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا جوڳي جنگ جلن	حضرت موسیٰ بیہوش ہوکر گرا جوگی فقیر بھی اس طرح تاب نہ لا سکے۔	سورۃ اعراف پارہ ۹ قرآن پاک
۔ ۔	مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى اهڙي روش روئن	نہ تو نظر پھری نہ ہی نافرمان ہوئے۔ ایسی (روش) حالت میں جوگی فقیر رہتے ہیں	سورہ نجم رکوع ۱ پارہ ۲۷ قرآن پاک۔
داستان ۱ بیت ۲۲۔	مَنْ لَهُ الْمَوْلٰى فَلَهُ الْكُلُّ اي پرو تڙج پند	جسکو اللہ ہے اسکو سب کچھ ہے یہ بات سمجھ لے	حدیث
۔ ۔	مَنْ عَرَفَ اللهَ كَلَّ لِسَانُهُ اهڙا ئي آهن۔	جسنے خدا تعالیٰ کو پہچانا اسکی زبان بند ہوگئی	حدیث

سر بلاول

داستان ۱۲۰	رَبِّ هَبْ لِيْ اُمَّتِيْ چڙهيو جام چئي۔	اے میرے رب مجھے اپنی امت دے	حدیث
	فكان قاب قوسين او ادنىٰ۔ اي مسير تنين مکان	حضور صلعم اللہ تعالیٰ کے نزدیک دو کمان جتنے فاصلے کیے ہیں قریب تھے یہ مکان سیر ہوا۔	سورۃ نجم رکوع ۱ پارہ ۲۷ قرآن پاک

باب چہارم

شاہ عبداللطیف بھٹائی کا رسالہ اور اس کی تدوین

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا مجموعہ رسالہ کے نام سے مشہور ہے۔ رسالہ کی معنی پیغام ہے۔ اس پیغام کی مدد سے زندگی کے بہت سے مسائل حل کئے جاتے ہیں۔ اس لیے رسالہ کو بڑی عزت و توقیر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ شاہ بھٹائی کے کلام میں اسلام کے بنیادی اصول اور ایمان کے عقائد موجود ہیں۔ جن میں ایمانی جوش وجذبہ، تصوف کے باریک نقطات اور انسانیت کے عظیم مقصد کو بیان کیا گیا ہے۔ شاہ بھٹائی کے رسالہ میں بہت سے عنوانات پر پیغام یک جا نظر آتے ہیں۔ جن میں حمد باری تعالیٰ، توحید، شرک سے پرہیز، توقیر رسالت، حضور صلعم کی ذات گرامی سے والہانہ محبت، توبہ، نفس کی پاکی، صبر کی تلقین، جھوٹ فریب سے گریز، سچ وصداقت، محبت، غمگساری، نیک نیتی، سخاوت، ایثار، وطن پرستی وغیرہ۔

شاہ بھٹائی کا کلام اور رسالہ ایک شاہکار ہے جو سندھ کی خالص اور خوشگوار زبان میں لکھا ہوا ہے۔ جیسے حضرت مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی خالص فارسی زبان میں موجود ہے۔ شاہ بھٹائی کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے اور سننے والے پر یکساں تاثر پیدا ہوتا ہے۔ رسالہ کی شروعات سرکلیان سے ہے حمد باری تعالیٰ سرکلیان میں گایا جاتا ہے۔ اس طرح سرکلیان حقیقت میں شاہ بھٹائی کے فلسفہ کی ایک کڑی ہے۔ رسالہ میں اکتیس سر یا راگنیاں موجود ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسالہ میں چند ایسے بھی سُر موجود ہیں جن کا موسیقی سے کوئی تعلق نہیں ہے مثلاً سر کنبھات، سرسسئی آبری، سرسوہنی، سر عمر مارئی، سر ساموندڑی، سرگھاتو، سر کارایل، سر رِپ اور سر ڈہر۔ اکثر سُروں کے عنوانات سندھ کے لوگ کہانیوں سے نسبت رکھتے ہیں مثلاً سر سسئی پنھوں، سرسوہنی، سر مارئی، سر مومل رانو، سر لیلا چنیسر، سر نوری جام تماچی، اور سر سورٹھ۔ یہ سر شاہ لطیف کے مقرر کردہ ہے رسالہ میں جو نیم تاریخی کہانیوں کی ہیروئن "HEROINES" موجود ہیں وہ نظامی گنجوی کے "ہفت پیکر" اور ولیم شیکسپیئر کی ہیروئنس سے بھی زیادہ سنجیدہ اور دلاویز لگتی ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کے لئے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کچھ بھی نہ لکھا تھا۔ جو بھی کلام کہا ہے وہ فی البدیہہ یا استغراق کی حالت میں مختلف اوقات اور جگہوں پر کہا تھا۔ جسکو آپ کے مریدوں نے سنتے ہی یاد کرلیا یا تحریر کردیتے تھے۔ دوسرے فقیر وہ کلام گایا کرتے تھے۔ اس طرح شاہ بھٹائی کا کلام جمع کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شاہ بھٹائی اپنی وفات سے پہلے فقیروں سے تحریر شدہ "رسالہ" لے کر کراڑ جھیل میں پھینک دیا۔ اس عمل سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر لوگ کلام کو سمجھ نہ سکیں اور گمراہ ہوجائیں۔ فقیروں نے یہ دیکھکر بہت روئے اور چلائے۔ اس گریہ زاری کو دیکھکر شاہ بھٹائی کو ان پر رحم آگیا۔ جن مریدوں کو پورا کلام یاد تھا اور لکھا ہوا تھا بلوا کر کلام کو جمع کرنے کو کہا جب کلام جمع ہو گیا تب اس کو سن کر تصدیق فرمائی۔ اس جمع شدہ "رسالہ" کو "گنج" کہتے ہیں۔ ڈاکٹر گربخشانی مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

> رسالہ کو پانی میں ڈالنے سے فقیروں نے گھبرا کر چلانا و چیخنا شروع کیا۔ شاہ بھٹائی کو ان پر رحم آگیا، اور اپنے مریدوں میں سے ایک مریدہ "مائی نعمت" کو بلوایا جسکو پورا کلام یاد تھا، مریدوں کو لکھانے کے لئے کہا۔ جسکو آپ نے سن کر تصدیق دی فقیروں کا جمع کیا ہوا کلام رسالے کی صورت میں تیار ہوا، جسکو "گنج" کہتے ہیں۔ وہ شاہ صاحب کے بڑے خلیفہ تمر فقیر کی

رسالہ کی معنی، مقالہ، لبندۃ، رسالہ A message mission قاموس العجیب انگلیزی عرب۔ ترتیب الیاس انطونی الیاس
Urdu Classical. Hindi. & English Dictionary by Jone T. Platts.

رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی مقدمہ مرتب ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی

"گنج" معنیٰ خزانہ

اولاد کے یہاں محفوظ ہے۔ گنج میں شاہ بھٹائی ؒ کا کلام غیر ترتیب درج ہے۔ شاہ بھٹائی کی وفات کے بعد کلام کو مضمون کے مطابق ترتیب دیکر سلسلے وار سروں کی صورت میں لکھکر رسالہ تیار کیا۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے شاہ بھٹائی ؒ کا رسالہ مسودوں کی صورت میں موجود تھا۔ آگے چل کر سندھ کے مفکر حضرات نے گنج وغیرہ سے استفادہ کیا یا مریدوں اور فقیروں سے سُنے ہوئے کلام کو جمع کیا۔ لیکن شاہ بھٹائی ؒ کے کلام کے ساتھ آپ کے ھمعصر اور مریدوں کا کلام بھی شامل ہوگیا، یا تو کاتبوں کی بے احتیاطی کے باعث ان نسخوں میں رد بدل پیدا ہوگئی، اور عوام صحیح نسخہ مل نہ سکا۔ حالانکہ اب تک رسالہ کے تیس سے زیادہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ رسالہ موجود ہوچکے ہیں۔ شاہ لطیف ؒ کے کلام کو کامل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاہ کا بڑے انداز میں کلام ضائع ہوا ہے۔ لیکن جو کچھ بچا ہے وہ بھی اتنا ضخیم ہے جس میں پانچ ہزار ابیات اور دو سؤ کے قریب وائیاں موجود ہیں جو علم موسیقی کے لحاظ سے مختلف سروں میں تقسیم کیئے ہوئے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ کا رسالہ زندہ جاوید کارنامہ ہے جو توحید کا ایک بیش بہا خزانہ ہے، وحدت، ذوق اور حقیقی جذبات سے سرشار ہے۔ شاہ بھٹائی کے کلام کے متعلق مرحوم ڈاکٹر عارف شاہ جیلانی کا تاثر کتنا عمدہ ہے لکھتے ہیں:-

"میں شیخ سعدی شیرازی کے ھرفن مولا ہونے، مولانا جلال الدین رومی ؒ کی وحدت الوجود کا نظریہ، مولانا عبدالرحمٰن جامی ؒ کی عظمت، عرفی کی گرمجوشی، حافظ شیرازی اور نظیری کی بے داغ تحریر، عمر خیام کی سنجیدہ فلسفی، عطار اور سنائی کا تصوف، میر تقی میرؔ کی نرم دلی، علامہ اقبال کی عظمت، وارث شاہ اور فضل شاہ کا سوز گداز اور خوشحال خان خٹک کی بیخوف اور بیباک صاف دلی کو تسلیم کرتا ہوں، لیکن شاہ بھٹائی ؒ کا درجہ اور منزل پر ہے، اور منزل ہی اور ہے، اُنکا کوئی بھی ثانی نہیں ہے۔ وہ سنجیدہ، خوشدل، ھرفن مولا، پر درد، اور سوز گداز سے بھرپور ہے" غمگین، ھمدرد، میٹھا، صوفی، وحدت الوجودی، وحدت الشھودی، فلسفی، عالم، بزرگ، تارک، ولی اور ھر دلعزیز تھے"[1]

شاہ بھٹائی ؒ کے سب سروں میں روحانی رموز موجود ہیں، اسکے علاوہ آپ بڑے بڑے سیاح، مورخ، جاگرافی دان تھے جسے آپ کی عظمت کا اندازہ بہ آسانی ہوتا ہے۔ اور "رسالہ" شاعری کے اصناف، وحدت الوجود اور وحدت الشھود کے حکمت اور افلاطون کا گنجینہ ہے سندھ کی ثقافت کا بیش بہا تحفہ ہے، موسیقی کا خزینہ بھی ہے، جس میں ھندوستان کی دیومالا، عرب موسیقی میں کلام موجود ہے۔ سندھ کی خالص موسیقی، مثلاً سر کھنباری، سر رانو، سر تلنگ، سر جوگ، سر لوڈائی، خاص طور پر شاہ بھٹائی ؒ کے دور کی ترتیب ہیں، جن کی گائکی میں عجیب جادو کا اثر موجود ہے۔

شاہ بھٹائی ؒ کا رسالہ سندھ کے عوام کی تطہیر نفس کا درجہ رکھتا ہے، جس میں نفس کی پاکی، ذھنی بیداری، روحانی بیداری، مساوات عملی کے لئے راہ نجات اور شمع ھدایت کا سرچشمہ ہے۔ یہاں پر رسالہ کی تدوین اور اُن کے مختلف نسخوں کا ذکر کیا جاتا ہے

رسالے کے نسخے

۱۔ گنج۔ گنج شاہ بھٹائی ؒ کے کلام کا سب سے قدیم نسخہ ہے جو آپ کی وفات کے بیالیس سال بعد ۱۲۰۷ھ ہجری میں لکھکر مکمل کرایا گیا تھا یہ رسالہ شاہ بھٹائی ؒ کے سب سے بڑے خلیفہ تمر فقیر کے خلیفہ اسماعیل فقیر کی تحرک سے سیّد عبدالعظیم نامی ایک مرید کے ہاتھوں سے مکمل ہوا

---

[1] ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی کی ۱۹۶۰ء میں بھٹ شاہ پر شاہ لطیف ؒ کی سالگرہ کے موقعہ پر تقریر کا اقتباس ہے۔

فقیر اسماعیل بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ شاہ بھٹائی سے اُنکا روحانی توسل تھا۔ اس نے سنہ ۱۲۸۲ھ میں وفات کی اس طرح تمام فقیروں کا متفقہ خیال ہے کہ اس گنج سے زیادہ اور کوئی رسالہ مستند نہیں ہے۔ اس رسالہ کو گنج اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں شاہ بھٹائیؒ کا پورا کلام بغیر ترتیب کے موجود ہے۔ اس گنج سے پہلے شاہ بھٹائی کا کلام خود تمر فقیر نے دائرے شریف (اڈیرو لعل) کے سیدوں کے پاس بطور امانت رکھا تھا۔ وہ گنج (رسالہ) وہاں رہ گیا اور اس طرح سندھ کا یہ نایاب خزانہ ناس ہوگیا۔ اور اسکا آج تک کوئی پتہ نہیں۔ گنج کا نسخہ جو بھٹ شاہ کی درگاہ پر موجود ہے۔ اس کی شروعات سر سسئی سے ہے

۲۔ بھٹ شاہ کی درگاہ کا نسخہ:۔

یہ رسالہ بھی قدیم ہے جو شاہ بھٹائیؒ کی درگاہ پر موجود ہے، اور حبیبن فقیر والا نسخہ کہلاتا ہے۔ یہ فقیر شاہ بھٹائیؒ کے جھرڑ یا فقیروں میں سے تھا۔ یہ فقیر جمعہ رات کو درگاہ پر شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو سماع کی محفل میں گاتے ہیں۔ یہ رسالہ سماع کے پیشوا غلام شاہ کے پاس ہے جو سجادہ نشین کے بھائی ہیں

۳۔ لنواری شریف والا نسخہ:۔

کہا جاتا ہے کہ یہ نسخہ بھی قدیم ہے جو شاہ بھٹائیؒ کی وفات کے ۴۵ سال بعد سنہ ۱۲۱۰ ہجری مطابق سنہ ۱۷۹۶ء میں لکھا گیا تھا۔ اس نسخہ کے ساٹھ سال بعد ایک اور نسخہ لکھا گیا جسکو بھی بھٹ شاہ کا نسخہ کہا گیا۔

۴۔ میر عبد الحسین خان سانگی والا نسخہ:۔

سندھ کے آخری تاجدار تالپروں حکمران کے پوتے ہز ہائینس میر عبد الحسین خان سانگی کو حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ سے بڑی عقیدت تھی، اسی جذبہ کے اثر سے آپ کا کلام جمع کیا تھا۔ جو عبد الحسین سانگی والا نسخہ کہلاتا ہے۔ یہ رسالہ ۱ ذو لقعد سنہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۶ جولائی سنہ ۱۸۹۰ء میں لکھا تھا

۵۔ میر نور محمد والا نسخہ:۔

یہ رسالہ مرحوم میر نور محمد خان کے کتب خانہ والا نسخہ ہے۔ یہ رسالہ سندھ کی ایک عورت مائی صاحبہ ملّی نعمت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو نہایت خوش خط، صاف، صحیح اور ستھرے بیلوں سے سجا ہوا ہے۔ نسخہ کے اختتام پر تاریخ ۲۸ ماہ جماد الثانی سنہ ۱۲۷۰ھ مطابق ۲۸ مارچ سنہ ۱۸۵۴ء لکھا ہوا ہے یہ کسی قدیم نسخہ سے نقل کیا گیا ہے جو نہایت صحیح اور دوسرے شعراء کے کلام سے پاک ہے۔ یہ رسالہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کی لیئبرری میں موجود تھا

۶۔ لشنی والا نسخہ:۔

میر امام بخش خان ٹالپر (متوفی سنہ ۱۹۱۴ء) کی فرمائش پر میاں محمد حافظ نامی ایک کاتب نے ۲۹ شعبان سنہ ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۶ مئی سنہ ۱۸۵۴ء میں لکھکر مکمل کیا۔ یہ گنج سے نقل کیا گیا تھا۔ مگر قیاس یہ ہے کہ گنج والے نسخہ سے یہ کسی بھی صورت میں نقل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ معمولی قسم کا نسخہ ہے۔ سروں کی ترتیب بھی وہی ہے جو بھٹ شاہ والے رسالہ یا آخوند احمدی اور میر عبد الحسین خان سانگی والے نسخوں جیسی ہے۔ اس نسخہ میں دوسرے شعراء کا کلام بھی شامل ہے

۷۔ سیہون شریف والا نسخہ

اس رسالہ میں شاہ بھٹائیؒ کا منتخب کلام اور اختصار دیا ہوا ہے، اور بہت سے سر غائب ہیں۔ اور ابیات میں تلفظ بھی صحیح نہیں ہیں۔

۸۔ میر علی مراد خان تالپر والا نسخہ:۔

مرحوم عثمان علی انصاری اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں کہ ہز ہائینس میر علی مراد خان تالپر نے اپنی شہزادی کے لئے نہایت خوش خط اور سُنہری بیلوں کی کناری سے سجا ہوا رسالہ لکھوایا تھا۔ لیکن اس نسخہ میں کلام اس طرح لکھا ہوا ہے۔ جیسے کسی بزبان یاد والے کے بتائے ہوئے ہو۔ رسالہ کی ترتیب بھی دوسرے رسالوں کی طرح ہے۔ اور شاہ بھٹائیؒ کے مریدوں کا کلام کثیر تعداد میں درج کیا ہوا ہے۔

۹. مخدوم ملا کا نسخہ :-

یہ رسالہ مالا میں موجود ہے جو نہایت نفاست سے لکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کی نقل بھٹ شاہ ثقافتی مرکز میں موجود ہے۔ یہ رسالہ بھی دوسرے شعراء کے کلام سے پاک نہیں ہے۔ جس میں اکثر مریدوں اور معاصر شعراء کا کلام بھی درج کیا ہوا ہے۔

۱۰. مرحوم عثمان علی انصاری والا نسخہ :-

مرحوم عثمان علی انصاری نے مختلف نسخوں کو اپنے سامنے رکھکر ایک رسالہ تیار کیا تھا، کچھ ابیات سندھ کے مختلف رسالوں میں شایع کرائی تھیں یہ رسالہ مسودے کی صورت میں سندھی ادبی بورڈ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۱۱. حافظ احمد جتؔ والا رسالہ :-

کچھ بھیجے کے ایک شخص حافظ احمد جتؔ تھرپارکر میں آکر مقیم ہوئے، جن کے پاس شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ کا نسخہ تھا۔ جسے وہ اپنے ساتھ کچھ بھج ہندوستان سے لایا تھا، جو غالباً گنج کا ہی نقل ہے۔ اُس نسخہ کے لئے ایک عجیب روایت نقل کرتا ہے :

"ہماری چار پشت کے زمانے میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ خود کچھ بھج تشریف لائے تھے، اتفاق سے شاہ بھٹائیؒ کو بخار ہو گیا، تین دن بخار کی حالت میں گاؤں کی مسجد میں قیام کیا، جب طبیعت اعتدال پر آئی تو وہاں سے تشریف لے گئے۔ دوسرے دن صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ شاہ بھٹائیؒ کی کوئی چیز کپڑے میں لپٹی ہوئی رہ گئی ہے جب اسکو کھول کر دیکھا گیا تو اس میں ایک ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب موجود تھی، جو خود بھٹائیؒ کا رسالہ تھا۔"

حافظ احمد جتؔ ڈاکٹر علامہ داؤد پوتہ مرحوم کی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا، ڈاکٹر مرحوم نے اُسے اصلی نسخہ لانے کے لئے ہندوستان جانے کا خرچہ، پاسپورٹ بنوا کر دیا تھا۔ لیکن احمد جت ہندوستان سے واپس نہ آیا۔ اس طرح یہ نسخہ ہندوستان میں رہ گیا۔

۱۲. علامہ مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ والا رسالہ :-

سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مستند رسالہ کو مرتب کرنے کا کام علامہ صاحب کو دیا گیا تھا، جسکی تکمیل کے لئے علامہ نے سندھ کے مختلف حصوں سے شاہ بھٹائیؒ کے رسالوں کے مسودے حاصل کیئے گئے۔ اور خود بھٹ شاہ کی درگاہ پر کافی عرصہ رہکر گنج اور فقیروں سے صحیح تلفظ حاصل کرکے رسالہ کا نسخہ تیار کر رہے تھے۔ اس کام پر آٹھ سال مسلسل کام کرتے رہے۔ جب یہ کام آخری مرحلے میں آ پہنچا تو ناگہانی وفات ہوئی۔ یہ کام رہ گیا۔ اس طرح ایک بے نظیر تحفہ سے سندھ محروم رہ گئی۔ بورڈ نے یہ کام سندھ کے ایک اور ادیب مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب کے سپرد کیا جو ۱۹۵۸ع سے لے کر آج تک مکمل نہ ہو سکا۔

مطبوعہ رسالہ

۱۳. آرنیسٹ ٹرمپ والا رسالہ سنہ 1866ع۔

جرمن فلاسافر ارنیسٹ ٹرمپ، جس نے شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو سب سے پہلے شایع کرا کے کلام کو تاریکی سے روشنی میں لائے وہ بھی جرمنی کے ملک میں لیپزگ سے سندھی رسم الخط میں شایع کرایا۔ اس رسالہ کے متعلق عالموں کی یہ رائے ہے۔ ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے لکھتا ہے[4]:

سب سے پہلی ادبی کوشش جس سے کلام کو مستقل بقا ملی، جو آنے والے نسل کے لئے شاہ بھٹائیؒ پر تحقیق کام کرنے

---

[4] Shah Abdul Latif of Bhit. by Dr. H. T. Sorley.

کا راستہ ہموار کیا۔ وہ تھے باہر کے مشنری تبلیغ کرنے والے پادری ارنیسٹ ٹرمپٹ۔ وہ اس زمانے میں سندھ میں رہتے تھے جس زمانے میں سر بارٹل فریئر SIR BARTL FRERE کمشنر سندھ تھے۔

ڈاکٹر سورلے کا خراج ادب کی دنیا میں ایک گونج ضل ہے کیونکہ وہ خود بھی ایک بڑے سندھی ادب کے جاننے والے تھے۔

ڈاکٹر علامہ داؤدپوتہ مرحوم اپنے تاثر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ ایک صدی تک شاہ بھٹائی کے شاہکار کو نظرانداز کیا گیا ہے ارنیسٹ ٹرمپ کو مرحبا کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ پہلا شخص ہے جس نے اس بات کا خیال کیا اور سندھ کے ادیبوں کو ایسا کوئی بھی خیال پیدا نہ ہوا۔

ڈاکٹر گربخشانی نے لکھا ہے:۔

"ارنیسٹ ٹرمپ شاہ لطیف کے رسالہ کا پہلا شایع کرنے والا شخص ہے، جنہوں نے کلام کو تاریکی سے روشنی میں لائے"

ارنیسٹ ٹرمپ ۱۳ مارچ ۱۸۲۸ء کو السفیلڈ بننگہیم کے شمالی جرمنی میں پیدا ہوئے۔ انکے باپ کا نام جارج تھامس ٹرمپٹ تھا جو اپنے گاؤں کا بہترین بڑھئی (carpenter) تھے۔ انکی والدہ کا نام شیرلاٹی بادرتھا، جن گھر میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ وہ بڑے آگ میں جل کر تباہ ہوا تھا۔ یہ آگ ۱۹۰۴ء میں اسکے گاؤں کو لگی تھی۔ ٹرمپ کا خاندان بہت غریب تھا۔ لیکن یہ بچہ فطرتی طور پر بڑا ذہین تھا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران انہوں نے بہت سی مختلف ملکوں کی زبانیں سیکھی جن میں لیٹن گریک، فرینچ زبانیں تھیں تعلیم کے دوران لبرل Liberal تحریک میں شامل ہوا، جنگ کے بعد قید ہو کر جیل میں گیا۔ رہائی کے بعد انہوں نے اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کیا، جسکے بعد لنڈن چلا گیا۔ جہاں انہوں نے Oriental Language سیکھی۔ اس دوران ایسٹ انڈیا ہاؤس میں اسسٹنٹ لیبریرین مقرر ہوئے۔ جہاں ہندوستان کی جدید زبانیں سیکھیں ان کی ذہانت کو دیکھکر چرچ مشن سوسائٹی کی طرف سے ہیں مشنری کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ اور انہوں نے لغت بھی تیار کی۔ برٹش گورمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی لکھیگا اسکی اشاعت وہ کرے گی۔ ٹرمپ بمبئی سے کراچی بھیجے گئے، سندھ میں آکر سندھی زبان سیکھیں اور سندھی زبان میں مہارت حاصل کی۔ جسکی وجہ سے۔ بمبئی کے گورنر نے انہیں سندھ میں چرچ کے پریسٹ مقرر کئے۔ کراچی کی آب و ہوا نہ بھائی اور بیمار ہوگئے۔ علاج کے لئے فلسطین بھیجے گئے جہاں عربی زبان سیکھی ۱۸۵۷ء میں شادی کرکے پھر کراچی آئے۔ کراچی میں انہیں بیٹا پیدا ہوا لیکن بیوی کا انتقال ہوا۔ اس پریشانی کی حالت میں سوئزلینڈ گئے جہاں بچے کی خاطر دوسری شادی کرکے واپس ہندوستان میں آئے۔ اور پشاور بھیجے گئے۔ سندھ میں رہکر ٹرمپ نے ایک سندھی کتاب لکھی جو چرچ مشن نے لنڈن سے ۱۸۵۸ء میں شایع کی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام جمع کرنا شروع کیا، ۱۸۶۳ء میں شاہ بھٹائی کے رسالے کی مشہور سورٹھ کی کہانی کو جرمنی زبان میں لکھکر شایع کرادی جو بڑی دلچسپ کتاب ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ سندھی گرامر ۱۸۷۲ء لنڈن سے شایع کرائی۔

ٹرمپ نے شاہ بھٹائی کے رسالے کی تمہید میں لکھا ہے کہ انہیں کلام کے بہترین مسودے ملے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے اپنے رسالے کی تمہید (مقدمہ) میں ٹرمپ کے متعلق لکھا ہے:۔

افسوس کہ جو نسخے ٹرمپ کو ملے تھے، ان کا مقابلہ کرنے کا کام خود کرتے، جسے انہوں نے کسی دیہی آدمی سے کرائے

ERNST TRUMPP (A brief account of his work and Life) by Prof. Annemarie Schimal.

۲۔ مقدمہ رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی مرتب ڈاکٹر گربخشانی۔

جس نے ان نسخوں کی کوئی قدر نہ کی جسکی وجہ سے "رسالہ" کی صحت پر اثر پڑا اور بہت سی غلطیاں رہ گئیں، انہوں نے جو تلفظ سمجھ میں نہ آئے وہ اپنی طرف سے لکھے، دوسری بات یہ تھی کہ اکثر تلفظ ۱۸۶۶ء والے۔ ان باتوں کو دیکھکر کہا جاتا ہے کہ یہ رسالہ مکمل نہیں ہے لیکن دوسرے رسالوں سے بہتر ہے۔ خاص طور پر وائیوں کو صحیح درج کیا ہے۔ رسالے میں جو ٹائیپ استعمال کی ہوئی ہے، وہ ٹرمپ نے رسالہ کے لئے تیار کرائی تھی، سرکار کی مالی امداد کے باوجود رسالہ کے بہت سے باب (سر) چھپوا نہ سکے۔ جن میں خاص طور پر سر مارئی۔ اس کی ایجاد کردہ ٹائیپ آج کل استعمال میں نہیں آتی۔ یہ پہلا شخص تھا، جنہوں نے شاہ بھٹائی کے کلام کو شایع کرایا۔ ان کی محنت تحسین کے لائق ہے۔ سندھ کے لوگ اُن کے اس احسان کو کبھی فراموش کر نہیں سکتی۔

ارنیٹ ٹرمپ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:-

"تحریر شدہ کتابیں سندھ میں نایاب ہیں، اس لئے میں جو کچھ مواد جمع کیا ہے وہ صرف گانے والے اور بھٹ فقیروں سے سُنے ہوئے ابیات ہیں، ظاھر ہے اُن کی صحت اور تلفظ میں بڑا اختلاف ہوگا"

جن آنکھوں نے ھزاروں مسودہ پڑھے، اور لاکھوں صفحات دیکھے اور لکھے وہ اپنی بینائی کھو بیٹھیں۔ ٹرمٹ نے دیکھا کہ وہ اب لکھ نہیں سکتا نہ پڑھ سکتا ہے، تو اُسے بڑا صدمہ ہوا۔ وہ نہ صرف کمزور ہو گیا، بلکہ سخت بیمار پڑگیا، زندگی کی آخری سال اسپتال کی تاریکی میں گذاری آخر وہ وقت آپہنچا، ایسٹر کے اتوار کو ۵ اپریل ۱۸۸۵ء میں وفات کی۔

۱۴۔ قاضی محمد ابراہیم والا رسالہ ۱۸۶۷ء

قاضی محمد ابراہیم کی کوشش سے یہ رسالہ ترتیب ہوا اور بمبئی سے لتھوگراف سے شایع کرایا۔ اس لئے اس رسالہ کو بمبئی والا رسالہ بھی کہتے ہیں۔ بعد میں خان بھادر محمد صدیق میمن نے موجودہ رسم الخط میں صاف کرکے شایع کرایا اُسی رسالہ کو شکارپور سندھ کے مشہور کتب فروش دیوان پوکرداس نے لتھوگراف میں شایع کیا تھا۔ اس رسالہ میں چھتیس سر موجود ہیں اور تیس حرفی کے اشعار بھی موجود ہیں۔ جو غالباً شاہ بھٹائی کی نہیں ہے قاضی صاحب نے ارنیٹ ٹرمپ کے رسالہ سے ایک سال بعد ۱۸۶۷ء میں شایع کیا۔ اس رسالے کی رسم الخط قدیم ہے لیکن ٹرمپ کی رسم الخط سے نرالی ہے اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلام جو ٹرمپ کے رسالہ میں موجود نہیں ہے وہ اس رسالہ میں موجود ہے مرزا قلیچ بیگ کی راء ہے، "یہ رسالہ اصلی رسالے سے نقل ہے لیکن یہ بات درست نہیں کہ ڈاکٹر گربخشانی نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے:-

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رسالہ اصلی رسالہ کا نقل ہے لیکن سندھ کے دوسرے شعراء کا کلام بھی شامل کرکے شاہ بھٹائی سے منسوب کیا ہے"

۱۵۔ کریمی رسالہ:-

"اس رسالہ کو جمع کرنے والے نے متن کے سواء اور کچھ بھی نہیں لکھا تھا، جب مرحوم محمد صدیق میمن نے اُسے شایع کرایا تو اس میں لکھتے ہیں جس وقت یہ رسالہ ترتیب دے رہا تھا، اس وقت میون محمد ھالائی اور اخوند عبدالرحیم زندہ تھے، اُن کے پاس وسبعی قدیم نسخہ موجود تھے، جن کے مشورہ اور بھٹ شاہ کے فقیروں سے کلام صحت اور تلفظ دریافت کرکے مسودہ تیار کیا گیا جسکو بمبئی بھیجا گیا"

---

۱ رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی مرتب ارنیٹ ٹرمپ۔ ۲ بمبئی رسالہ مطبوعہ دیوان پوکرداس، کتب فروش شکارپور

۱۶ محکمہ تعلیم والا رسالہ ۱۹۰۰ء

محکمہ تعلیم سندھ سرکار کے ترجمان مسٹر تاراچند شوقیرام آڈوانی نے شاہ کے رسالہ کا متن تیار کیا اور سندھ سرکار نے ۱۹۰۰ء کو موجودہ رسم الخط میں شایع کرایا۔ اس کی تصحیح میں اُنہوں نے لکھا ہے:۔

"جب جان فلٹن صاحب سندھ کے ایڈوکیشنل انسپیکٹر تھے تب اُنہوں نے بھٹ شاہ والے نسخہ کو نقل کرا کے ایک نسخہ تیار کرایا۔ جو راء بہادر دیوان کوڑومل کو تبصرہ کے لیئے بھیجا جو اس وقت حیدرآباد میں نارمل ٹیچرس ٹرینگ کالیج کے پرنسپال اور ٹرنسلیٹر تھے۔ اس نے بمبئی اور ٹرمپ کے رسالوں سے تقابل کر کے ایک نسخہ تیار کیا۔ دیوان کوڑومل کی وفات کے بعد۔ اس کے جانشین راء بہادر تاراچند شوقیرام نے رسالہ کا باقی کام مکمل کیا۔"
رسالہ شایع تو ہوا لیکن اس میں بھی بہت سی غلطیاں رہ گیں

۱۷ مرزا قلیچ بیگ والا رسالہ:۔

سندھ کے بے مثل ادیب و شاعر، مورخ شمس العلماء مرحوم مرزا قلیچ بیگ نے شاہ بھٹائی کے کلام کو ۱۹۱۳ء میں ترتیب دیا۔ اور اپنے سامنے وہ سب مطبوعہ رسالوں کو رکھا اور شاہ بھٹائی کا پورا کلام جمع کیا۔ ان ترتیب شدہ رسالوں سے استفادہ کیا۔ اس لئے وہ بنیادی غلطی مرزا صاحب کے رسالہ میں بھی رہ گئی۔ اور دوسرے شعراء کا کلام بھی رطب و یابس جمع ہوگیا۔ جس سے شاہ بھٹائی کا کلام دوسرے قدیم شعراء کے کلام سے پاک نہ ہو سکا۔ مرزا صاحب اس رسالے کی ترتیب میں تیرہ سال محنت کی۔ مرزا صاحب خود اپنے مرتب کیئے ہوئے رسالہ سے مطمئن نہ تھے، جسکا ذکر رسالہ کے شروع میں کیا ہے۔

"صحیح اور سچے نسخہ کی ابھی مزید ضرورت ہے کسی صاحب علم کو دل میں خیال پیدا ہوگا جو صحیح نسخہ تیار کریگا۔"

سوانح:۔ مرزا قلیچ بیگ سندھ کے غیرفانی ادیب تھے۔ اس بے مثل ادیب نے اپنی زندگی پچاس سال ادب کی خدمت میں صرف کیئے اور اپنی تصنیفات کا سرمایہ کثیر تعداد چھوڑا۔ اس عظیم مفکر سے ادب کی ایسی کوئی صنف نہ چھوڑی جس پر قلم نہ اُٹھایا۔ دوسری زبان سے بہترین کتابوں کا ترجمہ کر کے اپنی سندھی زبان کو مالا مال کیا۔ مرزا صاحب کی ذات گرامی جدید سندھی ادب کی بنیادی حیثیت کی حامل تھی، جسکو زمانہ کی گردش کبھی مٹا نہیں سکتی۔

مرزا قلیچ بیگ سندھ کے غیرفانی حیدرآباد کے نزدیک ایک گاؤں ٹنڈو ٹھوڑو میں ۱۲۷۰ھ مطابق ۱۸۵۳ء میں تولد ہوئے۔ مرزا صاحب کو بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا اور شعر سے شوق تھا۔ والد کا نام مرزا فریدون بیگ تھا۔ جو اصلی گرجستان رشیا کے ایک شہر سکز میں پیدا ہوئے۔ ایران کے بادشاہ کے یہاں اپنے خاندان کے ساتھ جنگی قیدی کی حیثیت سے گرفتار ہوئے۔ والد اور بڑے بھائی قید سے فرار ہوگئے۔ باقی یہ بچہ اپنی والدہ کے ساتھ قید میں رہ گیا والدہ بھی قید میں مرگئی اس طرح یہ بچہ دشمن کے رحم و کرم پر تنہا رہ گئے۔ میر کرم علی خان کے ایک وکیل نے، میر موصوف کے لیئے اس بچہ کو ایران کے بادشاہ سے لیا۔ کیونکہ میر صاحب کو کوئی اولاد نہ تھی۔ سندھ میں آکر جوان ہوئے۔ شادی کی مرزا فریدون بیگ کو سات بیٹے ہوئے۔ جن میں مرزا قلیچ بیگ تیسرے بیٹے تھے۔ مرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم حیدرآباد میں مکمل کرنے کے بعد بمبئی کی ایلفنسٹن کالیج میں داخل ہوئے۔ وہاں مرزا حیرت جیسے پروفیسر استاد ملے۔ والدہ کے انتقال کی وجہ سے تعلیم آدھوری چھوڑ کر سندھ میں آکر محکمہ مال میں ہیڈ منشی کی نوکری سے زندگی شروع کی۔ سندھ کے مختلف جگہوں پر بڑی دیانتداری سے نوکری کرکے ڈپٹی کلکیٹر کے عہدے سے رٹائرڈ ہوئے۔ آپ کے ادبی خدمات کو دیکھ کر انگریز سرکار کی طرف سے شمس العلماء کا لقب ملا۔ اس طرح یہ سندھ کی عظیم شخصیت ۳ جولائی ۱۹۲۹ء میں وفات کی۔

مرزا صاحب نے سندھی، فارسی، انگریزی زبانوں میں کثیر تعداد تصانیف چھوڑیں۔ ان کے علاوہ شاہ بھٹائی کا رسالہ جسکا ذکر اوپر آچکا ہے۔ "احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی" سندھی اور انگریزی میں، لغات الطیفی ۱۹۰۵ء۔ لطیفی لاٹ ۱۹۱۳ء اور سر سوھنی کی شرح بھی لکھی تھی۔

۱۸. ڈاکٹر گربخشانی والا رسالہ :-

جس وقت ڈاکٹر گربخشانی، شاہ بھٹائی کے رسالہ کو مرتب کر رہے تھے، اس وقت قریب قریب سب مطبوعہ رسالے موجود تھے۔ شاہ کریم اور بھٹ شاہ والے قدیم مسودہ بھی اپنے سامنے رکھے اور حتی العقدور کوشش کرکے صحیح نسخہ تیار کیا۔ یہ رسالہ اپنے دوستوں اور شاگردوں کی مدد سے ۱۹۲۳ء میں پہلا حصہ پریس میں دیا۔ اس حصہ میں رسالہ کے متن سے پہلے ڈاکٹر موصوف نے ایک عالمانہ مقدمہ لکھا ہے، جو اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جس میں شاہ صاحب کی سوانح کے علاوہ مختلف ابواب میں۔ شاہ کی صورت اور سیرت، شاہ کا مذہب، ویدانت اور تصوف، شاہ کی شاعری، شعر کا مضمون اور عبارت شاہ صاحب کی سندھی، شاہ کے کلام میں نحوی بناوٹیں، اور رسالہ کی تصنیف و تالیف کے ابواب موجود ہیں۔ متن کے بعد کلام کی تشریح دی ہوئی ہے جسے دیکھکر اس فاضل شخص کی علمی عظمت کی داد دی جاتی ہے۔ چونکہ مرتب نے رسالہ سے بہت سے ابیات غیر کا کلام سمجھکر خارج کردیئے تھے، اس لیئے سندھ کے ادیبوں نے رسالے پر کڑی تنقید کی۔ ایک سال بعد ۱۹ دسمبر ۱۹۲۴ء میں دوسرا حصہ تیار کرکے شایع کیا، جس میں ڈاکٹر موصوف نے لکھا ہے:

"پیر سید غلام حیدر شاہ سجادہ درگاہ شاہ عبد الکریم بلڑی کی مہربانی اور کوشش سے عزجانیش میر عبد الحسین خان سانگی والا قدیم رسالہ حاصل ہوا جس سے بڑی مدد ملی اور سب ابیات ان سے صحیح کرکے یہ حصہ تیار کیا۔"

اس کے شایع ہونے کے بعد ڈاکٹر گربخشانی ۔پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لئے لنڈن چلے گئے جہاں برٹش میوزم کے مشہور قلمی مسودہ کو دیکھا، جس کے مختلف تلفظ اپنے تیسرے جلد میں دیئے۔ تیسرا حصہ علی الترتیب ۱۹۳۶ء شایع کیا۔

اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ "شاہ کا رسالہ" ڈاکٹر گربخشانی کا ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مرتب کی محققانہ شان اور ادبی بصیرت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر خود بھی عالم تھے اور اُنہی کام میں مدد کرنے والے بھی عالم تھے، تذکرہ لطفی[۱] کے مصنف نے اپنے تاثر دیئے ہیں

"جس طرح خود ڈاکٹر گربخشانی سندھی ادب کے عالم تھے، اسی طرح ان کے ہم کار بھی ملے تھے۔ جن میں ڈاکٹر داؤد پوتہ کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے، جسکا خود ڈاکٹر موصوف نے رسالہ کے پیش لفظ میں ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے۔ "میں اپنے عزیز شاگرد اور اب ہم پیشہ پروفیسر عمر الدین داؤد پوتہ۔ ایم۔اے کا دل کی گہرائیوں سے شکر گذار ہوں جس نے اس حصہ کے نسخہ کے تیار کرنے، شرح لکھنے اور پروف ریڈنگ کرنے میں میری دل وجان سے شراکت کی، اگر یہ صاحب ایسی ہمدردی نہ دکھاتا تو شاید یہ کام مکمل نہ ہوتا"[۲]

مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم بلکل صاف ہے کہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کا ڈاکٹر گربخشانی کے اس کام میں کتنا حصہ تھا۔ اس زمانے میں مسٹر جیٹھمل گلراجانی ایک رسالہ روح رهان کے نام سے حیدرآباد سے شایع کرتے تھے، جس میں بھٹائی[۳] اور انکے تصوف پر مقالہ شایع کرتے تھے۔ جس کے ایک شمار میں سندھ کے ایک ہندو ادیب لیلارام وطن مل لعلوانی کے ایک مقالہ کا اقتباس جیٹھمل نے اپنے اداریہ میں دیا تھا۔ جس سے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ڈاکٹر گربخشانی نے شاہ بھٹائی کے رسالہ میں جو محنت کی ہے اس میں نوجوان مسلمان داؤد پوتہ کا بڑا ہاتھ ہے مسٹر لیلارام، کو شاہ بھٹائی کے کلام اور انکی بزرگی سے بیحد عقیدت تھی، اُنہوں شاہ بھٹائی کے کلام اور شخصیت پر انگریزی زبان میں ایک مستقل تصنیف لکھی ہے۔ جس سے ڈاکٹر صورلے نے بھی استفادہ کیا۔ مخدومی پروفیسر لطف اللہ بدوی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں، اور ان خطوط کا ذکر کرتے ہیں جو مرحوم علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ نے مرحوم بدوی صاحب کو دکھائے تھے، وہ خطوط ڈاکٹر گربخشانی کے درمیانہ ہوئے تھے۔ یہاں ان کے اقتباس دیئے جاتے ہیں:

---

۱. تذکرہ لطفی ۔۔ مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی جلد اول صفحہ ۳۲۶ ۲. رسالہ ڈاکٹر گربخشانی پیش لفظ۔ جلد اول

۳. رسالہ عام راہ، سپٹمبر ۱۹۵۰ء مقالہ "ڈاکٹر داؤد پوتہ کا رسالہ میں حصہ" مقالہ نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔

پہلا مکتوب :۔ شاہ کے رسالہ کی ایک کاپی حاصل ہوئی، بڑی مسرت ہوئی، اسکے باوجود مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرورق پر آپ کے نام کے ساتھ اپنا نام دیکھکر، جیسا کہ آپ نے واعدہ کیا تھا، دلی کوفت ہوئی، مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے لیکن آپ کو اس بات کا خیال کرنا چاہئے تھا، جو مختصر قبولیت آپ نے دی تھی وہ غیر مکمل اور معمولی ہے۔ اس سے بہتر تھا کہ میرا ذکر ہی نہ آتا۔ یہ میرے چھ سال کی محنت کا صِلہ ہے"

دوسرا مکتوب :۔

میرا نام آپ کے نام سے شریک تھا، اس کے لئے میرا جداگانہ خیال ہے، جس کے لئے میری کوئی بھی صدائی احتجاج نہیں ہے۔ غلام دستگیر پاندھیانی، جسکا کتاب کے ۲۸۳ صفحات تک کوئی واسطہ نہ تھا، اس کے لئے آپ نے لکھا ہے کہ اس نسخہ کو انہوں نے تیار کیا ہے یہ اچھا نہیں ہے، ہم دونوں نے ۲۸۳ صفحات تک ملکر کام کیا۔ یہ دونوں لکھنے والوں کی طرز تحریر کا ثمر ہے۔ سوائے کسی اہم چیزوں کے جو کہ آپ نے حصہ اول کے لئے لکھنے باقی کام ہم دونوں نے ایک جتنا کیا ہے میں نے اپنی طرف سے فراغت میں جو وقت کی قربانی دی ہے وہ اگر اپنی صحت پر صرف کرتا تو بہتر تھا۔ یہ دیکھکر کہ غلام دستگیر میری محنت کے بھی وارث بنے۔ تو دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی اعتراف نہ کیا کہ میں نے برٹش میوزم میں رسالہ کے لئے مسلسل کام کیا۔ اس کام کے لئے ہیں واپس آنے کا پروگرام ملتوی کیا تھا، ایک مغربی عالم ضرور اس امداد کا بغیر کسی طلب کے اعتراف کرتا۔ جو کچھ ہو کے گذرا میں ان کے ذکر سے اب میں بہت دور ہوں اور آگے اس بات کا کوئی ذکر نہ کیا جائے گا۔ کیوں کہ جو کچھ ہو کے گذرا اس سے ہمارے بہتری تعلقات میں کوئی خلش آنے نہ دوں گا۔

ان دونوں مکتوب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گربخشانی کی رسالہ کی تالیف میں کتنی محنت تھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ حقیقت دیر سے ظاہر ہوئی جو پہلے ظاہر ہونی چاہئے تھی۔ لیکن علمی تحقیق ہمیشہ دیر سے ظاہر ہوتی ہے جب کوئی مصنف اطمینان حاصل کرتا ہے۔ بقول مرزا قلیچ بیگ، کوئی صاحب علم پیدا ہو جس کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جو صحیح نسخہ تیار کرے ڈاکٹر گربخشانی نے ہمت کی اور رسالہ کی ترتیب کا گران بار اپنے سر پر ہو لیا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ رسالہ مکمل نہ ہو سکا اور چوتھی جلد لکھ نہ سکے۔ رسالہ سے تقریباً ایک ہزار ابیات نکالے گئے۔ جس کی ان کو کوئی سند نہ تھی۔ بہرحال یہ رسالہ بہتری سمجھا گیا ہے۔ لیکن رسالہ کے شایع ہونے کے بعد سندھ کے ادیبوں نے تنقید کی، جن میں دیوان بھیرومل مہرچند آڈوانی نے "سندھو رسالہ"[2] میں آٹھ قسطوں میں تنقید کی۔

شاہ بھٹائی کے رسالہ کی ترتیب سوائے گنیج کے اکثر ایک جیسی نظر آتی ہے۔ اکثر بزرگوں نے رسالہ پر تحقیق کی ہے لیکن آج تک کوئی جامع صورت میں نسخہ پیش نہیں ہوا۔ اعتراض کرنے سے کام نہیں بنتا۔ مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی نے صحیح نقطہ بیان کیا ہے:۔[1]

"دنیا کے عظیم شعراء کے کلام پر آج تک یہ اعتراض عائد نہیں ہوا کہ ان کے کلام کے صحیح نسخہ کی ضرورت ہے۔ ایک غیر فانی کام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے وجود کا خود ثبوت ہوتا ہے اور اپنے غیر فانی ہونے کا ثبوت دیتا ہے جو کہ انکی صحت کے لئے دلیل ہوتا ہے"

سوانح = ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی ۸ مارچ سنہ ۱۸۸۴ع کو حیدرآباد سندھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی اوئلی زندگی کے متعلق کوئی احوال نہیں ملتا۔

---

[1] تنقید و تنقید نگاری۔ مصنف مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی

[2] رسالہ سندھو۔ یہ رسالہ سندھی زبان میں بڑی اھمیت رکھتا ہے۔ اسکا مدیر بولچند راجپال تھا جو سنہ ۱۹ سے سنہ ۱۹۴۷ تک جاری رہا اور شکارپور میاں جو گوٹھ (گاؤں) سے شایع ہوتا۔ اس رسالہ کو سندھی ادب کا انسیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں داخل ہوئے ۱۹۰۵ء میں بی۔اے پاس کرکے بمبئی کی ولسن کالج سے ایم۔اے فارسی اور انگریزی میں پاس کی اور وہیں فارسی اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے ۱۹۰۸ء کو سندھ میں آکر ڈی۔جے۔سندھ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ سال ۱۹۲۸ء میں لنڈن یونیورسٹی میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لئے داخل ہوئے۔ اس ڈگری کے لئے انکو مقالہ یہ ملا "MYSTICISM IN ENGLISH - POETRY" "انگریزی شاعری میں تصوف"۔ پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وطن واپس ہوکر ڈی۔جے۔سندھ کالج میں مختلف عہدوں پر فائز ہوئے۔ اور آخر پرنسپال ہوکر ریٹائرڈ ہوئے ۱۹۴۰ء کو ۸ فیبروری میں وفات کی۔ ڈاکٹر گربخشانی ایک ادیب حیثیت سے سندھی ادب میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے رسالے کے علاوہ دو اور کتابیں بھی لکھی تھی ۱۔ نورجہان (ناول) ۲۔ "لنواری کے لعل" لنواری شریف کے بزرگوں کے حالات زندگی۔

۱۹۔ غلام محمد شاھوانی والا رسالہ :-

مرحوم غلام محمد شاھوانی کا بہترین شاہکار شاہ کا رسالہ ہے اس کو سندھی ادب میں اس لئے اہمیت ہے کیونکہ یہ رسالہ اس وقت منظرعام پر آیا جب سندھ میں شاہ بھٹائی" کا رسالہ ناپید ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس وقت سندھ سے ہندو ہندوستان چلے گئے تھے۔ خصوصیت سے ہندو ناشر چلے گئے تھے۔ اور مارکیٹ میں رسالہ موجود نہ تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مرحوم غلام محمد شاھوانی نے ۱۹۵۰ء میں محنت سے ایک نسخہ تیار کیا۔ جسے آر۔ایچ۔احمد برادرس حیدرآباد نے شایع کیا۔ شاھوانی مرحوم رسالہ کے متن کو جمع کرنے کے وقت مقدمہ لکھنے میں کوئی خاص محنت نہ کی اور نہ تو کوئی نیئی تحقیق پیش کی ڈاکٹر گربخشانی والے رسالہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ رسالہ کی ترتیب بھی وہی رکھی ہے۔ خبر نہیں کہ مرحوم کیوں نہیں اس طرف متوجہ ہوئے حالانکہ ان سے بڑی توقع تھی۔ اس رسالہ میں کوئی نیئی چیز نظر نہیں آتی۔ بہرحال یہ رسالہ سندھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

سوانح :- مرحوم غلام محمد شاھوانی سندھ کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے وطن کے ادب کی بڑی خدمت کی اور اپنی ادبی تخلیقات سے مالا مال کیا۔ مرحوم نے اپنی مختصر زندگی میں عمدہ کتاب شایع کرائے۔ مرحوم شاھوانی ایک ماہر تعلیمات تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ادب سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ جسکے نتیجہ میں سندھی ادب کو بہترین تصنیفات ملی۔ شاہ کے رسالے کے علاوہ دیگر کتابیں یہ ہیں

۱۔ ادبی خزانہ۔ شیخ سعدی رح کے گلستان کا سندھی زبان میں ترجمہ۔ مولانا جلال الدین رومی رح کی مثنوی کے دو دفتروں کا ترجمہ کیا۔ اور ڈیل کارنیگی کی مشہور تصنیف "How to win Friends & Influence People" راز و رموز کے نام سے ترجمہ کیا۔ سیدنا غوث اعظم دستگیر رح کی مشہور تصنیف "فتوح الغیب" کا ترجمہ سندھی میں کیا اور سندھی زبان میں تنقید کے اصولوں پر "ادبی اصول" کے نام سے کتاب لکھی۔

۲۰۔ محمد عثمان ڈیپلائی والا رسالہ :-

ڈیپلائی نے رسالہ مرتب کیا جو آج نایاب ہوچکا ہے۔ اس کی ترتیب میں اخبار کی طرح دوکالم میں کلام دیا گیا ہے۔ کلام پر کوئی تحقیق نہیں کی گئی ہے بلکہ بہت سے ابیات خارج کیئے گئے۔ اس رسالہ میں سب بری چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف صفحات پر اشعار دیئے گئے ہیں، جس سے شاہ بھٹائی" کے رسالہ کی اہمیت پر برا اثر ہوا۔

سوانح :- محمد عثمان بن حبیب اللہ میں ۱۹۰۸ء کو ڈیپلہ تھرپارکر میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی ذہین تھے، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی۔ لیکن کن وجوہات کی بناپر تعلیم کو منقطع کیا۔ لیکن فارسی اور عربی زبانوں میں اچھی تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد چھوٹے قسم کے تاجر تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو اپنا معاون کیا۔ ان کی ذھانت چھپ نہ سکی، انہوں نے سندھی ادب میں اسلامی اکابروں پر ناول لکھنے شروع کیا۔ جس میں اسلامی تاریخ پر خاص طور پر تھے جو آج تک بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

۲۱ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی والا رسالہ

مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب سندھ کے بزرگ اور فاضل ادیب ہیں آپ کو سندھی، اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ انہوں نے سال سنہ ۱۹۵۰ع میں کراچی کے مشہور تاجر کتب و ناشر مرحوم بشیر احمد کی فرمائش پر شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو مرتب کیا تھا۔ مولانا قاسمی صاحب شاہ بھٹائیؒ کے کلام سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس کے اچھے شارح بھی ہیں۔ مولانا صاحب نے کلام جمع کرتے وقت اپنے سامنے محکمہ تعلیم والا نسخہ رکھا۔ مشکل الفاظ کی معنیٰ ہر بیت کے ساتھ دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس رسالہ میں جو نئی بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو ابیات جو شاہ لطیف کے نہیں ہیں، ان کے سامنے نوٹ دیئے ہیں یہ بیت شاہ بھٹائیؒ کا نہیں ہے۔

مولانا قاسمی صاحب نے شاہ بھٹائی کے کلام کی شرح شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فلسفے کی روشنی میں دینے کی کوشش کی ہے۔ جس میں قدری کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ رسالہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں مکمل کر کے شایع کیا۔ رسالے کی چھپائی تین رنگوں میں چھپی ہے۔ اور بہت دیدہ زیب ہے۔

۲۲۔ علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی والا رسالہ سنہ ۱۹۶۱

علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی، صاحب سندھ کے برگزیدہ عالم تھے۔ انہوں نے شاہ بھٹائی رحؒ کے کلام اور فلسفہ پر بڑی تحقیق کی ہے۔ سندھی ادبی بورڈ نے شاہ لطیف بھٹائی کے کلام کو مرتب کرنے کا کام سپرد کیا، جو انگریزی زبان میں شرح لکھنی تھی تاکہ شاہ بھٹائیؒ کے فلسفہ کو بیرونی دنیا سے روشناس کرایا جائے۔ علامہ صاحب نے شرح لکھنے سے پہلے رسالہ کے متن کو درست کرکے لکھنا شروع کیا، مکمل ہونے کے بعد سندھی ادبی بورڈ نے بڑے اہتمام سے سنہ ۱۹۶۱ء میں شایع کیا۔ جو ۸۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالے کے شروع میں تین صفحات پر جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے تعارف عالمانہ انداز میں لکھا ہے۔ ملک تمام اور دوسرے ممالک کے ادیبوں اور شاعروں کی خواہش تھی کہ شاہ بھٹائیؒ کا جامع اور مستند رسالہ منظرعام پر آنا چاہیئے۔ یہ تقاضا پوری کی گئی۔ سندھ کے بڑے عالم اور بزرگ کے غور و فکر کا نتیجہ ہے رسالہ میں کلام کو سلسلہ وار ترتیب دینے پر خاص خیال رکھا گیا ہے۔ محترمی جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ لکھتے ہیں:

"یہ پہلا مرتب کیا ہوا رسالہ ہے جس میں شاعر کے ذہن اور فکر کی بتدریج ارتقا کا خاکہ نسبتاً صاف نظر آتا ہے"

علامہ صاحب نے رسالہ سے کافی کلام غیر کا سمجھکر نکالدیا خاص طور پر سر کیڈارو۔ رسالہ کے آخر میں مشکل الفاظوں کی معنیٰ اور شرح دی ہوئی ہے۔

سوانح :۔ سندھ کے مفکر اور عالم علامہ امداد علی بن امام علی قاضی سنہ ۱۸۸۶ کو حیدرآباد میں تولد ہوئے، آپ کے والد ضلع دادو کے مشہور گاؤں پاٹ کے قاضی خاندان میں سے تھے۔ قاضی صاحب نے سنہ ۱۹۰۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرکے مزید تعلیم کے لیئے لنڈن چلے گئے، جہاں سے ۱۹۱۰ء کو بیرسٹر (Law) کا امتحان پاس کرکے سندھ میں واپس آئے کچھ عرصے کے لئے خیرپور ریاست میں ڈسٹرکٹ جج مقرر ہوئے سنہ ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی کے وائیس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس دوران آپ سندھ اور سندھی ادب کی بڑی خدمت کی جسکو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا سنہ ۱۹۵۹ء میں وائیس چانسلر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ علامہ صاحب نے اسلام کی اشاعت کے لیئے بڑا کام کیا۔ نوجوان مسلم شاگردوں کو بیدار کرنے کے لیئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ جنکو اپنی تحریر اور تقاریر سے صحیح راہ بتانے اور بیدار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ عظیم شخصیت ۱۳ اپریل سنہ ۱۹۶۸ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ علامہ صاحب شاہ بھٹائی رحؒ کے بڑے شارح تھے۔ انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کے فلسفہ اور شخصیت پر تقاریر اور مقالہ لکھے جس میں Shah Abdul Latif's Position among the world Poets مشہور مقالہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک انگریزی زبان میں تصنیف "Shah Abdul Latif, An Introduction to his Art" بھی مشہور ہے۔

۲۳۔ کلیان آڈوانی کا رسالہ (انڈیا)

کلیان آڈوانی ڈی۔ جے۔ سندھ کالیج کراچی کے سابق پروفیسر اور ھندستان میں بمبئی کے جے ھند کالج کے موجودہ پروفیسر کلیان بولچند آڈوانی نے بمبئی انڈیا سے ۱۹۵۸ء میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے رسالہ کو مرتب کیا، اور اُسی سال شایع کیا۔ بر صغیر ھند و پاک کی تقسیم کے بعد اکثر ھندو پاکستان (سندھ) کو چھوڑ کر ھندوستان چلے گئے۔ ھندؤں کو حضرت شاہ لطیف کے لئے بڑی عقیدت تھی، انہوں نے اپنے ساتھ شاہ بھٹائیؒ اور دوسرے سندھ کے بزرگوں کا کلام لے گئے۔ کلیان آڈوانی نے اس جذبہ کے تحت شاہ بھٹائی کے رسالہ کو ترتیب دیا۔ رسالہ شایع ہونے سے پہلے انہوں نے سندھ کے تین بزرگ شعراء پر علیحدہ علیحدہ کتابیں (سوانح) لکھی، جن میں شاہ - سچل - اور سامی تھے، یہ تصانیف سندھی ادب میں اپنی نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ رسالہ ھندوستان کتاب گھر بمبئی پبلیکیشن کی طرف سے شایع ہوا، یہ رسالہ مختلف نسخوں کے مقابلے میں اچھا چھپا ہے، جن میں سب سے نمایاں چیز یہ ہے کہ رسالے کے تلفظ موجودہ رسم الخط میں دیئے ہیں۔ رسالہ میں ابیات دو کالم میں دیئے ہیں۔ مرتب ایک پر لکھتے ہیں۔

"ھند اور سندھ کے عالموں، بزرگوں اور ادیبوں اور شائقوں کی خدمت میں شاہ لطیف کا رسالہ کمال ادب سے پیش کرتا ہوں"

کلیان آڈوانی نے رسالہ کی ترتیب ڈاکٹر گربخشانی اور غلام محمد شاھوانی کے رسالوں کی طرح قائم کی ہے۔

۲۴۔ برٹش میوزیم لنڈن والا رسالہ۔ مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔

سندھ کے مشہور ادیب جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے سندھ کے عوام کی دیرینہ خواہش کو پورا کیا۔ بڑی محنت سے انڈیا آفس لنڈن کے کتبخانہ میں موجود رسالہ کو بھٹ شاہ ثقافتی مرکز کامیٹی کی تجویز کے تحت ۱۹۶۹ء کو شایع۔ رسالہ کی تمھید میں برٹش میوزیم لنڈن کے انڈیا آفس کے کتبخانہ میں نمبر SIND - 3 سے کتاب اور مسودہ نمبر NO.Or: 2987 سے یہ رسالہ موجود ہے اس نسخہ کے کل صفحات ۲۸۹ ہیں جو کسی نے شمار کرکے یہ تاریخ 14.Feb.1886 لکھدی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۸۶ء سے پہلے انڈیا آفس کے کتبخانہ میں موجود تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق یہ نسخہ تھوڑے دو نسخوں میں سے ایک کا نقل ہے۔ یہ نسخہ شاہ بھٹائیؒ کے اور نسخوں کی ترتیب سے مختلف ہیں۔ رسالہ کی شروعات سر کلیان کی جگہ سر سنی سے کی ہے۔ اس نسخہ میں دوسرے شعراء کا کلام بھی موجود ہے۔ تلفظ کے لحاظ سے یہ نسخہ بھی ہے۔ بھرحال شاہ بھٹائی کے اس نسخہ کی سندھ والوں کو ضرورت تھی۔ جو رسالہ کی تحقیق میں بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔

سوانح :۔ سندھ کی مایہ ناز شخصیت اور لاثانی ادیب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ سندھی ادب کے معماروں میں سے ایک ہے۔ اُن کی گرانقدر شخصیت پر سندھ کو بجا طور پر فخر ہے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی علی محمد خان لغاری بلوچ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ولادت تعلقہ سنجھورہ کی ایک بستی جعفر خان جمالی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی نوشہرو فیروز اسکول سے ۱۹۳۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرکے ڈی۔ جے۔ سندھ کالج سے ۱۹۴۱ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی پاس کیا ۱۹۴۵ء کو تعلیم کے شعبہ میں کولمبیا یونیورسٹی امریکا سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس ہوکر سندھ گورنمینٹ سیکریٹریٹ میں ملازمت شروع کی۔ ۱۹۵۱ء میں سندھ یونیورسٹی میں شعبہ تعلیم اور سندھی ادب کے سربراہ ہوئے۔ آج سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسیلر کے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے والہانہ عقیدت ہے۔ بھٹ شاہ ثقافتی کامیٹی کے بہت عرصہ تک اعزازی سیکریٹری ہوکر رہے۔ بھٹ شاہ پر شاہ بھٹائیؒ کے سالانہ عرس بڑے اہتمام سے منانے میں بڑی کوشش رہتی ہے۔ شاہ صاحب کے ۲۰۲ سال برسی پر ۱۹۵۴ء میں "یادگار لطیف" کامیٹی کی طرف سے مرتب کیا۔ آج تک شاہ بھٹائیؒ کے کلام اور فلسفہ پر بڑی تحقیق کرتے رہتے ہیں، اور تحقیقاتی مقالہ لکھتے رہتے ہیں، جن کی مدد سے شاہ لطیف بھٹائیؒ پر مزید تحقیق کرنے کی راہیں ہموار کردی ہیں۔

۲۵. رسالۂ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ (منظوم اردو ترجمہ)

سندھ یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۵۲ء میں ایک جامع اسکیم بنائی تھی۔ جس میں شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا اُردو ترجمہ اور سندھی زبان میں جامع لغات تیار کرائی جائے۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آخری منظوری دی گئی، اور یہ کام سندھ کے نوجوان شاعر شیخ مبارک علی ایاز کے سپرد کیا گیا۔ شیخ ایاز سندھی اور اردو زبانوں کے شاعر ہیں، چونکہ یہ کام ایک قومی فریضہ ہے۔ اس لئے سندھ کے بہت سے بزرگوں نے اس کام کو سرانجام کرنے میں کوشش کی جن میں پیر حسام الدین شاہ راشدی، مرحوم مخدوم امیر احمد صاحب نے شاہ بھٹائیؒ کے ابیات کا اردو نثر میں تحت لفظ ترجمہ کیا، جو بذات خود مشکل کام ہے اردو کے مشہور شاعر مرحوم حفیظ ہوشیارپوری نے ترجمہ کو دیکھا، اور محترمی جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی نے مسودہ کی صحت وغیرہ کو دیکھا اور پریس کاپی تیار کرائی۔ رسالہ کی ترتیب شروع میں ڈاکٹر گربخشانی کی قائم رکھی۔ اور آخر میں مختلف رسالوں سے استفادہ کیا۔

ترجمہ ادب کی مشکل صنف ہے شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ رسالہ کے ترجمہ کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ شیخ ایاز نے ترجمہ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، وہ رسالہ کے مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوگا۔ دراصل شاعری احساس اور جذبہ کا نام ہے۔ اگر ترجمہ میں وہ احساس اور کیفیت نہ رہی تو اصلی شاعر کا مفہوم ختم ہوجائے گا۔ شاہ لطیف بھٹائیؒ کے ظاہری مفہوم اور شعر کا ترجمہ تو ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے احساس اور کیفیت کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ بہرحال شیخ ایاز کا ترجمہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس بات کی خوشی ہے کہ حضرت شاہ بھٹائیؒ کے پیغام کو ہمارے ہم وطنوں کے سمجھنے کے لئے یہ غیرفانی قدم رہے گا۔ رسالہ کے شروعات میں مترجم نے عالمانہ مقدمہ لکھا ہے، شاہ لطیف بھٹائی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ جس میں سوانح، سماجی پس منظر، شاہ کے صوفیانہ نظریات، شاعرانہ ماورائیت، عوامی کہانیاں، مختلف سُر، سندھی کافی کی ارتقا، شاعری اور تنقید، ترجمہ کی اہمیت یہ مقدمہ ۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ رسالہ جون سنہ ۱۹۶۳ء کو سندھ یونیورسٹی کی طرف سے شایع ہوا۔

سوانح مترجم:-

شیخ مبارک علی بن شیخ غلام حسین، شکارپور سندھ میں سنہ ۱۹۲۳ء میں تولد ہوئے۔ شکارپور کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں بڑے صاحب دل اور صاحب نظر شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں حیثیت حاصل کرکے اولیت کا درجا حاصل کیا۔ شیخ ایاز بھی اس زمین پاک کا فرزند ہے۔ جنہوں نے سندھی اور اردو ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہے۔ شاعری میں گیتوں اور آزاد نظم سے مشہور ہوئے، ان کے گیتوں میں سندھ کی رومانی کیفیت چھلکتی ہے شاعری کے علاوہ اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ اور اپنے تخلص سے مشہور ہیں۔

شیخ ایاز کی ابتدائی تعلیم شکارپور میں ثانوی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول میں پوری کرکے، شکارپور کے کالج میں شروع کی لیکن جلد ہی کراچی جاکر ڈی۔ جے۔ سندھ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا، ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد سندھ سیکریٹریٹ میں ملازمت شروع کی یہ ملازمت چھوڑ کر کراچی میں وکالت شروع کی۔ کراچی سے سکھر منتقل ہوئے اور آج تک سکھر میں وکالت کر رہے ہیں اور بہترین وکیلوں میں شمار ہوتے ہیں۔

شکارپور میں تعلیم کے دوران شعر و شاعری سے شوق ہوا چند ہم خیال دوستوں سے مل کر ادبی سرکل کی بنیاد رکھی، جس میں لعل محمد لعل نعیم صدیقی، مرحوم احسان احمد بدوی، مرحوم رشید لاشاری، نازش شام قابل ذکر ہیں۔ ایاز کے شعر "ادیب سندھ" اور "سندھو" رسالوں میں شایع ہوتے تھے شیخ ایاز نے ترقی پسند شاعری کو فروغ دیا۔ اور وقت کے ماحول کی عکاسی ان کی شاعری میں نمایاں ہے سندھ کے نوجوان طبقے کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ آیاز نے اردو زبان میں بھی شاعری کی ہے جس سے اردو ادب میں نمایاں جگہ حاصل کی ہے۔ اردو میں ایک شعر کی کتاب "بوئے گل و نالۂ دل" مشہور ہے۔

باب پنجم

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سندھ کے بزرگ و شعرا کرام جن سے متاثر تھے

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے سندھی معاصر شعرا میں بزرگ پیشرو بھی تھے اور ہمعصر بھی. اس بابرکت دور میں سندھ پر اسلام کے آفتاب کی روشنی چمکی اور وہ ہستیاں پیدا ہوئیں. جن کے علم و فضل سے تاریخ اور تذکروں کے صفحات بھرپور نظر آتے ہیں. جن کے روحانی برکتوں سے ہر دور ارفع و اعلیٰ نظر آتا ہے گیارھویں صدی ہجری میں سندھ کے سب سے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ تھے. وہ زمانہ بڑا سعید تھا. سندھ کے گوشہ گوشہ سے روحانی جلال اور جمال کا منظر نظر آتا تھا یہ سندھ کی عظمت تھی. شاہ لطیف بھٹائیؒ کی غیرفانی شخصیت اسی وقت سندھ کا سنگھار بنی. اس لئے شاہ لطیف کو سمجھنے کے لئے یہ بیحد ضروری ہے کہ آپ کے دور کے صالحین کا ذکر کیا جائے جن آپ متاثر تھے یا وہ متاثر تھے. ان کے روحانی فیوض سے سندھ کا ذرہ ذرہ سیراب ہو چکا تھا. بیشتر بزرگوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے اُن میں مخدوم عنایت اللہ صوفی شہید. سید عنایت اللہ رضوی. میون عیسیٰ. مخدوم محمد معین ٹھٹویؒ. حضرت شاہ فقیر اللہ علویؒ اور سید محمد حسن شاہ جیلانیؒ ان بزرگوں کے عظیم کارناموں سے سندھ کا ذرہ ذرہ بیدار ہو چکا تھا. اُن کے روحانی برکتوں اور ھدایات سے سندھ کے غیور عوام اسلام کے پیرو رہے. اگرچہ محمد بن قاسم فاتح سندھ کی آمد سے سندھ باب السلام بنا تو ان بزرگوں کی رہنمائی سے سندھ دارالسلام بن گیا جن کا ذکر کیا جاتا ہے.

مخدوم شاہ عنایت اللہ صوفی شہید

صالحین میں سے مخدوم شاہ عنایت صوفی کا درجا بلند ہے. صوفی شہید اپنے وطن جھوک میرانپور میں یاد الٰہی میں مشغول تھے. اس وقت شاہ بھٹائیؒ بہت کم عمر تھے. شاہ عنایت جوانی میں حق کی جستجو میں وطن چھوڑ کر حیدرآباد دکن چلے گئے. جہاں ایک خدارسیدہ بزرگ امیر عبدالملک کی نیک صحبت نصیب ہوئی. عرصے کے بعد وطن واپس ہوکر جھوک میرانپور میں فیض دینے لگے. جس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی. جسے وقت پیر و زمیندار حسد کی آگ میں جلنے لگے. اور حکومت سے سازباز ہوکر درویش کو تکلیف دینے لگے. اس وقت ٹھٹہ کے نواب محمد اعظم خان جو بڑا سفاک شخص تھا. پیر و زمینداروں کے کہنے سے ھندوستان کے مغل بادشاہ فرخ سیر سے اس خدارسیدہ درویش کے خون بہانے کی اجازت حاصل کرلی سنہ ۱۱۳۰ھ میں آپ کو شہید کیا گیا. اُس کے بعد اس غواص بحر حقیقت کے سرمبارک کو ٹھٹہ کی گلیوں میں تشہیر کیا گیا. مرزا مظہر جان جاناں نے ایسے شہید بزرگوں کے لئے فرما گئے ہیں:

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را.

اس واقعہ کے وقت شاہ بھٹائیؒ کی عمر ۲۸ سال تھی اور شاہ صاحب کی شاعری کا چرچا عام ہو چکا تھا. لیکن انہوں اس حادثے کا ذکر اپنے کلام میں نہیں کیا. البتہ ایک بیت سے اُس کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے.

آج نہ اوطاقن جي طالب تنوارين.

آديسي اُٿي ويا، مڙهيون موُن مارين.

جي جيءَ کي جيارين، سي لاهوتي لڏي ويا.

اج ان مکانوں میں دوست نہیں رہے جن کی طلب ہے وہ پردیسی اُٹھکر چلے گئے. اُن کی خالی جگہوں دیکھکر دل تڑپ اٹھتا ہے جن کے سخن دلوں کو زندہ کرتے تھے وہ لاہوتی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے.

شاہ صوفی نے سندھ میں تصوف کا ایک نیا ورق پلٹا تھا، ان کے خیالات کے بعد سندھ میں بڑے صوفی شاعر پیدا ہوئے، جن میں چل سرمست اور قادر بخش بیدل جیسے عارف قابل ذکر ہیں۔ شاہ صوفی فارسی اور سندھی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپ کی مثنوی بسیر نامہ (فارسی) کا ذکر فقیر قادر بخش بیدل نے اپنی فارسی مثنوی دلکشا میں کیا ہے، جن کا انتخاب اپنی تصنیف سندالموحدین میں بطور تبرک دیا ہے۔[1]

من بغیر تو نہ بینم در جہاں — قادرا پروردگارا جاوداں

چون بجز تو نیست در ہر دو جہاں — لاجرم غیرے نباشد درمیان

من ترا دانم وہی بینم ترا — خود ترا کے غیر باشد اے خدا

اول و آخر ای احد — ظاہر و باطن وبیعدد

ہم نہان وہم عیان پیدا توئی — ہم درون گنبد خضرا توئی۔

آپ نے ہمہ اوست کا نعرہ لگایا، جس سے اکثر اس وقت کے علماء کرام ناراض رہتے تھے۔ میر علی شیر قانع نے آپ کی تاریخ شہادت نکالی ہے۔

ماقتلوہ یقیناً بل رفع ١١٣٠ھ — آہ مظلوم حق ١١٣٠ھ

میون شاہ عنایت اللہ رضویؒ

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے بزرگ پیشرو و ہمعصر سید شاہ عنایت اللہ رضویؒ کا خصوصیت سے شمار ہوتا ہے۔ شاہ عنایت رضوی اور شاہ لطیفؒ بیک وقت سندھ کو اپنے شعر و سخن سے نوازتے رہے۔ شاہ عنایت اللہ رضوی شاہ صاحب سے عمر میں بہت بڑے تھے، اپنی بزرگی اور علمی فضیلت سے اتنے بہی تھے جتنے کہ شاہ بھٹائیؒ۔ میر علی شیر قانع نے تاریخ تحفۃ الکرام میں شاہ خیرالدین شاہ جیلانی قدس سرہ کے مرید ہونے کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں۔[2]

شاہ عنایت رضوی بن سید نصیرالدین شاہ خیرالدین شاہ جیلانی قدس سرہ کے مریدوں میں سے تھے، اور درویش صدو، درویش حبیب بن پلی اور سید عبدالولی رضوی کی خدمت میں رہ کر بھی فیض حاصل کیا تھا۔

اس مختصر احوال سے شاہ عنایت اللہ رضوی کی زندگی کے حالات پر کوئی زیادہ روشنی نہیں پڑتی، لیکن قیاس کے طور پر ان تھوڑی سی سطروں سے کچھ نہ کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔

سندھ میں سید رضوی خاندان کے نسب کا سلسلہ حضرت امام علی نقی رضا سے جا ملتا ہے۔ سادات کی اس شاخ کے ایک بزرگ امیر محمد مکی مکہ شریف سے ہجرت کرکے سندھ میں آئے تھے اور ١٢١٠ عیسوی میں سید صاحب نے بکھر میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ آپ کی اولاد سب سے پہلے روہڑی اور بکھر میں آباد ہوئی، بعد میں سندھ کے دوسرے شہروں میں پھیل گئی۔

شاہ عنایت کے آباؤ اجداد بکھر کے رہنے والے تھے جن کے متعلق پہلے ذکر کیا جا چکا ہے آپ کے والد سید نصیرالدین بن سید اسمٰعیل شاہ بکھر سے ہجرت کرکے نصیر پور (ضلع حیدرآباد) میں مقیم ہوگئے۔ صاحب تحفۃ الکرام کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید نصیرالدین، سلسلہ قادریہ میں بکھر کے مشہور بزرگ حضرت شاہ خیرالدین شاہ جیلانیؒ کے مرید تھے۔ شاہ عنایت اللہ رضوی کی ولادت نصیر پور میں سال ١٠٢٥ ہجری میں ہوئی۔[3] آپ علوم متداولہ میں بڑی دسترس رکھتے تھے قادریہ طریقہ کے علاوہ سہروردیہ طریقہ پر بھی بیعت رکھتے رہے۔

---

[1] تذکرہ لطفی تاریخ ادبیات سندھ جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ٢٦٨

[2] تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع۔

[3] میون شاہ عنایت مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صفحہ ٣١۔

افکار قلندری کے مصنف نے صاف لکھا ہے کہ وہ سہروردی طریقہ کے تھے، جس کے ثبوت میں ایک مختصر روایت لکھی ہے۔[1]

روایت ہے حضرت شاہ عنایت اللہ رضوی نصرپوری کو حضرت سیدنا پیر مخدوم سیتھ بھاون شاہ ملتانی نے فرمایا، آپ کی امانت اس بزرگ کے پاس ہے، جس کا ابھی تک اس جہان میں ظہور نہیں ہوا ہے۔ شاہ عنایت اللہ نے عرض کیا، جس بزرگ کا ابھی تک ظہور نہیں ہوا ہے، میں ان سے کس طرح ملاقات کرونگا۔ سیتھ بھاون شاہ نے فرمایا، تم شاہ خیر الدین جیلانی اولیاء کے مقام[2] پر جاکر اعتکاف میں بیٹھو، تھوڑے وقت میں ایک گھوڑے سوار ان نشانیوں سے نظر آئیگا جو تمہیں اس راہ کا پتہ بتادیگا ان سے باطنی فیض بھی حاصل ہوگا۔ شاہ عنایت رضوی سکھر اس جگہ پر پہنچ کر ورد وظائف میں مشغول ہوگئے۔ ایک دن جب کہ آسمان غبار آلودہ تھا، ایک گھوڑے سوار نورانی لباس میں ملبوس دکھائی دیا۔ وہ ان کو دیکھکر بہت خوش ہوا، اس بزرگ کی آپ نے قدم بوسی کی اور بڑا فیض حاصل کیا۔ واپس کے وقت شاہ عنایت رضوی نے آپ کا اسم مبارک دریافت کیا، آپ نے فرمایا میرا نام قائم الدین ہے اب تک ظہور ہوا ہے۔

آپ کے کلام میں شیخ صدرالدین عارف ملتانی اور شیخ رکن الدین ملتانی کی تعریف افراط سے موجود ہے۔ شیخ صدرالدین ملتانی کی تعریف میں فرماتے ہیں:

منھنجو پیر ملتان ۾ صدرالدين سچي،

نگر تنهن نوريءَ جو، رحمتي ۾ ڀي،

پيني بکہ پگي، ڏسندي، ساڻ ڏاتاري.

ملتان میں میرا پیر صدرالدین، سچے میں آتا ہے۔

اس نورانی ہستی کا شہر رحمت الٰہی سے معمور ہے۔

اے میری ہم جولیاں اس سخی کے دیکھنے سے روحانی بھوک مٹ جاتی ہے۔

شاہ لطیف کی طرح شاہ عنایت اللہ رضوی بھی بڑے سیاح تھے، وہ بارہا ملتان گئے تھے، اور زیرین سندھ میں سمندر تک سفر کیا تھا۔ ٹھٹہ کے علاقہ سے تو انہیں خاص طور پر محبت تھی۔ آپ اپنے دور کے بلند پایہ شاعر تھے، لیکن شاہ بھٹائی کے معاصر ہونے سے آپ کی شہرت کو بڑی چوٹ لگی، حالانکہ آپ کے کلام کا بڑا حصہ شاہ بھٹائی کے کلام سے مل گیا ہے۔ اگر شاہ عنایت کسی اور دور میں پیدا ہوتے تو وہ اپنے وقت کے شاعر امام سمجھے جاتے۔ شاہ بھٹائی کی وجہ سے شہرت نہ ہو سکی۔ بالکل اسی طرح جیسے فارسی زبان میں حضرت حافظ شیرازی اور خواجو اور انگریزی ادب میں شیکسپیئر اور مارلو۔ حالانکہ مارلو فن شاعری اور ڈرامہ نگاری میں شیکسپیئر سے کسی بھی صورت میں کم نہ تھا۔ مارلو نے ڈرامہ "تیمور لنگ" اور "فسٹس" دو بلند پایہ ڈرامے لکھ کر انگریزی ادب میں ڈرامہ نگاری کی ایک جدید راہ قائم کی تھی۔ لیکن شیکسپیئر کی بڑھتی ہوئی شہرت نے مارلو کو گوشہ گمنامی میں رکھا۔

شاہ عنایت اللہ رضوی حقیقت میں شاہ بھٹائی کے پیشرو تھے۔ شاہ عبدالکریم بلڑی کے بعد ایک سو سال کے عرصہ میں سندھی شاعری کا میدان خاموش نظر آرہا ہے۔ حالانکہ شاہ عنایت، شاہ لطیف سے عمر میں کافی بڑے تھے اس معصر شخصیت کے کلام کا اثر شاہ بھٹائی پر ہوا تھا۔ کیونکہ وہی خصوصیتیں شاہ بھٹائی کے کلام میں موجود ہیں جو شاہ عنایت کے کلام میں ہیں۔ شاہ لطیف کے رسالے میں ایسے ابیات موجود ہیں جو آپ نے شاہ عنایت کے تتبع میں کہی ہیں۔ "وائی" کے اولین موجد بھی شاہ عنایت رضوی ہیں۔ ان حالات کے مدنظر ہم آپ کو شاہ لطیف کا عظیم پیشرو کہہ سکتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام میں شاہ بھٹائی کے رسالے کی طرح اکثر سر موجود ہیں۔ اور اکثر عنوان بھی وہی ہیں آپ کے کلام میں عجیب سوز و گداز موجود ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

---

[1] افکار قلندری صفحہ ۱۰۱۔ بتوسط تذکرہ لطفی جلد اول صفحہ ۵۹۴

[2] حضرت شاہ خیر الدین شاہ جیلانی کا مقام سکھر پرانے میں واقع ہے۔

لڳڻون لوھ لھي پيا، ٿيا بند بدا.

سو مر واءُ وصال جو ھندي ھانگ ملا

آئي پھر عنايت چئي، آس ج لاھ ھيا

سڀ سنجھ سيا، ملندءِ مٿ ملير جي.

میرے جسم سے فولادی زنجیر اُتر گئی اور مجھے قید سے رہائی مل گئی ہے۔ مجھے وصال کی نوید حاصل ہوئی ہے، اور زاغ کی صدا سے معلوم ہو رہا ہے۔

شاہ عنایت کہتا ہے اُنھوں وقت یہ امید دل میں موجود ہے۔ اے عصمت مآب عورت آج یا کل تیرے عزیز تجھے ملیر میں مل جائیںگے۔

تھڙو ڪينجھر ج ڪين ٻين جھڙي سونھن سند ياس [1]

طول تنھنجي سان ڪنھن، راڻيون اچن نہ راس.

مور چل مٿاس اُبو تماچي ھاڪي.

کینجھر کے کنارے پر ایسا کوئی نہیں جو اُس کے حُسن سے مقابل ہو سکے۔ اُس کے حسن، قد و قامت سے رانیوں کی مشابہت نہیں ہو سکتی۔

تماچی خود اُس کے اوپر اپنے ہاتھوں سے پنکھا جھلا رہا ہے۔

وائي

چوندس حال پھنوار جي ٿر وڃان پاڙ وڃان. [2]

شال نہ ٿيان ڪنھن ويڇيڙنا ڌار

جي ٿر وڃان پاڙ وڃان.

منان مور نہ وسرن ساٿيھ جا سنگھار

جي ٿر وڃان پاڙ وڃان.

ڌبي اُڌ وطن ج واسيان پنھنجا وار

جي ٿر وڃان پاڙ وڃان.

الاھي عنايت سڀن سوڀل سنڀال سار

جي ٿر وڃان پاڙ وڃان.

میں تھر ملک جاؤں اور پاڑ ملک جاؤں اپنا حال میں پنوھار سے کہونگی

خدا کرے کہ میں اپنے عزیزوں سے جدا نہ ہو جاؤں، میں تھر ملک جاؤں اور پاڑ ملک جاؤں

میرے دل سے وطن کے ساتھی، فراموش ہو نہیں سکتے۔ میں تھر ملک جاؤں، پاڑ ملک جاؤں۔

میں اپنے وطن میں جاکر، بالوں کو صاف کرونگی... میں تھر ملک جاؤں پاڑ ملک جاؤں۔

خدایا عنایت کی اپنے کرم سے جلد خبر گیری کر۔ میں تھر جاؤں پاڑ ملک جاؤں۔

---

[1] یہ بیت سندھ کی ایک مشہور کہانی "نوری جام تماچی" سے تعلق رکھتا ہے۔ تماچی سمہ خاندان کا ایک بادشاہ تھا، نوری ایک مچھیرن تھی، کینجھر ضلع ٹھٹھ کے گرد و نواح میں ایک جھیل ہے جہاں نوری کی محبت میں جام تماچی گرفتار ہوا تھا۔ [2] تھر مارئی کا ملک ہے پاڑ تھر کا ایک گاؤں ہے یہ وائی مارئی سے تعلق رکھتی ہے۔

میون عیسیٰؒ :-

میون عیسیٰؒ بھی شاہ عنایت رضویؒ کی طرح شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے پیشرو بزرگ اور ہمعصر تھے، ھالا تعلقہ کے رہنے والے تھے۔ روایت ہے "شاہ بھٹائیؒ بچے ہی تھے تو اتفاقاً میون عیسیٰ آپ کے گاؤں میں آئے، جب اُن کی نگاہ اس ہونہار بچے پر پڑی تو فرمایا۔

"اس بچے سے وہ گل کھلینگے، جس کی خوشبو سے سارا جہاں مہک اُٹھے گا"

میون عیسیٰؒ اپنے دور کے بڑے شاعر تھے، اُن کی ایک یادگار تصنیف "میون عیسیٰ کی سندھی" سے مشہور ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا کلام بہت شیریں اور متین ہے۔ جس میں تصوف کے باریک نکتوں کو عمدہ طور پر نظم کیا گیا ہے۔ شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ میون عیسیٰؒ سنہ ١١٢٣ ہجری میں گذرے ہیں۔ ان کی زندگی کا پوری طرح احوال نہیں ملتا صرف یہی ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنوب سندھ کی طرف سے اپنے مرشد سے ملنے کے بعد، دریا سندھ سے سفر پر چلے جب ان کی کشتی خانوٹھ میں لنگرانداز ہوئی تب مرشد نے ارشاد کیا کہ تمہاری سکونت یہاں ہے۔ مرشد کے فرمودہ سے انہوں نے وہیں سکونت اختیار کرلی اور مخلوق خدا کی خدمت کرتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مریدوں نے انہیں ھالا لے گئے، جہاں وفات پائی۔ قادریہ طریقہ سے واسطہ رکھتے تھے اس لئے کلہوڑہ حکمران بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ کے کلام میں ایک سہ حرفی موجود ہے یہ ابیات اپنی ہیئت سے بہت طویل ہیں۔ چنانچہ شاہ لطیفؒ کے پیشرو تھے، اسلئے ان کے کلام کا شاہ لطیفؒ پر بڑا اثر موجود ہے۔ مثال :-

میون عیسیٰؒ۔

رات سهائي پون سنئين، پس پڌر ۾ پٽ

هل نه رسين موٽ ڪي، پسين جانب جٽ

ڪٿ ورسو ڪٿ، هتين وائين ويسري.

چاندنی رات ہے، اور زمین ہموار، صاف میدانوں کو اچھی طرح دیکھ، چل اور منزل کو طے کر اپنے دوست کو دیکھ

مہار اور فاصلے کے ناپ کی باتیں نہ کر، اس فکر میں فراموشی سے کام نہ لے۔

شاہ لطیفؒ

رات سهائي پون سنئين، پٽن وڏو پنڌ،

هلندي حبيبن ڏي، ڪڍجا موڙ نه ڪنڌ،

پنڌڙ سوئي پنڌ، جو ڪاهي پرينءَ کي.

چاندنی رات ہے اور زمین ہموار ہے میدانوں کی طویل راہ، اے اونٹنی، دوست کی طرف چلتے ہوئے اپنی گردن کو نہ موڑ۔

کوئی ایسی تجویز نکال جس سے ہم دوست کے پاس پہنچ سکیں۔

میون عیسیٰؒ کے کلام میں بڑی جاذبیت، سوز و گداز سمایا ہوا ہے۔ اُن کا شمار کلہوڑہ دور حکومت کے بہترین شعراء میں سے ہوتا ہے۔ میون عیسیٰؒ کے کلام کو سنہ ١٣١٢ ہجری تاریخ ٢٥ ماہ ربیع الاول میں سید شیر محمد شاہ حسینی محمد پوترہ نے جمع کیا تھا، اور حافظ رکن الدین نے طبع کیا۔

تذکرہ لطیفی جلد اول مصنفہ مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ٥٧٠

حضرت شاہ فقیر اللہ صاحب علویؒ شکارپوری

حضرت حاجی شاہ فقیر اللہ صاحب علوی کلہوڑہ دورِ حکومت کے مشائخ میں بڑے رتبے کے مالک تھے۔ آج بھی آپ کا اسم گرامی بڑی عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید عبد الرحمان علوی بن سید شمس الدین علوی تھا۔ شاہ فقیر اللہ علویؒ کی ولادت افغانستان کے مشہور شہر جلال آباد کے نزدیک حصارک کے گرد نواح کے ایک گاؤں روتاس میں تقریباً سنہ ۱۱ھ[1] میں ہوئی۔ آپ کے خاندان کا سلسلہ حضرت امام محمد حنیفہؒ سے جاکر ملتا ہے جو کر علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ظاہری علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے حضرت شاہ محمد مسعود دائم پشاوری بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لاہور کے ایک کامل بزرگ حاجی سعید لاہوری کی بابرکت صحبت سے ظاہری و باطنی فیوض سے مالا مال ہو کر اپنے وطن افغانستان واپس چلے گئے۔ لیکن افغانستان میں بدامنی اور بےچینی پھیلی ہوئی تھی۔ آپ نے وہاں سے ہجرت کرکے حج کے ارادہ سے نکلے سنہ ۱۱۳۰ھ میں قندھار کے راستہ سندھ میں تشریف لائے۔ شکارپور سندھ کی آب و ہوا پسند آئی اور شکارپور کو اپنا وطن بنا کر سکونت اختیار کی۔ آپ کے دم سے شکارپور نقشبندی سلسلہ کا بڑا مرکز بنا۔

شکارپور میں سکونت کے بعد ٹھٹہ گئے جہاں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹویؒ سے حدیث کی سند اور طریقت کی اجازت حاصل کرلی۔ آپ وحدت الوجود کے عقیدہ پر ایمان رکھتے تھے، جس کے بانی حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ تھے۔ ٹھٹہ میں قیام کے دوران مخدوم محمد معینؒ سے آپ کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں جس کے نتیجے میں آپ سے پرخلوص محبت کا رشتہ استوار ہو گیا۔ اور ان کے عقیدے "ہمہ اوست" کے حامی بن گئے۔ لیکن آپ "وحدت الشہود" اور "ہمہ از اوست" کے قائل تھے۔ قیاس ہے کہ آپ کی ملاقات حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی سے مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے بیان کے مطابق ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت شاہ لطیف بھٹائی کی عمر چھیالیس سال تھی۔ شاہ صاحب مخدوم صاحب کی صحبت کے لئے اکثر ٹھٹہ جایا کرتے تھے۔

آپ کے مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے، حج سے فارغ ہو کر سورت بندر میں مقیم ہوئے اور وہاں سے پھر حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ آپ نے سات مرتبہ حج کیے۔ آخری حج سے واپس ہو کر شکارپور آئے اور ہاتی دروازہ کے بیرون (موجودہ علوی محلہ) میں مقیم ہو گئے۔ آپ کی روحانیت کا چرچہ عام ہوا۔ اور فیض حاصل کرنے کے لئے لوگ متوجہ ہوئے اور ارادتمندوں میں داخل ہوئے۔ سندھ کے حاکم میاں نور محمد کلہوڑہ کے فرزند میاں غلام شاہ آپ کے معتقد تھے۔ ریاست قلات کے والی میر نصیر خان بروہی بھی مریدانِ خاص میں سے تھے۔ روایت ہے احمد شاہ ابدالی پانی پت کی لڑائی سے پہلے شکارپور سے گذرے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مرید ہوئے۔ حاجی صاحب نے نصرت کے لئے دعا کی تھی۔ اس طرح اُن کا بیٹا تیمور شاہ بھی والد کے نقش قدم پر چلے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بڑے عالم و فاضل اور روشن ضمیر و قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کثیر التعداد تصانیف کے مالک تھے۔ مشہور تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ منتخب الاصول، ۲۔ قطب الارشاد، ۳۔ طریق الارشاد، ۴۔ فتوحات الغیبیہ فی شرح عقائد الصوفیہ، ۵۔ فتح المجیل فی مدارج التکمیل ۶۔ وثیقۃ الاکابر، ۷۔ فوائد فقیر اللہ علوی ۸۔ شرح قصیدہ بانت السعاد ۹۔ قصیدہ جبروہ ۱۰۔ ملفوظات ۱۱۔ مکتوبات شاہ فقیر اللہ ۱۲۔ ملفوظات و عملیات ۱۳۔ شرح ابیات مشکل مثنوی۔

تاریخ تحفۃ الکرام میں حاجی فقیر اللہ علوی کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"حاجی فقیر اللہ از وارد السند ایام زمان دراز شد کہ آنجا صاحب مرجع آنام می باشد۔ سلسلہ مشیخت و معرکہ را باقصی غایہ رسانیدہ الحق و فضیلتی نیک وارد حکام آنجا بقدم ارادت در خدمتش سلوک دارند و بادشاہ شناس است دُرّد امر و نواہی مسجدی سعی دارد و بیفیض ظاہر و باطن گروہ معتقد وامی"

۱۔ شاہ فقیر اللہ جلال آبادی رسالہ سروش (فارسی) مرتبہ آغا سید جیبی شمارہ ۲ جلد دوم مارچ ۱۹۵۸ء ۲۔ تذکرہ المتقی جلد اول صفحہ ۳۲۸

۳۔ مکتوبات۔ حضرت شاہ فقیر اللہ علوی مطبع اسلامیہ پریس لاہور۔ ۴۔ تاریخ تحفۃ الکرام مصنف میر علی شیر قانع۔ جلد سوم صفحہ ۱۳۲

باہر سے وارد ہوئے تھے۔ لیکن طویل عرصے سے یہاں کے لوگ خاص و عام آپ کی طرف رجوع ہیں۔ پیری مریدی اور تعلیم کے سلسلہ میں آپ نے اپنی حد تک پہنچا دیا ہے۔ بیشک یہ صاحب حال اور بڑی فضیلت، اعلیٰ صفات کے مالک ہیں۔ وہاں کے حاکم اُن کی خدمت میں اور حلقہ ارادت میں ہیں۔ وہ بادشاہ کو پہچانتے ہیں۔ اور اوامر و نواہی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ لوگ آپ کے بڑے معتقد ہیں۔

حاجی صاحب نے اسلام کی بڑی خدمت انجام دی۔ روایت ہے آپ کو ۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۷ء میں شکارپور سندھ کی طرف ہجرت کرنے اور قیام کرنے کا الہام ہوا تھا۔ حاجی صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ میر جمال الدین علوی اپنے بیاض میں رقمطراز ہیں[1]:

"حاجی فقیر اللہ شاہ تقریباً در سنہ ۱۱۵۰ ہجری در شکارپور سندھ آمد و متوطن شدند"

اس وقت شہر شکارپور میں بڑے کثیر انداز میں غیر مسلم رہتے تھے۔ حاجی صاحب کی روحانی فیض و برکت سے انہیں دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ موجودہ شیخ خاندان کے بڑے سیٹھ ہرومل بجاج اور دیگر ھندو مسلمان ہوئے تھے۔

یہ برگزیدہ ہستی ۳ صفر سنہ ۱۱۹۵ ہجری مطابق ۱۷۸۰ء کو شکارپور میں رحلت فرمائی۔ آپ کے ایک مرید و شاگرد میر محمد وفا لکھوی نے تاریخ وفات اس شعر میں قلمبند کی ہے۔ جو کہ آپ کی مزار مبارک پر کندہ ہے

ولی و غوث خدا حاجی فقیر اللہ

شدہ بخلد مربع نشین الی الابد

وخامہ و شب و تاریخ و سال وصال

بگو سویم صفر و نصف اللیلۃ الاحد

۱۱۹۵ ہجری

آپ کا مزار مبارک شکارپور شہر میں ہاتی دروازہ کے اندرون علوی محلہ میں واقع ہے جس پر ایک عالیشان کاشی کا قبہ تعمیر کیا گیا ہے۔ جو غالباً تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی نے تعمیر کرایا تھا۔ بعد میں میر علی نواز علوی نے توسیع کیا۔ جو مرجع خاص و عام ہے۔ آپ عظیم شاعر تھے۔ فارسی، عربی، پشتو، اور اردو ریختہ میں شعر موجود ہے جو فقر و غناء سے بھرپور ہے۔ چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

چونکہ ز اسباب جہان بی سر و سامان گردی

سینہ گنجینۂ اسرار خدا میگردد

زنگ ز آئینۂ دل بر یاضت بردار

عکس مرآت پذیرد چو جلا میگردد

جب اس جہاں کے اسباب سے بے تعلق ہونگے، تب ہمارا سینہ خدا تعالیٰ کے اسرار و رموز کا خزانہ بن جائےگا۔ اپنی محنت سے دل کے آئینہ کا چڑھا ہوا زنگ اُتار دے

کیونکہ جب آئینہ صاف اور روشن ہوتا ہے تب ہی اس میں اچھا عکس نظر آتا ہے

آپ کی ایک غزل کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

مصدرے فیضے کہ عالم را تر و تازہ نمود — فی الحقیقت ہست چون مرآت در جسم شہود

سے پوست از سے نیا شامد نی گردد درست — باد آن جاسے بیکر عقل صوفی در ربود

---

[1] بیاض میر جمال الدین علوی شکارپوری (قلمی نسخہ) [2] قطب الفرد الحاج شاہ فقیر اللہ علوی مضمون نگار پروفیسر امین اللہ علوی رسالہ الرحیم سندھی ستمبر ۱۹۷۱ء

[3] تذکرہ لطفی جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔

مناجات عرب زبان کے چند شعر نقل کیئے جاتے ہیں:۔

اَحمد الله العلی و ذو الجلال　　با النعم و بعد و نما فی کل حال

ثم الصلواۃ العزیز المقتدر　　دائما کانت علی الخیر البشر

یا الا الخلق مولانا القدیم　　ربنا الرحمان رؤف یا رحیم

قد مرفت العمری قیل وقال　　مناع عمری فی قباحات الخیال (الخ)

قصیدہ

ایا محبوب سبحانی محی الدین جیلانی　　ایا مطلوب یزدانی　　محی الدین جیلانی۔

ایا منظور پیغمبر گلے از باغ آن سرور　　ز تو رونق پذیر افسر　　محی الدین جیلانی۔

سراپا فیض رحمانی، کمالِ جاہ انسانی　　مقدس سر ربانی　　محی الدین جیلانی۔

زہے محبوب سبحانی بہ ملک دین سلطانی　　صمت شاہ مردانی　　محی الدین جیلانی (الخ)

تاریخ بیست نہم ۲۹ ذی القعدہ سنہ ۱۱۶۳ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

کہ در حرم محترم بیت اللہ شرفہا اللہ تعالیٰ، در حاشیۂ مطاف مواجۂ رکن شامی تالیف این مناجات بانجام رسیدہ، در آمروز کہ این مناجات گفتہ شد چون این بیت سحاب کرم امروز بباری بسرم گفتہ شد برائے تفاول گفتم کہ این مناجات مقبول است امروز باران خواہد بارید، بتقدیر ایزدی رعد بغرید و باران باریدن گرفت۔

ای سحاب کرام امروز بباری بسرم　　تا بخشکی نشود روضۂ ام از بی عملی

مناجات

عمر من رفت بتحصیل قباحات معام،　　مگذادم بکرم سیّد تا فی خذلی

ما التف القلب الی الغیر دانی تترکنی،　　فی فلاۃ ہکذا کنت دان فی الغلل

این فقیرست بسے عاجز و بیچارہ چنان　　دستگیرش نبود جز تو مخفی نہ جلی

متحیث آمد است نزد تو فقیر اللہ　　سعی فرما مکرم بہر خدا در پہلی۔ الخ

حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی [۲]

حضرت مخدوم محمد معین ٹھٹوی کلہوڑہ دور حکومت کے بڑے جید عالم اور صوفی تھے، آپ علامہ زمان تھے، ظاہری تعلیم مخدوم عنایت اللہ ٹھٹوی [۲] سے حاصل کی اور باطنی فیض حضرت ابوالقاسم نقشبندی ٹھٹوی سے حاصل کیا۔ صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں:۔

"آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم محمد امین بن مخدوم طالب اللہ تھا، جو پہلے جنوب سندھ میں روپاہ کے رہنے والے تھے، جہاں سے ہجرت کرکے ٹھٹہ میں مقیم ہوئے۔ مخدوم محمد معین ٹھٹہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم مخدوم عنایت اللہ ٹھٹوی سے حاصل کی۔ خدا تعالیٰ جل جلالہ نے اس ذات والا صفات میں سبھی علوم منقول و معقول کو جمع کیا تھا۔ اپنی کمالات علمی کے باعث علامہ دہر مشہور ہوئے۔ مخدوم ابوالقاسم نقشبندی کے حلقۂ مریدی میں داخل ہوئے۔ زندگی کے آخری زمانہ میں سید عبداللطیف تارک سے دوستی

۱۔ بیاض لطفی مرتب مخدومی مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی (قلمی نسخہ) ۲۔ تحفۃ الکرام میر علی شیر قانع صفحہ ۲۲۹

اور عقیدتمندی پیدا ہوئی مخدوم حاجی محمد ہاشم ٹھٹوی سے علمی باتوں پر اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ آپ کثیر التصانیف تھے۔ ۱
وقت کے حاکم آپ کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ سماع دوست تھے، اور علم موسیقی کے جاننے والے۔ شعر بھی آپ کی یادگار ہیں۔
فارسی شعر میں تسلیم" سندھی اور ھندی زبان میں "بیراگی" تخلص کرتے تھے۔ آپ نے سنہ ۱۱۶۱ ھجری میں وفات پائی تھی۔ آپ
کی تاریخ وفات محمد محسن ٹھٹوی نے موزون کی ہے۔

قطرہ در بہ بحر واصل شد

معین الدین احمد رفت صد حیف
سنہ ۱۱۶۱ ھجری

حضرت مخدوم نعمت اللہ نے فرمایا ہے

شفیع تو رسول
۱۱۶۱ ھجری

محمد پناہ رجا نے بھی اس طرح تاریخ وصال نکالی تھی:۔

نا بی شی اوکشہ ال محمد معین اوست
سنہ ۱۱۶۱ ھجری

آپ کی بلند مقامی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آخری دنوں میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے گاؤں میں خادموں اور فقراء سے فرمایا تھا۔
"چلیں اپنے دوست کا آخری دیدار کر آئیں" شاہ بھٹائیؒ بھٹ سے ٹھٹہ تشریف لے گئے، وہاں سماع کی محفل منعقد کروائی مخدوم محمد معین بھی اس محفل میں
شامل ہوئے، عین اُسوقت جبکہ محفل شباب پر آئی تو مخدوم صاحب وہاں سے اُٹھ کر اندر حجرہ میں چلے گئے۔ اور وہیں جان بحق ہوئے۔ شاہ بھٹائی کو بہت ملال
ہوا۔ آپ نے جنازہ نماز پڑھائی، میت مبارک کو دفن کرنے کے بعد جب وطن واپس ہو رہے تھے، تو فرمایا تھا

"ٹھٹہ میں ہمارا آنا صرف اس دوست کے لئے ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہمارا یہاں آنا موقوف ہوا"

آپ باوجود نقشبندی طریقہ پر عامل تھے۔ لیکن سماع کی مجلس میں بھی شریک رہتے تھے، کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ آپ نے بہت سی تصانیف چھوڑی ہیں، اب وہ
تقریباً نایاب ہوگئی ہیں۔ جن میں یہ مشہور ہیں:۔
رسالہ فی تحقیق اھل البیت۔ ۲۔ رسالہ در بحث تناسخ۔ ۳۔ رسالہ اثبات اسلام ابی طالب۔ ۴۔ قرۃ العین فی ابکاء علی الامام الحسین ۵۔ رسالہ فی اثبات السلام الاحدیث الصراۃ
ایک تصنیف رسالہ اویسیہ فارسی میں ہے جو مخدوم صاحب نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ[2] کے مذہبی سوال پر ان سے اویسی سلسلہ کی تحقیق کے بارے میں لکھی تھی۔
حضرت شاہ فقیر اللہ صاحب علوی شکارپوری سے آپ کے مراسم تھے آپ نے جو مکتوب حاجی صاحب کو لکھے تھے اُن کا ذکر اپنی تصنیف مکتوبات میں دیا ہے۔
اور مخدوم صاحب کا ذکر بھی کیا ہے جو اس طرح مخاطب کیا ہے۔ "از مکتوبات قدسی آیات طالبان خدا حضرت ایشان ماکر بنام مخدوم محمد معین تتوی صدور یافتہ"
آپ علم تصوف، علم حدیث اور دیگر علوم و فنون کے سرچشمہ تھے، ٹھٹہ میں ایک مدرسہ چلاتے تھے جس میں خود تعلیم دیتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مریدوں میں سے
تھے۔ مخدوم صاحب کے بڑے شاگرد گذرے ہیں جو اپنے وقت کے مشہور عالم و فاضل تھے جن میں میر نجم الدین عزلت، مولوی محمد صادق، علامہ محدث محمد حیات سندھی، جعفر شیرازی
شرف الدین علی۔ اور میر مرتضیٰ سیوستانی قابل ذکر ہیں۔[3] آپ کے سندھی کلام کا آج کہیں بھی پتہ نہیں۔ البتہ فارسی میں کلام موجود ہے۔ ایک شعر نقل کیا جاتا ہے

سگت را خونِ دل دادم کہ با من آشنا گردد
ندانستم زبختِ بد کہ او دیوانہ خواھد شد۔

۱؎ تذکرہ لطفی جلد اول صفحہ ۲۹۹۔ ۲؎ مکتوبات حضرت شاہ فقیر اللہ علوی مکتوب ۲۱ تا ۲۵ تک۔ صفحہ ۱۰۶

۳؎ صوفیائے سندھ مرتب اعجاز الحق قدوسی صفحہ ۲۴۴

صاحب تکملہ مقالات الشعراء نے مخدوم محمد معین کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے :

"عمدۃ العلماء الربانین، قدوۃ المفسرین والمحدثین المخدوم محمد معین قدس سرہ ."

مخدوم ضیاء الدینؒ

مخدوم ضیاء الدینؒ صاحب فضیلت اور بڑے عالم و فاضل گذرے ہیں، آپ مخدوم عنایت اللہ کے شاگردوں میں سے تھے، مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی آپ کے شاگرد تھے، آپ کی ولادت سنہ ۱۰۹۱ ہجری میں ہوئی تھی، اور وفات سنہ ۱۱۷۱ ہجری میں آسی ۸۰ سال کی عمر میں ہوئی .

حضرت مخدوم محمد ھاشم ٹھٹویؒ :-

حضرت مخدوم محمد ھاشم ٹھٹویؒ سندھ کے مشاہیر علماء میں سے تھے. ایسی شخصیتوں پر سندھ کو بجا طور پر ناز ہے مخدوم صاحب قریشی خاندان کے فرد تھے. آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم عبد الغفور تھا. یہ خاندان ٹھٹھہ کے گرد و نواح کے رہنے والے تھے . مخدوم صاحب کی ولادت سنہ ۱۱۰۴ ہجری مطابق سنہ ۱۶۹۳ع کو ہوئی. آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے والد کے یہاں ہوئی . مزید تعلیم ٹھٹھہ میں مخدوم سعید کے یہاں ہوئی اور تعلیم کی تکمیل مخدوم ضیاء الدین کے یہاں ہوئی اور شرف دستاربندی حاصل کی تعلیم کے دوران آپ کے والد کا انتقال ہوا . والد کے انتقال کے بعد بھرام پور کے گاؤں کی طرف ہجرت کی. جہاں درس و تدریس کا کام شروع کیا. لیکن وہاں کے لوگوں کی حسد کی وجہ سے مجبوراً ہجرت کرکے ٹھٹھہ میں مستقل سکونت اختیار کی. جہاں اپنے علم و فضل سے وقت کے بڑے علماء میں شمار ہونے لگے. آپ نے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شریعت کے پابندی پر چلنے کی دعوت دیتے رہے، اور بدعات کے خلاف زبردست جہاد شروع کیا. ٹھٹھہ اس زمانہ میں علم و فضل کا مرکز تھا، مخدوم صاحب کی علمی شہرت دور دراز مقامات پر پہنچ گئی تھی، ھزاروں کی تعداد میں طلباء فیض حاصل کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے. وقت کے حاکم میاں غلام شاہ کلہوڑہ بھی آپ کے معتقدوں میں شامل ہو گئے . اس وقت ٹھٹھہ میں شیعہ مذھب زور پکڑ رہا تھا، کچھ عالم تفضیلی مذھب رکھتے تھے، شہر میں قبر پرستی کا رواج تھا، اور بدعات کا بھی بڑا زور تھا، مخدوم صاحب نے کوشش کرکے ان بدعتوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوئے، سندھ کے حاکم میاں غلام شاہ کلہوڑہ سے ان بدعتوں کے خلاف ایک پروانہ حاصل کر لیا. جس کا فارسی متن مندرجہ ذیل ہے :

عمال و کارپردازان حال و استقبال متعلقہ این جانب بدانند کہ حسب مرقوم جناب مخدوم محمد ھاشم درباب اجراد ترویج مقدمات اسلام و منع ماتم و تابوت وغیرہ بدعات آیام عاشورا و منع شرب وجمیع مسکرات و قماربازی و لولی بازی و زنان فاحشات و مخنثین و منع رفتن زنان مسلمین در مقابر و کوہستان و باغات زنان و مردان از نیاحت در وقت تعزیت و منع مصورین از صور ذی الارواح و منع هنود از برہنہ کردن زانو چادر بازار و کوچہا و دکانہا . و منع مسلمین از گرفتن لحیہ قبل القبضہ و کشیدن خط ریش و گذاشتن بروت، و منع هنود از ہولی و بھگت و سرود و مزامیر دھول و نواقیس و سجدہ پیش اصنام و دریا بطریق علانیہ زجر و توبیخ شدیدہ نمودہ قدغن بلیغ نمایند کہ احدی از رعایا متعرض و مرتکب حرمات و بدعات نشدہ متنبہ گردد و نیز مسلمانان را در باب صلوۃ و صیام و سائر عبادات مالیہ و جانیہ تاکید اکید بجا آرند کہ احدی ارتکاب ترک آن نمایند درین باب تاکید اکید دانستہ حسب المسطور بعمل آرند و باب مداهنت بر ذمہ خود دانستہ تخلف نورزند تحریر تاریخ ۲ شہر شعبان سنہ ۱۱۸۲ ہجری .

اس حکم نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھٹھہ میں شاہی زمانہ سے شیعہ مذھب کی بدعات کا رواج تھا، نشیدار منشیات کا استعمال بکثرت ہوتا تھا، عورتیں مزاروں پر بلاتکلف جایا کرتی تھیں، وہاں بدکار عورتیں بھی رہتی تھیں وغیرہ

میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے آپ کی علمیت و قابلیت کی قدر کرکے آپ کو ٹھٹھہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا سنہ ۱۱۳۵ ہجری کو حج کرنے کے لئے مکہ معظم تشریف لے گئے

۱؎ اخبار الوحید .. سندھ آزاد نمبر کراچی ـــ ۱۵ جون سنہ ۱۹۳۶ صفحہ ۲۲-۲۳ .

وہاں بڑے بڑے علماءِ دین سے ملاقات کی جیسے شیخ عبدالقادر صدیقی مالکی، شیخ عبد بن علی مصری، شیخ محمد ابو طاہر مدنی اور شیخ علی بن عبدالملک دراوی، جن سے حدیث اور دیگر علوم میں سندیں حاصل کرلی، جن کو اپنی مشہور تصانیف "اتحاف الاکابر" اور "ذیلہ" میں جمع کیا تھا۔ آپ کی ایک تصنیف کے حاشیہ میں دکھایا گیا ہے کہ آپ کو تاریخ ۱۲ رجب ۱۱۳۶ھ ہجری بروز جمعہ مدینہ علیہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت کا شرف حاصل ہوا۔ حج سے واپسی کے دوران سورت بندر میں ایک بزرگ حضرت سیّد محمد سعد اللہ کے مبارک ہاتھ پر بیعت کرکے خلافت کا خرقہ حاصل کیا۔ اس سفر کے بعد باقی عمر خدا تعالیٰ کی یاد اور تصنیف و تالیف میں گذاری۔ آپ کی تصنیفات کا انداز تقریباً ڈیڑھ سو کہا جاتا ہے۔ جو عربی، فارسی اور سندھی زبانوں میں موجود ہیں۔ ان میں بہت سی تصنیفات ابتک شایع نہ ہوسکی ہیں۔ سندھی زبان آپ کی مادری زبان تھی۔ اس میں آپ کی مشہور تصنیف بناءُ الاسلام ہے، جس میں آپ نے اسلامی عقاید کو بڑی توسیع اور تشریح سے پیش کیا ہے۔

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف کی روایت کے مطابق مخدوم محمد معین اور مخدوم ہاشم ٹھٹوی کے درمیان کچھ علمی اختلافات تھے۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ دین اسلام کی خدمت کے لئے آپ نے جو کوششیں کی تھی وہ کبھی بھی فراموش کی نہیں جا سکتی۔ میر علی شیر قانع لکھتے ہیں:-[1]

دین مبین کی تقویت کے لئے جو کچھ اس زمانے میں ہوتا رہا ہے وہ آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ دین اور مشرکوں پر آپ کا عمل جاری ہو رہا تھا۔ آپ کے ایام میں سیکڑوں ذی ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ وقت کے بادشاہوں مثلاً نادر شاہ، اور احمد شاہ ابدالی سے آپ کی خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ آپ کے ارشاد کے مطابق، تقویت دین کے لئے احکام کا اجرا ہوتا تھا۔

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے اپنی تصنیف[2] "شاہ بھٹائیؒ کا احوال" میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے مخدوم صاحب خود "بھٹ شاہ" پر تشریف لے گئے تھے، اور سماع کی مجلس کو منع کرانے کے لئے دوسرے علماء بھی ساتھ لے گئے تھے۔ میر عبدالحسین خان سانگی نے اپنی تصنیف[3] "لطائف لطیفی" میں لکھتے ہیں کہ جب شاہ بھٹائیؒ کو علماء کے آمد کا پتہ ہوا، تو احتراماً، اپنے فقیروں کو ارشاد فرمایا۔ ان ساز سرودوں کو کسی کمرے میں بند کرکے رکھو۔ علماءِ دین تشریف لا رہے ہیں۔ ملاقات کے بعد شاہ بھٹائیؒ نے فرمایا:-

"ایک ایسا پودہ جو خاص و عام کے فائدہ کے لئے ہو، لیکن پاک پانی نہ ہونے کی وجہ سے خشک ہونے لگا ہو، اگر اس پودے کو کسی پلید تالاب سے پانی دے کر ہرا اور تروتازہ کیا جائے تو یہ ٹھیک ہے یا اس پودے کو ایسے چھوڑا جائے کہ وہ سڑ کر مرجائے۔ علماء نے یک رائے ہو کر کہا کہ اس پودے کی بقا کے لئے اگر پلید پانی بھی دیا جائے تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ خاص و عام کے فائدہ کے لئے ہے۔ شاہ صاحب نے یہ جواب سنکر فرمایا، میرے دل میں حقیقی عشق کا ایک پودہ ہے جس کے سرسبز اور شاداب رکھنے کے لئے سماع پانی کا کام دیتا ہے روایت ہے، اس مقالمہ کے بعد وہی ساز جو احتراماً کمرے میں بند کردے گئے تھے، خود بہ خود بجنے لگے۔ اس بات پر علماء کرام بہت غصہ ہوئے، اور کہا، "ہم جس چیز کو بند کرانے کے لئے آئے تھے، وہی ہماری موجودگی میں ہو رہا ہے"۔ شاہ لطیفؒ نے فرمایا، میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ آپ خود جاکر دیکھیں، وہ تو خود بہ خود بج رہے ہیں۔ حقیقت حال معلوم کرنے کے معلوم ہوا تو بات سچ نکلی"

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بات کی بنیاد صرف خوش اعتقادی پر رکھی گئی ہے، کیوں کہ صوفیوں کے یہاں سماع کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے مخدوم صاحب خود ایک بڑے عالم تھے، اُن کو سماع کے متعلق پوری پوری خبر تھی۔ شاہ بھٹائیؒ کے یہاں سماع کی مجلیس بڑی پابندی اور ادب سے ہوا کرتی تھی۔ خبر نہیں اس میں کون سی بدعت سمائی ہوئی تھی۔ جو کہ مخدوم صاحب صرف ساز و سرود بند کرانے کے لئے بھٹ شاہ پر تشریف لے گئے تھے۔ دوسری طرف سازوں

---

[1] تاریخ تحفۃ الکرام - میر علی شیر قانع۔ [2] احوال شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ مرتب شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم

[3] لطائف لطیفی - مصنف میر عبدالحسین خان سانگی۔

کا خود بہ خود بننا ایک بحث طلب بات ہے واللہ اعلم بالصواب ۔

مخدوم صاحب اُس علمی قابلیت کے مالک تھے جو آج ان کی تصنیفات بڑے بڑے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں ۔ مخدوم صاحب ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے آپ کے کلام میں دین کی تبلیغ کے عنصر پائے جاتے ہیں ۔ آپ کی ایک مشہور تصنیف "تحفۃ السندہ" مشہور ہے جس سے آپ کے وطن دوست ہونے کی ایک روشن مثال ملتی ہے ۔ مخدوم صاحب نے سنہ ١١٧٤ ھجری مطابق ١٧٦٠ء میں ستر برس کی عمر میں رحلت فرمائی ۔ آپ کو مکلی کی پہاڑی پر دفن کیا گیا ۔ آپ کے ایک شعر کی تصنیف "بنا الاسلام" سے ایک شعر نقل کیا جاتا ہے ۔ جس سے اسلام کے عقاید کا بڑی تفصیل سے پتہ چلتا ہے ۔

سڀ ساراهون، تنهن صاحب کي جوڙيا جنهن جهان ،

عرش خلقيائين ڪرسي، زمينون ۽ آسمان ،

آپي ڪيائين تارن سان رحمتون روشان ،

پيدا ڪيائين قدرت سان ڪوڙين لک انسان

ڪي ڪافر ڪيائين، تن منجهان ڪي پڻ مسلمان ۔ (الخ)

" سب توصیف اس صاحب (ربّ) کی ہے ۔ جس نے جہانوں کو پیدا کیا ، عرش و کرسی زمین و آسمانوں کو بنایا ،

اپنی رحمت سے آسمان میں تاروں کو روشن کیا ، اپنی قدرت سے اس نے لاتعداد انسان پیدا کئے ، جن کسی کو کافر تو کسی کو مسلمان کیا "

یہ پوری تصنیف آزاد نظم میں ہے اور بڑی شستہ سندھی میں لکھی گئی ہے ۔

حضرت سلطان الاولیاء خواجہ محمد زمان قدس سرہ ۔

سلطان الاولیاء حضرت خواجہ محمد زمان قدس سرہ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی شیخ حاجی عبداللطیف نقشبندی تھا ۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاکر ملتا ہے ۔ آپ کا خاندان ٹھٹہ کے لنواری کی بستی میں رہتا تھا ، جو عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دور خلافت میں عربستان سے ہجرت کرکے سندھ میں آکر ٹھٹہ میں آباد ہوا تھا ۔ سومرہ اور سمہ کے دور حکومت میں ملک کے اندر بد انتظامی کی وجہ سے ٹھٹہ کو خیرباد کہہ کر کچھ (ریگستان) میں جاکر سکونت اختیار کرلی ۔ لیکن روحانی تعلقات سندھ سے قائم رہے سنہ ٩١٠ ھجری مطابق سنہ ١٥٠٤ء میں مریدوں کی منت پر آبائی وطن واپس گئے ۔ خواجہ صاحب تاریخ ٢٢ ماہ رمضان المبارک سنہ ١١٢٥ ھجری مطابق سنہ ١٧١٣ء کو تولد ہوئے ۔ آپ کی ولادت کی تاریخ ابجد کے حساب سے قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے نکلتی ہے

" اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ "

" تحقیق وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے "

آپکی ابتدائی تربیت اپنے والد بزرگوار کے زیر نظر ہوئی ، اُنہی سے قرآن مجید کو حفظ کیا ۔ ظاہری علوم کی تحصیل مخدوم محمد صادق نقشبندی سے ہوئی ، وہاں عربی اور فارسی علوم کی تعلیم مکمل کرلی ۔ تحصیل علوم کے بعد ٹھٹہ کے ایک کامل بزرگ خواجہ ابوالمساکین نقشبندی کے مریدوں میں داخل ہوئے ۔ مرشد کی فیض پرور نظر سے آپ کو خلافت کا اعزاز حاصل ہوا ۔ خواجہ ابوالمساکین نے آپ سے خوش ہوکر اپنے ہاتھوں سے طریقت کے تعلیم کی سند لکھ دی جس کا متن یہ ہے ۔ [1]

ويقول الشيخ محمد : لما كان الأخ في الله محمد الزمان سلك في مسلك الارادة وصحب مع المسكين صحبة كثيرة اجزته بتعليم الطريقه وشرط الاستقامة على الشريعة والطريقة والسلام

(شیخ محمد کہتا ہے : چونکہ خدا تعالیٰ کی راہ میں میرے بھائی محمد زمان مریدی میں شامل ہوئے ہیں ، اور اس مسکین کی صحبت میں بہت وقت گذارا ہے ، اس لئے ، اُن کو طریقت کی تعلیم کی اجازت دے دی ہے اس شرط پر کہ آپ شریعت و طریقت پر قائم ہونگے ..... والسلام

ابیات سندھی ۔ مرتب علامہ شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ مرحوم حاشیہ ط ۔ ج

مرشد نے اپنی دستار مبارک اُتار کر آپ کے سر پر رکھی اور اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ خواجہ صاحب کی بیعت کریں۔ آپ کے مرشد حج کو جانے کے وقت خواجہ صاحب کو اپنی مسند پر بٹھا کر گئے۔ آپ کے والد بزرگوار نے ۱۱۴۹ ہجری مطابق ۱۷۳۶ء میں رحلت فرمائی۔ آپ نے اُس وقت قدیم لنواری کو چھوڑ کر جدید لنواری میں منتقل ہوگئے جس کو آپ نے خود آباد کیا تھا۔ آپ یہاں بیٹھکر لوگوں کو فیض پہنچاتے رہے۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، زندگی کے آخری ایام میں خواجہ صاحب کی ملاقات کے لئے لنواری شریف آتے تھے۔ حالانکہ خواجہ صاحب نے ظاہری علوم کی تحصیل شاہ بھٹائیؒ کے ایک مرید مخدوم محمد صادق نقشبندی کے یہاں حاصل کی تھی، لیکن اس نوجوان عارف کو دیکھنے کے لئے شاہ صاحب دور دراز سفر طے کر کے لنواری شریف تشریف لے گئے تھے۔ جب آپ حجرہ کے دروازہ پر پہنچے تو ایک خادم کو اندر آنے کی اجازت کے لئے بھیجا۔ خواجہ صاحب نے کہا، شاہ صاحب سے کہو ذرا ٹھہر جائیں ہم استقبال کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ شاہ بھٹائیؒ نے خادم سے دریافت کیا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ خادم نے جواب دیا خاموش بیٹھے تھے۔ شاہ بھٹائی نے کہا اس صورت میں خبر نہیں کب فارغ ہونگے اور ہماری طرف متوجہ ہونگے۔ تب خود اندر تشریف لے گئے۔ ملاقات کے دوران شاہ صاحب نے سوال پوچھا فنا کے بعد بھی کوئی علم ہے؟ خواجہ صاحب نے جواب کے بجائے سوال کیا "فنا سے پہلے بھلا کیا ہے" یہ سن کر شاہ صاحب نے عرض کیا، ارادہ ہے کہ آپ کا مرید ہو جاؤں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "سماع ہماری طریقت میں سوائے کسی خاص موقعے کے سواء حرام ہے۔" شاہ صاحب نے فرمایا "پوری زندگی سماع میں گذری ہے اب اس کو ترک کرنا محال ہے۔" پھر کافی وقت تک آپس میں باتیں کی جب شاہ صاحب نے اجازت چاہی، تب خواجہ صاحب نے آپ کو خلافت کی چادر عنایت کی۔ کہتے ہیں شاہ صاحب نے وصیت فرمائی تھی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو یہ چادر کفن کے اوپر رکھی جائے۔ ملاقات کے بعد شاہ صاحب ہمیشہ خواجہ صاحب کی شان میں کہتے تھے۔

مون سي ڏٺا ماءُ، جنين ڏٺو پرين کي.

تنهين سندي ڪا، ڪري نه سگهان ڳالهڙي.

"اے میری ماں! میں نے دیکھا ہے اُنہیں، جس نے دوست کا دیکھا جمال، یہ حقیقت ہے کہ میں اُن کی عظمت کا بیان کر نہیں سکتا۔"

کہتے ہیں آخری زندگی کے ایام میں آپ نے حجرہ بنوانے میں بڑی جلدی کی، اور جب حجرہ تیار ہوگیا تب خود اُن میں رہنے لگے۔ کسی اور کو بغیر وضو کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ اکثر تمام رات حجرہ میں رہتے تھے، کہتے ہیں ان دنوں اکثر حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معنوی ملاقات کا شرف حاصل ہوا کرتا تھا۔ اپنے دوستوں سے فرماتے تھے ہر جمعہ کی رات سو مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھیں۔ ۱۱۸۸ھ ہجری میں آپ کی بیماری نے شدت اختیار کرلی۔ ماہ رمضان میں آپ بستر سے اُٹھنے کے قابل نہ رہے۔ وفات سے چند ساعت پیشتر آپ نے اس بیت کی تکرار کرتے رہے۔

اُوڏڻ اُوڏي آءُ، توکي لاکي کوٺيو.

لهي تو مٿان، سنهو مٿئين مامرو

"اے اُوڈن (مٹی اُٹھانے والی) قریب آجا، تجھے سردار لاکھے نے طلب کیا ہے، تاکہ تیرے اُوپر جو ظاکبازی کا معاملہ ہے وہ اُتر جائے۔"

حافظ شیرازیؒ نے اس قبیل میں فرمایا ہے۔

این جان عاریت کہ بحافظ سپرد دوست

روزی بینیم اُرا تسلیم وے کنیم۔

یہ مستعار جان جس کو دوست نے حافظ کو سپرد کی ہے، ایک دن اُسی دیکھتے دیکھتے ان کے سپرد کردینگے۔

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف نے حضرت خواجہ محمد زمانؒ کے روحانی رتبہ کا ذکر اس طرح کیا ہے ۱؎

۱؎ تاریخ تحفۃ الکرام۔ صفحہ ۱۲۴۔

"میاں محمد زمان، مشہور مرشد میاں ابوالقاسم نقشبندی اور محمد نقشبندی ٹھٹوی کے مرید تھے، بڑے باھدایت، سلسلہ نقشبندی کے مریدوں میں مرجع اور صاحب کرامت بزرگ تھے، بدین کے قریب موضع لواری میں سکونت اختیار کی تھی، اور ایک زمانہ کو اپنے دریائے فیض سے سیراب کرتے تھے۔ لاتعداد لوگوں کا اعتقاد ہے کہ یہ اپنے عہد میں بے نظیر تھے۔ بظاہر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہونے کے باوجود ان کا لنگر جاری رہتا ہے تعجب ہے کہ ایک گروہ حقیقت کو سمجھے بغیر ظاہر کو دیکھکر اُن پر طعنہ زنی کیا کرتے ہیں۔ اُنہی ایام میں اس دار فانی سے رخصت ہو کر داعی حقیقی سے جا ملے ہیں۔ آپ کا سن وفات ۱۱۸۸ھ ہجری ہے۔"

صحیح تحقیق کے رو سے آپ نے ۲ ذوالقعدہ ۱۱۸۸ھ ہجری مطابق ۱۷۷۴ء عیسوی کی صبح صادق کے وقت رحلت فرمائی، اس وقت عمر ۶۳ سال تھی۔ تاریخ وصال اس قطعہ سے نکلتی ہے جسے سید غلام حسین ٹھٹوی نے موزوں کیا ہے:

هردو عالم شده است عرض بتو

کن قبول از یکی که به دانی

گفتت آواز جواب وهم تاریخ

به زهٔ خدا وصال عریانی.

۱۱۸۸ھ ہجری

آپ کے ابیات کو ایک مرید و خلیفہ حضرت مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی ؒ نے ملفوظات کے سلسلہ میں جمع کیا تھا۔ اور ان کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں شرح بھی لکھی، شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم نے بڑی کاوش سے اس کتاب کا سراغ لگایا۔ متن اور شرح کا ترجمہ اپنی عالمانہ تمہید کے "ابیات سندی" کے نام سے شایع کرایا۔ خواجہ صاحب کی زندگی کا احوال تذکرہ لطفی جلد اوّل میں مخدومی مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی نے بھی تفصیل سے دیا ہے۔ اس کے علاوہ انجہانی ڈاکٹر ہوتچند گربخشانی نے بھی اپنی تصنیف "لنواری جا لعل" میں ذکر کیا ہے۔

رسالہ ابیات سندی کا شمار تصوف کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ جس میں اکثر پیچیدہ مسائل کو سادہ اور نہایت آسان طریقہ سے حل کیا ہے۔ جس سے آپ کے اعلیٰ فکر اور بلند تخیل کا پتہ ملتا ہے۔ آپ خلیفہ مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی ؒ نے آپکے ابیات کے متعلق یہ راء دی ہے۔

(ان ابیات میں جو صوفیانہ نکتے بیان کیئے گئے ہیں، وہ ایک طالب کو مشاہدۂ الٰہی کا ذوق پیدا کرنے کے لئے ہیں، اور یہ اُن کے لئے شاہد بن جاتے ہیں)

یہ تصنیف، آغاز سے لے کر انجام تک تصوف کی تلقین سے پُر نظر آتی ہیں۔ مثال دیئے جاتے ہیں:۔

فعل شريعت، حب طريقت، حبوء حقيقت هوءِ

معرفت نالوءَ آهه پروڙڻ پار سيين

"ہر فعل شریعت کے مطابق ہونا چاہیئے خلق خدا کی محبت طریقت ہے اور قلب حقیقت کا آئینہ ہونا چاہیئے، معرفت نام ہے صراط مستقیم کی طرف جانے کا"

سچڻ ڏٺو جن - تن ڏسڻ غير گناهه،

جنين لڌي راهه، ويچڻ تنين وهه ٿيو.

جنہوں نے محبوب کو دیکھا، ان کے لئے غیر کی طرف نگاہ اُٹھانا گناہ ہے، جس کو صراط مستقیم مل گئی، ان کے لئے بہٹکنا زہر مثل ہو گیا۔

محب جھڙي آهه حقيقت حبيب جي

نکو ڏينهو سو ڏٺي، نکو مخلو ٿا

شفق جي ساڀاءُ، جامع ليل ونهار جو.

میرے دوست کی حقیقت کتنی عجیب ہے، نہ تو ہم اُنہیں خالق کہ سکتے ہیں نہ ہی مخلوق، ان کی مثالی تو شفق کی سی ہے نہ تو اس کو دن کہینگے نہ ہی رات بلکہ لیل و نہار کا جامع کہینگے
(حقیقت محمدی)

فقیر صاحبڈنہ فاروقیؒ

فقیر صاحبڈنہ فاروقیؒ، خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن خطاب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ فقیر صاحبڈنہ فاروق کے آباؤ اجداد نے حجاز سے ہجرت کرکے عراق میں سکونت اختیار کی تھی، جن میں حضرت شیخ شہاب الدین اپنے علم وفضل اور سیاست کی وجہ سے مشہور تھے۔ عراق کے مشہور والی حجاج بن یوسف ثقفی نے جب دیبل کے واقعہ کے بعد سندھ پر دوبارہ فوج کشی کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنے عزیز محمد بن قاسم کو راجا ڈاھر کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ تب اس فوج کے ساتھ جہاد کی خاطر شیخ شہاب الدین بھی سندھ میں آئے۔ دیبل کی فتح کے بعد جب سیوہن فتح ہوا تو شیخ شہاب الدین بھی سندھ میں مقیم ہوئے اور سیوہن سے ہجرت کرکے ٹھرکے ایک گاؤں گڈیچی میں سکونت اختیار کی۔ فقیر صاحبڈنہ فاروقی اس گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اس کامل درویش سن پیدائش ۱۱۰۱ھ ہجری مطابق ۱۶۹۷ء تھا۔ آپ کو بچپن میں ہی محمد حافظ کے لقب سے پکارتے تھے۔ اُسی گاؤں میں اچھی تعلیم حاصل کرلی۔ آپ کی طبیعت کا رجحان فقر اور تصوف کی طرف مائل ہوا حضرت عبداللہ قادری دہلوی کی مریدی میں داخل ہوئے۔ اپنی زندگی کا طویل عرصہ عبادتِ الٰہی اور نفس کے تزکیہ میں گذارا۔

روایت ہے فقیر صاحبڈنہ نے ایام جوانی میں کلہوڑہ حکمران کی ملازمت اختیار کی تھی، لیکن جلد ہی ملازمت سے بیزار ہوگئے، اور ترکِ ملازمت کرکے گوشہ نشینی اختیار کی۔ آپ کے ایک مرید دراز ونڈیرنے ایک نئی بستی، درازہ کے نام سے آباد کی۔ آپ گڈیچی سے ہجرت کرکے درازہ میں آکر مقیم ہوئے جہاں ۱۱۸۸ء میں وفات پائی۔ آپ کو دو فرزند تولد ہوئے، ایک میاں صلاح الدین اور دوسرا میاں عبدالحق۔ میاں صلاح الدین، حضرت عبدالوہاب سچل سرمستؒ کے والد تھے۔ سچل سرمست کی ولادت ۱۱۳۹ء میں ہوئی تھی اور آپ کی تعلیم وتربیت اپنے دادا میاں صاحبڈنہ فقیر کے زیرِ نگرانی ہوئی۔ کیونکہ آپ کے والد کا عین جوانی میں انتقال ہوا۔ میاں عبدالحق کا فقر میں بڑا مقام ہے، وہ سچل سرمست کے مرشد تھے۔

روایت ہے، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اکثر فقیر صاحبڈنہ سے ملاقات کرنے دراڑہ آتے تھے۔ اس وقت سچل سرمست کی عمر سات سال کی تھی شاہ لطیفؒ نے جب اس نونہال بچہ کو دیکھا تو فرمایا "ہم نے جو دیگچی چڑھائی ہے اُسکا ڈھکنا یہ بچہ اُتارے گا" آگے چل کر یہ پیشنگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

فقیر صاحبڈنہؒ اپنے وقت کے قادر الکلام شاعر تھے، لیکن آپ کے کلام کا بڑا حصہ مرور ایام کے باعث ضایع ہوگیا ہے۔ پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم کی تحقیق کے مطابق آپ کے کلام (کافیوں) کی طرز اور اُن کی بندش کو دیکھکر ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ کافیوں اور صاحبڈنہ کی کافیوں میں کوئی اتنا فرق نظر نہیں آتا۔ شاہ لطیفؒ فقیر صاحبڈنہ کے کلام سے واقف تھے یا نہ لیکن صاحبڈنہ فاروق آپ کے ہمعصر تھے، ہوسکتا ہے کہ فقیر صاحبڈنہ پر پنجاب کے صوفی شعراء کے کلام کا اثر ہو، بہرحال کافی کی صحیح تاریخ مرتب کرنے کے لئے اس حقیقت کو غور سے دیکھنا ہوگا۔ آپ کا جو تھوڑا سا شعر باقی رہ گیا ہے ان سے آپ کے بلند مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

پاڻ پنھنجو پاڻ ۾، جن پيو نا پيھي،
صاحبڈنہ صورت جي، کل تنھن کيھي،
تنھنکان وھامي، ويئي، چپ چئيندي راتڙي.

(جنہوں نے خودی کے اندر داخل ہوکر خود کو دیکھا ہی نہیں، صاحبڈنہ کہتا ہے، انہیں صحیح صورت کو کوئی خبر ہی نہیں، اُن کی رات بیکار خیالات میں ضایع ہوگئی۔)

فکر فرحي جن آئي پسر مراقبو،
دلين جي درياه ۾، ٽٻي ڏني تن
سي سمھي پرين پسن، ننڊ عبادت تني.

(جنہوں نے فکر کی فرحی کو سامنے رکھا، اور ہر وقت مراقبہ میں گذارا، انہوں نے دل کے دریا میں غوطہ لگادیا ہے، وہ سونے میں اپنے دوست کو دیکھتے ہیں، نیند بھی عبادت ہے۔)

ؒ تذکرہ لطفی جلد اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۵۶۵۔

حضرت مخدوم شہید عبدالرحیم گرہوڑی قدس سرہ۔

حضرت مخدوم عبدالرحیم گرہوڑیؒ کا شمار سندھ کے بڑے جید عالموں، مشائخ اور صوفیوں میں ہوتا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم محمد اللہ تھا۔ اور وہ ذات کے مگریہ تھے۔ آپ کی ولادت غالباً ۱۱۵۲؁ ہجری کو خیرپور میرس کے ایک شہر رانیپور میں ہوئی۔ بچپن میں آپکی تعلیم و تربیت اچھی طرح ہوئی۔ گرہوڑی صاحب ظاہری علوم سے آراستہ تھے اور روحانیت کی طرف بھی آپ کا رجحان تھا اس وجہ سے روحانیت میں فیض حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے، کچھ عرصہ شہید عنایت اللہ صوفی کے خلیفہ میاں ابن سمی اوڈارکی صحبت میں جھوک میرانپور کی درگاہ میں رہ کر گذارا۔ ابن سمی نے آپ کو لنواری شریف جانے کا مشورہ دیا۔ اس کے بعد خیرپور سے ہجرت کرکے گرہوڑ (ضلع تھرپارکر) میں سکونت اختیار کی اور وہاں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ آپ دینی بحث اور مناظرہ کے بہت شوقین تھے۔ خواجہ محمد زمانؒ کی زیارت اور لنواری شریف کو جانا بھی ایک اتفاق واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں سلطان الاولیا حضرت خواجہ محمد زمانؒ کے فیض کا چرچا عام تھا، ان کے روحانی فیض کی خوشبوں مخدوم تک بھی پہنچ چکی تھی۔

روایت ہے ایک مرتبہ ظہر کی نماز کے لئے وضو کر رہے تھے کہ دور سے ایک مسافر نے سلام کرکے کوزہ لینے کے لئے کہا تاکہ وہ بھی وضو کرکے نماز میں شامل ہو جائے۔ نماز کے بعد آپ نے مسافر سے سفر کی روئداد معلوم کی۔ مسافر نے جواب میں کہا میں لنواری شریف اپنے مرشد کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ مسافر جب جانے لگا تو مخدوم صاحب نے حضرت خواجہؒ کے لئے ایک پیغام دیا جو اس طرح تھا۔

"اپنے پیر سے یہ دریافت کرنا کہ وہ راستہ جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (معراج شریف) آسمان کی طرف تشریف فرما ہوئے تھے، وہ صرف آپ کی ذات گرامی کے لئے مخصوص تھا یا دوسروں کے لئے بھی کھلا ہوا ہے، صوفی کے عروج اور نزول کو کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ عروج کی انتہا چوارہے نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج مبارک کی کیفیت پر ختم ہو چکی ہے"

مرید یہ پیغام لے کر خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے لیکن آپ کے دیدار میں اتنے محو ہوگئے کہ پیغام دینا بھول گئے جب واپس ہونے لگے تب خواجہ صاحب نے مرید سے پیغام کے لئے کہا مرید کو مخدوم صاحب کا پیغام یاد آیا اور پورا کا پورا عرض کیا۔ جواب میں خواجہ صاحب نے فرمایا۔ ان سے کہنا :

"جب بغداد کے سلطان کے لئے دجلہ ندی پر پل بنوایا گئی تھی، تو سب سے پہلے اس پل سے سلطان گذرے تھے، وہ پل اب تک قائم ہے اس سے خاص و عام گذرتے ہیں لیکن اپنے مرتبہ اور درجے کے مطابق۔"

مرید سے جب یہ جواب سنا تو گرہوڑی صاحب بلا تاخیر لنواری شریف تشریف لے گئے۔ اور خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر مرید ہوگئے۔ اور بڑا رتبہ حاصل کیا، خواجہ صاحب کے بڑے خلیفہ بنے۔ مخدوم صاحب کی سوانح پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے وقت میں دین کی بڑی خدمت کی، بڑے مبلغ تھے۔ آپ نے شرک اور بت پرستی کو ختم کرنے کے لئے جان کی بازی لگادی، کیونکہ آپ کی شہادت بھی اسلام کی تبلیغ کے لئے جہاد کرتے ہوئے ہوئی۔ مخدوم صاحب اپنے مرشد سے فیض حاصل کرکے گرہوڑ پہنچے، اس وقت سے اتنے جلال میں آگئے کہ خود کو درخت کی بلندی سے گراتے تھے اور یہ بیت بار بار ورد زبان رہتا تھا۔

فرزند بي بي فاطمة جا، ناحق حسن کين

ويو وتندي سين، پاسو پٽ نه کوڙيان - الله اکبر، کوفي تکبر۔

"حضرت بی بی فاطمہؓ کا فرزند، کس طرح ناحق قتل ہوا، جب تک اس کا بدلا نہ لینگے تب تک آرام سے نہ سوئونگا، اللہ اکبر - تکبر ہیں :۔

یہ کہکر پانی کا بھرا ہوا کوزہ اپنے سر کے اوپر ڈالتے تھے، پورا پانی سر میں جذب ہو جاتا تھا، جب یہ حقیقت لنواری شریف پہنچی تب ہدایت ملی وہ اس وقت

---

۱ کلام گرہوڑیؒ مرتب علامہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ صفحہ ۱۰۔ ۲ تذکرہ لطفی جلد اول مصنف پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۶۵۶

۳ ایضاً بروایت سنگھار فقیر صفحہ ۱۶۔

جلال میں ہے۔ کوئی بھی ان کے نزدیک نہ جائے، مبادا کوئی نقصان نہ کر بیٹھے۔ آپ کو کہلا کے بیجھا "دنیا کے رسومات کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے" مرشد کا پیغام سن کر جوش کم ہوا۔ اور کہنے لگے میرا ارادہ تھا کہ شیطان کو اس دنیا سے نکال کر باہر کروں لیکن اجازت نہ ملی۔

حضرت مخدوم عبدالرحیم گرہوڑیؒ بڑے صاحب فقہ تھے۔ وقت کے علماء سے بڑے مناظرے کیئے آپنی زندگی میں آپ نے تین بڑے کارنامے کیئے تھے:

۱۔ کارنامہ:۔ آپ نے پیر پٹھورہ کی گرجا (ٹھلیز) کو ختم کرکے خود جاکر اُن کی مزار پر قبہ تعمیر کرایا اور آذان دی تاکہ ہر ایک سمجھے کہ پیر پٹھورہ مسلمان تھے نہ کہ ھندو جیسے کہ ان کے مرید جیٹھمل وار قوم سمجھتی تھی۔ پیر پٹھورہ حضرت غوث بہاؤ الدین ذکریا ملتانی کے مرید اور بڑے صاحب کرامت تھے۔

۲۔ کارنامہ:۔ ٹنڈو جان محمد کے نزدیک ایک درخت کے دو شیطانی تھڑتے، جس میں جادوگر مکین تھے۔ وہ جادو کی طاقت پر مسلمانوں کو بگاڑتے رہتے تھے۔ مخدوم صاحب نے اپنے دو مریدوں کو وہاں یہ ہدایت دیکر بھیجا کہ ان درخت کے تنوں کو کاٹ دو جس میں دو سانپ نکلینگے اگر دونوں کو تم نے مار ڈالا تو وہاں شیطانی کام نہ ہوگا۔ اگر جادوگر جاگ گئے تو وہاں سے بھاگنا ورنہ جان کا خطرہ ہوگا۔ میں زمین کو تنگ کرکے تمہیں اُٹھالونگا۔ آخرکار آپ کے دونوں آدمیوں نے منزل پر پہنچ کر آپ کے حکم مطابق ایک تنے کو کاٹا، جس سے ایک سانپ نکلا چنانچہ اسکو وہیں مار دیا۔ لیکن جب دوسرا تنا کاٹا تو اس میں سے بھی سانپ برآمد ہوا لیکن جادوگر جاگ اُٹھے، مرید وہاں سے نکل کر گرہوڑ پہنچے، آجکل اس جگہ میلہ لگتا ہے جسے امری کا میلہ کہتے ہیں

۳۔ کارنامہ:۔ یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا جو کہ اسلام اور دین کی بقا کے خاطر انجام دیا، جس میں شہادت بھی ہوئی۔ یہ ایک مہادیو کی مڑھی تھی جس کا ذکر سنگتار فقیر نے مرغوب الاحباب اور فردوس العارفین میں کیا ہے۔ یہ مڑھی خیرپور ریاست کے ریتیلے حصہ میں ایک گاؤں "متھونگو" میں تھی، کہتے ہیں یہ مڑھی ۵۰۰ ہجری میں بنی تھی۔ مڑھی کی بنیاد ڈالنے والا گنگا جل لے کر نکلا تھا، جس جگہ کا پانی ناپ اور تول میں گنگا جل کے برابر ہوگا وہاں مڑھی بنائیجائیگی۔ بڑی تلاش کے بعد اسی جگہ کا پانی برابر ملا اور وہاں مڑھی بنوائی گئی۔ اس مڑھی کی وجہ سے اسلام کو بڑا نقصان ہو رہا تھا، کیونکہ مڑھی کا مہنت جادو کے زور سے بڑا طاقتور بن گیا تھا۔ بارھویں صدی ہجری کے آخر میں مڑھی کا مہنت سوامی دت گر تھا۔ جو کہ بڑی طاقت والا مہاراج تھا، جس کے ہزاروں ھندو اور مسلمان معتقد تھے مخدوم گرہوڑیؒ کو اس بات کا بہت رنج تھا، اور یہی تمنا تھی کہ کسی طرح بھی اس بدعت کو ختم کردیں۔ گرہوڑی صاحب نے ایک دن عام منادی کرادی کوئی غازی ہے جو جہاد فی سبیل اللہ میں شہید ہونا پسند کرے، اس اعلان پر باھفر مجاھد آپ کا ساتھ دینے کے لئے حاضر ہوئے۔ گرہوڑی صاحب کی دعا سے ٹالپوروں کو حکومت ملی تھی، لیکن افسوس میر بجار خان نے مدد نہ کی بلکہ جواب میں کہلا کے بھیجا، آپ اور مہنت دونوں فقیر ہیں ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے، اور مہنت کو کہلا کے بھیجا فقیروں کی لڑائی سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس طرح مجاھدوں کی مختصر جماعت شہر کے قریب پہنچی تو دیکھا کہ ایک کشکول گھوم رہا ہے جو شہر میں گشت کرکے گوشت گھی، چاول، گیہوں وغیرہ جمع کرکے بڑی دیگ میں ڈالتا رہتا تھا۔ دیگ میں خصوصیت یہ تھی کہ لاتعداد افراد کے کھانے کے باوجود اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی گرہوڑی صاحب نے اپنے پاؤں سے جوتی نکال کر اُسی حکم دیا کہ کشکول کو آگے جانے نہ دے چنانچہ کشکول جدھر بھی جاتا تھا، جوتی اُس تعاقب کرتی تھی، اور اُسے مار مار کر آگے بڑھنے سے روکتی تھی، کشکول واپس جاکر مہاراج کے قدموں میں گرا، جب سوامی کو اس بات کا پتہ ہوا تو بات سمجھ گئے، لیکن مناسب نہ سمجھا کہ ایک درویش سے لڑیں، کیونکہ اُن کی دعا سے میروں کو حکومت ملی تھی، ھندؤں نے بڑی منت کی اور بے شمار دولت ہیرے جواہر اور حسین عورتیں پیش کی لیکن مجاھد نے جواب میں اسلام قبول کرلو، لیکن سوامی نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا، تو آپ نے چند شرائط قبول کرنے کو کہا، اور ان کی عدم قبولیت کی صورت میں یہ تنبیہ کردی اگر کوئی شرط تمہیں قبول نہیں تو فیصلہ تلوار کریگی۔ شرائط مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ ھندؤں کا سردار ہمارے پاس آجائے ہم اُسے چالیس راتیں ایک جگہ بند کرینگے جس میں کوئی کھڑکی نہ ہوگی، دروازہ مقفل ہوگا یا میں مسلمانوں کا نمائندہ بن کر اس طرح تمہارے پاس رہونگا، جس فریق کا آدمی مرجائے وہ دوسرے کا مطیع ہوجائے گا۔

۲۔ دونوں کا لشکر ایک مقرر جگہ پر آمنے سامنے رہیں میں اور ھندؤں کے لشکر کا سپہ سالار کُشتی لڑیں جو ہارے وہ طابع ہوجائیں۔

۳۔ سوامی اور مجھے ایک ہی کانٹے میں تولا دیں، حالانکہ میں ان سے بہت کمزور ہوں اگر اس سے وزن میں زیادہ ہوجاؤں تو وہ اسلام قبول کرلیں یا میں ھندو بنجاؤنگا

۴۔ ھندو اپنے بتوں کے سامنے راگ رنگ کی رسمیں ادا کریں جب جوش میں آجائیں تو میں تن تنہا وہاں پہنچ جاؤں گا، مجھ پر تصرف چلائیں یا میں اپنے ذکر کے حلقہ میں بیٹھ جاؤں تمہارا سردار اکیلا اُنیس قدم ہم سے دور کھڑے رہیں، وہ از خود کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو کر اسلام میں شامل ہو جائینگے۔

۵۔ آخری شرط جہاد ہے جسکے لئے یہاں آئے ہوئے ہیں:۔

اس پیغام کے مخدوم صاحب نے اپنے آپ کو کندھوں تک ریت میں دفن کراکے ساتھیوں سے پوچھا۔ اگر ھندو یہ چار شرائط قبول نہ کریں تو پھر کیا مشورہ ہے سب نے کہا "فلاح ما مم آنست کان تراست صلاح" گرھوڑی صاحب نے کہا تو ہم شہید ہو کر دفن ہو جائیں۔ ھندؤں نے ایک بھی شرط قبول نہ کی تب گرھوڑی صاحب نے ان سے کہا اپنا کشکول منگوا کے ان سے پوچھو، جب اُس سے پوچھا گیا تو وہ خاموش رہا۔ گرھوڑی صاحب نے کہا میرے اس پیالے (جمنی) سے پوچھو، تو پیالے سے آواز آئی "دین دین" سامی خدا سے کہنے لگا پیالہ "دمن دمن" کی آواز آرہی ہے۔ تب ایک دم حق حق کی آواز آنے لگی یہ سن کر دونوں سوامی بھائی حیران رہ گئے۔ آپس میں مشورہ کرنے کے لئے اجازت چاہی، تو اتنے میں میر بہار خان کا آنے خط ملا جس سے وہ شیر بن گئے اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ دشمن کے لشکر کی تعداد زیادہ تھی، مجاہدین صرف بہتر تھے۔ سوامی دت گر گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھا مخدوم صاحب نے اپنے ساتھی سے کہا اس پر بندوق چلاؤ جو صرف ایک کو تھی۔ بندوق کی گولی لگنے سے سوامی گھوڑے سے گر گیا۔ اور اسکا پاؤں رکاب میں پھنس گیا، ھندؤں کے لشکر نے جب اسکو ایسی حالت میں دیکھا تو اُسے بچانے کے لئے دوڑے تو مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ دشمن کے لشکر نے مخدوم صاحب پر حملہ کیا جس سے آپ سخت زخمی ہوئے۔ بقول علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کے آپ جنگ میں شہید ہوئے۔ لیکن ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تحقیق کے مطابق، مخدوم صاحب جنگ میں شہید نہ ہوئے تھے۔ بلکہ فتح کے بعد اس مڑھی کی جگہ پر مسجد بنوا رہے تھے، تو دشمن کے دو آدمیوں نے زیارت کے بہانے آپ کو زخمی کر دیا تھا۔ اتنے زخموں کے باوجود مخدوم صاحب کے جسم مبارک سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ زمین پر گرا سوامی کی فوج پر خدائی مصیبت نازل ہوئی، اور پورا لشکر تباہ ہو گیا۔ مخدوم صاحب کے بہت سے اصحاب شہید ہو گئے۔ مخدوم صاحب نے اپنے رفقاء کو حکم دیا اس بت خانہ کو توڑ کر مسمار کر کے اس جگہ مسجد تعمیر کریں چنانچہ جب یہ سب انتظام ہو گیا۔ تب تین دن کے بعد رحلت فرمائی۔ اس شہر کا نام دین پور رکھا۔

آپ کی میت مبارک کو گرھوڑ میں لاکر دفن کیا مرغوب الاحباب کے مولف کی ایک قطعہ سے آپ کی تاریخ وفات نکالی گئی ہے جس کے آخری شعر سے نکلتی ہے۔

زدست ساقی دھر آندریں دیر — میٔ تلخ شہادت دکشیدہ

چوں تاریخ وصالش جستم از دل — جواب آمد بحق خلوت گزیدہ۔

۱۱۹۲ ھجری۔

یہ واقعہ سنہ ۱۱۹۲ ھجری مطابق ۱۷۷۸ء میں ہوا، اُس وقت آپ کی عمر چالیس برس تھی۔ حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی ملاقات گرھوڑی صاحب سے ہوئی تھی۔ علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ اپنی تالیف "کلام گرھوڑی" میں دو روایتیں دی ہیں

پیالہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ وہ پیالہ شاہ بھٹائیؒ کو معرفت ملا تھا، ایک مرتبہ شاہ لطیفؒ نے اپنے فقیروں سے کہا امانت آگئی ہے جس کو نکال کر مالک کے پاس بھیجنا ہے۔ شاہ بھٹائی فقیروں کو ساتھ لے کر ایک کوئیں پر کھڑے ہوئے تو اس کا پانی اوپر آگیا، جس کی سطح پر پیالہ تیر رہا تھا۔ جسکو نکال کر بڑے احترام سے حضرت مخدوم گرھوڑی کے پاس بھیج دیا، اس کے ساتھ ایک عصا اور تلوار بھی تحفے کی طور پر بھیجے۔

دوسری روایت ہے:۔

ایک مرتبہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ گرھوڑی صاحب گاؤں کے نزدیک ایک مسجد میں علماء اور دیگر مریدوں اور افراد کے ساتھ فروکش تھے، اس مجلس میں مخدوم گرھوڑی صاحب بھی موجود تھے، اتنے میں عشاء کی نماز کا وقت ہوا، لوگوں کے اصرار پر نماز کی امامت شاہ صاحب نے فرمائی۔ اقتدا میں

کلام گرھوڑی، مرتب ڈاکٹر مرحوم عمر بن محمد داؤد پوتہ صفحہ ۶

ایضاً 〃 〃 〃 〃 ۶۱

سبھی علماء تھے۔ پہلی رکعت میں قرأت کے بعد رکوع کے وقت اپنا رخ جنوب کی طرف کردیا۔ اس طرح ہر رکعت میں اپنا رخ نئی سمت میں پھیرتے رہے، اور آخری رکعت قبلے کی طرف کرکے نماز پوری کردی۔ مقتدی تو پہلی رکعت میں جماعت کو چھوڑ کر علیحدہ ہوگئے، صرف مخدوم گرھوڑی نماز میں شامل رہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد علماء نے شاہ صاحب کی اس عجیب روش پر اعتراض کیا اور سبب پوچھا اس کے ساتھ گرھوڑی صاحب سے بھی پوچھا کہ تم کیوں نماز میں شامل ہوئے۔ گرھوڑی صاحب نے جواب دیا، آپ اس رمز جان نہ سکے۔ شاہ صاحب کیا کریں، کیوں کہ تمام رکعتوں میں ملائک کعبۃ اللہ شریف کو مختلف سمتوں میں لاکر رکھتے تھے، چنانچہ شاہ صاحب بھی مجبوراً اپنا رخ اس کے مطابق تبدیل کرتے رہے، اس لئے نماز ہم دونوں کی قبول ہوئی۔ ...... واللہ اعلم بالصواب

شاہ لطیف کی وفات ۱۱۶۵ھ ہجری میں ہوئی تھی، اور مخدوم صاحب کی ولادت غالباً ۱۱۵۲ھ ہجری میں ہوئی تھی۔ مخدوم صاحب کی اس وقت عمر تیرہ یا چودھا سال ہوگی اس عمر میں پیالہ اور نماز کے واقعے گذرے۔ ان روایتوں کو دیکھ کر کہا جائے گا، اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو ہم ان دونوں بزرگوں کے روحانی عظمت کا اندازہ آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ گرھوڑی صاحب حقیقت میں بچپن سے ہی روحانیت کی طرف مائل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم گرھوڑی کو شاہ لطیف کی شخصیت اور کلام سے بڑی عقیدت تھی۔ اور شاہ بھٹائی کی شان میں ایک بیت آپ کے بیاض میں نظر آتا ہے، جس سے آپ کی عقیدت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

آھي عبداللطيف تي رحمت رحمان،

جوڙي جنھن قرآن، سنڌيءَ ۾ صحيح ڪيو.

"شاہ عبداللطیف پر رب رحیم کی رحمت ہے، جنہوں نے قرآن پاک کو سندھی زبان میں صحیح نظم کیا۔"

مخدوم صاحب ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کے کلام تصوف کا ایک بحر بے پایاں موجزن ہے کلام کے علاوہ آپ کی بہت سی تصنیفات موجود ہیں، جن میں ۱۔ فتح الفضل جو مرشد کے کلام کی شرح مجموعہ ہے، یہ کلام سندھی زبان میں تھا لیکن گرھوڑی صاحب نے عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ ۲۔ شرح ابیات سندھی۔ ۳۔ رسالہ گل غا (فارسی) ۴۔ مکتوبات (فارسی) جو کہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا اختصار ہے۔ ۵۔ مجموعہ سندھیات۔ مخدوم صاحب کا سندھی کلام اور کلمات جمع ہیں۔ ان میں "رسالہ حقیقت محمدی" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آپ کے کلام میں برجستگی اور روانی کمال درجے کی ہے۔ آپ عاشق رسول ﷺ تھے، یہ محبت جنون کی حد تک تھی۔ حضور کی شان مبارک میں کہتے ہیں

وصف جنھن وڏھ جي ڪٿو مون نہ آھ،

مدح ۾ محبوب جي ھاتف حيران آھ

حقيقت حبيب جي عجب ڄڻ آھ،

جامع ليل نھار ڪي جئن شفق جي ساجاھ.

ترجمہ:- "محبوب کی توصیف کی کوئی حد نہیں، آپ کی تعریف میں بڑے بڑے فصحاء حیران ہیں۔ حبیب کی حقیقت حیرت میں ڈالتی ہے آپ لیل و نہار کے وقت شفق کی طرح نمایاں ہیں۔"

آپ کے کلام میں سوز و گداز موجود ہے۔ وحدت الوجود اور خودی کا فلسفہ صوفیائے کرام اور قرآن پاک سے ماخوذ کئے ہیں یہ آیت استحکام خودی کا نادر مثال ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

اے ایمان والے تم پر خودی کی محافظت فرض ہے، اگر تم ھدایت پر ہو، تو وہ شخص جو گمراہ ہے تمہیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم سب کو اللہ ہی کے پاس جانا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال پر مطلع کردے گا تاکہ ان کے مطابق جزا و سزا مل سکے۔ (سورۃ مائدہ آیت ۱۰۵)

وحدت الوجود کا مقصد اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

کلام گرھوڑی مرتب ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ صفحہ ۶۱۔

صورت ۽ معنيٰ ۾ ڪونهي ويچ وڇاءُ.

هو نہ سڃاڻي، من ۾ ئي هي مور نہ موجود آهه

ڪٿي جوهر ڪونهي، ڪٿي عرض بہ آهه

حقيقت هيڪاءُ، پر نالن مٿو ناهہ ڪو.

صورت اور اس کی معنی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ خدا اس (انسان) کے سوا پہچانا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ موجود کہاں، وہ کسی جگہ جوہر ہے، تو کسی جگہ عرض، حقیقت ایک ہے، لیکن اس کے اسماء کی کوئی حد نہیں ہے۔

سید میر علی شیر قانع :-

سید میر علی شیر قانع سندہ کے زندہ جاوید، بزرگ، مورخ، محقق، شاعر اور سندہ کے نام کو روشن و زندہ کرنے والے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب ٹھٹہ کے قاضی سید شکر اللہ شیرازی سے ملتا ہے، جو شاہ بیگ ارغون کے زمانہ میں شیراز سے بکھر سندہ میں ہجرت کرکے آئے تھے۔ مرزا شاہ حسین ارغون کے دور حکومت میں بکھر کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔ آپ کے خاندان سے متقی اور اہل دل درویش گذرے ہیں۔ میر علی شیر کے والد کا اسم گرامی سید عزت اللہ تھا، جو سنہ ۱۱۷۰ ہجری میں وفات پا گئے تھے۔ میر علی شیر قانع کی ولادت سنہ ۱۱۴۰ ہجری میں ہوئی جو اس آیت سے نکلتی ہے

"خلق انسانا من السلالہ"

آپ کی ابتدائی تعلیم بہتر طریقے سے بہترین اساتذہ کے زیر نگرانی ہوئی، جن میں میاں نعمت اللہ میاں محمد صادق اور مرزا محمد جعفر، قابل ذکر ہیں۔ جو دینی اور دنیوی علوم کے بڑے کامل اور مقتدر عالم تھے۔ مقالات الشعرا میں لکھتے ہیں [1]:-

"فقیر بخدمت ہر دو صاحبان نسبت تلمیذی دارد"

میاں نعمت اللہ سے آپ نے میزان صرف سے لے کر شرح ملا تک تعلیم حاصل کی، ظاہری علوم سے بہرہ ور ہو کر باطنی علوم کے حصول کے لئے علامہ مخدوم محمد معین ٹھٹھوی کی طرف رجوع ہوئے اور سندہ پر اپنی قابلیت کا سکہ جمایا۔ آپ کو بارھویں برس کی عمر میں شعر و شاعری سے رغبت ہوئی۔ اور اشعار کہنے لگے اوائل جوانی میں آپ بارہ ہزار اشعار موزون کئے تھے، یہ پورا دیوان آپ نے دریا میں ڈال دیا، لیکن کچھ عرصے کے بعد پھر سے شعر و سخن کا شوق ہوا، یہ شوق میر حیدر الدین ابو تراب کامل کی صحبت میں ہوا شعر میں "مظہری" تخلص اختیار کیا، اس وقت آپ کی عمر غالباً ۱۵ سال تھی، شعر کے ساتھ نثر میں بھی لکھتے رہے۔

آپ کی شہرت اس وقت کے روشن دماغ بادشاہ میاں غلام شاہ کلہوڑہ تک پہنچی، جس نے میر صاحب کو اپنے خاندان کی تاریخ لکھنے کے لئے ملازم مقرر کیا، آپ نے شاہ نامہ فردوسی کی طرز پر لکھنا شروع کیا، لیکن تاریخ مکمل ہو نہ سکی۔ اس لئے خدا آباد سے واپس ٹھٹہ چلے آئے اور مستقل ملازمت سے فراغت حاصل کر لی۔ لیکن میر صاحب نے حکمران خاندان سے خوشگوار تعلقات قائم رکھے جس کی وجہ سے وقتاً فوقتاً وظیفے [2] اور دیگر سہولتیں ملتی رہتی تھی۔ سیاسی طور پر اس وقت سندہ عجیب افراتفری کے دور سے گذر رہی تھی۔ نادر شاہ کی آمد اور لوٹ مار نے سندہ کی آزادی ختم کردی تھی، میاں غلام شاہ کے دور حکومت میں کافی اطمینان تھا، لیکن بعد میں قتل و غارت کی بازار گرم تھی ظلم کا دور تھا۔ بے پناہ لوٹ مار کی وجہ سے اتنی دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ عام زندگی معطل ہو گئی تھی، اسی ایام ابتلا و مصائب میں میر علی شیر قانع نے اوج و کمال حاصل کیا، ان تمام تکالیف اور مصیبتوں اور ملکی تباہ کاریوں کے پیش نظر انہوں نے اپنی زندگی تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں گذاری علم ادب سے وابستگی کی وجہ سے دوسرے مشاغل کی طرف رجوع نہ ہوئے۔ تھوڑے عرصہ کے لئے سیوہن اور جام نگر کی طرف سفر پر گئے تھے۔ جہاں بہت سے بزرگوں سے ملاقات کی تھی، جن میں خاص طور پر شیخ اعظیم ٹھٹوی۔

---

[1] مقالات الشعرا مرتب میر علی شیر قانع صفحہ ۲۹۰

[2] رسالہ مہران سنہ ۱۹۵۶ جلد ۲۔ مقالہ نگار پیر حسام الدین شاہ راشدی صفحہ ۱۳۸۔

میر صاحب کو اس وقت کے بڑے بڑے علماء کی صحبتیں نصیب ہوئی جن میں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، مخدوم محمد معین ٹھٹوی، مخدوم ضیاء الدین، میاں نعمت اللہ، میاں محمد صادق آخوند ابو الحسن، بولچند آزاد، شیبوک رام عطارد ٹھٹوی اور محمد پناہ رجا قابل ذکر ہیں ان میں اکثر شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے دوست، مرید اور معتقد تھے۔ شاہ بھٹائی سے ملاقات اپنے استاد مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے یہاں ہوئی ہوگی کیوں کہ شاہ صاحب اکثر مخدوم صاحب کی ملاقات کے لئے ٹھٹہ آیا کرتے تھے، آپ کے بزرگانہ اور مشفقانہ عظمت کو دیکھکر قائل ہوئے ہونگے، اس لئے آپ کو "تارک" کے لقب سے ذکر کیا ہے۔ میر صاحب نے اُن علماء اور شعراء کی صحبتوں اور ادبی محفلوں سے پورا فائدہ اُٹھایا اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کیا۔ میر صاحب کو تاریخ نویسی میں اعلیٰ دسترس حاصل تھی۔ شاعرانہ صنائع کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ موجد بھی تھے۔ میر صاحب کا ایک مشہور مصرعہ ہے، جس کے حروف کو اگر مختلف طور اس کے دائرے کے اندر لکھا جائے گا تو یہ مصرعہ دس مختلف عروض بحوں پر موزوں ہو جائے گا، وہ اس طرح ہے "بردر تو دولت نو آمدہ" اس مصرعہ کا ابجد کے حساب سے عدد ۱۱۷۰ بنتا ہے۔ میر صاحب نے اس مصرعہ کے لئے ایک رباعی موزوں کی تھی جو کہ اس کی شرح ہے۔ [1]

قانع کہ بصنعتش بودہ دست

این دائرہ عجیب بر ہست،

یک مصرعہ بحر دہ دور درج

تاریخ چنین کم از کسی ہست۔

مقالات الشعراء میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:۔ [2]

"فقیر در صفات غریبہ وایجاد آں بفیض الہام دستی تمام حاصل ست اگر بشرحِ آن پرواز و نسخہ علاحدہ باید"

میر علی شیر قانع منصباً محب آل بیت تھے، لیکن صحاب کرام کی بے حد عزت کرتے تھے، اہل تشیع کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے ایران کے شیعہ بزرگوں کے حالات زندگی اپنی تصنیف "مجلس المومنین" میں لکھا ہے۔ اس کے علاوہ میر صاحب کی دوسری تصنیفات "اعلان غم"، "زبدۃ العاقب" اور مناقب کی کثیر تعداد ملتی ہیں۔ میر صاحب کے آخری ایام بڑی تکلیف سے گذرے سنہ ۱۲۰۲ ہجری میں ایک مہلک بیماری سے دوچار ہوئے جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ آخر سنہ ۱۲۰۳ ہجری میں چونسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ بقول پیر حسام الدین شاہ راشدی۔ [3]

"افسوس، اس عظیم المرتبت عالم، ادیب، شاعر، مورخ کی ساعت، تاریخ وفات کسی نے بھی محفوظ نہ کی اور کسی نے کوئی کتبہ مزار پر نصب کیا"

آخوند غلام محمد ٹھٹوی نے البتہ "علیہ الرضوان" سے سال وصال کی تاریخ برآمد کی ہے۔ میر صاحب کے فرزند میر غلام علی مائل نے "البشرہ بالجنۃ النعیم ابدا" تجویز کیا تھا میر علی شیر قانع کی تصانیف کثیر التعداد ہیں، میر صاحب کا سندھ والوں پر بڑا احسان ہے تاریخ "تحفۃ الکرام"، حالانکہ یہ کتاب مقالات الشعراء کے بعد سنہ ۱۱۸۱ھ میں مکمل کی تھی، اس ضخیم کتاب سے آپ کی تاریخ دانی سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، تاریخ میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے اگر یہ کتاب نہ ہوتی تو سندھ کی تاریخ نامکمل رہتی۔ یہ تاریخ تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں تاریخ انبیاء علیہ وسلام، حکما، خلفائے راشدین، اسلام کے حالات موجود ہیں، دوسری جلد میں "ہفت اقلیم" کہتے ہیں، جس میں ابتدائی آفرینش سے اسلام تک حالات درج ہیں اور اسلامی ممالک کی مختصر تاریخ بھی شامل ہے۔ جلد سوم میں سندھ کا تفصیل سے ذکر موجود ہے جو سندھ کے لئے بڑی اہمیت والا حصہ ہے، سندھ کے تمام مشاہیر اور شہروں و بزرگوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ تاریخ نہ ہوتی تعجب حالات گوشہ گمنامی میں ہوتے، اس عظیم کتاب کے اختتام پر ایک قطعہ موزوں کی تھی، جو اس طرح ہے:۔

---

1. مقالات شعراء مصنف میر علی شیر قانع پیر حسام الدین شاہ راشدی
2. ایضاً " " "
3. ایضاً " " "

شکر خدا کہ تذکرۂ تحفۃ الکرام — آندر سہ جلد یافتہ تزئین اختتام
ہر جلد اوست روضۂ اخبار دلکشا — نظارہ کیش مفت شود دیدہ شا
قانع اگرچہ نیست سزاوار ذکر خیر — لیکن بفیض اہل خبر یافت این مرام
باشد کنند اہل دلش یاد بعد مرگ — یعنی کہ یادگار نکو ماند مستدام
سال تمامیت چو نمود از خود سوال — اینک چہ منتخب ز دل آمد مرا پیام
۱۱۸۱ھ

شکر خدا کہ یافتہ تزئین انتخاب
این تحفۃ الکرام بازین انتخاب
سال تمامیت چو نمودم ز دل سوال
ہاتف زدہ ندا کہ نوائین انتخاب۔
۱۱۸۱ھ

اس جلد کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے وسیع المطالعہ تھے۔ اس جلد میں سندھ کی مفصل تاریخ دی ہے۔ بقول ڈاکٹر ایچ ٹی سورلے "میر علی شیر قانع نے سندھ کے بادشاہوں اور امیروں و بزرگوں کے حالات کو تاریکی سے بچایا ہے" گویا یہ جلد کتاب کی جان ہے۔ تاریخ تحفۃ الکرام کو سنہ ۱۳۰۴ ہجری مطابق سنہ ۱۸۸۳ء میں مطبع ناصری بمبئی نے طبع کیا دوسری کتاب جو زیادہ مشہور ہوئی وہ ہے "مقالات الشعرا" سنہ ۱۱۷۴ ہجری۔ میر علی شیر قانع نے اس نیم تاریخی کتاب میں سندھ کے فارسی گو شعراء کے حالات اور شعروں کو جمع کیا ہے۔ یہ سرخوش اور خان آرزو کی تصنیفات سے کسی طرح کم نہیں۔ اصل عبارت سے مصنف کی انشاپردازی ظاہر ہوتی ہے۔ میر قانع نے مختلف شعراء کے کلام کا موازنہ نقادانہ رنگ میں کیا ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۱۶۹ ہجری لکھنا شروع کی اور پانچ سال کی محنت کے بعد سنہ ۱۱۷۴ھ میں مکمل کیا۔ ان دو عظیم شاہکاروں کی وجہ سے قانع کا نام زندہ جاوید ہوگیا مقالات الشعراء کو پیر حسام الدین شاہ راشدی نے اپنے عالمانہ مقدمہ اور حواشی کے ساتھ سنہ ۱۹۵۷ء کو سندھی ادبی بورڈ کے معرفت شایع کرایا۔ اس انمول کتاب کی اشاعت سے سندھ کے قدیم شعرائے کرام کا تذکرہ پھر صدیوں تک زندہ ہوگیا۔ ان کتابوں کے علاوہ میر علی شیر قانع نے بہت سی کتابیں لکھی جن میں خاص یہ ہے۔

۱. مختیارنامہ ۲. دیوان قانع ۳. مکلی نامہ ۴. مثنوی قضاء قدر ۵. زین الافکار مثنوی ۶. کان جواہر ۷. کامیں و کامروپ مثنوی ۸. تاریخ کلہوڑہ خاندان۔

میر علی شیر قانع اپنے دور کے قادرالکلام شاعر تھے۔ مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرمایا ہے۔

"ایران میں نظامی گنجوی نے خمسہ لکھ کر آنے والے شعراء کو طبع آزمائی کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ خراسان میں مولانا عبدالرحمان جامی اور ہاتفی نے۔ ہندستان میں خسرو اور فیضی نے اپنے اپنے رنگ میں لکھا۔ اسطرح سندھ میں میر علی شیر قانع اور میر محمد معصوم بکھری "نامی" نے ہی خمسہ لکھ کر سندھ کا نام روشن کیا ہے۔ قانع کو اس قسم کی شاعری کا سندھ میں موجد مانا جاتا ہے"

قدر و قیمت

میر علی شیر قانع کو علم عروض پر بڑی دسترس تھی۔ افسوس کہ آج ان کا دیوان موجود نہیں ہے۔ اگر وہ موجود ہوتا تو ایک نقاد اس کی صحیح قدر و قیمت کرسکتا آپ کے کلام کا مختصر انتخاب "محک خسروی" کتاب میں موجود ہے۔ چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

حولہ

الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا — بعین جرعہ میتوان شد حل مشکلہا
جرس فریاد میدارد کہ بربندید محملہا — قدم زن از سرائے تن برون زین کاروان گنبد
کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا۔ — بکوئے عشق آسائش نبیند زین سبب دیرو

---

۱ شاہ عبداللطیف اینڈ ہز ٹائمز ڈاکٹر ایچ ٹی سورلے۔ ۲ میر علی شیر قانع مقالہ نگار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی رسالہ ماہ نو کراچی جون ۱۹۴۹ء۔

بشعر عشق چرا در بدر کن سارا   ہمیں بس است کہ گشتم بچشم تر محتاج .

ہمیشہ خونِ جگر خوردنش بود عادت   کسے کہ غنچہ صفت شد بحشت زر محتاج

نگاہ عشق بہر خام پختہ می سازد   بآفتاب بہ بس قانعاً شجر محتاج

محمد محسن ٹھٹوی :-

محمد محسن ٹھٹوی بن نور محمد بن محمد ابراہیم بن محمد یعقوب ٹھٹوی سندھ کے باکمال فارسی شعراء میں سے تھے ، ان کے والد ریشم کا کاروبار کرتے تھے ، محمد محسن بچپن سے شعر و شاعری کی طرف رجوع ہوسے تھے ، میر لطف علی خان والی ٹھٹہ کی صحبت میں آپ کے اقتاد طبع اعلیٰ رنگ میں ظاہر ہوئی اور فارسی زبان کے صف اول کے شاعر مانے گئے . ان کی شہرت سندھ کے حدود سے نکل کر دہلی اور دکن تک جا پہنچی ، شروع میں میر مقبل اصفہانی سے جو کچھ وقت ٹھٹہ میں مقیم تھے شعر کی اصلاح لیتے تھے ، پوری زندگی فارغ البالی اور شاعرانہ وضع میں گذاری ، اہل بیت کے متوالے تھے ، منقبت اور مداح میں آپ کے بے نظیر قصائد اور مثنوی موجود ہے . وقت کے حاکم میاں نور محمد کلہوڑہ نے ان کی علمی استعداد کی قدر کرتے ہوئے وظیفہ مقرر کیا . تصنیفات میں عقد دوازدہ - گوہر . طراز دانش ، دیوان ، قصائد ، اعلام ، ماتم ، بیاض ، محک کمال ، مشہور ہیں ، میر علی شیر قانع نے ان کے شعر کا انتخاب "مقالات الشعراء" میں دیا ہے ، جن سے چند مثال نقل کیئے جاتے ہیں .

محسن از عشق تو در پیری نخواہد توبہ کرد   میکشی ہرچند در مہتاب باشد بہتر ست .

من عقد دوازدہ گوہر سے :-

علی مقصود از ترتیل آیت   امیر المومنین شاہ ولایت ،

اگر از علم بین خود جدا ماند   یقین کن علم غیر از لم نماند .

وگر لام خود از اسلام گیرد   اسام از ما بقی صورت پذیرد .

. . .

بی نصیبان را ز دنیا بہرہ ، حسرت بردن ست   مار را جز خاک خوردن ، قسمت از گنجینہ نیست

اہل معنی را ترقی ، در تنزل حاصل ست   سطر اول بعد سطر آخرین جز زینہ نیست

محمد محسن ٹھٹوی عین عالم شباب میں ۲۰ شوال سنہ ۱۱۶۳ ہجری مطابق ۱۷۵۰ء میں انتقال کر گئے ، آپ کے فرزند غلام علی مداح نے تاریخ وفات اس آیت مبارک سے نکالی تھی .

ان رحمتُ اللہ قریب من المحسنین

سنہ ۱۱۶۳ ہجری

میان سرفراز خان کلہوڑہ :-

میاں سرفراز خان کلہوڑہ اپنے وقت کے بڑے علم دوست ، علم و فضل میں بلند مرتبہ رکھتے تھے ، فارسی زبان پر آپ کو بڑا عبور تھا ، حکومت کی جوابداری کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے دلدادہ تھے خود تو بڑے عالم تھے ، لیکن آپ کا دربار بھی علماء و شعراء سے مزین تھا ، جنکو بڑے انعام و اکرام سے نوازتے رہتے تھے سندھ کے مشہور شاعر و مورخ میر علی شیر قانع اور شیخ کرام عطارد ، آپ کے درباری ہمیشہ رہتے تھے ، بچپن میں آپ کی تعلیم شاہانہ طور پر ہوئی ، میر عظیم ٹھٹوی سے بڑا دوستی کا رشتہ تھا ، مولوی مداح کے شاگرد رشید تھے ، حضرت شاہ فقیر اللہ علوی اور مخدوم محمد معین اور مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی سے قریبی تعلقات رکھتے تھے . مکتوبات شاہ فقیر اللہ علوی میں بہت

اخبار الوحید اسپیشل ایڈیشن (سندھی) سندھ آزاد نمبر سنہ ۱۹۳۶ء

لہ مقالات الشعراء ، مرتب پیر حسام الدین شاہ راشدی صفحہ ۲۰۷ .

سے خطوط آپ سے منسوب ہیں۔ لیکن اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے تخت وتاج سے ہاتھ دھونا پڑا اسیر ہونے کے بعد شمشیر کردیئے گئے قید وبند کے زمانے میں سندھی زبان میں بھی شعر کہا تھا۔ جس میں خاص طور پر مداح (مناجات) جو کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں ہے جس میں اپنی دکھی زندگی کا ذکر کیا ہے۔ آپ سندھی زبان میں مداح کی صنف کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کے فارسی شعر میں بڑی لطافت اور سوز موجود ہے ایک غزل نقل کی جاتی ہے۔

توای مرغ چمن شاد می کن

بمرغانِ قفس هم یاد می کن

تو چون با گل نشینی هم نگاهی

بدام افتادۂ صیاد می کن.

تو چون بر شاخ گل باشی نوا سنج

بیادِ ما دمے فریاد می کن.

تو چون پرواز گیری در گلستان

زبانِ بستهٔ من یاد می کن.

تغافل چند اے سرو سرفراز

ز بندم بالطف آزاد می کن.

سندھی کلام مداح سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

بسم اللہ تہ اللہ محمد شاہ کر پناہ پربین تون،

منھنجو درگاہ عیمر آہ متي راہ رسین موں،

پلا جام من غلام سندو سوال سٹج تون.

بسم اللہ۔ یا محمد رسول اللہ صلعم خدا تعالیٰ کے واسطے مجھے اپنی پناہ میں لے لیں۔ میں نے آپ کی حضور میں اپنی فریاد پیش کی ہے، مشکل راہ میں میری مدد کر۔

آقا اس غلام کے سوال کو سن لے۔

شریعت ۽ طریقت ڪرين نصیب آسان کي.

حقیقت ۽ معرفت سندي نگاہ ڪرين تون

پلا جام من غلام سندو سوال سٹین تون

شریعت اور طریقت ہمیں نصیب کر، حقیقت اور معرفت کے پہچاننے کی نگاہ نصیب ہو، میرے آقا اس غلام کے سوال کو سن لے۔

یہ مداح بہت طویل ہے اور بحر طویل میں لکھی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کو مداح کی صنف کا سندھی شاعری میں موجد سمجھا جاتا ہے۔ اس مداح کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے، سرفراز خان کلہوڑے نے سندھی زبان میں اور بھی شعر کہا ہوگا لیکن افسوس اسکا ملنا بہت مشکل ہے ہوسکتا ہے مرور ایام نے اس کو برباد کردیا ہو۔

مداح (مناجات) سندھی شاعری میں بہت مقبول صنف ہے، یہ عوامی شاعری ہے جو مقبول عام ہوئی۔ میاں سرفراز خان کلہوڑہ نے اس صنف کو ایجاد کیا، بعد میں سندھ کے اکثر شعرا نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے، مداح میں اکثر شعرا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں تعریف کی ہے شعراء نے بزرگوں کی شان میں بھی مداح لکھی ہیں۔ سندھ کی اوائلی شاعری میں مداح کو قصیدہ کی منزل حاصل تھی۔

حضرت شہید بقا شاہ راشدی قدس سرہ۔

سندھ میں راشدیہ خاندان کے بانی حضرت بقا شاہ راشدی، سید علی مکی کی اولاد میں سے تھے، جو بزرگ عباسیہ دورِ خلافت میں سندھ میں ہجرت فرمائی تھی۔ اس وقت سندھ کے اندر بے چینی بڑھی ہوئی تھی، خاص طور پر دلوراء ایک سفاک اور ظالم راجا موجود تھا۔ جو اپنے ظلم و تشدد کی وجہ سے مشہور تھے، جن کی حرکتوں کو دیکھکر آپ نے وطن واپس جانے کا ارادہ ترک کرکے راجا دلوراء کا مقابلہ کیا اور ہمیشہ کے لئے سندھ کو اپنا وطن بنا لیا۔ اور سیہون کے نزدیک لکیاری میں سکونت اختیار کی آپکا خاندان بڑی عزت اور توقیر سے دیکھا جاتا ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے حسینی سید ہیں۔ سید بقا شاہ راشدی کی ولادت رسولپور میں شعبان ۱۱۳۴ھ ہجری کو ہوئی آپ نے ایک جگہ سے تعلیم حاصل نہ کی بلکہ جہاں بھی علم کا گہوارہ معلوم ہوا وہاں حصول تعلیم کے لئے پہنچ جاتے تھے، اور اس طرح ہمیشہ علم کے حصول میں مشغول رہے اور شہادت بھی اس شغل کی وجہ سے ہوئی۔

روایت ہے، ایک مرتبہ آپ اپنے سر پر کتابوں کی بھاری گٹھڑی لیکر جا رہے تھے، ڈاکوں نے گٹھڑی کو دیکھکر مال و دولت کے شبہ میں آپ کو شہید کردیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۳ سال تھی۔ آپ کے نعش مبارک کو شیخ طیب کے گاؤں تعلقہ فیروز میرس میں دفن کیا گیا۔

آپ کی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکلتی ہے جو آپ کے مرقد مبارک پر نصب کی ہوئی ہے۔

چوں سید محمد بقا شد شہید۔ حلاوت زرحمت الاہی چشید۔

بسی بود نافع بہر خاص و عام۔ کزو زدہ طالب خدا شد رسید

خود سال تاریخ او در دلم بگفتا بدرجہ شہادت رسید۔

۱۱۹۸ھ ہجری

آپ فارسی اور سندھی زبانوں کے پختہ شاعر تھے۔ سندھی کا کلام زیادہ دستیاب نہ ہو سکا ہے تھوڑے کلام کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا زیادہ کلام ہوگا۔ آپ کے کلام میں بڑی سادگی اور روانی موجود ہے۔ مثال پیش کی جاتی ہے:۔

سج لھي سانجھي ٿي، پکي پيا وڻين

اُڏر ھنيڙا پوئنر ٿي، لھ پر ھٽين

ٿوري ڏينھن ڳڻين، ٿيندءِ ميڙو سڄڻين

سورج غروب ہوگیا، شام ہوگئی، پرندے درختوں میں پہنچ گئے ہیں۔ اے دل تو بھی بھونرے کی طرح اڑ کر دوست کی منزل پر جاکے پہنچ۔

چند روز کے بعد آخر تیرا وصال دوست سے ہو ہی جائیگا۔

احسان لانگاہ

سندھ کے مرثیہ گو شاعر احسان لانگاہ ہالا شہر (ضلع حیدرآباد) کے رہنے والے تھے، آپ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے معصر تھے، جہاں تک مرثیہ نگاری کا تعلق ہے، سندھ کے ابتدائی مرثیہ گو شعراء شاہ بھٹائیؒ سر فہرست ہیں۔ شاہ صاحب کے رسالہ میں سر کیڈارو کے عنوان سے کافی ابیات مرثیہ کے انداز میں موجود ہیں، حالانکہ جدید تحقیق کی رو سے بعض محققین سر کیڈارو کو شاہ صاحب کی تصنیف نہیں مانتے، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سر کیڈارو کے ابیات حضرت شاہ لطیف بھٹائی کی ہی تصنیف ہے مرثیہ نگاری اپنی جگہ پر ایک فن ہے، شعر کے اصناف میں مرثیہ نگاری کو جو درجہ ہے وہ کسی صنف میں موجود نہیں ہے جناب پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم مرثیہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

۱۔ تذکرہ لطفی جلد اول مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۶۷۳

۲۔ اخبار ستارہ سندھ (بھاو سندھ نمبر) مقالہ "راشدی خاندان" مقالہ نگار پیر حسام الدین شاہ راشدی ۲۱ فیبروری سنہ ۱۹۳۵ء، مدیر پیر علی محمد شاہ راشدی

۳۔ کیڈارو۔ سر کیڈارو دیپک راگ کی ایک شاخ ہے، یہ سنسکرت شبد کیدار کی بگڑی صورت ہے جسکی معنی جنگ کا میدان ہے اس سر میں مرثیہ اور رزمی شاعری ہوتی ہے۔

"جذبات غم، جس میں شاعری کا اصلی روح ہوتا ہے، وہ ہمیں دوسری شاعری میں کم ملتا ہے، مگر مرثیہ میں اول اور آخر تک ہوتا ہے"

اردو شاعری مرثیہ نگاری میں مشہور ہے۔ اردو شاعری میں مرثیہ نگاری کب شروع ہوئی اسکا اندازہ لگانا البتہ مشکل ہے۔ لیکن مختلف تذکروں کی ورق گردانی سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے، کہ میاں مسکین غالباً سب سے پہلے شاعر تھے، جس نے مرثیہ کی شاعری کو اپنایا۔ "سودا" نے ان کے لئے کہا ہے:-

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا

پھر کوئی نہ پوچھے، میاں مسکین کہاں ہے:

اردو کے مرثیہ گو شعراء میں "مرزا رفیع سودا" کا نام لیا جاتا ہے۔ مگر سودا طبعاً خوش باش اور بے فکر انسان تھے۔ اس لئے وہ رنج والم کے اثر سے متاثر ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔ اس لئے ان کے مرثیہ میں جذبات کا فقدان ہے۔ مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی کی تحقیق کے مطابق:-

اردو میں مرثیہ نگاری کی صنف کو جن کے ہاتھوں عظمت حاصل ہوئی تھی، وہ تھے انیس کے خاندان کے فرد، میر انیس کے اس شعر "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فن کو گویا مذہبی فرض سمجھا جاتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی چیز کو مذہبی رنگ دیا جائے، تب اس میں جذبات اور احساسات کی پوری ترجمانی ہوتی ہے۔ میر ضمیر اور میر خلیق سے مرثیہ بتدریج ترقی کرتا ہوا میر انیس اور مرزا دبیر تک پہنچا تب ان میں جوہر پیدا ہوا، اور دنیا کی دوسری شاعری پیدا نہ کر سکی"

سندھی زبان میں شاہ لطیف بھٹائی رح نے اس فن کو فروغ دینے کے لئے ایک وسیع میدان چھوڑا ہے آپ کے ابیات (مرثیہ) میں مقامی رنگ کے ساتھ ساتھ قوت بیان اور سوز و گداز بھی موجود ہے۔ شاہ بھٹائی رح کے بعد احسان لانگھاہ اور مراد فقیر اور فتح فقیر نے شاہ بھٹائی کی تقلید کرتے ہوئے مرثیہ نگاری کو فروغ دیا۔ آگے چل کر مخدوم عبداللہ ٹھٹوی، سید خیر شاہ پردیسی، اور سید ثابت علی شاہ اور حضرت سچل سرمست نے اس صنف کو عروج پر پہنچایا۔

احسان لانگھاہ کے کلام پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا بڑا اثر نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ احسان لانگھاہ کے ابیات میں ایک وجدانی کیفیت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بہرحال احسان لانگھاہ، مرثیہ کی صنف میں طبقہ اولیٰ میں آتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں ملتان پر حکومت کرتے تھے۔ جب حکومت جاتی رہی تو وہاں سے ہجرت کرکے حالا سندھ میں آکر مقیم ہوئے۔ احسان لانگھاہ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان مبارک میں مرثیہ گوئی میں انتہا کردی ہے۔ امام صاحب کے جان نثار ساتھی حر کے متعلق کہا ہے،

حر هلي آيو، ما ڄھي مردانو،

اينديءَ چيئن امام کي جنگ پريءَ جانو

آهيان عاشق اگ جو پتنگ پروانو.

هيءُ سر سانو، گهوٽ مٿان گهوريو.

دلیر و مردانہ وار صف سے باہر نکل آئے، امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں جھک کر عرض کی۔

میں پروانہ کی طرح آگ کا عاشق ہوں، یہ سر میں آپ جیسے نوشہ پر قربان کرتا ہوں۔

آپ کے فرزند اسماعیل لانگھاہ بھی مرثیہ گو شاعر تھے انہوں نے بھی عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ امام صاحب کے معصوم صاحبزادے اصغر کی شہادت پر اس طرح لکھا ہے

اصغر جي افسوس ۾ دل جري داهون

ناگهه وڃي نڪتو، اندر مان آهون

ڏيکائيون واهون، هيءُ هيا ڙوت ذباه

اصغر کے ماتم میں میرا دل، آہ و فغاں میں مبتلا ہے۔ ناگہانی طور پر میرے سینے سے فریاد نکلتی ہے۔ افسوس و میلہ اور سے یاروں کا ذکر کر رہا ہوں۔

صوفی مدن بھگت :۔

صوفی مدن بھگت ایک صوفی و درویش گذرے ہیں ۔ صوفی مدن شاہ لطیف بھٹائیؒ کے مرید تھے اور آپ کے اصلی وطن کوٹڑی مغل کے رہنے والے تھے ۔ اور شاہ صاحب کی خدمت میں اکثر آکر رہتے تھے ۔ ایک روایت ہے ۔ شاہ صاحب نے ایک مرتبہ مدن بھگت سے سوال کیا ۔

حشر ويل حساب ۾ ڪافر ڪيئن ڪندا ؟

(روز محشر کو جب حساب ہوگا تو کافر کیا کرینگے)

اس عجیب سوال کو سن کر مدن صوفی نے عرض کیا ۔ قبلہ اس سوال کا جواب کسی اور وقت میں عرض رکھونگا ۔ کچھ عرصے کے بعد ایک دن اتفاقاً شاہ بھٹائیؒ کو کسی کام سے دریا کا سفر کرنا تھا ۔ اور مدن صوفی بھی ہمراہ تھے ۔ جب آپ دریا سندھ کے کنارے پر پہنچے تو ناخدا اپنی کشتی کو آگے دھکیل چکا تھا ۔ مدن صوفی نے اُسے کہا اگر ہمیں بھی سوار کروگے تو میں دگنا کرایہ دونگا ۔ ناخدا نے اس لالچ میں آکر کشتی کو واپس کنارے سے لگایا ۔ دونوں کو کشتی میں سوار کرکے منزل کی طرف چل دیئے اور دوسرے کنارے سے لگایا ۔ اس وقت مدن صوفی نے شاہ بھٹائی سے عرض کی ۔ قبلہ کچھ عرصہ پہلے آپ نے ایک سوال مجھ سے پوچھا تھا ۔ "روز محشر کو جب حساب ہوگا تو کافر کیا کرینگے" آپ کے اس سوال کا جواب آج مل گیا ۔ اور یہ شعر کہا :۔

"ڏٽ جنهي جو هيٺين سي پهرين پتڻ پار پيا"

"جس کے ہاتھ اسطرح کشادہ ہو (سخی ہو) گناہوں سے پاک ہو ، وہ پہلے وقت میں پتوار کو پار کرکے منزل پر جا پہنچے گا ۔"

مدن صوفی سندھی زبان کے اچھے شاعر تھے ۔ اُن کے کلام پر شاہ بھٹائی کا رنگ نظر آتا ہے جو کہ اس بیت سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔

ڪالهه پڻ ڪالهه هئي، آڄ پڻ ڏينهن ٻيو،

مڙهيءَ ۾ مدن چوي، ويٺي ڪانگ ويو،

جنهن ۾ ماڻ پيو، سا واٽ رهندي ڪيترو.

کل کا دن کل تھا اور آج دن اور ہے ، مدن کہتا ہے اس مڑھی (جسم) کے اندر پرندا (روح) رہ کر اُڑ گیا ۔

جس کا وقت آپہنچا ، وہ اس راہ پر کتنا وقت ٹھہرے گا ۔

مخدوم ابو الحسن سندھیؒ :۔

مخدوم ابو الحسن سندھی ٹھٹھ کے رہنے والے تھے ۔ آپ کا شمار سندھ کے نامور علماء دین میں ہوتا ہے ۔ آپ اپنے وقت کے جید عالم و فاضل تھے ۔ ۱۶۵۰ء کے بعد نواب حفظ اللہ کے دور حکومت میں بغداد سے ایک بزرگ شیخ یوسف الدین بغدادی جو قطب ربانی حضرت شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ میں سے تھے ، سندھ میں ٹھٹھ کے شہر میں تشریف لائے تھے ۔ اب وجود مسعود سے غیر مسلم ، اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئے ۔ نومسلم کی اتنی بڑی تعداد کو اسلامی اصولوں اور قوانین سے واقف کرنا اور زبانی وعظ و نصیحت کرنا کافی نہ تھا ۔ مخدوم صاحب نے بڑی محنت سے عربی اور فارسی زبانوں کے حروفوں کو ملاکر ایک سندھی رسم الخط تیار کی ۔ چنانچہ سندھی زبان کو اپنی کوئی رسم الخط نہ تھی ۔ مخدوم صاحب اس رسم الخط میں ایک فقہ کی کتاب لکھی ، جو "مقدمہ الصلوات" کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ کتاب سنہ ۱۱۱۲ ہجری مطابق سنہ ۱۷۰۰ء میں مکمل ہوئی ۔ اُسی رسم الخط کو مخدوم ضیاء الدین نے بھی اختیار کیا ۔ آگے چل اس رسم الخط کو بڑا فروغ ملا ۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ، مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی اور دیگر تمام بزرگوں نے اپنایا ۔ مخدوم صاحب ٹھٹھ میں مذہبی علوم کے ساتھ اس کا بھی درس دیتے تھے ۔ چنانچہ یہ سندھ میں پہلی نثر کی کتاب ہے ۔ جسکو عبدالحسن کی سندھی کہتے ہیں ۔ اس کے بعد سب سے پہلے نثر میں قرآن پاک کا ترجمہ لکھا گیا ۔ جس کو ہالا شہر کے ایک بزرگ مخدوم عزیز اللہ (متوفی سنہ ۱۲۴۲ ہجری) میں لکھ کر تیار کیا تھا ۔[2]

---

[1] سندھی ادبی تاریخ حصہ اول مرتب مرحوم محمد صدیق میمن صفحہ ۱۱۳ ۔ [2] اخبار الوحید سندھ آزاد نمبر صفحہ ۲۱

مخدوم صاحب کرامت بزرگ تھے۔ آپ نے شعر بھی کہا جو ہندی دوہوں کی طرز پر ہے۔ تاریخ تحفۃ الکرام میں ایک روایت آتی ہے :۔

"گویند شخصی از معتقدانش روزی نالیده گفت، خدمتگار نواب شہادت خان بر خانۂ ام رسیده حکماً در می آید و بازنمی نشیند و هرچه میخواهد میکند برحال زار من رحم کرده فرمود باش تا تدارک ببینم آنگاه پسر خواہر منکوح خود میاں عبداللہ را گفت در خدمت پیر پٹھہ۔ برو پیغام و سلام من برسانید تا تدارک ان ظالم بکند چون ایشان رفتند و عرض کردند و صبحی پس امدند دیدند آن ظالم دروقتی که بخانه مرد مذکور می آمد برای اراقۂ بول پس دیوار نشسته پایش بلغزید و بر میخی که در زمین زده بود شکمش خورده برقید و احشاس دردم جان را هوره بود"[1]

کہتے ہیں کہ آپ کے مرید نے آپ سے آکر شکایت کی کہ نواب شہادت خان کا ایک خدمتگار رات کو نشے میں، میرے گھر میں جبراً داخل ہوتا ہے اور میری بیوی کے ساتھ بیٹھ کر جو اس کا جی چاہتا ہے کرتا ہے۔ اُس کے حال پر رحم فرماتے ہوئے انہوں نے فرمایا اس کا تدارک کرتے ہیں۔ اور اپنی بیوی کے بھانجے میاں عبداللہ سے کہا کہ پیر پٹھہ کی خدمت میں جاکر میرا سلام کہنا اور اس ظالم کی تدارک کے لئے پیغام دینا۔ اُنہوں نے جاکر حسب ہدایت سلام پہنچایا۔ صبح کو واپس آکر دیکھا کہ وہ شخص اس مرید کے گھر سے نکل کر جا رہا تھا، راستے میں پیشاب کرنے کے لئے دیوار کی اوٹ میں بیٹھ رہا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ ایک کھونٹے کے بل جاگرا جو زمین گڑی ہوئی تھی، جس کے لگنے سے اُس شخص کی آنتیں باہر نکل آئیں اور وہیں مرگیا :

مخدوم صاحب ایک اہل نظر درویش تھے، آپ کی بہت سی تصنیفات موجود ہیں۔ مقدمۃ الصلوٰۃ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کتاب کو مثنوی کی طرز پر لکھا ہے لیکن اس میں عروض کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایک بیت نقل کیا جاتا ہے۔[2]

سر و باري آبد سين ڪجي مک ڪنن

ابي هريون آڱريون ڦيري ڪنڌ ڌ جن،

سنتون ساري وضو جون، دل سين دعائون

ته مولو مريي مون ڏي، خالق خطائون (الخ)

سر کو پانی سے آلودہ کرکے، کانوں کو پانی سے مسح کیجئے، اس پانی سے تر انگلیوں کو گردن کے گرد ڦیرنی چاہئیں

وضو کی سنتوں کو یاد کرنا چاہئے اور دل میں دعائیں پڑھنی چاہئیں تاکہ خدا تعالیٰ ہماری خطاؤں سے در گزر کرے۔

شعر میں یہ طرز فارسی اور عربی شاعری کی تقلید نظر آتی ہے، شاید مخدوم صاحب نے فارسی زبان میں فقہ کی کتابوں کے مثنوی کی طرز پر دیکھکر اپنی تصنیف کو بھی اس رنگ میں پیش کیا ہے۔ بہرحال مخدوم ابوالحسن سندھی زبان میں نثر کے موجد تھے، جن کی ذات بابرکات سے سندھی زبان بتدریج مختلف منازل کو طے کرکے آج اس منزل پر پہنچی ہے کہ جہاں دنیا کی اور مہذب زبانیں پہنچی ہیں :

مخدوم عبدالرؤف بھٹی :۔

مخدوم عبدالرؤف بھٹی سندھ کے شاعر تھے جنہوں نے سندھی زبان میں موزوں شاعری کی۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی مخدوم محمد عمر بھٹی تھا جو ہالا کے بھٹی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بھٹی دہلی کے راجا جادم کے بیٹے بھوپٹ کی اولاد میں سے تھے جو ہندوؤں کے مشہور اوتار رام چندر کی اولاد میں سے بتایا جاتا ہے۔ اس خاندان سے ارجن نامی راجکمار جو جسلمیر کے راجا تھے، مخدوم شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی رح کے ہاتھ پر بیعت کرکے مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا اسلامی نام عبداللہ رکھا گیا جو بعد میں بڑے صاحب کمال بزرگ بن گئے۔ اور حضرت غوث بہاؤالدین ذکریا کے خاص خلیفہ ہوکر سندھ میں ماڑی محمد خان کے نزدیک ہالا میں مقیم ہوئے۔

---

[1] تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۲۸۔ [2] مقدمۃ الصلوٰۃ مصنف مخدوم ابوالحسن سندھی

مخدوم عبد الرؤف بھٹی اُسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد بڑے بزرگ تھے۔ مخدوم صاحب بچپن سے ہی عبادت الٰہی کی طرف رجوع تھے اپنی ریاضت اور کرامت کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ میاں نور محمد کلہوڑہ آپ کے خاص معتقد تھے۔ مخدوم صاحب کا پورا کلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف (مولود) اور محبت سے پر ہے۔ آپ کی یہ آرزو تھی کہ مدینہ منورہ میں وفات ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ درخواست قبول فرمائی اور اُنکی خواہش پوری ہوئی۔ جب دوسری مرتبہ حج کو گئے تو وہاں انتقال کیا۔ اس وقت آپ کی عمر ستر برس کی تھی۔ آپ شاہ بھٹائی[2] کے ہمعصر تھے۔ شاہ صاحب سے ایک سال بعد وفات کی تھی شیخ محمد ابراہیم نے تاریخ وفات نکالی تھی

کان ولیا مرؤف الحق

۱۱۶۲ ہجری

پروفیسر احسان احمد بدوی مرحوم کی تحقیق کے مطابق۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مخدوم عبد الرؤف بھٹی سندھ میں پہلی شخصیت تھے۔ جن کا کلام علم عروض کی پابندی اور موزونیت میں نظر آتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ موزون شاعری کا آغاز سندھی زبان میں ان سے ہی شروع ہوا۔ آپ کے جو بھی (مولود) نعت کلام موجود ہے وہ علم عروض پر ہے"

منارا ميرِ مرسل جا ڏسان شل ڏينهن سڀ ڏوري

ملي حالا متيا ميسا، اُنڙ پور کي ڇڏيان اوري

پيان ها ڦي سنڌ زمزم، ڇڏيان احرام اُت چوري،

مديني ميس وٽ مولا تڪڙي پهچاءِ سنهن توري.

سید المرسلین کے گنبد مبارک کے مینار کو کاش میں اس طرح پیادہ چل کر دیکھوں، اپنے وطن حالا اور میسا کو خیرباد کیکر اُنڑپور کو بھی آگے چھوڑ دوں کاش میں آپ کے ملک میں زمزم کا پانی پیئوں اور وہاں اپنے احرام کو کھولدوں، یا میرے رب مجھے مدینے کے میروالی کے پاس جلدی پہنچادو۔

شیخ حمر :-

شیخ حمر لس بیلہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۰۲۲ھ میں سندھ سے شیخوں کا ایک قبیلہ ہجرت کرکے لس بیلہ پہنچا تھا۔ اور وہیں سکونت اختیار کی۔ لس بیلہ خلفاء عباسیوں کے دور حکومت میں ایک جداگانہ ریاست تھی۔ جہاں "جام" حکمران تھے۔ اسی شیخ خاندان سے دو بڑے بزرگ شاعر شیخ حمر اور اُنکا بیٹا شیخ ابراہیم ہوکے گذرے ہیں جو بڑے نکتہ سنج اور نکتہ دان تھے۔ شیخ حمر بڑے عابد شخص تھے۔ لس بیلہ میں اپنے علم و فضل سے خلق خدا کی خدمت سرانجام کر رہے تھے۔ اُوتھل شہر میں ایک بڑا مدرسہ چلاتے تھے۔ پوری زندگی درس و تدریس میں گذار دی۔ آپ نے سندھی زبان میں کلام چھوڑا ہے جسے دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے سندھی ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ چونکہ شیخ حمر شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے ہمعصر تھے اس لئے ان کے کلام پر شاہ بھٹائیؒ کا اثر نظر آتا ہے۔ ایک جگہ شاہ صاحب کے رنگ میں کہتے ہیں :-

جاڳڻ منجهان جس، سُتي ساڄن نہ مليو،

هنان ويا ڪمت ڇڏي، پٽ تڏين پس

جڳ ۾ آهي جس، جي ڏيئن اوجاڳو اکين کي.

شب بیداری سے نفعے حاصل ہوتا ہے، نیند کرنے سے دوست نہیں ملتا۔ حمر کہتا ہے جو گئے اُن کے میدانوں کو جاکر دیکھو اس جہان کے اندر اُنہی فائدہ ہوگا جو اپنی آنکھوں کو بیدار کرتا ہے۔

---

1. کلام سانگی مرتب مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی صفحہ ۱۳۔
2. بیلاڻ جا ٻول۔ مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ صفحہ ۱۵۔

وطایو فقیر :-

کلہوڑہ دور حکومت میں ایک عجیب شخصیت "وطایو فقیر" کے نام سے گذرے ہیں، جو ٹھٹھ کے رہنے والے تھے۔ یہ مجذوب، صاحب کرامات، سالک اور کامل بزرگ تھے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہمعصر تھے، اُنکی شخصیت کو ہندستان کے شیخ چلی، اور ترکی کے ملا نصیرالدین سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف میر علی شیر قانع نے آپ کے لئے لکھا ہے۔[1]

"وطایہ مجذوب سالک کامل در بعا یدن وقت بمرتبۂ عرفان زیستہ۔"

"وطایہ سالک کامل تھے اور وقت کے مجذوبوں میں صاحب عرفان شمار ہوتے تھے"

اُن کی دلچسپ اور پُر نصیحت کہانیوں کو سندھ میں بڑی اہمیت اور شہرت ہے، صاحب تذکرہ لطیفی[2] نے ایک عجیب روایت لکھی ہے جس سے آپ کے بلند درجہ کا پتہ چلتا ہے:

مخدوم حمزہ واعظ کی وفات کے دن ایک شخص مکلی کی زیارت کے لئے جا رہے تھے، اس وقت وطایو فقیر مکلی سے ٹھٹھ واپس ہو رہے تھے ایک اور مجذوب فقیر مکلی کی طرف جا رہے تھے، وطایو فقیر نے اس مجذوب شخص سے کہا جلدی واپس ہو جا، آج حمزہ واعظ نے وفات پائی ہے، اور سید المرسلین اُن کے جنازہ نماز کی امامت کے لئے تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ مکلی جانے والا شخص اسی جگہ سے واپس ٹھٹھ ہوئے۔ ٹھٹھ پہنچ کر دیکھا کہ واقعی مخدوم حمزہ نے وفات کی ہے۔ جنازہ نماز بھی تیار ہے، وہ شخص جلدی سے جاکر پہلی صف میں کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے سنا امام کی تکبیر سے پہلے غیب سے آواز آ رہی تھی"

وطایو فقیر کے درویشانہ قصے اور کہانیاں مشہور ہیں، جن میں سے ایک کہانی نقل کی جاتی ہے۔

ایک مرتبہ وطایہ فقیر کے پاس ایک روپیہ تھا، اور وہ کسی سفر پر جا رہے تھے۔ اسے روپیہ کو سنبھالنا مشکل نظر آیا۔ آخر یہ فیصلہ کیا اور روپیہ کو ایک جنگلی پودے کے تنے کے قریب دفن کرکے چلا گیا۔ اتفاقاً ایک شخص اُسی جگہ رفع حاجت کے لئے بیٹھا، اور اس روپیہ سے مٹی اُتر گئی اور ظاہر ہو گیا، اس شخص نے روپیہ تو حاصل کر لیا لیکن سوچنے لگا یہاں ضرور کوئی خزانہ مدفون ہے لہٰذا اس نے زمین کو کھودنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ پودا جڑ سے اُکھڑ گیا اور اسی کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ وہ ناامید ہوکر چلا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وطایو فقیر اُسی راستہ سے واپس لوٹ رہے تھے تو اُسے روپیہ یاد آ گیا، جب اُنہوں نے روپیہ کے بجائے ہرے بھرے پودے کو ایک طرف زمین پر مرجھایا ہوا پایا، تو اُسے بہت افسوس ہوا۔ لیکن فوراً آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بڑی عاجزی سے کہا۔ "شکر ہے یا رب! یہ اچھا ہوا کہ روپیہ میرے پاس نہ تھا ورنہ میری بھی اس پودے جیسی حالت ہوتی۔"

اس قسم کی بیشمار کہانیاں اور مزاحیہ قصے اس زندہ دل شخصیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان نثری کہانیوں کے علاوہ کچھ ابیات بھی آپ سے منسوب ہیں مثال ہے

ڏيڏر ويٺو کوھ ۾ ڏونرائي ڏليل

مون جهڙا ٿليل هوندا من جهان ۾.

"مینڈک نے کنوئیں میں بیٹھ کر یہ خیال کرتا ہے کہ میری طرح کوئی فہیم اس جہان کے اندر بہت کم ہونگے۔"

---

[1] تاریخ تحفۃ الکرام جلد سوم صفحہ ۲۵۵۔

[2] تذکرہ لطفی جلد سوم اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی صفحہ ۶۹۶۔

حصۂ چہارم

باب اوّل

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سندھ کے معاصر اُردو شعرا

"شاہ بھٹائی کا دور"

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ (۱۱۰۲ھ ۔ ۱۶۸۹ء تا ۱۱۶۵ھ ۱۷۵۲ء) سندھ کے اُن جلیل القدر برگزیدہ شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے سندھ کی تہذیب و ثقافت مذہب اور زبان پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ آپ سندھی شاعری میں غیر فانی مرتبہ رکھتے ہیں۔ سندھی زبان کو جس طرح اُوج و کمال پر پہنچایا، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کا شمار دنیا کے عظیم ترین شعرا کی صف اول میں ہوتا ہے۔ آپ کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ الہامی تھی۔ یہ واحد مفکر تھے جن کے افکار نے ایک ادبی تاریخ کو جنم دیا۔ آپ کے ادبی کارنامے سے سندھی ادب میں ایک عظیم باب کا اضافہ ہوا۔

شاہ بھٹائیؒ کا دور ایک پرآشوب دور تھا۔ ایک طرف سندھ میں سندھی زبان اپنی ارتقائی منازل طے کرکے عروج پر پہنچی تھی، تو دوسری طرف ھندوستان میں اُردو زبان ھندی سے ھندوی اور اردو معلیٰ تک بتدریج ترقی کر رہی تھی۔ اردو کے عظیم شعرا خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ ۔ ۱۱۹۹ھ ، میر تقی میر ۱۱۳۵ھ ۔ ۱۲۲۵ھ اور میر محمد رفیع سودا (۱۱۲۵ھ ۔ ۱۱۹۵ھ) اردو زبان کی نشو نما اور ترقی کے لئے کوشاں تھے۔ یہ مغلیہ سلطنت کے تاجدار سلطان محی الدین اورنگزیب عالمگیر کا زمانہ تھا۔ جب شاہ بھٹائیؒ کی ولادت ہوئی تو اس وقت اورنگزیب عالمگیر کے جلوس کا ۳۵ واں سال تھا۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے زمانے میں خلق خدا امن و اطمینان کی دولت سے مالا مال تھی جس کی وجہ سے سندھ میں بھی اطمینان اور سکون تھا۔ چونکہ سندھ کا علاقہ دہلی کی دارالحکومت سے وابستہ تھا، سندھ میں جو گورنر آتے رہے وہ اپنے اہل و عیال، امراء و شعرا اور فنکاروں کو بھی ساتھ لاتے تھے جو اپنی زبان اور ثقافت کو بھی ساتھ لاتے تھے۔ جس سے سندھ میں ھندوی اور اُردو معلیٰ کی نشونما ہوئی۔ سندھ کا جیسلمیر، دکن اور گجرات سے بڑا رابطہ قائم تھا۔ گجرات کے لوگ سندھ میں بستے تھے اور سندھ سے اکثر لوگ ہجرت کرکے ھندوستان میں جاکر بسے تھے اس طرح اس باھمی نقل و حرکت سے قدیم اردو شاعری کی نشو و نما سندھ میں بھی ہوئی۔

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ سلطنت کے نئے تاجداروں کے زور نہ چلنے کی وجہ سے برصغیر میں افراتفری پھیل گئی دوسری طرف مختلف علاقوں میں ادب اور فکر کی نئی راہیں پیدا ہوئیں، چونکہ ھند و پاک میں بڑے صالحین اور بزرگان دین موجود تھے جنہوں نے وقت کی رفتار سے علم ادب اور زبان کو بڑا فروغ دیا۔ مختلف علاقوں کی زبانوں میں نیا اسلوب پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ جیسا عظیم صوفی شاعر پیدا ہوا۔ دکن میں وؔلی، دہلی مظہر جان جاناں ۔ میر تقی میر، مرزا سودا، خواجہ میر درؔد شمال ھند میں پشتو زبان کے بے نظیر شاعر خوشحال خان خٹک اور پنجاب میں حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر ۔ شیخ عثمان ۔ شیخ جنید ۔ مولانا عبدی اور شیخ ابوالفرح محمد فاضل جیسے بزرگ شعرا پیدا ہوئے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شعرا ھند و پاک کے مختلف علاقوں میں رہتے تھے اور ایک دوسرے الگ تھلگ اور دور رہتے تھے لیکن ان کے خیالات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور انکے ھمعصر شعرا کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سندھی اور اُردو زبانوں کی ماھیت اور ارتقائی ترقی پر غور و فکر کریں تاکہ دونوں زبانوں کے مشترک ہونے کا اندازہ ہوجائے۔ سندھی اور اُردو زبانوں میں مشابہت اور مناسبت پائی جاتی ہے ان زبانوں میں میں الفاظ ۔ تشبیہات ۔ استعارات اور کنایہ بھی یکساں نظر آتے ہیں۔

سندھی زبان ۔ جہاں تک سندھی زبان کا تعلق ہے یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ صوبہ سندھ قدیم ثقافتی ورثہ کا مالک ہے مولانا ابو ظفر ندوی نے

---

1. Linguistic Survey of India by G. A. Grierson Vol. 1 Page - 30.

اپنی تصنیف[1] "تاریخ سندھ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ آریہ قوم سے پہلے سندھ کے پرانے باشندے اس ملک کو کیا کہتے تھے۔ ابھی تک تاریخ کی زبان اس سوال کے متعلق خاموش ہے۔ آریہ قوم نے جب سندھ کی وادی میں قدم رکھا تو بڑے دریا کو دیکھکر اس کا نام سندھو رکھا۔ کیونکہ سندھواں کی زبان میں سندھو دریا کو کہتے ہیں۔ اس سندھو دریا کی مناسبت سے پورے ملک کا نام سندھ اور زبان کو سندھی کہا گیا۔ ہندوؤں کے مذہبی کتب ویدوں میں سندھ کو دریا کہتے تھے اس کا اصلی نام سرسوتی تھا، جس کی تعریف اس شعر کی صورت میں کی ہے

"سرسوتی آتی ہے، شور وشغب کرتی ہوئی، غذا لیئے ہوئے، ہمارے لیئے حصن حصین ہے، پیتل کا قلعہ ہے، مثل ایک

سورما کے جو اپنے رتھ کو دوڑاتا ہو وہ سندھو (ندی) تیزی کے ساتھ آتی ہے دوسری ندیاں پیچھے رہ جاتی ہیں۔"

موئن جو دڑو کے آثار قدیم جو اس سرزمین میں پائے جاتے ہیں محققین کے نزدیک آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے کے آثار ہیں جو مصر اور عراق کے قدیم ترین تمدن کے ہم عصر سمجھے جاتے ہیں۔ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح آریہ قوم کے قبیلے وسط ایشیا یا کسی اور مقام سے نکل کر وادی سندھ میں آکر آباد ہوئے۔ ایران کے ہخامنشی بادشاہ دارا نے سندھ کو فتح کرلیا اور ایک مدت تک یہ صوبہ ہخامنشی فرمارواؤں کے زیر حکومت رہا۔ ۳۲۹ قبل مسیح سکندر اعظم نے ایران کو فتح کرکے بعد میں سندھ میں داخل ہوا تو اس کو ملتان سے بھی آگے فتح کرلیا۔ سندھ سے واپسی کے بعد یہ صوبہ موریہ خاندان کا جزو بن گیا بعد میں یونان کے باختر خاندان کا تسلط رہا۔ یہاں تک کہ بنی امیہ کے عہد خلافت میں عرب نوجوان جنرل محمد بن قاسم نے ۹۳ ہجری میں سندھ کے ساحلی شہر دیبل کو فتح کرلیا اور ملتان تک فتح حاصل کرکے اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی اس وقت سے ۱۲۰۰ ہجری تک سندھ پر مختلف مسلمان خاندان حکومت کرتے رہے۔

جہاں تک برصغیر کی زبانوں کا تعلق ہے یہ داستان بھی تاریخ کے ساتھ ساتھ قدیم ہے۔ آریہ کے متعلق تاریخ کی بحث ابھی تک تکمیل تک نہ پہنچ سکی ہے کہ آریہ حقیقت میں کس سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کا اصلی وطن کونسا تھا؟[2] تاریخ نویس ان کو ارکٹک کے رہنے والے سمجھتے ہیں۔ کچھ وسط ایشیا اور سائبیریا کے باشندے کہتے ہیں پروفیسر جائیلس اپنی کتاب میں ان کا وطن ہنگری لکھتے ہیں۔ پروفیسر چٹرجی ان کا الطائی تانشان کے پہاڑی علاقہ کا سمجھتا ہے۔ لیکن آریہ کے خود قدیم کتابوں میں ان کے اصلی وطن اور آمد کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ایسی حالت میں ان کے اصلی لسانی مسئلے کو حل کرنا غایت مشکل ہے۔ آریائی زبان کا پہلا مستند نقش رگ وید (۱۰۰۰ ق م) میں ملتا ہے۔ رگ وید کے مختلف حصوں میں کہیں قندھار کے راجا دیوی داس کا ذکر ملتا ہے تو کہیں سندھ کے راجا سوداس کا بیان نظر آتا ہے۔ میکڈونالڈ تاریخ سنسکرت ادب میں لکھتے ہیں:۔

ویدک زبان ہڑپا اور موئن جو دڑو کی زبان کے اختلاط سے بن گئی ہوگی، آریہ حکومت کے عروج کے

زمانہ میں ویدک زبان گروہ بندی میں آگئی تھی، جس کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے

ادیچ: یہ زبان شمال اور مغربی ہندوستان کی زبان تھی۔ مدھ دیس: یہ زبان انبالا سے لے کر الہ آباد تک بولی جاتی تھی۔

پراچیہ: مشرقی ہندستان کی زبان تھی۔

ان زبانوں میں اودیچ کو فوقیت حاصل تھی۔ کیوں کہ یہ قدیم اور معیاری زبان تھی اور آہستہ آہستہ جیسے آریائی تہذیب کا مرکز شمال مغرب کے دیس سے مدھ دیش بنا تو وہاں کی زبان کو بھی ممتاز حیثیت حاصل ہونے لگی یعنی آگے چل کر سنسکرت شد بن گئی اور اس زبان ہی کو سب سے اعلیٰ زبان سمجھا گیا برہمنوں کی سخت گیری نے ان میں کسی تبدیلی کی اجازت نہ دی کیونکہ یہ زبان برہمن، بادشاہ، وزیر اور امیروں کے سواء کسی اور کو بولنے کی اجازت نہ تھی۔ عوام نے مجبوراً ایک ایسی زبان بولنے لگے جس کو سنسکرت کی بگڑی صورت کہا گیا جو کہ پراکرت یا عوامی زبان کے نام سے مشہور ہو گئی۔

---

[1] تاریخ سندھ مصنف مولانا سید ابوظفر ندوی۔

[2] ویدک هند۔ میڈیم۔ زیڈ۔ اے۔ راگوزن مترجم مولوی حبیب احمد انصاری صفحہ ۲۰۴۔

جان بیمز اپنی مختصر تصنیف میں سنسکرت کے عروج و زوال پر لکھتے ہیں کہ ھندوستان کی سب سے قدیم اور نمائندہ وید کی زبان ہے اور تحریری سنسکرت کی سب سے زیادہ قدیم صورت ہے جس کو کلاسیکل سنسکرت اور بعد میں پراکرت یعنی بگڑی زبان کہا گیا، پراکرت کی ایک شاخ ماگدھی ہے جو موجود بہار میں بولی جاتی ہے۔ جو گوتم بدھ کی مادری زبان تھی، جب بدھ دھرم کا پرچار ہوا تو یہ زبان مقدس بن گئی ۵۴۳ ق م میں جب یہ زبان سلون (لنکا) میں پہنچی تو اس کو پالی کہا گیا پراکرت کا اثر مندرجذیل زبانوں پر براہِ راست ہوا وہ ہے، ھندی۔ سندھی۔ مرھٹی، گجراتی، بنگالی، اسامی اور کشمیری وغیرہ۔

سر گریرسن۔ جان بیمز کے خیالات کی تائید کرتا ہے اور صاف الفظوں میں کہتا ہے۔

لہندا (پنجابی) اور سندھی انڈین آریہ زبان، ان بجمی گروھوں سے تعلق رکھتی ہیں جس میں بہت سی وہ باتیں موجود ہیں جو ڈاوڈک (دراوڑی) زبانوں میں موجود ہے جس میں کشمیری زبان خاص اھمیت رکھتی ہے۔

عرب فتوحات سے پہلے عربی زبان سندھ میں آچکی تھی، اس میں شک نہیں کہ سندھی زبان نے آھستہ آھستہ عربی زبان کے لفظوں کو اپنایا تھا عرب فتوحات سے پہلے عرب کے سیاح اس بات کا ذکر کرتے ہیں۔ سندھ کے ساحلی حصوں میں سندھی زبان کے ساتھ عربی زبان بھی بولی جاتی تھی، خصوصاً منصورہ اور دیبل کے شہروں میں۔ ابن حوقل مشہور سیاح نے اسکا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ابو ریحان البیرونی اور اصطخری۔ جن کو سلطان محمود غزنوی کی دربار میں بڑی عزت حاصل تھی۔ جنہوں نے سلطان مسعود کا زمانہ بھی دیکھا تھا، انہوں نے ۱۰۱۷ء سے ۱۰۲۹ء کے درمیانی وقت میں ھندوستان کی سیاحت کی تھی، وہ سنسکرت کے عالم بن گئے تھے۔ البیرونی نے لسانیاتی تحقیقات کا بڑا حصہ اپنی تصنیف "کتاب الھند" میں دیا ہے چونکہ اس سیاح کی سیاحت کا دائرہ سندھ اور پنجاب تھا، اسلئے اُس کی تصنیفات میں جو لفظوں کی فہرست نظر آتی ہے، اس کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ آج بھی سندھی زبان میں عام مروج ہیں۔ عربوں کے آنے کے بعد سندھی زبان نے عربی زبان اور اسلامی ثقافت کا اثر لیا جو آگے چل کر موجود سندھی زبان کی صورت اختیار کی۔

اردو زبان

لسانیات کے ماھروں کے سامنے اردو زبان کے ارتقا کا پیچیدہ مسئلہ یہ ہے کہ اردو زبان کا مرکز کہاں تھا۔ اس پر ھر ایک کی مختلف رائے ہے۔ پروفیسر ھاشمی کا خیال ہے اردو زبان نے پہلے جنوبی ھندوستان میں جنم لیا۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ اردو کی ابتدائی نشونما میں افغانوں کا بڑا حصہ ہے۔ حافظ محمود خان شیرانی کا نظریہ ہے اُردو زبان کی ابتدائی ترقی پنجاب میں ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی تحقیق سے لکھتے ہیں کہ اردو سب سے پہلے سندھ میں بنی۔ ان نظریات کے رو سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اردو زبان کی ارتقائی ترقی مختلف صوبوں کی اصلی پراکرت زبانوں سے مل کر بنی، جس میں ھندی زبان خصوصیت سے سبھی علاقوں میں عام مروج تھی۔ جس میں عربی اور فارسی زبانوں کے میل جول سے اردو بنی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی سید سلیمان ندوی کی تائید کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ "سندھ میں اُردو کی ترقی ہوئی، لیکن بعد میں" مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

تذکرہ لطفی حصہ اول مصنف مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔ ۲ جان بیمز صفحہ ۳۔

Linguistic Survey of India VOL: VIII by Sir Jone Grierson. ۴ AL-Hind ... Al Beroni.

۵ پنجاب میں اردو مولف حافظ محمود شیرانی مرحوم ۶ سندھ کے جدید اردو شعرا مرتب مشتاق جعفری (مقدمہ)

۵ اردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصہ۔ رسالہ معارف مئی ۱۹۴۹ء۔ مقالہ نگار جناب امتیاز علی عرشی

۷ It is agreed that a language was certainly developing in Sind, but it was not Urdu, It was the earlier form of Language (Hindustani Phonetics P. 17) by Dr: Mohiuddin Qadri Zor

"اردو کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا کام نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں اور کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازم نتیجہ ہے"
سید سلیمان ندوی ایک اور مقالہ "ھندوستان میں ھندوستانی" میں فرماتے ہیں [1]
"سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ گذر چکا ہے کہ ہندوستان کے ھر صوبہ میں الگ الگ بولی تھی، مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اس وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"
شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد صاحب کا خیال ہے کہ :-[2]
"اردو زبان اول لین دین، نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہوگئی، ھندوؤں کے ساتھ، ھندی مسلمان جو اکثر ایرانی یا ترکستانی نسل سے تھے، ھندوستان کو وطن اور اس کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی، اس طرح کوئی زبان زبان بے شاعری کے نہیں رہ سکتی۔ محمد شاہی دور تھا، اور عیش و عشرت کی بھار تھی ان شرفا کو خیال آیا ہوگا کہ جس طرح ھمارے بزرگ اپنی فارسی کی انشاپردازی میں گلزار کھلاتے تھے۔ اب ھمارے یہی زبان ہے ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں۔"
ان بزرگوں کے مختلف نظریات پر ہم ھندوستان میں اردو کی نشو نما جو مختلف علاقوں میں اس پر بحث کرتے ہیں۔

سندھ میں اُردو، اور سندھ کے اردو شعرا۔

سندھ کا علاقہ پاک وھند کا پہلا خطہ ہے جہاں سب سے پہلے عربوں کی آمد ہوئی، جب محمد بن قاسم نے پہلی صدی ہجری ۹۳ھ مطابق ۷۱۱ء میں سندھ کو فتح کیا، اور مسلمانوں کی حکومت کا آغاز کیا، تو سندھ کی حکومت کا تسلط بڑے عرصہ تک عربوں کے ہاتھ میں رہا۔ اسلام کے آنے سے سندھ باب الاسلام کے شرف سے مالا مال ہوا، اور اسلامی ثقافت کا گہرا اثر قبول کیا۔ چونکہ اسلام کی تبلیغ یہاں سے شروع ہوئی، تو اس عرصہ میں بڑے علماء اور صالحین پیدا ہوئے، جن کی وجہ سے سندھ دار العلوم والادب بنا۔ تین سو سال کے طویل عرصہ کے بعد پنجاب میں مسلمان فاتحوں نے فتوحات حاصل کیں ان فاتحوں کا علمبردار سلطان محمود غزنوی تھا۔ ان کے بیٹے سلطان مسعود نے مسلم حکومت کا آغاز کیا، چونکہ وہ حصہ بھی اس زمانے میں سندھ کا حصہ تھا، اس لئے سندھ پر بھی ان فاتحین کا براہ راست اثر رہا۔
جہاں تک سندھ میں اردو زبان کا تعلق ہے، یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان دونوں زبانوں کا آپس میں گہرا تعلق رہا ہے۔ لیکن اس کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اردو کی ساخت عربوں کے سندھ میں اقتدار و اختلاط نے کس قدر اعانت کی۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان اور ھندوؤں کی زبانوں کی اجنبیت بڑی حد تک دور ہوگئی تھی، یہ اثر سندھ اور ملتان پر بھی ہوا تھا کیونکہ عربوں نے باقاعدہ یہاں آکر سکونت اختیار کی تھی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ تمام سندھ سے بیشتر ھندوستان کے حصوں کو مدد ملی۔
یہ حقیقت مسلّم ہے کہ سندھی زبان کا اردو زبان سے تعلق بہت قدیمی ہے۔ سندھ میں اردو زبان کے نشان دسویں ہجری میں نظر آتے ہیں، سندھ کے اسی دور کو مورخوں نے نظر انداز کیا ہے۔ سندھ نے جہاں دنیا کو پہلے سبق سکھائے وہاں اردو زبان کی بھی بنیاد رکھی، اور اس اردو پر آج دنیا ناز

---

[1] نقوشِ سلیمانی، مصنف علامہ سید سلیمان ندوی مقالہ ھندوستان میں ھندوستانی صفحہ ۳۱۔
[2] آبِ حیات، مصنف شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین آزاد دہلوی صفحہ ۲۹

کرتی ہے تاریخ شاہد ہے کہ سندھ میں سب سے پہلے تہذیب اور تمدن کا چراغ روشن ہوا. ہندؤں کے قدیم کتاب ویدوں سے پتا چلتا ہے کہ آریہ ورش نے سندھ کو "ھند" کا نام دیا تھا. یہ پہلی سرزمین ہے جہاں سامی اور آریائی زبانوں کا میل ہوا. جسے اردو زبان بننے کے آثار نمودار ہوئے. مغربی ہندوستان کی زبان ھندی نے یہاں سے عربی اور فارسی زبانوں کا اثر لیا. کسی ملک کے ادب پر نظر کرنے سے اندازہ ہوگا کہ ادب کی شروعات شاعری سے ہوئی. سندھ میں عربی۔فارسی۔ سندھی، ھندی۔ سرائکی اور اردو شاعری سے ادب کی شروعات ہوئی. اردو شاعری کے قدیم نشانات نظر آتے ہیں. جسے دیکھکر کہا جائے گا کہ دکن کے ساتھ ساتھ سندھ نے بھی اردو زبان کی توسیع و ترقی میں نمایاں حصہ لیا. جو کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے. تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ سندھ میں اردو شاعری کو دکن کے پہلے صاحب دیوان شاعر بادشاہ قلی قطب شاہ نے متعارف کرایا. جس کا دور غالباً ۹۸۸ھ تھا. قلی قطب شاہ کے مراسم بکھر کے ایک بزرگ میر فاضل بکھری سے تھے. اس کے پاس اکثر آتے جاتے تھے. اس بزرگ سے مل کر بکھر میں اردو شاعری کی بنیاد رکھی ہوگی۔[1]

دسویں صدی ہجری میں سندھ کے بہت سے شعراء کا سراغ ملتا ہے. جنہوں نے فارسی، عربی، سندھی کے ساتھ ساتھ اردو ریختہ میں بھی شاعری کی ہے گیارھویں صدی ہجری میں سندھ کے اردو شعراء بکثرت نظر آتے ہیں، ان شعراء میں ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹوی (۱۰۴۰ھ۔ ۱۱۴۰ھ) کو اولیت حاصل ہے

ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹوی اپنے دور میں فارسی زبان کے بہترین شعراء میں شمار کیئے جاتے ہیں. عطا نے بڑی عمر پائی. میر علی شیر قانع نے مقالات الشعرا میں لکھا ہے "عطا نے شہنشاہ شاہجہان کے دور حکومت سے لے کر محمد شاہ کے دور حکومت تک کا زمانہ دیکھا. ان کی شاعری کا آغاز ۱۰۶۰ھ ہجری سے شروع ہوا. اس زمانے میں ھندی شاعری پر فارسی شاعری کا اثر ہو چکا تھا. اور اردو شاعری دکن سے دھلی پہنچی تھی. اردو شاعری کا ابتدائی دور تھا، اور سندھ میں اردو شاعری شروع ہو چکی تھی. عطا کے فارسی دیوان کے آخر میں انکا اردو کلام نظر آتا ہے، جسے دیکھکر دکن کی شاعری یاد آجاتی ہے ان کے اردو کلام سے چند نمونے کے طور پر مثال دیئے جاتے ہیں:

"عطا" خبطا کہاں خاموش رہتا   سخن گر از زبان برگوش رہتا.
چو مجنون ذوفنونِ راز اینجا،   کہ بی پروا ز خود بیہوش رہتا.
ز خود خونِ جگر پیتا و جیتا   بدرد و داغ ہم اغوش رہتا.
مسافر را همین آب و غذا خوش   کز اشک و آہ دوشا دوش رہتا.
چون گل رنگِ حنا بندی بریزد   چو نیلوفر کہ نیلی پوش رہتا.
ہر دم آدمی بیچارہ بی تاب
بغم‌ها غوطہ نوشا نوش رہتا.[2]

دوسری مثال:۔

غبارِ فقر مرا روپ رو برنگِ بھبوت   چہ کلجگ است کہ از بھوک جوگیاں ماریت.
بہ سینہ سوختہ پھر دیکھنا نہ دکھہ دینا   ز دل شکستہ نہ پینا لھو سمجھ ای میت
بہ اھل ترس نہ سینا (سیان نباید دست)   کہ داب مردم دانا باھل درد پریت.[3]

---

1. ماہنامہ نئی قدریں۔ سندھی ادب نمبر شمارہ ۵۔۶ جلد ۲۷ ۱۹۷۳ء مقالہ "اردو پر قدیم سندھی کا اثر" مقالہ نگار ڈاکٹر اسعد اللہ شاہ حسینی صفحہ ۳۴

2. دیوان عطا مرتب سید محمد مطیع اللہ راشد برھانپوری۔ سندھی ادبی بورڈ [2] مقالات الشعراء مصنف میر علی شیر قانع.

3. دیوان عطا صفحہ ۴۵۹.

میر حیدرالدین ابوتراب (سنہ ۱۱۰۰ھ / سنہ ۱۶۸۸ء تا ۱۱۶۴ھ / سنہ ۱۷۵۱ء) میر حیدرالدین ابوتراب خانوادہ امیر خانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے وقت کے بڑے فارسی گو شاعر تھے۔ ان کا تخلص کامل تھا۔ فارسی کے علاوہ سندھی اور اردو زبانوں میں بھی شاعری کی تھی، کامل حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہم عمر اور ہمعصر تھے ان کی زندگی کا مختصر احوال ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ[1] نے "سندھ میں اردو شاعری" کی کتاب میں دیا ہے۔ ان کی ایک اردو غزل دی جاتی ہے

پیارے لڑکے ہمیں ستانا کیا — ہر گھڑی لڑکے روس جانا کیا۔

پھر سجن پاک سچ چلے ہیں کیوں — بات ہے ہیچ میں بتانا کیا۔

یوں جلا کھیل میں یو جاتا ہوں — اے شمع رونپنگ اڑانا کیا۔

یار جانا کی بات جانی مس — یہ نہ جانے تو پھر نہ جانا کیا۔

دلبری میں سکھے سو کچھ نامیں — دل چرانے میں دل چرانا کیا۔

شمع کہتی جلی جلی بتیاں — کاٹنا سر جلا جلا نا کیا۔

تیغ غمزے کی زور کامل پر — جو بہانا، تو پھر بھانا کیا۔

میر محمود صابر رضوی

میر محمود صابر سید رضوی خاندان سے تھے۔ ان کا اصل وطن استر آباد ایران تھا۔ ان کے والد نے ایران سے ہجرت کرکے ہندوستان آکر جہان آباد میں سکونت کی تھی، وہاں سے دہلی چلے آئے۔ اور سنہ ۱۱۱۵ھ میں سید محمود تولد ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد وطن جانے کے ارادے سے سندھ کی راہ سفر اختیار کیا۔ جب ٹھٹہ پہنچے تو شہر پسند آگیا اور وطن جانے کا ارادہ ترک کرکے سندھ کو اپنا وطن بنایا۔ میر محمود صابر کو ٹھٹہ میں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی اور مخدوم محمد معین ٹھٹوی جیسے بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ ان کی صحبت میں رہکر شعر و شاعری شروع کی۔ فارسی شاعری میں کمال حاصل کیا۔ ابتدائی اردو معلیٰ سے پہلے ہی واقف تھے۔ اور مخدوم محمد معین کی صحبت میں اردو شاعری بھی شروع کی۔ حالانکہ ان کے دور میں ولی دکنی کی شاعری کا چرچا سندھ میں ہو چکا تھا۔ ولی کی شاعری سے متاثر ہوکر ان کی تعریف میں خود کہا ہے:

سن ریختہ ولی کا دل خوش ہوا ہے صابر — حقا ز فکر روشن ہے انوری کے مانند۔

صابر کے اردو کلام میں بڑی پختگی ہے اور ابتدائی اردو شاعری میں افضل سمجھا جاتا ہے۔ صابر شاہ عبداللطیف بھٹائی[2] اور دہلی کے اکثر استاد شعراء کے معصر تھے۔ ان کے کلام سے ایک غزل نقل کی جاتی ہے:

تجھ زلف کے بچھوں کو پکڑ کون سکیگا — اس زہر بھری لٹ کوں جکڑ کون سکیگا۔

ابرو کی کمان کھینچ جو توں کھولیگا گھونگٹ — پلکاں کے خدنگ آگے ٹھر کون سکیگا۔

ہیں کاتب قدرت خط یاقوت کے جراں — تفسیر ترے حسن کی پڑھ کون سکیگا۔

تجھ چہرہ کی رنگ دیکھ گلی شرم سوں بانکی — اس طرۃ کی سنج دیکھ اکڑ کون سکیگا۔

ہے فتنہ گری کام تیری شوخ نگہ کا — غمزہ کے مقابل ہو جھگڑ کون سکیگا۔

ہر موج ہے تجھ عشق کے دریاؤ کی خونخوار — غیر از کشش شوق کے تڑ کون سکیگا۔

تا عمر ہی تجھ در کے بکھاری ہو رہینگے — اغیار سوں ہر بات میں لڑ کون سکیگا۔

صابر ہے تیرے عشق میں مشہور و گرنہ — تجھ نیہ میں دم عشق کا بھر کون سکیگا۔

---

[1] "سندھ میں اردو شاعری" مولف ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ مہران آرٹس کونسل حیدرآباد سندھ۔ صفحہ ۹ - ۱۵

میر حفیظ الدین علی میر حفیظ الدین، میر حیدر الدین ابوتراب کاملؔ کے بھتیجے تھے کاملؔ کی انہوں نے بڑی تقلید کی ہے، اس لیئے اُن کے کلام میں وہی رنگ موجود ہے۔ میر علی شیر قانع نے مقالات الشعرا میں ان کے متعلق لکھتے ہیں [1]:

در زمین لطائف و غرایب شعر بزبان ہندوی، خسرو ثانی است معانیھارا کہ وی دھرھا۔

وکبت والہیات و نکات ہندی ی بندہ فہم ان برھمہ کس از قبیل دشوار۔

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

اچاو ہو اکھٹا پا پر لیئے ہے بچھے   سر کا بنا تو آکی سوتی سلونی اچھے۔

دوسری مثال:۔

پیلے ہے کیوں کنارے سونا ہیں ہر کا   چونی پھوپی۔ ہی باتیں موتی تو دیکھ رہا کا۔

روحل فقیر ۱۱۳۲ھ - ۱۱۹۴ھ روحل فقیر کا درجہ سندھ کے اعظیم شعراء میں کیا جاتا ہے۔ اس کی ولادت تھر کے علاقہ میں ۱۱۳۲ھ میں ہوئی۔ والد کا نام شاہو تھا۔ اور ذات کے زنگیجہ تھے۔ ابتدا میں روحل فقیر کی تعلیم ہندو پنڈتوں سے ہوئی۔ بعد میں اسلامی درسگاھوں میں تعلیم مکمل کرلی۔ جوانی میں کلہوڑہ بادشاہ کی ملازمت اختیار کی تھی۔ لیکن میاں سرفراز کلہوڑہ کے عہد میں بڑھتی ہوئی بد امنی اور بے چینی کو دیکھکر ملازمت چھوڑ کر جھوک بیرانپور جاکر شاہ عنایت صوفی شھید کے فرزند صوفی عزت اللہ کے مرید ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد مرشد کے ارشاد سے جنوبی سندھ کی طرف کوچ کیا۔ اور ایک غیر معروف مقام پر اقامت کی جس کو کنڈڑی کا نام دیا۔ روحل کا سندھی کلام اتنا نہیں ہے جتنا سرائکی اور ھندی کلام ہے۔ کلام کا موضوع تصوف ہے۔ جس میں وحدت الوجود کا فکر موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

ستگر جی میں سرن تمہارے آیا۔

من میں ممتا رہی نہ کائی   درد مٹیا سکھ پایا۔

گیان سورج گھٹ نیتر ہوتا،   اکھنڈ جوت رنگ لایا۔

جس کارن جگ پھرت اُداسی   سو گھٹ نیتر پایا۔

جنم مرن کا سدا بھاگا   چیتن سوں چت لایا۔

پارس سے جب پرچا لاگا   لعل امر بھئی کایا۔

اگم دیس کو انتر مارگ   ستگر موہ بتایا۔

"روحل" رتن امر تک ملیا   بھاگ پرایت پایا [2]

حضرت حاجی شاہ فقیر اللہ علویؒ حاجی فقیر اللہ صاحب علویؒ کا ذکر "شاہ بھٹائی کے ھمعصر سندھی شعراء" کے باب میں تفصیل سے دے چکا ہوں۔ حاجی صاحب اپنے وقت کے بڑے بزرگ کامل ولی اور فارسی عربی زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اردو زبان میں بھی شعر کیا ہے۔ حالانکہ آپ کا اردو کلام اتنا دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کے دور

---

[1] مقالات الشعرا۔ میر علی شیر قانع۔ ...... کنڈڑی شہر۔

[2] کنڈڑی والوں کا کلام "سندھی۔ مرتب مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی۔ مطبع (سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ) صفحہ ۱

[3] ۔ ایضاً ۔

افتادہ شہر شکارپور سے اس قدیم زمانے میں اردو کی صدا بلند ہوئی۔ آپ کے اردو کلام میں وہ شستگی نہیں ہے۔ مگر قدیم دہلی اور دکن کی ریختہ شاعری کے مقابل ہو سکتا ہے۔ حاجی صاحب نے اپنی زندگی بہت سفر کیئے۔ بقول صاحب تذکرہ لطیفی حاجی صاحب ۱۱۳۰ھ ہجری میں قندھار کے راستے سندھ میں آکر شکارپور شہر کو پسند کرکے سکونت اختیار کی۔ یہ شکارپور شہر کی خوش نصیبی ہے کہ حاجی فقیراللہ صاحب جیسے جید عالم یہاں کی پاک زمین سے پیوندخاک ہیں۔ حاجی صاحب کئی مرتبہ حج بیت اللہ کو گئے سفر کے دوران ٹھٹھ کے علاوہ سورت بندر میں بھی اکثر قیام فرماتے تھے۔ جہاں بڑے بڑے بزرگوں سے راہ رسم حاصل کی تھی۔ ٹھٹھ کے اکثر بزرگ مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی، مخدوم محمد معین ٹھٹوی اور دیگر عالموں سے ملاقات رہتی تھی۔ جن کی صحبت میں اردو زبان میں بھی ناصحانہ کلام کہا۔ آپ کی اردو کو یہاں دیا جاتا ہے۔

مناجات

شمس الضحیٰ بدرالدجیٰ ارحم نبی المجتبیٰ | کانِ وفا بحرِ عطا ارحم نبی المجتبیٰ
سرتا قدم پراز گناہ آکر پڑا تیری پناہ | کر لطف کی مجھ پر نگاہ ارحم نبی المجتبیٰ
سر پرگنہ کا پوٹ ہے، بھاری پڑی چون کوٹ ہے | تجھ باجھ کب مجھ چھوٹ ہے ارحم نبی المجتبیٰ
سب عمر در حرص وھوا کی صرف یاور در بلا | کر مہر کی مجھ پر عطا ارحم نبی المجتبیٰ۔
دے استقامت دین میں رکھ اس شہا آئین میں | راسخ قدم تمکین میں ارحم نبی المجتبیٰ۔
دل جان سے توبہ کیا، بد راہ سے گوشہ کیا۔ | محکم یقین اس نے دیا ارحم نبی المجتبیٰ۔
علم و عمل، عفت ادب، تقویٰ دیانت روز شب | کر بھر اس احقر طلب ارحم نبی المجتبیٰ۔
جب موت کا پیالہ پیوں، دن حشر کے پھر کر جیون | گر ھول سے بچلا بہون ارحم نبی المجتبیٰ
جب در نزع مسکین کون، جھگڑا پڑے بے دین سون۔ | تب ھاتھو دے غمگین کون ارحم نبی المجتبیٰ۔
اے سرور سالاردین۔ اے رھبرِ اصل یقین | اے شاہ ختم المرسلین ارحم نبی المجتبیٰ۔
روزِ قیامت سر بسر ہوگا، پر از خوف وخطر | کر اصل محشر پر نظر، ارحم نبی المجتبیٰ۔
عصات کا جو راج ہے، آن پر پڑا کو تاج ہے | دامن لگے کی لاج ہے ارحم نبی المجتبیٰ۔
ہے گدا یا بادشاہ، در آپ کے پُر داد خواہ | تم باجھو ناہیں عفو خواہ ارحم نبی المجتبیٰ۔
از سختیٔ روزِ حشر، چون سپر گرود ہر بشر۔ | دامن لگوں کے غور کر ارحم نبی المجتبیٰ۔
اے داد خواہ انس وجان، بہر خدا ہو مہربان | ھو عفو بہر عاصیان ارحم نبی المجتبیٰ
جو کام ہے دارین میں، گذران ہوسکھ چین میں | کر بخشش طرفہ عین میں ارحم نبی المجتبیٰ

آیا "فقیر" از صدق دل گو ہے گناھوں میں خجل
خواہ بھر او زحق بجل ارحم نبی المجتبیٰ۔

۱؎ یہ مناجات حضرت حاجی فقیراللہ شاہ علوی ؒ نے حج کے موقعہ پر لکھی تھی۔ جس کے لئے خود لکھتے ہیں تاریخ بسیت نہم ۲۹ ذی القعدہ ۱۱۶۳ھ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ در حرم محترم بیت اللہ شرفہا اللہ تعالیٰ در حاشیۂ مطاف مواجہ رکن شامی تالیف مناجات "بیاض لطف" مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی نگاہ اصلی متن میں لکھا ہوا ہے در اصل لفظ گناہ ہے۔ باجھ قدیم اردو لفظ ہے جسکی معنیٰ "بغیر" ہے

ول،

بگرداب عصیان فرو رفت خاطر — بلطفت ازیں ورطہ بردار بردار.

مرا نفس و شیطان ز راہم بردہ — شب و روز ہے اندر اصرار اصرار.

بروز جزا گر کریں سوال ہم سے — تلطف تمھارا ہے درکار درکار.

بچشم کرم گر کنی یک نگاہے — شود جلد آسان ہے دشوار دشوار

مجھے نور کا رنگ اپنا دکھا دو — شود جسم و جان جس سے انوار انوار

ہمہ را بود یک جہت قبلہ گاہی — مرا قبلہ گاہست دلدار دلدار

تمہارا سوالی ہیں کوئی خالی — کرامداد یا شاہ مختار مختار

غرۃ ربیع الاول سنہ ۱۱۹۴ھ

بھگوت گیتا:- سندھ میں قدیم اردو کا ایک اور سراغ ملتا ہے جو ایک ھندو اساس گولاپتداس نے بھگوت گیتا کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا ہے۔ جس کے شروع میں اور آخر کے صفحات پر فارسی کے ساتھ ھندی اور اُردو زبان میں کچھ کلام دیا ہے جس کی تاریخ کتابت پانزدھم ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۵ ہجری دیا ہے۔ حالانکہ شعر میں بہت سی غلطیاں ہیں لیکن سندھ میں قدیم اُردو کی یقین دہانی ہوجاتی ہے۔ نظم کے چند اشعار نقل کیئے جاتے ہیں۔

یہ عرض عجز آمیز من سُن کان دھر بہرے خُدا — بیکس بھیا ہوں کہ نہیں غمخوار اب غیر خُدا

پابند قسمت کا ہوں بیدل بہت جانے خُدا — از یاوری بختم اگر دل میں مہر ڈالے خُدا

یا غور کُن یاد وداع خلق خدا ملکے خُدا

طاقم چو شد طاقت بسے لپنات آکر موں دھنے — مووے او چاہت، سون سنے ہم چشم جبھ ترت ہنے

چو ترحشقت سوں کیہ مفلوک گشتم مفلسے، — حالت سوناوں کہہ کسے بے گفتہ کی داند کسے.

یا غور کن یاد وداع. خلق خدا ملکے خدا.

کل میں رہے پہاتے جیکے تن پر تنکاری نت تکے — جہارے سے سارے نس چکے سینے سے آکہوتیں لگے

از بس حیا کہنا سکے و زکینہ گردون بدرگے — گشتیم چوں جو کے بکے آدیس کر پانوں لگے.

یا غور کن یاد وداع. خلق خدا ملکے خدا. (الخ)

مراد فقیر سنہ ۱۱۴۲ھ - سنہ ۱۲۱۱ھ:- مراد فقیر، روحل فقیر کے مرید اور قریبی عزیز تھے۔ اور ھمیشہ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ مراد فقیر کے والد کا نام محمد حیات تھا۔ ان کی ولادت سنہ ۱۱۴۲ھ میں ہوئی تھی۔ مراد فقیر اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ ان کا سندھی ھندی سرائکی اردو زبانوں میں کلام موجود ہے۔ کلام سے یہ ابیات دے جاتے ہیں۔

نہ کہوں اوے نہ کہوں جاوے — آپ ھیں ہیں پھر آپ تمارے

میوہ ساگر پر اینگ تر نگا — ات ایک اور جا جو رنگا.

اس طرح بارھویں صدی ھجری میں سندھ میں اُردو شاعری کو بڑا فروغ ملا یہ کلہوڑہ حکمرانوں کا دور تھا۔ حاکم خود بھی ادب نواز تھے۔ اس لئے شاعروں کی سرپرستی میں سندھی فارسی اور اردو زبانوں کی بڑی ترقی ہوئی۔ یہ سندھ کا سنہرا دور تھا۔ جس میں اُردو شعرا پیدا ہوئے جن میں سید ثابت علی شاہ، محمد عظیم تتوی، حضرت سچل سرمست، میر کرم علی خان میر غلام علی مائل، حضرت قادر بخش بیدل روھڑوی۔ ان بزرگوں نے اردو شاعری کو عروج پر پہنچایا۔ جس کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں سندھ نے بھی اُردو کی نشونما میں حصہ لیا۔

رسالہ ھندوستان کراچی جنوری - فیبروری ۱۹۴۲ع لکھنؤ مدیر - اے - جی - کاروانی - سکو کنڈڑی والوں کا کلام مرتب مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی.

سچل سرمست :- ۱۱۵۲ھ - ۱۲۴۲ھ

• عارف حق آگاہ سالک مسالک حضرت حافظ عبدالوہاب فاروقی سچل سرمست بن میاں صلاح الدین بن حضرت فقیر صاحبڈنہ فاروقی رحمۃ اللہ علیہ فضل و کمال شاعر و بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں درازہ شہر میں ہوئی۔ آپ کا خاندان امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ جد امجد حضرت شیخ شہاب الدین فاروقی فاتح سندھ محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آئے۔ محمد بن قاسم نے جب سیہون کو فتح کیا تو شیخ موصوف کو وہاں کا نواب مقرر کیا۔ آپ نے ۱۳۴ھ میں وفات پائی۔ اس خانوادہ فاروقی میں سے مخدوم نورالدین اپنے علم و فضل سے مشہور ہوئے یہ خاندان سیہون سے ہجرت کرکے کاکڑی کے شہر میں آباد ہوا۔ حضرت مخدوم بہاءالدین ذکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ جب سندھ میں تشریف ہوئے تھے تو آپ نے فاروقی خاندان کے بزرگوں سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس خاندان نے اپنی گنبٹ اور رانی پور کے درمیانی علاقہ کی جاگیر اپنے دولائق خادم دراز ونڈیرا اور کاچھن ونڈیر کے سپرد کردی۔ جنہوں نے علحدہ علحدہ اپنے ناموں پر گاؤں آباد کیئے۔ کاچھن کا گاؤں آباد نہ ہوسکا، لیکن دراز کا گاؤں آباد ہوا، جو درازہ کے نام سے مشہور ہوا۔ فاروقی خاندان کاکڑی شہر سے ہجرت کرکے درازہ میں آکر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ درزاہ شہر کو شہرت دینے والے حضرت میاں صاحبڈنہ فاروقی تھے۔ فقیر صاحب کو دو فرزند تھے بڑے کا نام میاں صلاح الدین اور چھوٹے کا نام میاں عبدالحق تھا۔ سچل سرمت کے والد میاں صلاح الدین عین جوانی کے عالم میں وفات کر گئے، اور سچل سرمست کی تعلیم و تربیت میاں صاحبڈنہ کی نگرانی میں ہوئی ظاہری علوم کے ساتھ اُنہوں نے قرآن پاک بھی حفظ کرلیا۔

روایت ہے کہ جب سچل سرمست سات برس کے تھے تو حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی[1] رحمۃ اللہ علیہ آپ کے جد بزرگوار حضرت صاحبڈنہ کی ملاقات کے لئے درازہ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے نونہال سچل کو دیکھکر فرمایا تھا، "ہم نے جو دیگچی چڑھائی ہے اس کا ڈھکن یہ بچہ اُتارے گا" شاہ بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ کی پیشنگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ فقیر صاحبڈنہ کی وفات کے بعد سچل سرمست کی تربیت ان کے چچا میاں عبدالحق کے ذمے ہوئی۔ فارسی کے ساتھ روحانی فیض بھی حاصل کیا۔ سچل سرمست اپنے چچا میاں عبدالحق کے ارادتمندوں میں داخل ہوگئے۔ چچا کو بھی اپنے بھتیجے سے بیحد محبت تھی سچل ایک پرخلوص مرید کی طرح رہے، اپنے مرشد کی شان میں فرمایا ہے[2]

گر بگوئی می شوم واقف ازان اسرار واز — پس کو کن با صدق دل روئی بسو شہر دراز
ہست آنجا پیر عبدالحق عارف اولیا، — می کند آگہ سر وحدتش مسکیں نواز
در رضای دوست، صابر شاکران مرد خدا — در نیازست باہمہ اماز و دنیا، بی نیاز
جز خدا ہرگز نداند ہیچ موجودی دگر — ہست ان سلطان حقیقت در دوعالم سرفراز

آشکارا و نہان شو از غلامانش غلام
باب عشق و معرفت را بر ہمہ کردہ است باز

1۔ حضرت شاہ عبداللطیف رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۷۵۲ء میں وفات فرمائی تھی۔

2۔ دیوان آشکار (فارسی) حضرت سچل سرمست رحمۃ اللہ علیہ طبع منشی بشن لال صاحب محلہ گنج لکھنو صفحہ ۶۲ —

میاں عبدالحق کی صحبت میں رہکر آپ نے روحانی مدارج طے کیئے، اور حال و قال دونوں میں طرۂ امتیاز حاصل کیا، آپکی پوری زندگی جذب اور حال میں گذری اسی وجہ سے سرمست کے لقب سے مشہور ہوئے، آپ کی زندگی عبادت الہی اور گوشہ تنہائی میں گذری سچل سرمست کی ملاقات حضرت محکم الدین سیلانی چشتی بہاولپوری سے ہوئی، جس نے اس کی حالت بدل ڈالی اور رات دن سماع میں مشغول رہے شعر و شاعری کا شوق ہوا، آپ کے کلام میں صرف قال نہیں ہے بلکہ حال بھی ہے۔ سچل سرمست پہلا شاعر ہے جنہوں نے قدیم شاعری کے ساتھ سندھی شاعری میں غزل کی شروعات کی، شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے بعد سچل سرمست کا اسم گرامی امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

سچل سرمست نے بڑی عمر پائی، نوے برس کی عمر میں رمضان المبارک ۱۲۴۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور درازہ میں مدفون ہوئے، آپ کی مزار مرجع خلائق ہے جہاں ہرسال رمضان المبارک میں بڑے اہتمام سے عرس ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح لکھی ہے

<u>آفتاب اوج عشق</u>
۱۲۴۲ھ

درازہ کے صوفیانہ مکتب فکر کے صحیح معنیٰ میں روح رواں سچل سرمست رح تھے۔ انہوں نے اسلامی تصوف کو ایرانی رنگ نہ صرف پیش کیا بلکہ ایرانی شعراء سے بھی بہت آگے نکل گئے ہمہ اوست کے فلسفہ کا ان پر بڑا اثر تھا۔ سچل سرمست کے کلام میں وہی رنگ جھلکتا ہے جو سندھ کے عظیم شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے کلام میں موجود ہے، مثال کے طور پر یہ بیت دیا جاتا ہے:-

کٿي ساڻ ڪٿي، جا آند ٿين ملڪ مليرڪان
متي تان مارئي جي، اُما لحظو ڪين لٿي،
لوئي سندي لڄ ڪان ڍڪيان پٽ نہ ٿي،
هت سورن جي سٽي، هت ڏوراپن ڏکوئيو.

"مارئی اپنے ساتھ جو پشمین چادر لے آئی ہے، وہ ایک گھڑی کے لیئے بھی ان کے سر سے جدا نہ ہوسکی اس لوئی (پشمی چادر) کی عزت اور آبرو کی وجہ سے وہ ریشم اوڑھ نہیں سکی یہاں غم نے مجھے مارا ہے اور وہاں مجھے طعنے دیکر دکھ دیا جاتا ہے"

سچل سرمست ہفت زبان شاعر مشہور ہے اور کثیر التعداد تصانیف چھوڑیں، فارسی شاعری میں اپنا تخلص آشکار کرتے تھے باقی زبانوں میں سچو، سچل۔ اور سچڈنہ تخلص اختیار کیا ہے۔

سچل سرمست نے اردو میں بھی طبع آزمائی ہے، جو اس وقت کے لحاظ سے اعجاز کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ اس وقت اردو شاعری اپنی ابتدائی منازل طے کر چکی تھی۔ اردو شاعری کے مشہور شاعر سراج الدین علی خان آرزو کی وفات کے وقت آپکی عمر ۱۷ سال تھی۔ اردو زبان کے مشہور عالم و شاعر نسیم امروہی نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے "سچل سرمست نے جو غزلیں صوفیانہ طرز میں پیش کی ہیں وہ آج بھی مقبول ہیں" سچل سرمست اپنے ہی اردو کا بلند پایہ شاعر تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں مشہور استخدہ شعرا اُن کے ہمعصر تھے۔ ان میں مصحفی۔ انشاء۔ نظیر اکبر آبادی، رنگین اور نصیر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی اُردو شاعری میں حالانکہ پختگی نہیں ہے، لیکن وہ قدیم دکنی اردو سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ چند اشعار دکنی شعرا کا ملاحظہ ہو

۱؎ نخلستان گورمینٹ کالج شکارپور میگزین ۱۹۶۹ء مقالہ حضرت عبدالوہاب فاروقی مقالہ نگار راقم الحروف

بیمار ہوں تیرے برہ کا چھوٹن مرا مشکل ہوا
یہ درد مرا دیکھ کر افلاطون لایعقل ہوا
اے یار تو آتا نہیں مجھ پر شفا بخشش کرو
اس درد میرے کی دوا آنا تیرا اک پل ہوا۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کا کلام ملاحظہ ہو:-

گلشن ہے تو پیارے، بلبل ہے دل ہمارا
رنگ باس دونوں، تجھ میں پھل ہے پھلیا ہوا۔

ولی دکنی کا اردو غزل دیا جاتا ہے:- [۱]

اہلِ گلشن پر تیرے قد نے جب امداد کیا — اولامر کوں غلامی سینے آزاد کیا
اس کی تعظیم ہوئی اہلِ چمن پر لازم — بلبل باغ نے جب مصحفِ گل یاد کیا
روز ایجاد تیری چشم سوں اے نورِ نظر — حسن کے فرد پر دیوان ازل صاد کیا
سب سوں ممتاز ہوا سلسلۂ معنی میں — دل دیوانے کوں جب عشق نے ارشاد کیا۔
سینۂ بلبل و قمری کوں کیا محشرِ درد — جب کہ اس سرو نے سیرِ گل و شمشاد کیا۔
آج مجھ یاد آئے دلبر شیریں حرکات — آہ کوں دل کے اوپر تیشۂ فرہاد کیا

اے ولی جب سوں کیا عشق تحصیل جنو
روح مجنوں نے اپس کا مجھے استاد کیا۔

اسطرح سچل سرمست کی اردو شاعری کو دیکھکر دکن اور قدیم دہلی کے اردو شعرا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سچل سرمست کا کلام بحرِ بے پایاں ہے، اردو میں جو آپ کا کلام ہے وہ حقیقت میں اس سے ان کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتی۔ البتہ وہ اردو کے لئے ایک قابل صد افتخار سرمایہ ہے کہ سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں وادی مہران کے عظیم صوفی شاعر نے اپنی کرم نوازی سے، اُردو میں طبع ازمائی فرماکر اردو کی نشو ونما اور اشاعت میں حصہ لیا۔ آپ کے اردو کلام کی مثالیں دی جاتی ہیں:- [۲]

کیا کروں میں جو مرا کوئی اختیار نہیں — ہائے رے، آج مرے پاس وہ دلدار نہیں۔
نبض کو دیکھ کے مایوس افلاطو بھی ہوا — کہدیا صاف کہ یہ مست تو ہوشیار نہیں۔
تجھ کو تو درد نہیں، یار نے سچل سے کہا — میں نے رو رو کے کہا، تجھکو اعتبار نہیں۔

---

[۱] دکن میں اردو   مولف نصیرالدین ہاشمی   صفحہ ۲۵۰
[۲] سندھ میں اردو شاعری   مولف ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ   مہران آرٹس کونسل حیدرآباد ۱۹۶۷ء

غزل

ایک دن بازار اندر دیکھا عجب نظارا .
طفلان کے ہاتھ میں . ایک بلبل ہوا بیچارا .
پرو ہاں رشتہ اندر اس کا کیا تھا محکم
تڑپن سے وہ نہ چھوٹا کرتا تھا لاکھ پکارا
ہم حال اس سے پوچھا کہ بلبل ہمیں سوں
کس حال میں پڑا ہے ، چھوڑا چمن ہزارا
ہنس ہنس کے گویہ ہویا ، تجھکو خبر نہیں ہے
عاشق کا حال جو ہے . وہ حال ہے ہمارا
دم عشق جس نے مارا ، اس کے گلے میں رشتہ
سر جان اس پر صدقہ "سچو" سریر سارا .

غزل

میرے پاس کہہ ری قاضیا کیسا تمہارا کام ہے   تجھکوں کتابوں کی خوشی ، مجھکوں سارا ما تام ہے
ڈالیں کتابو نمکا ورق عاشق . عشق کی اگ میں   میرا نام ایک یاد کر یہی دوست کا پیغام ہے
اُسکی ہجر مجھکوں لیا کہتے ہو تم تم کتاب پڑھ   میرے گھر اُسی محبوب کے آنے کا آج انجام ہے
ایکدم بھلانا یار کوں نا عشقوں کا کام ہے   سجدہ سہو اُسکو نہیں جسکا عشق امام ہے
رہے نیکنامی تم لئے ای عشق سیں بے خبر   تیری جماعت کے آگے برہ سارا بدنام ہے
یہی درد سر مطلب ہوا مُرشد ہم کوں یوں کہا   بن عشقِ سچو یار کے کیا کفر کیا اسلام ہے

غزل

بہتر ایسی زندگی   بن عشق ہے شرمندگی .

جسکو سجن کا درد ہے . رونت اُسکی زرد ہے   اِس اَس جگت سوں مرد ہے صف عاشقانکے مرد ہے
عاشق اول جس غم ہوا . دونوں جگت ایکدم ہوا   دنِ رین اس ماتم ہوا اکیوں آب آگم ہوا .
برہ ظاہر بدنام ہے باطن میں کیا یہ کام ہے   نا صبر نا آرام ہے وہ واس اُس ماتم ہوا .
یہ عشق عجب آفات ہے نا کشف . یہ کرامات ہے   تقویٰ نہ کوئی طاعت ہے . جس میں نہ مرجوعات ہے
وہ ایک دم دیوانگی گم کر نہ یہ فرزانگی   یہی اصل ہے مردانگی . بن عشق ہے بیگانگی ،
کردیں بدل زنار پر یہ ہی حال ہے ہوشیار پر   منصور ہو چڑھ دار پر کہہ انا الحق سو خار پر
سُولی اوپر منصور ہے . منظور ہے مشہور ہے   مئے پی کے ہوئے مخمور ہے ، اُسکا عجب مذکور ہے
بارِ برہ کا بار ہے ، سر عاشقان سینگار ہے   "سچو" کے سر خار ہے . یہی عشق کا اسرار ہے .

باب دوم

اُردو زبان کی ابتدائی نشوونما

سندھ میں عربوں کی فتوحات کے بعد ایک مدت تک اُنکا اقتدار رہا، جس سے مقامی زبان پر بڑا اثر رہا، عربی زبان سندھ کے حدود سے نکل کر ہندوستان کے مختلف علاقہ میں پہنچی اور وہاں کی زبانوں پر اپنا اثر جمایا، عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کثرت سے شامل ہونے لگے۔ اس سے پنجاب بھی متاثر ہوا۔ اُردو کی ساخت میں عربوں کے سندھ پر اقتدار نے کس قدر اعانت کی، اور تمام سندھ کے حصوں سے اردو زبان کو مدد ملی ہوگی۔ محمود غزنوی کے حملے کے بعد اُن کا سیاسی مرکز وہ علاقہ تھا جو لاھور سے لے کر دہلی آگرہ اور میرٹھ تک تھا۔ پنجاب میں غزنوی حکومت کا اقتدار اندازاً دو سو برس تک رہا، اس عرصہ میں ہندوؤں کی زبان پراکرت ہندی بھاشا تھی، مسلمانوں سے تعلقات بڑھائے اور فارسی زبان سیکھی۔ مسلمانوں نے بھی ہندی زبان جان لی اس طرح اس وقت کے فارسی شعراء کے کلام میں ہندی الفاظ شامل ہونے لگے بلکہ اس زمانہ کے مشہور فارسی زبان کے شاعر مسعود بن سعد کے محمد عوفی نے اپنی تصنیف لباب الالباب میں لکھا ہے کہ عربی فارسی کے علاوہ اس کا ہندی زبان میں بھی کلام موجود تھا۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں وارد ہونے کے وقت، ہندستان کی عجیب حالت تھی، ملک، مختلف حکومتوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر حکومت کی زبان بھی جدا جدا تھی، مسلمانوں کی زبان عربی مذہبی زبان تھی، علمی زبان فارسی اور ترکی تھی۔ اس سے روزمرہ کی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن دفتر، فوج اور دربار کی زبان فارسی تھی۔ لیکن زندگی اور حکومت کی ضرورتیں اُنہیں عام لوگوں کی زبان کو استعمال کرنے پر مجبور کیا۔ اس طرح عام لوگوں کے لیئے بھی ہوا کہ وہ اپنی بات نئے آنے والوں کو سمجھانے کے لیئے ان کی زبان کو استعمال کرنا شروع کیا۔ محکوم زبان کا اصلی زبان "ہندی" سے میل کے بعد ایک نئی زبان وجود میں آئی جو "ہندوی" کہلاتی رہی بعد میں جب شاعری میں استعمال ہوئی تو ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس سے مراد "ملی جلی" زبان ہے جسکو آگے چل کر ہندوستانی زبان رکھا گیا۔ یہ زبان رفتہ رفتہ اُردو معلیٰ کہلانے لگی اور عرصہ کے بعد معلیٰ نکل گیا اور اُردو رہ گئی جو مقبول عام ہوگئی۔ شہنشاہ اورنگزیب کے عہد تک اُردو نام کی زبان کسی تحریر میں نظر نہیں آتی۔

اُردو زبان پنجاب و سندھ میں بنی، جس نے دہلی میں ایک حالت میں نئی زبان کا روپ اختیار کیا۔ صوفیوں، درویشوں اور سلطنت دہلی کے لشکروں کے بدولت، گجرات، دکن پنجاب، اور دوسرے علاقوں میں پہنچی اور بڑی تیزی سے پھیلی۔ اس سلسلہ میں سب سے پرانی تحریر میر امنؔ دہلوی کی ہے جو انہوں نے باغ بہار کے دیباچہ میں دی ہے یہ کتاب ۱۲۵۱ھ میں شروع کی اور ۱۲۱۷ھ میں لکھ کر ختم کی۔ لکھتے ہیں۔

حقیقت اُردو کی زبان کی، بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے۔ اُنہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے، اور اپنی بھاکھا بولتے تھے۔ ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا۔ سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی امیزش پائی۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد، سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ اُن کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔"

حاجی امداد اللہ تھانوی[2] کی سوانح حیات میں پروفیسر محمد انوار الحسن صاحب لکھتے ہیں۔

---

[1] اردو ادب مقالہ نگار عزیز احمد ثقافت پاکستان ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی۔

[2] باغ و بہار۔ قصہ چہار درویش۔ مولف میر امن دہلوی مترجم عطا حسین خان ــ مطبع نیا ادارہ لاھور صفحہ ۲۱۔

ان امور کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت معلوم ہوئی کہ ۱۲۶۸ھ میں حاجی نے آج سے ایک سو نو سال پہلے اردو کو ہندی کے نام سے یاد کیا ہے گویا اردو کو اس دور میں ہندی کہتے تھے ملاحظہ ہو یہ شعر۔[1]

کیا میں نے ہندی ملا کر کچھ اور   کہ تا خاص اور عام سمجھیں بغور ۔

مرزا نثار علی بیگ (مدرس اول آگرہ کالج) نے اپنی کتاب رسالہ قواعد اردو حصہ سوم میں اردو زبان کی ماہیت کے تحت ۱۸۶۹ء میں لکھتے ہیں[2]

اُردو کے معنیٰ پادشاہی لشکر کے ہیں، چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں بادشاہی فوج کو اردوی معلیٰ لکھا ہے، لشکر کے سپاہی جو ایران اور توران کے ملکوں کے رہنے والے تھے، سودا سلف خریدنے کے لئے دہلی کے بازاریوں کے ساتھ جن میں اکثر ہندو تھے، جن کی زبان ہندی بھاشا تھی، فارسی ہندی آمیز بولنے لگے، رفتہ رفتہ شاہجہان کے عہد تک یہ زبان غلط سلط ہوکر ایک نئی زبان بن گئی اور اُسکا نام اردوی معلیٰ سے منسوب ہوکر زبان اردو ہوگیا اور کثرت استعمال سے لفظ معلیٰ دور ہوکر صرف اس زبان کا نام اردو رہ گیا۔"

ایک مستشرق عالم ٹی گریہم بیلی اپنی تصنیف "اُردو ادب" میں اردو کے متعلق لکھتے ہیں:-[3]

اُردو لفظ اصلی ترکی زبان کا ہے، جسکی معنیٰ لشکر یا چھاونی کی ہے، انگریزی ادب میں (ہورڈی HORDE) کہتے ہیں جو ساتھ کہا گیا، مسلمانوں کے لشکر یا چھاونی کی جگہ دہلی تھی جو ۱۱۹۳ء سے لیکر آگے بھی رہی، اردو جو اردو معلیٰ کہلائی جس کی معنیٰ اعلیٰ لشکر کی تھی، اس کا اعتراف ہے، یہ لشکر فارسی زبان بولتا تھا، اور شہر کے رہنے والے ہندی بولتے تھے، کوئی سبب نہیں کہ دلی کی اصلی زبان اس حالت میں رہے۔

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اور چھاونی کا مترادف ہے، اردو معلیٰ شاہی فرودگاہ کہلاتی ہے شاہجہان نے نئی دہلی آباد کی تو لال قلعہ اور اس کے حوالی علاقہ اس ممتاز لقب سے پکارا گیا مغل شہنشاہ کی ذات مرکز ہوا کرتی تھی۔ لوگ رہنے سہنے بلکہ ہر چیز میں "ان داتا" کی نقالی کرنے میں فخر سمجھتے تھے۔

الغرض متذکرہ بالا بیانات میرامن کے بیان سے کتنی مشابہت رکھتے ہیں، سیر المصنفین میں مولوی محمد یحییٰ تنہا نے ان بیانات کی تصدیق اس طرح کی ہے۔[4]

رفتہ رفتہ عہد شاہجہان میں آگرہ کے بجائے دلی پھر دار السلطنت قرار پائی۔ شہنشاہ، ارکان دولت وہاں رہنے لگے، اہل سیف اہل قلم، اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے، ترکی میں اردو بمعنی فرودگاہ یا لشکر آتا ہے۔ چونکہ اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے، اس لئے وہاں کی بولی کا نام بھی اُردو ہوگیا۔ اور یہ زبان خاص و عام میں شاہجہان کے اردو کی طرف منسوب و مشہور ہوگئی"

مولوی محمد حسین آزاد کی آب حیات اور اس کے بعد کے تمام تذکروں میں مرکزی خیال وہی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو دراصل ایک مقامی محاورہ کا نام ہے، جس نے دلّی کے لال قلعہ اور اس کے آس پاس کے چند محلوں میں پرورش پائی اور شعر و شاعری کے پروان چڑھ کر ہندوستان کے تمام حصوں کی ادبی زبان بنی، ظاہر ہے کہ جب تک کسی زبان کی جڑیں قوم کی تہذیبی اور روحانی روایات میں پیوست نہ ہونگی، اور جب تک اس کی بنیاد کسی زندہ

---

[1] حیات امداد (حاجی امداد اللہ تھانوی رح) مرتب محمد انوار الحسین انور صفحہ ۱۲۴

[2] رسالہ قواعد اردو حصہ سوم مصنف مرزا نثار علی بیگ۔

[3] Urdu Literature, (The Heritage of India Series) by T. Grahame Bailey P. 5

[4] سیر المصنفین جلد اول مصنف مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب، عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور صفحہ ۲۹ ۔

زبان پر نہ ہو جو کسی خاص گروہ یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ عوام میں بھی رائج ہو، اس وقت تک وہ عمومی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی۔ حکمرانوں کے دور اُردو ادب کے فروغ میں اس وقت مسلمان صوفیوں اور فقیروں کا بھی ہاتھ تھا۔ جو اپنا پیام اس ملک کے عوام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ یہ درویش عربی فارسی اور ترکی کے عالم تھے۔ لیکن اُنہوں نے محسوس کیا کہ اپنے روحانی پیغام کو ھندوستان کے عوام تک پہنچادیں اس لئے اُنہوں نے محسوس کیا کہ ھندوستان کے علوم، مذھبی اور فلسفہ حضرات کو جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ مسلمان علماء نے سنسکرت اور دوسری زبانوں کا مطالعہ کیا۔ اس کھری بولی میں فارسی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ سب سے پہلے فقرے اور اشعار مشہور صوفی بزرگ بابا فرید گنج شکر سے منسوب ہیں۔ آپ نے اس زبان کو ھندی یا ھندوی کہا۔ شیخ بہاو الدین باجن (۹۱۰ھ / ۱۳۸۸ء) نے اپنی تصنیف "خزائن رحمت" حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے یہ دو قول نقل کئے ہیں، جو ھماری رائے کو مستند کرتی ہے[1]

۱۔ راول دیول ھی نہ جائے پساٹا پہنہ روکھا کھائے۔

ھم درویشنہ رہے ریت پالی لوریں اور مسیت

۲۔ جسکا سائیں جاگتا، سو کیوں سوئے داس۔

ایک اور مثال نظر آتا ہے:-

سن ری سکھی پریم کی بتیاں یوں مل رہیں جوں دودھ بتیاں

حضرت شیخ بوعلی قلندر (۷۲۴ھ / ۱۳۲۳ء) کا امیر خسرو سے یہ کہنا، "ترکا کچھ سمجھدا ہے"[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بزرگ بھی مقامی زبان سے واقف تھے۔

امیر خسرو (۶۵۱ھ - ۱۲۵۲ء تا ۷۲۵ھ - ۱۳۲۵ء) سب سے پہلے شاعر تھے جنہوں نے تیرھویں صدی میں جدید اُردو اور ھندی ریختہ شاعری کا جنم داتا مانا گیا ہے امیر خسرو دہلی کے سلطان کی دربار سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ھندوستان کے بڑے عالم، شاعر، ماہر موسیقی، درویش اور صوفی تھے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے محبوب مرید تھے۔ امیر خسرو نے نہ صرف عوامی لطائف اُردو میں مرتب کیئے، بلکہ فارسی اور بھاشا کی مخلوط شاعری کا بھی تجربہ کیا۔ اُنکی ایک مشہور مثال یہ ہے[3]

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں۔

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں۔

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں، تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں،

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں زمہر آں مہ بگشتم آخر۔

نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں۔ نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں۔

اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کے کلام کے مثالیں نقل کیگئی ہیں۔ سب سے قدیم کلام ایک مستند بیاض میں سے ملا ہے۔ جس میں میران جی شمس العشاقؒ[4] اور اُن کے بیٹے اور بعض مریدوں کا کلام بڑی احتیاط سے جمع کیا گیا ہے اس کا سنہ کتابت ۱۵۶۸ء[5] ہے

ھندوستان کے بادشاہ محمد تغلق نے دلی شہر کی آبادی کو دولت آباد لے کر بسایا، جس میں تقریباً دو لاکھ کے قریب لوگ دہلی کو چھوڑ کر دولت آباد میں آباد ہوئے۔ اس غیر معمولی تبدیلی کی وجہ سے دلّی والوں کی زبان میں بھی تبدیلی آگئی، جس کی بنا پر ان کی زبان فارسی رسم الخط میں لکھی گئی اور قلیل

۱۔ اُردو دائرہ معارفِ اسلام۔ زیرِ اہتمام دانش گاہِ پنجاب لاھور جلد دوم کُراسہ ۶۔ صفحہ ۳۳۵

۲۔ ایضاً " " "

۳۔ مسلم ثقافت (ثقافت ھندوستان میں) مصنف عبدالمجید سالک۔ صفحہ ۵۳۹۔ ۴۔ دائرہ معارف اسلامیہ صفحہ ۳۳۷

عرصہ میں عروض بھی اختیار کرچکی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس زبان نے دلّی میں جنم لیا وہ دکن میں جاکر ادب اور انشاء کا رتبہ حاصل کیا۔ ہندوی یا ہندوی غیر تعلیم یافتہ عوام میں استعمال ہوتی رہی۔ اور یہ زبان ادبی درجہ حاصل کر نہ سکی تھی۔ صرف وہ لوگ جن کا تعلق عوام سے تھا، وہ اس زبان کو استعمال کرتے تھے۔ اردو نثر میں سب سے پہلے ایک رسالہ دلّی کے ایک مشہور بزرگ حضرت سیّد محمد یوسف الحسینی المعروف گیسو دراز بندہ نوازؒ نے اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے سلسلے میں نکالا جس کا نام "معراج العاشقین" [1] تھا جو غالباً سنہ ۱۳۹۸ء میں لکھا گیا۔ آپ تبلیغ کے سلسلے میں دلّی سے گجرات بھی گئے تھے۔ آپ کی وفات گلبرگہ میں ہوئی۔ سنہ ۱۴۹۵ء میں شاہ میرانجی شمس العشاق کی شرح "مرغوب القلوب" [2] ملتی ہے جس کی زبان بھی معراج العاشقین کی طرح ہے۔ میرانجی کے صاحبزادے شاہ برہان الدین جانم بیجاپوری نے نظم و نثر میں کتاب لکھی تھیں آپ کی وفات سنہ ۱۵۸۲ء میں ہوئی۔ سترہویں صدی کے اوائل میں بھی صوفیاء اور مشائخ کے لکھے ہوئے۔ مذہبی رسالے ملتے ہیں۔

دکن میں اُردو

جہاں تک موجودہ تحقیقات کا تعلق ہے۔ اس امر کی تحقیق ہوتی ہے کہ اگرچہ دکنی اُردو کی سب سے قدیم کتاب "نظامی کی مثنوی" ہے لیکن اُردو کو مستقل طور پر ادبی صورت دینے کی فضیلت، گجرات کو حاصل ہے۔ اور یہ صوفیاءِ کرام کی بدولت نصیب ہوئی [3]۔

ہندوستان کے سلطان بادشاہ علاؤالدین خلجی سب سے پہلے بادشاہ تھے۔ جس نے دکن پر حملہ کیا۔ اور اس کے بعد گجرات پر فتح حاصل کی جس سے دلّی کی سلطنت کی طرف سے صوبیدار مقرر ہوئے۔ صوبیدار کے ساتھ لشکر مختلف پیشہ ور ملازم، مصاحبین عالم کثیر تعداد میں اپنے اہل وعیال کے دکن اور گجرات پہنچے اور اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے، گویہ دلّی کا ثقافتی اثر اس علاقہ پر ہوا۔ دہلی سے جو زبان دکن میں گئی تو ان کی دو شاخیں ہوگئیں۔ وہ زبان جو جنوب کی طرف کو گئی اس کو دکنی بگتی کہا گیا۔ جو گجرات کی طرف گئی اس کو گجراتی کہا گیا۔ لیکن زبان دراصل ایک تھی۔

اُردو زبان کا دوسرا بڑا مرکز بیجاپور تھا۔ جہاں عادل شاہی سلاطین کی زیر سرپرستی ان زبانوں کو فروغ حاصل ہوا۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں قدیم اردو کا خاصا رواج ہوگیا۔ اور یہ سرکاری دفاتر میں بھی پہنچ گئی۔ بادشاہ خود بھی شاعر تھے۔ اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔ اس نے ایک کتاب "نورس" فن موسیقی پر لکھی ابراہیم عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد محمد عادل شاہ (سنہ ۱۰۳۷ء - سنہ ۱۰۶۷ء) کے عہد میں اُردو کا رواج بڑھتا گیا اس عہد میں اردو کے تین شاعر گذرے ہیں۔ ۱۔ مقیمی (مرزا مقیم خان) ۲۔ ملکہ خوشنود ۳۔ رستمی (کمال خان)۔ محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی (سنہ ۱۰۶۷ء - سنہ ۱۰۸۲ء) کے عہد میں دکن میں اُردو کی خوب فروغ ہوئی۔ بادشاہ خود بھی اُردو کے شاعر تھے۔ اس لئے انہوں نے اردو کی طرف خاص توجہ دی اس کا تخلص "شاہی" تھا اور شعر میں کلیات موجود ہے۔ جس میں اردو اور ہندی کلام موجود ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا شاعر نصرتی تھا۔ جو علی عادل شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھے۔ نصرتی کی یہ مثنوی نہ صرف دکن کے ادب میں وقعت رکھتی تھی بلکہ اُردو ادب میں بھی بڑی جگہ رکھتی ہے۔ اس عہد کا ایک اور بڑا شاعر سیّد میران شاہ ہاشمی گذرے ہیں جو مادرزاد نابینا تھے۔ اس کی مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور رہی ہے۔ سیّد ہاشمی نے اُردو زبان میں غزلیں بھی لکھیں تھی جس میں ریختہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس طرز کا کلام لکھنے والا یہ پہلا شخص تھا۔ کلام کی مثال یہ ہے۔

جاتا ہو اے مسافر رہنے کی بھی کچھ خبر ہے   آیا اتا کدھر سوں جانا سو کہو کدھر ہے

دن بھی رہا ہے تھوڑا آتی ہمیں بوند ہو کے   بہوتے جگر ہے تس پر رہیں بھی بے خطر ہے۔

---

[1] رسالہ نیا ادب بمبئی مقالہ اردو ہندی، ہندوستانی مقالہ نگار سجاد ظہیر صفحہ ۵

[2] ایضاً " " "   [3] - اُردو معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب جلد دوم کراسہ ۶ صفحہ ۳۲۹

[4] - دکن میں اردو مصنف نصیر الدین ہاشمی۔ صفحہ ۱۹۴۔

نصیرالدین هاشمی نے "دکن میں اُردو" لکھکر اس موضوع کی تکمیل کردی۔ مگر ان کی طرز بیان سے اس مسئلہ کو صوبہ وارانہ سوال پیدا کردیا ہے۔ اور مرحوم حافظ محمود خان شیرانی نے "پنجاب میں اُردو" لکھکر ثابت کیا ہے کہ اُردو کی جنم دکن میں نہیں بلکہ پنجاب میں ہوئی ہے۔

اُردو کا ایک اور مرکز گولکنڈہ قطب شاهی کا دارالحکومت بھی تھا۔ قطب شاهی بادشاہ علم و هنر کے بہت قدردان تھے بالخصوص اس خاندان کے پانچویں بادشاہ۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ ۹۸۸ھ کے عہد میں ملک بڑا خوشحال تھا اس لئے علم، فن، اور ادب میں بھی بڑی ترقی کی۔ شاعری کو خاصا فروغ حاصل ہوا۔ بادشاہ خود بھی شاعر تھے۔ اُن کا کلیات بھی موجود ہے۔ جس میں غزل، قصیدہ، مثنویاں، مرثیہ کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اُن کے کلام میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو آگے چل کر اُردو ادب موجود ہوئیں۔ سلطان قلی قطب شاہ کا مستند کلیات جدید طرز پر مرتب ہوا تھا، جس میں جو اردو غزلیات موجود ہیں ان میں هندی اسلوب بیان پایا جاتا ہے۔ جس کو اُن کے جانشین بھتیجے محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ھ - ۱۰۳۵ھ) نے مرتب کیا۔ وہ خود بھی شاعر تھے، اور "ظل الله" تخلص کرتے تھے۔ اُن کا بیٹا عبد الله قطب شاہ بھی شاعر تھے۔ اور ان کا دیوان موجود ہے۔ قطب شاهی دور کے تین شعراء قابل ذکر ہیں ۱۔ وجہی جو دکن کے ممتاز شاعر تھے۔ اُن کی دو نظمیں اُردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ۱۔ نظم قطب مشتری جن کے پس پردہ محمد قلی شاہ کی داستان عشق لکھی ہے اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شایع ہوئی ہے۔ ۲۔ "سبرس" دکن کے شاعری کا سہ پارہ ہے۔ ۲۔ شاعر غواصی ۱۰۲۵ھ جسکو سلطان عبد الله کے عہد میں بڑا تقرب حاصل تھا۔ شاهی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ ہوا۔ اس کی دو مثنویاں سیف الملک و بدیع الجمال۔ دوسری طوطی نامہ۔ غواصی کا ایک دیوان بھی موجود ہے۔ ۳۔ شاعر ابن نشاطی، جن کی مثنوی "پھول بن" یہ ایک فارسی مثنوی بساتین کا ترجمہ ہے۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پانچ نئی خود مختیار سلطنتیں قائم ہوگئیں جن میں قطب شاهی، عادل شاهی، نظام شاهی، عماد شاهی، اور برید شاهی ان سب حکومتوں نے اُردو زبان کی سرپرستی کی نظام شاهی حکومت کے دور میں ایک شاعر کا سراغ ملا ہے، جن کا تخلص اشرف تھا۔ اس نے ایک مثنوی حضرت امام حسین علیہ وسلام کے مصائب اور حالات کربلا منظوم کیئے۔ آشرف سید علی ساگر کے سلطان مشکل آسان قندهاری متوفی ۸۴۳ھ کے بھانجے تھے۔ کلام یہ

الله واحد حق سبحان   جن پر سرجیا جوئیں آسمان

چندر سورج تارے روکھ   بادل بجلی مینہ اچوک

نبی محمدؐ حق رسول   کیتا جن پہ فقر قبول

دونهوں جگ اسرور سہبر   جن کون چاروں یار وزیر

بوبکر صدیق ایک سرا   عمر خطاب یعم دوسرا ... الخ"

اس مثنوی کی زبان سادہ ہے حالانکہ یہ بہت قدیم ہے۔ گجرات اور دکن میں اُردو کی ترقی و فروغ کا یہ تذکرہ شہنشاہ اورنگزیب کے عہد تک پہنچتا ہے۔ سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات واضع ہوجاتی ہے۔ کہ بتدریج هندی کے نامانوس الفاظ کم ہوتے گئے۔ اور ان کی جگہ عربی اور فارسی زبانوں کے الفاظوں نے جگہ لی کیونکہ اردو شاعری کے تمام اصناف فارسی شاعری کی مرهون منت ہیں۔ اور ان کے ادا کرنے میں بھی فارسی زبان کی تقلید کی گئی ہے اونگزیب عالمگیر کے آخری دور حکومت میں اردو ادب کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ولی دکنی کا انتقال شہنشاہ اورنگزیب کی وفات کے ایک سال بعد یعنی ۱۱۱۹ھ ہجری میں ہوئی۔ اس سے چند سال پہلے ۱۱۱۲ھ میں وہ دلّی آیا تو اہل ذوق ان کے کلام کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور اسکا رنگ اتنا مقبول ہوا کہ وہاں کے لوگ بھی اس کی طرز میں غزل کہنے لگے۔ اس سے پہلے شمالی هند میں کوئی غزل گو شاعر نظر نہیں آتا۔

۱؎ طوطی نامہ فارسی زبان کے مشہور شاعر ضیاء الدین بخشی کے فارسی مثنوی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے دکن میں اردو مصنف نصیر الدین هاشمی صفحہ ۷۷

۲؎ دکن میں اردو صفحہ ۲۲۳

ولی کو بھی دلّی کی زبان کا بڑا اثر ہوا۔ ولی چونکہ غزل کا شاعر تھا۔ اس لئے ان کی زبان میں لطافت اور بیان میں لذت اور روانی پائی جاتی ہے۔ تصوف کے لگاؤ سے اس کے کلام میں درد پیدا ہوا۔ اس نے فارسی اور ہندی الفاظ کا موزوں تناسب قائم رکھا۔ اگرچہ اُن کے کلام میں بلند پروازی نہیں ہے تاہم پستی بھی نہیں ہے۔ دکن میں ولی کے ہمعصر اور بھی شاعر تھے، ان چند شعراء کے نام قابل ذکر ہیں۔ جیسا کہ آمین گجراتی۔ جس کی مثنوی یوسف زلیخا مشہور ہے۔ اُنہوں نے یہ مثنوی ۱۱۰۹ھ میں لکھی تھی۔ یہ مثنوی کسی فارسی مثنوی کی نقل ہے۔ نمونے کے طور پر چند شعر دیئے جاتے ہیں :-

دیکھی صورت عزیز مصر کی جب — پڑی دھرتی اوپر پچھاڑ اے کر تب۔

کہ واویلا کہ واویلا کر دائی — بخت رب نے مجھ سے اوندھی کھائی،

وہ تو کچھ اور تھا۔ اینتو ہے کچھ اور — اینتو دشمن رہے اس دوست کے ٹھور (الخ)

۲۔ قاضی محمود بحری۔ ان کی مشہور مثنوی من لگن "۱۱۱۲ھ" میں تصنیف کی جس میں اورنگزیب کی مدح کی ہے۔ بحری کی زبان صاف نظر آتی ہے۔ مثال یہ ہے

اے روپ نرا رتی رتی ہے — پربت پربت پتی پتی ہے۔

اٹھ اے قلم اس گھوڑی نگھر جائیں۔ — شک لغت نگر کی سیر کرائیں۔

ہے نام واحد نشان احدؐ — سرفی سواحد ہے ہان احدؐ۔

۳۔ وجیہ الدین وجدی۔ یہ صوفی منش شاعر تھے۔ اُن کی تین مشہور مثنویاں موجود ہیں۔ جن میں پنچھی باچھا، تحفۂ عاشقاں، اور مخزن عشق پنچھی باچھا حضرت فرید الدین عطار کی مشہور مثنوی "منطق الطیر" کا ترجمہ ہے۔ شعر کا نمونہ دیا جاتا ہے۔

واہ واہ اے ہد ہد ہادیِ راہ — ہے تجھے معلوم سب وادی کی راہ

ہے سبا کے شہر پر تیرا گزر — کیا سلیمان کو دیا تو خوش خبر،

تا تجھے ہے تاجداری ساز وار — جب سلیمان کا تو جو ہوا راز دار (الخ)

شمال ہند میں اُردو شاعری کا آغاز محمد شاہ بادشاہ متوفی ۱۱۶۱ھ کے وقت میں ہوا۔ اس وقت تک دلّی میں ولی دکنی کا دیوان پہنچا تو غزل گوئی کا چرچہ شروع ہو گیا۔ ولی دکنی کا دیوان دیکھ کر دلّی نے بھی غزل کہنی شروع کی۔ خود اُردو معلیٰ کے ناخداؤں، شاہزادوں اور سلاطین نے بھی اِس زبان میں شعر کہنا شروع کیئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دلّی کے اس شاہی علاقہ کو ادب میں مرکزیت بھی حاصل ہو گئی۔ جب کبھی الفاظ یا محاورے کو "اردو معلیٰ" اصطلاح اہل اُردو متعارف اردوی بادشاہی اصطلاح شاہ جہاں آباد عرف اردوی بادشاہی کہدیا گیا۔ خان آرزو (۱۱۵۶ھ – ۱۷۴۳ء) نے ایک کتاب "نوادر الالفاظ" کے نام سے لکھی تو اس میں عبدالواسع ہانسوی کی اردو لغت، غرائب اللغات میں حجت قاطع کے طور پر بھی مذکور بالا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ انشائے دریائے لطافت میں لکھا ہے

مبنع فصاحت و معدن بلاغت کہ زبان شان مشہور بہ اُردو ست۔ سواری بادشاہ ہندوستان کہ تاج فصاحت بر سرادی زیبد چند

امیر و مصاحب شان و چند کہ دیگر و چند زن قابل از قسم و خانم و کبی ہر لفظی کہ دریں استعمال یافت اُردو زبان شد۔

جب اُردو شاعری نے عوامی رتبا حاصل کیا اور زیادہ مقبول ہوئی تو جو لوگ محاورہ اُردو معلیٰ سے ناواقف تھے مجبوراً اس کو اپنایا اور اپنا کلام اصلاح کے لیئے دکھائے اس طرح اردو شاعری میں نیا رنگ پیدا ہوا۔ دلّی کے بہت سے استاد لکھنؤ گئے تو وہاں بھی اس خاص محاورہ کی قدر کی گئی۔

دکن میں اردو — مصنف نصیر الدین ہاشمی — صفحہ ۲۶۱

ایضاً — ۲۶۴

ایضاً — ۲۷۲

پورب والے لوگوں پر جو حکومت کرتے تھے وہ خود حاکم نہ تھے بلکہ وہ دلّی کے بادشاہ کے تابع تھے۔ اور مغل بادشاہوں کے طور و طریقہ سے واقف تھے دلّی کے شعراء ان کی حضور میں تقرب حاصل کرتے تھے۔ اور ان کی ادبی مجلسوں کو گرماتے تھے۔ بلکہ غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ زبان کے معاملے میں اُنہوں نے محاورہ اردو معلیٰ ہی کے اتباع کو اپنا شاہی شان سمجھا۔ شاعری شروع کی تو اس میں بھی دلّی والوں کو استاد بنایا۔ اس طرح اُردو معلیٰ کا محاورہ لکھنؤ میں بھی زبان زد ہو گیا۔ مگر کچھ تو لفظی طوالت کے باعث اور کس قدر دلّی کی سیاسی قوت نے انحطاط سے معلیٰ کا لقب بول چال میں کم ہونے لگا اور صرف اردو رہ گیا۔ اس عہد کے مشہور غزل گو شعرا جنہوں نے اردو زبان میں باقاعدہ شاعری شروع کی تھی وہ ہیں۔

شاہ مبارک آبرو۔ شیخ شرف الدین مضمون۔ غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ۔ شاہ حاتم۔ خان آرزو۔ اشرف علی خان فغاں۔

مرزا مظہر جان جاناں۔ میر محمد رفیع سودا۔ میر تقی میر۔ خواجہ میر درد۔ سید میر سوز۔ اور انعام اللہ خان یقین۔

اُسی دور میں سندھ کے اندر حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی ؒ سندھی شاعری کو عروج پر پہنچا رہے تھے۔ اس لئے شاہ بھٹائی ؒ کی شاعری کو سندھی زبان کی شاعری کا کلاسک (CLASSIC) کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ آپ کے کلام میں وہ سبھی خوبیاں موجود ہیں جو کہ دنیا کے مہذب اور بڑے شعراء میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے نے اپنی تحقیقی مقالہ "شاہ عبد اللطیف آف بھٹ" میں ایک باب دیا ہے جسکا عنوان ہے "کلاسک کا جنم" (The Birth of a Classic) ڈاکٹر سورلے کے خیال کے مطابق "سندھی زبان میں کلاسک" نے اس وقت جنم لیا جب حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی ؒ کا رسالو وجود میں آیا۔ اردو کے متعلق لکھتے ہیں۔[۵]

It was not surprising that Urdu was regarded till Seventeenth century as a barbararous and uneducated tongue unfit for the game of Poetic inspiration.

"اس میں کسی حیرت کی بات نہیں ہے کہ اُردو کو سترھویں صدی عیسوی تک کوئی قدر نہ تھی۔ مگر اُسکو وحشی اور ناترتیب یافتہ زبان سمجھا جاتا تھا۔ جو کہ شعر و شاعری کے لئے موزوں نہیں تھی۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اردو شاعری سے واقف تھے یا نہیں یا اُردو شعرا کے کلام سے واقف تھے؟

شاہ صاحب کے دور میں اردو، اُردوی معلیٰ اور ہندوی کہلاتی تھی۔ جس سے آپ کو واقفیت تھی۔ لیکن اپنے کلام میں اسکا ذکر نہ کیا کیوں کہ سوائے عربی کے مقصود۔ قرآن پاک کی آیات اور حدیث کے اور کسی زبان کو تضمین نہیں کیا مگر اپنے عظیم کلام میں عربی فارسی سنسکرت ہندی۔ بلوچی۔ سرائکی۔ پنجابی زبانوں کے الفاظوں کو کثیر تعداد میں استعمال کیا ہے۔ وہ الفاظ جو آج بھی اردو زبان میں مروج عام ہیں وہ آپ کے الفاظ آپ کے کلام میں موجود ہیں۔ آپ نے اس دور کے اردو شعراء کا کلام سنا اور اثر بھی قبول کیا۔ کیونکہ آپ کی درگاہ میں ہندوستان کے مشہور موسیقار رہتے تھے۔ اور آپ کا سفر کے سلسلے میں ہندو جوگی یاتریوں سے صحبت رہی۔ آپ گجرات جیسلمیر جوناگڑھ بھی تشریف لے گئے جہاں کی قدیم زبانوں سے واقف ہوئے تھے۔ ملتان پنجاب کا بھی سفر کیا۔ اس طرح شاہ صاحب اردو کی ابتدائی صورت سے واقف تھے۔ اور بہت سے مشہور بزرگ شعراء سے ملاقاتیں کی ہوگی اور ان سے متاثر ہوئے ہونگے۔ شاہ بھٹائی کی مریدی کا سلسلہ نہایت وسیع تھا۔ وقت کے راجا اور بادشاہ بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ جس اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اردو کی ابتدائی شکل و صورت سے واقف تھے۔

Shah Abdul Lateef of Bhit by Dr: H.T. SORLEY Page. 207

باب سوم

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعرانہ خصوصیات

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ دنیا کے عظیم شعراء میں سے ایک ہیں۔ ہر دور کے شعراء اپنے ملک کے مختلف حالات اور اثر کے ماتحت خیال آرائی کرتے ہیں۔ صوفی شعراء نے اللہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سرشار ہوکر عشق حقیقی کے رموز کو بیان کرتے ہیں۔ شاہ بھٹائیؒ وہ شاعر تھے۔ جن کے کلام میں شاعری کے کل صفات موجود تھے۔ آنہوں نے ہر پہلو کو اپنے کلام میں پیش کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کے ایسے بھی ابیات موجود ہیں جن کے تخیل پر آج تک دنیا کا کوئی شاعر پہنچ نہ سکا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے ہر مذہب و ملت اور ہر طبقے کے لوگ بڑے ذوق و شوق اور عقیدت سے پڑھتے ہیں سندھ کے لوگوں کے دلوں پر ان کا کلام منقش ہے۔ اور شاہ بھٹائیؒ اپنے کلام کی وجہ سے لافانی شہرت کے مالک ہیں۔ شاہ بھٹائی شعر کے فن کی خوبیاں اور شاعرانہ استعداد میں نہ صرف سندھ کے شعراء سے سبقت لے گئے۔ بلکہ دوسری زبان میں بھی شاعروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے کلام میں تمثیلی فطری جال، واقع نگاری انسان کے حقیقی حسن کا اسلوب بیان پیش کیا ہے۔ جن میں تشبیہات کی سادگی اور صنائع بدائع کی عمدگی موجود ہے وہ دوسرے شعراء میں نہیں ملتی۔ سندھ کے اس صوفی شاعر کے کلام میں ان مقامی خصوصیات میں فن کی لطافتوں کا اتنا متوازن امتزاج ہے کہ زبان سندھی نہ جاننے والا بھی شعر سنتا ہے تو اس کے دل پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کے افکار کی وسعت ان کی بلندی اور گہرائی بے پایاں ہے شاہ بھٹائیؒ کی زندگی میں ہی اُن کے کلام اور پیغام کا اثر نفوذ نمایاں ہوگیا تھا سندھ کی تاریخ اس تاثیر کا ایک کرشمہ سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ، فکر و ادب میں کوئی ایسا شاعر اور مفکر پیدا نہ ہوئے، جنکا فکر اس قدر ہمگیر ہے کہ اُنہوں نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی ایسا اہم پہلو نہیں چھوڑا جس کے متعلق کوئی حیات آفرین کا حل پیش نہ کیا ہو۔ شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں خود شناسی بھی ہے تو خدا شناسی بھی ہے۔ اُردو ادب کے مشہور نقاد وقار عظیم[1] شاہ بھٹائی کے کلام کے متعلق لکھتے ہیں۔

> سندھ میں جو مقبولیت شاہ صاحب کے کلام کو حاصل ہے، اس کے مقابلہ اردو شاعری میں کسی حد تک کوئی شاعر کرسکتا ہے تو وہ غالبؔ اور اقبال کرسکتا ہے۔ لیکن غالبؔ اور اقبالؔ کی مقبولیت ایک خاص طبقہ تک محدود ہے۔ اور شاہ صاحب کی مقبولیت کسی طبقہ یا علاقہ تک محدود نہیں ہے

سیاسی و تاریخی نقطہ نظر سے شاہ صاحب کی زندگی کا پس منظر انتشار اور آزادی کا ایک ملا جلا مرقع تھا۔ ان کے گرد پیش کی زندگی سیدھی سادی دیہاتی زندگی تھی۔ شاہ بھٹائی کے کلام کی بنیاد صوفیانہ نظریہ ہے۔ لیکن اس صوفیانہ فکر کے لئے اُنہوں نے سترھویں صدی کے آخر کی دیہاتی زندگی کے سادہ جذباتی پہلوؤں کے پیکر سے مدد لی ہے۔ شاہ بھٹائیؒ نے سندھی زندگی کے جن خاص رسموں کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے وہ اپنی جگہ پر مستند ہیں۔

شاہ بھٹائیؒ کی زندگی میں سادگی اور احساس کا خلوص موجود ہے۔ شاعرانہ بیان کی تازگی اور اُن سب چیزوں پر چھائی ہوئی ہے۔ ان خصوصیات کی وجہ ہے۔ وہ سندھ کے ہر طبقہ خیال کے لوگوں کے محبوب ہیں آپ نے دیہاتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا جو آپ کے کلام کا مرکزی خیال بنا۔ جس کی وجہ سے آپ قادر الکلام اور فطرت کے مصوروں میں ایک سمجھے جاتے ہیں۔ جن کو لسان الغیب کہا جاتا ہے۔

شاہ بھٹائیؒ کا رتبہ نہ صرف سندھ کے ہمعصر شعراء میں بلند ہے بلکہ اس دور کے اُردو شعراء میں بھی بلند ہے کیونکہ آپ کا کلام ہر حالت میں اُردو شعراء کے کلام پر فوقیت رکھتا ہے۔ اردو شاعری پر فارسی شاعری کا بڑا اثر ہے۔ اس لئے پر اُردو زبان کا ایک نقاد

---

[1] ماہنامہ روح ادب شمارہ نمبر ۱۵، ۱۶، بابت ماہ مئی۔ جون ۱۹۵۲ء۔ مقالہ "سندھ کا عوامی شاعر" مقالہ نگار وقار عظیم۔ صفحہ ۱۰۴۔

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی تحریر فرماتا ہے:[1]

ہماری اردو زبان کی شاعری جو سراسر فارسی شاعری کے تتبع سے پیدا ہوئی۔ اپنے ابتدائی حالات میں عشق و محبت عاشق و معشوق و دیگر لوازمات عاشق کے وہی سانچے، وہی تصورات اور وہی معیار رکھتی ہی جو ایران میں اس وقت رائج تھے

چونکہ اُردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید تھی۔ اس لئے اردو شاعری غزل سے شروع ہوئی۔ لیکن شاہ بھٹائی[2] غزل کے شاعر نہ تھے۔ اردو شاعری کا پہلا دور، سندھی شاعری کا بالکل متوسط اور عروج کا دور تھا۔ حالانکہ غزل کی ابتدا ہوچکی تھی۔ لیکن شاہ صاحب کی شاعری وہی قدیم شاعری تھی۔ جس میں تغزل کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس دور میں مختلف شاعری کے اسلوب نشوونما پا چکے تھے۔ اور ان میں بھی شاہ بھٹائیؒ کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

شاہ بھٹائیؒ کی شاعری کا دور سنہ ۱۱۱۲ھ سے سنہ ۱۱۶۰ھ تک تھا۔ ہم بہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ شاہ بھٹائی، اُردو شاعری کے اوّلین دور کے شعراء مثلاً۔ ولّی دکنی، شاہ مبارک آبرو، سراج الدین خان آرزو، ظہور الدین حاتمؔ، مرزا مظہر جان جاناں، میر دردؔ، میر تقی، اور سوداؔ کے ہمعصر تھے۔

سندھی اردو الفاظ میں مشترک مشابہ

شاہ بھٹائیؒ کے کلام پر ہندی شاعری کا بڑا اثر نظر آتا ہے۔ اور ہندی ویدانت کا اثر بھی نمایاں ہے۔ شاہ بھٹائیؒ کے رسالہ پر نظر کرنے سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ اُردو کی ابتدائی صورت سے واقف تھے۔ آپ نے اپنے کلام میں اپنی سندھی الفاظ کے ساتھ سنسکرت، اپبھرنش۔ پراکرت۔ ہندی، گجراتی، مرہٹی، سرائکی، بلوچی۔ پنجابی، عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کیئے ہیں۔ اُردو زبان میں بھی عربی۔ فارسی۔ ہندی۔ گجراتی اور سنسکرت کے الفاظ موجود ہیں۔ لسانی روابط کے اعتبار سے اُردو سندھی کے مشترک اور مشابہ ایسے الفاظ دیئے جاتے ہیں جن کو شاہ بھٹائیؒ نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ ان کی صورتیں ایک جیسی ہیں۔ ان کی معنی میں بھی یکسانیت ہے مثالیں یہ ہیں۔

سندھی الفاظ	اُردو الفاظ	سندھی الفاظ	اُردو الفاظ	سندھی الفاظ	اُردو الفاظ	سندھی الفاظ	اُردو الفاظ
۱۔ قائم	قائم	۱۷ شاکر	شاکر	۲۹۔ خوب	خوب	۴۱۔ آزل	ازل
۲۔ قدیم	قدیم	۱۸۔ سلوک	سلوک	۳۰ طالب	طالب	۴۲۔ جمال	جمال
۳۔ واحد	واحد	۱۹۔ شاعر	شاعر	۳۱ مفتي	مفتی	۴۳۔ خلت	خلت
۴۔ حکیم	حکیم	۲۰۔ کناړو	کنارہ	۳۲۔ حجاب	حجاب	۴۴۔ عرفان	عرفان
۵۔ ایمان	ایمان	۲۱۔ پري	پری	۳۳ میثاق	میثاق	۴۵۔ رباب	رباب
۶۔ لسان	لسان	۲۲۔ ڪال	کلّ	۳۴ گڑکیون	کھڑکی	۴۶ تراب	تراب
۷۔ فائق	فائق	۲۳۔ بالم	بالم	۳۵ رمز	رمز	۴۷ خیمون	خیمہ
۸۔ حق	حق	۲۴۔ ڪام	کام	۳۶ جشن	جشن	۴۸۔ پریم	پریم
۹۔ وصال	وصال	۲۵۔ چپوہ	کافور	۳۷ پھاڙ	پھاڑ	۴۹۔ تماری	تمھاری
۱۰۔ فراق	فراق	۲۶ ویمو	ویعہ	۳۸۔ سالم	سالم	۵۰ رندی	رندی
۱۱۔ فرقان	فرقان	۲۷ ھوٹل	کوٹل	۳۹ دڪان	دکان	۵۱ سپاهي	سپاہی
۱۶۔ ڪاتب	کاتب	۲۸۔ معمور	معمور	۴۰ لوھ	لوھا	۵۲ پان	پان

[1] دلی کا دبستانِ شاعری مصنف ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ دوسرا باب صفحہ ۲۲ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی۔

سندھی	اُردو	سندھی	اردو	سندھی	اُردو	سندھی	اردو	سندھی	اُردو
۵۳۔خالی	خالی	۵۷۔بود	بود	۶۱۔کثرت	کثرت	۶۵۔مشاھدو	مشاہدہ	۶۹۔قاتل	قاتل
۵۴۔ارواح	ارواح	۵۸۔دار	دار	۶۲۔جناب	جناب	۶۶۔جام	جام	۷۰۔سوری	سولی
۵۵۔راءِ	رائے	۵۹۔بات	بات	۶۳۔بازی	بازی	۶۷۔فکر	فکر	۷۱۔درشن	درشن
۵۶۔سمانا	سمانا	۶۰۔سنسار	سنسار	۶۴۔چندن	چندن	۶۸۔قصر	قصر	۷۲۔اُور	اُور سُو

اس طرح پورے رسالے میں ایسے ہزاروں الفاظ ملینگے جو مشترک اور مشابہ صورتوں میں موجود ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوگا کہ شاہ بھٹائی اردو زبان کی ابتدائی لسانی صورت سے واقف تھے۔ لیکن پھر بھی اپنے کلام سندھ کے عوامی زبان سندھی میں پیش کیا۔

وطن، زبان سے محبت

حضرت شاہ لطیف رح بڑے وطن دوست تھے۔ اُنکو اپنے وطن عزیز کی ہر چیز سے محبت تھی۔ اسلئے اپنا کلام بھی سندھی زبان میں پیش کیا اور اپنے عالی درجہ کی وطن پرستی کا ثبوت دیا۔ یہ بڑی قومی خدمت تھی جو آپ نے انجام دی۔ شاہ بھٹائی رح اس نظریہ کو تقویت پہچانے کے لئے سندھی محاورہ، تشبیہات اور سندھ کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آپ نے اپنے کلام فارسی زبان کے اشعار کو تضمین نہ کیا۔ سواء ایک شعر کے[2] خدا تعالیٰ اور رسول اللہ کے سعادتمند اور نیک بندے کی حیثیت سے الاہی رموز کو سمجھانے کے لئے قرآن پاک اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے کلام میں تضمین کیا۔ اور ساتھ ساتھ اپنے شاعرانہ طریقے اُن کی معنیٰ و تشریح بھی دی۔

شاہ بھٹائی کے زمانے میں سندھ کے علاقہ کی قیادت متکبر اور مغرور حاکموں کے ہاتھ میں تھی۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کے قول کے مطابق عوام بھی گمراہ ہو رہا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں اقتدار ہوتا ہے۔ وہی تھذیب اور تمدن، معاشرت اور سیاست، علم و ادب اور اخلاق کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ سندھ کے والی کلھوڑہ تھے جو پہلے پیر تھے بعد میں حاکم۔ عالم فاضل تھے لیکن عمل کے بغیر۔ اس لئے ان کے تعلقات دوسرے بزرگوں اور عالموں سے ناخوشگوار تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اُن کا اقتدار، جاہ جلال قائم رہے۔ شاہ عنایت صوفی کی شہادت اور شاہ عبداللطیف رح سے دشمنی اس دور کی مثالیں ہیں۔ ان حاکموں کی مادری زبان فارسی تھی۔ لیکن شاہ بھٹائی رح نے ان حاکموں کے سخت رویئے آگے سر نہ جھکایا۔ بلکہ سندھ کے عوام میں ایک نئی روح بھردی۔ سندھی زبان کو زندہ جاوید بنا دیا۔ جو لوگ فارسی کو اپنی زبان پر ترجیح دے رہے تھے، ان کو اس طرح تلقین فرمائی ہے۔

جي فارسي سکيو، گولو تو ءِ غلام

جو ہڏو ہن ڳالین ءِ سو ھين چائي ڄام

اُجون تان آب گھري، بکيو تان طعام

اي عامن سندو عام، خاصن منجھان نہ ٿئي۔

جس نے فارسی سیکھی وہ ناقص غلام رہ گیا۔ جو ان باتوں میں الجھیگا، وہ کس طرح بادشاہ کہلائیگا۔

پیاسے کو ہمیشہ پانی کی ضرورت ہوگی اور بھوکے کو طعام کی۔ ان سب چیزوں کا میسر ہونا عوام پر ہے

اور خاص کچھ بھی نہیں جانتے۔

---

[1] رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی رح جلد اول دوم۔ سوم مرتب ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی۔

[2] یہ مصرع شہید صوفی شاہ عنایت رح کی ہے پورا شعر اسطرح ہے۔

سر در قدم یار فدا شد چہ بجا شد ۔ این بار گران بود ادا شد چہ بجا شد۔

یہ اشعار اس زمانے کی غلامانہ ذہنیت کے خلاف آواز تھی۔ شاہ بھٹائیؒ حقیقت میں انقلابی شاعر تھے۔ اُنہوں نے اپنے زمانے کے خراب ماحول سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لئے اپنی آواز کو بلند کیا، اور سندھی زبان جو عوام کی زبان تھی۔ اس میں اپنا پیغام دیا جو مقبول عام ہوا۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں ان کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ جتنی شاعر کی شخصیت اُنکے کلام میں نمایاں ہو گی۔ اتنا ہی اُن کا اثر ہوگا، اور لوگ اُن کے کلام اور شخصیت سے متاثر ہونگے۔ شاعر کا کلام اگر کوئی حیثیت رکھتا ہے تو صرف تاثیر کے لئے۔ اور ادب کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے۔ شاعر اپنے کلام میں تصوف کے باریکیوں اور رموز کو باریکبینی سے پیش کرتا ہے۔ کیونکہ تصوف کے فلسفہ کو عوامی زبان میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ شاہ بھٹائیؒ کا کلام اس حدیث مبارک کے مبنی اور مطابق ہے:۔

"من عرف نفسہ فقد عرف ربّہٖ"

(جسنے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا)

شاہ بھٹائیؒ نے بھی اپنے تزکیہ نفس کے لئے ریاضتیں کر کے اس منزل پر پہنچے اور اسلامی ادب کی تخلیق کے باعث بنے۔ شاہ بھٹائیؒ کا کلام دو حصوں میں منقسم ہے۔ ۱۔ الاہیات، ۲۔ ذاتیات۔ الاہیات کا تعلق فلسفہ ربوبیّت، توقیر اور رسالت مآب کی محبت۔ ذاتیات کا واسطہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی حقوق سے ہے۔ شاہ بھٹائیؒ کا پیغام ان دونوں عنوان سے بھرپور ہیں۔ جس کی اپنے کلام میں وضاحت کرتا ہے، کیونکہ الاہیات کے اشتراک عمل سے ملک میں امن قائم ہوتا ہے۔ شاہ بھٹائیؒ نے سندھی تہذیب و تمدن کا دلکش منظر اپنے مخصوص کہانیوں کے ذریعہ پیش کیئے ہیں۔

شاہ بھٹائیؒ ایک عظیم شاعر کے علاوہ برگزیدہ شخصیت اور مجذوب سالک بھی تھے۔ آپ نہ صرف مبلغ، مصلح اور عارف تھے بلکہ قطب الاقطاب بھی تھے، جو قطب الارشاد اور قطب تکوین ہوتا ہے۔ قطب الارشاد وہ بزرگ ہوتے ہیں جو عوام کی اصلاح، قلوب اور نفوس کی تربیت کرتے ہیں، وہ انبیاء علیہ السلام کے خاص پیرو اور نائب ہوتے ہیں۔ قطب تکوین وہ بزرگ ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے حکم سے کسی خاص دنیا کے حصہ کے لئے ہوتے ہیں جو عوام کی اصلاح معاش اور دفع بلیات کی کوشش کرتا ہے۔ ان سب سے بڑھکر قطب الاقطاب ہوتا ہے جس کے سپرد کائنات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ شاہ بھٹائیؒ قطب ارشاد کے علاوہ قطب تکوین بھی تھے۔ اس لئے تمام موجودات کو فیض پہنچاتے تھے سر سارنگ میں فرماتے ہیں۔

بیت

موٽي مانجهاڻ جي، واري ڪيائين واءُ

وڄون وسڻ آئيون، چوڌس ٿي چوڌار

ڪي اُٿيون استنبول ڏي، ڪي مٿريون مغرب پار.

ڪي چمڪن چين تي ڪي، لهن سمرقندن سار،

ڪي رُمي ويئون روم تي ڪي ڪابل ڪي قنڌهار

ڪي دلي، ڪي دکن ڪني، گڙگن مٿي گرنار

ڪمين جهڙي جيسلمير تان، ڏنا بيڪانير بڪار

ڀمين ڀڄ ڀڃائيو. ڪنهن ڍٽ مٿاهين ڍار

ڪنهن اچي عمرڪوٽ تان وسايا ولهار

سائيم سدائين ڪرين مٿي سنڌ سڪار

دوست تون دلدار! عالم سڀ آباد ڪرين.

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اسلام کے عظیم انقلاب کو رحمت کے بادلوں سے تشبیہ دے کر فرمایا ہے۔

بادل لوٹ کر برسات کو برسانے کے لئے اپنی باری پر آ گئے۔

بادل جب برسانے کے لئے آئے، تو چاروں طرف بجلی کی چمک سے روشنی پھیل گئی۔

کچھ بادل استنبول کی طرف گئے، تو کچھ مغرب کی طرف برسانے کے لئے گئے

تو کچھ چین کی طرف برسانے کے لئے گئے، اور کسی نے سمرقند کی جانب خبر لی

کچھ تیزی سے روم کی طرف گئے، کچھ کابل اور قندھار گئے۔

کچھ دلی، دکن گئے تو کسی نے گرنار کے طرف برسانا شروع کیا۔

بادل جوش میں آکر جسلمیر گئے، تو وہ بیکانیر میں بھی ہریالی پیدا کی۔

بادلوں نے کچھ بھج کو بھگو کر ڈھٹ کے اوپر برسانا شروع کیا۔

بادلوں کے سلسلوں نے عمرکوٹ پر آکر برسات برسائی

اے میرے رب تو ہمیشہ سندھ کے اوپر اپنی رحمت برسا کر ارزاں کر دے

اے مالک! سندھ کے ساتھ پوری دنیا اور عالم کو شاد اور آباد کر دے۔

باب چہارم

سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی مختصر سیاسی اور معاشی حالات۔

اُردو شاعری کی ابتدائی نشو ونما کے وقت ہندوستان، سیاسی اور معاشی اعتبار سے بڑے مصائب میں مبتلا تھا۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ سیاسی افراتفری اور زبوں حالی کے ساتھ عوام مصیبت میں گھرے ہوئے تھے۔ مغل شہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ شہزادہ محمد معظم نے کابل سے آکر اپنے بھائی کو آگرہ کے نزدیک شکست دی اور شاہ عالم، بہادر شاہ کے لقب سے سنہ ۱۱۱۹ھ مطابق سنہ ۱۷۰۷ء کو تخت پر بیٹھا۔ لیکن اپنے آباء اجداد کے وقار کو برقرار رکھ نہ سکا۔ اس کے عہد میں کوئی خاص ترقی بھی نہ ہوئی سنہ ۱۱۲۴ھ میں وفات کی۔ ان کی وفات کے بعد اسکا لڑکا بیٹا جہاندار شاہ صرف گیارہ مہینے حکمراں رہا۔ اس نے سلطنت مغلیہ کے تین صدیوں کی عزت اور آبرو کو ایک طوائف لعل کنور کے قدموں پر نچھاور کردی۔ وہ میدان جنگ سے ایسا بھاگا، جسکا پھر کہیں پتا نہ چلا۔ فرخ سیر بادشاہ بنے جس نے اپنے تدبر سے مغلیہ سلطنت کا وقار قائم رکھا، لیکن وہ درباریوں کے سازش کا شکار ہوا۔ فرخ سیر کی حکومت کی مدت سات سال رہی اس کے عہد میں شاہی دربار میں مدبروں اور ہوشمندوں کا ایک قابل قدر اجتماع ہو گیا تھا۔ نظام الملک آصفجاہ کی سیاست، امیر الامرا سیّد حسین علی خان کی فراست اور امیر و فضلاء کی جرأت مندی، اگر یہ سبھی متحد ہو جاتیں تو کیا عجب تھا کہ مغلیہ حکومت کی وہی شان و شوکت دوبارہ نظر آجاتی۔ لیکن درباری آپس کی فتنہ انگیزیوں میں مبتلا رہے جس سے تباہی ہوئی، اور فرخ سیر سیّدوں کے ہاتھوں سنہ ۱۷۱۹ء میں قتل ہوئے، جس کے بعد سات ماہ کے عرصے تک دلّی کے تخت پر سیّد برادران یکے بعد دیگر بیٹھے جن میں رفیع الدرجات اور رفیع الدّولہ تھے۔ اتفاق سے یہ دونوں بھائی ایک ہی سال میں مرگئے، تو تخت وارث شاہ جہاں ثانی ہوئے۔ اس حکومت صرف تین ماہ چند دن رہی کیوں وہ اسہال کی بیماری میں مبتلا ہوگئے تھے جسمانی تکلیف کے علاوہ بارہہ کے اقتدار کا بھی ذہنی صدمہ ہوا، اور زیادہ دن رہ نہ سکا اور وفات کر گئے۔ تین ماہ کے اندر کچھ کر نہ سکے۔

سنہ ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ تخت نشین ہوا، یہ بہت عیش پرست اور غافل بادشاہ تھا۔ ان کی غفلت کی وجہ سے امیر اُمرا آپس میں حسد کرنے لگے بادشاہ معمولی قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں آگئے۔ رشوت قتل و غارت کی بازار گرم رہی، مغلیہ سلطنت ٹکرے ٹکرے ہوگئی تھی۔ ریاستوں کے گورنر خود مختیار ہوگئے۔ ہند مسلمان اور غیر طاقتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ مطلب یہ کہ اس طویل عرصہ میں وہ تمام سامان ایک ایک کرکے جمع ہوگیا تھا، جیسے اس عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کیا جاتا۔ مغلیہ دربار میں اکبری عزم کے بجاء شیشہ و پیمانہ کی بدمستی تھی، جہانگری انصاف کے بجائے ظلم و تشدد کا دور تھا، عالمگیری جاہ و جلاہ و خدا پرستی کے بجائے بےبسی اور بیکسی و بےبرت کا منظر تھا۔ خودغرض امراء اور درباریوں میں نہ تو نیت کی پاکیزگی تھی نہ مقصد کی یکجہتی۔ جو باقی رہی سہی قوت تھی وہ بھی نادر شاہ کی خونریزی، مرہٹوں اور روہیلوں کی سرکشی سے جاتی رہی۔ اس طرح ایک شاندار تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھر گیا۔

محمد شاہ کے آخری عہد میں مرہٹوں نے شمال کی طرف سے پیش قدمی کی سنہ ۱۷۲۰ء میں محمد شاہ نے مرہٹوں سے عہدنامہ کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ سیواجی کی موت کے وقت تک جو بھی علاقہ مرہٹوں کے قبضہ میں تھا وہ اُن کو دے دیا جائے۔ اور دکن کے چھ بادشاہی صوبوں سے چوتھ وصول کرنے کا حق اُن دیا جائے۔ سنہ ۱۱۴۷ھ میں مرہٹوں نے شاہجہان آباد سے دور تک علاقہ پر حملہ کرکے لوٹ لیا۔ مرہٹوں نے دہلی کے قریب پہنچ کر کالکا کے میلہ کو لوٹ لیا، جس میں بہت سے ہندو اور مسلمان بے گناہ مارے گئے۔ دار السلطنت اس وقت فوج سے خالی تھی۔ میلہ سے زخمیوں کی ٹولیاں فریاد لے کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچیں تب اس بے خبر بادشاہ کو ہوش ہوا کہ غنیم سر پر آپہنچا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے دس پانچ امیر معمولی فوج لے کر نکلے اور تال کٹورہ پر لڑائی ہوئی اور شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ شکست کھا کر فرار ہوگئی اس اثنا میں مرہٹوں کی یلغار کی خبر سُن کر برہان الملک اور دوسرے امیر دلی پہنچے تو باجی راؤ کو ان کی آمد کا ایسا خوف ہوا کہ وہ ریواڑی کی راہ گجرات اور مالوہ کی طرف بھاگ گئے۔

نادر شاہ کا دلّی پر حملہ

١١٥١ھ مطابق ١٧٣٨ء میں نادر شاہ ایران کا بادشاہ آندھی اور طوفان کی طرح ہندوستان پر چڑھ آیا۔ قندھار اور کابل کو فتح کرکے آگے بڑھا دلّی کی دربار میں اس وقت تک لوگ اُنہیں نادر قلی سمجھتے تھے۔ اور یہ توقع کر بیٹھے تھے کہ سرحد کے پٹھان اُسے مار بھگائینگے۔ مگر نادر شاہ جلال آباد پہنچ گئے اور وہاں قتل عام کیا۔ پھر اٹک سے اُتر کر پنجاب میں داخل ہوا تو دلّی میں شور مچ گیا۔ محمد شاہ فوج اکٹھا کرکے کرنال میں جاکر کیمپ کی۔ اور وہاں سے۔ برہان الملک، صمصام الملک، دوران خان، قزلباشوں کے مقابلہ پر گئے۔ امیر الامرا لڑتے ہوئے مارے گئے۔ برہان الملک گرفتار ہوکر نادر شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ برہان الملک کی بہادری کا قدر کرتے ہوئے۔ نادر شاہ نے اُسے اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھا لیا اور بڑی عزت کی۔ آصف جاہ نے جب دیکھا کہ نادر شاہ تلوار کے زور سے ہار نہیں مانیگا تو گفت و شنید کرکے مصالحت پر اسے آمادہ کیا اور وہ دو کروڑ روپیہ لے کر واپس جانے پر تیار ہوا۔ نادر شاہ نے محمد شاہ سے ملنے کے لیئے اصرار کیا۔ جب محمد شاہ اُنکے ملنے کے لیئے آئے تو نادر شاہ نے خیمہ سے نکل کر اُن کا استقبال کیا۔ اور محمد شاہ کو صاف کہدیا "ہندوستان کی سلطنت آپ کو مبارک ہو"

برہان الملک نے نظام الملک کے حسد میں آکر نادر شاہ سے کہا کیا آپ دو کروڑ روپیہ پر راضی ہوگئے۔ اتنی رقم تو میں اس وقت اپنی طرف سے ادا کرسکتا ہوں۔ آپ کے لئے تو دلّی کے خزانہ موجود ہیں۔ نادر شاہ لالچ میں آکر نظام الملک اور محمد شاہ بادشاہ دونوں کو گرفتار کرکے قبضہ میں رکھا۔ اور دلّی کی طرف کوچ کیا۔ عید کے دن جامع مسجد دلّی میں نادر شاہ کے نام خطبہ پڑھا گیا۔ کچھ دن کے بعد ایک بھنگڑانے کہا۔

"واہ محمد شاہ رنگیلے تیرا کیا کہنا۔ تونے مغل کو ایک قلماقنی کے ہاتھ سے مروا ہی دیا۔"

جیسے ہی نادر شاہ کے مرنے کی افواہ اُڑی تو شہریوں نے قزلباشوں پر حملہ کردیا۔ جس سے بہت نادری سپاہی مارے گئے۔ نادر شاہ اس غلط خبر کو سن کر، شورش کو مٹانے کے لئے قلعہ سے باہر نکلا۔ شہر والوں نے اس پر پتھراؤ کیا۔ کسی نے بندوق بھی چلادی۔ نادر شاہ یہ صورت حال دیکھکر بہت برہم ہوئے، اور حکم دیا۔ جہاں ایک ایرانی سپاہی کی لاش دیکھو وہاں ہندوستانی کو زندہ نہ چھوڑو۔ بس قزلباشی تلواریں سونت نکل پڑیں اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں کسی کو ہمت نہ تھی کہ نادر شاہ کے سامنے جائیں۔ اس وقت وہی نظام الملک آصف جاہ نے دلّی والوں کی مزید جانیں بچانے کے لئے اپنا سر ہتھیلی پر رکھکر پگڑی گلے میں ڈال کر نادر شاہ کے سامنے پہنچا۔ نادر شاہ نے اس کی سفارش کو قبول کر لیا۔ اور تلوار نیام میں ڈالی اور اَمان کا اعلان کیا۔ نادر شاہ واپس جانے سے پہلے اپنے بیٹے نصراللہ کا عقد محمد شاہ کی بیٹی سے کیا اور دلّی کی ساری دولت، جس میں تخت طاؤس بھی شامل تھا۔ اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک تخمینہ کی رو سے کہا جاتا ہے کہ کوئی ستر کروڑ روپیہ کی مالیت ساتھ لے گیا صلح نامہ یہ ہوا کہ سندھ کے آس پاس والے سارے علاقہ نادر شاہ کے قبضہ میں ہوجائینگے۔

احمد شاہ ابدالی کا حملہ:۔

نادر شاہ کے حملہ سے دلّی کی مرکزیت کمزور ہوگئی اور خزانہ خالی ہوگیا۔ لوگ دلّی کو چھوڑ کر نکل گئے۔ ملک ٹکروں ٹکروں میں تقسیم ہوگیا، ہر طرف طوائف الملوکی پھیل گئی۔ مغلیہ حکومت کے زرخیز صوبے بنگال۔ بہار اور اوڑیسہ دلّی سے کٹ گئے اور وہاں جداگانہ حکومت قائم ہوگئیں۔ نادر شاہ کے جانے کے بعد علاقہ کے ماتحت نواب باغی ہوگئے اور اپنی حکومت کا اعلان کردیا۔ آخر ٢٦ ربیع الثانی ١١٦١ھ مطابق ١٧٤٨ء میں محمد شاہ انتقال کرگئے۔ ان کی حکومت کا عرصہ تیس سال تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں احمد شاہ درانی نے لاہور پر پہلا حملہ کیا۔ لاہور کے صوبدار شاہنواز خان تھے جن کی مدد کے لیئے دلّی ایک بڑا لشکر ولی عہد مرزا احمد شاہ کی قیادت میں بھیجا گیا۔ لیکن احمد شاہ ابدلی نے لاہور پر قبضہ کرکے اسے پامال کردیا۔ اس جنگ میں قمرالدین بن نظام الملک شہید ہوگئے اس کے بیٹے میر منو نے بڑی جگری سے درانیوں کو بھگایا یہ واقعہ ربیع الاول ١١٦١ھ مطابق ١٧٤٨ء کا ہے۔

سیاسی نقطہ نظر سے محمد شاہ کا زمانہ بڑی مصیبت اور غارت کا تھا۔ بادشاہ کی کمزوریوں اور نادانیوں کی وجہ سے رعایا کو بہت کچھ بھگتنا پڑا وہ بیگاہ بڑی بے دردی سے کچلے گئے۔ نادر شاہ کے ظالمانہ ضرب سے دلّی مدت تک سنبھل نہ سکی۔ جو قتل سے بچا، اُسکا گھر بار تباہ اور برباد ہو گیا۔ لیکن دوسری طرف ادبی نقطۂ نظر سے محمد شاہ کا زمانہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اُس زمانے میں اُردو شاعری کو بڑی ترقی ہوئی۔ حکومت کی شان تو گئی۔ لیکن مغلیہ سلاطین نے اپنی زبان بھی کھودی۔ اب دربار میں فارسی کے بجائے اب ہندوستانی زبان کا اقتدار ہوا۔ محمد شاہ کی دربار میں فارسی زبان کے بجائے اردو زبان میں علم و ادب کی محفلیں ہوتی رہیں۔ وہ خود بھی بڑے شاعر اور موسیقار تھے۔ اس نے ہندوستانی زبان میں شعر کہا تھا۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں[1]

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی۔ دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا۔

خوف سے مار کے یاران اُسے لرزاں نہ کرو

زلف کا نام نہ لو اور پریشان نہ کرو۔

یہ اس زمانے کے اشعار ہیں جب ہندوستانی زبان دکن سے شاہجہان آباد پہنچی۔ ولّی دکن سے دلی آئے تو ان کی شاعری کا چرچہ ہوا۔ جس کے نتیجہ میں فارسی کے شعراء نے بھی ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے اور اُردو کے اُستاد پیدا ہوئے۔ جن میں عبد القادر، مرزا بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، مرزا مظہر جان جانان میر سودا، خواجہ میر درؔد، میر تقی میؔر وغیرہ۔

دلّی کی معاشی حالت کا یہ حال تھا کہ حرص و آز کی وجہ سے شریفانہ اخلاق و خصائل کسی میں باقی نہ رہے تھے۔ فوج کی حالت الگ زبوں ہو گئی تھی نہ کسی کو تنخواہ ملتی تھی نہ سامان اور اسلحہ موجود تھا۔ سپاہی بے سروسامان تنخواہ کے وعدوں پر جیا کرتے تھے۔ وہ تنگ آکر اپنی ڈھال اور تلوار گروی رکھ دیتے تھے۔ عالم، فاضل، ادیب، صناع، تاجر ہر ایک مفلسی میں بہت پریشان حال تھے۔ جس کو جدھر سہارا دکھائی دیتا تھا۔ اس طرف چلے جاتے تھے۔ روز روز کے حملوں نے عام لوگوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اپنے تحقیقی مقالہ "دلّی کا دبستانی شاعری" میں صاحب فن کے تحریر فرماتی ہے[2]

فرخ آباد، لکھنو، فیض آباد، عظیم آباد کی طرف ہر صاحب فن ہجرت کر رہا تھا۔ یہ فنکار اپنے دل کے پھپھولے شہر آشوب اور حالات زمانہ اور گردشِ تقدیر پر نظمیں لکھ کر پھوڑتے تھے۔ سوؔدا کا قصیدہ شہر آشوب، مخمس شہر آشوب، قصیدہ تضحیک روزگار، میر کا مخمس "درحال لشکر" مثنوی دربیانِ کذب اور ذکر میر میں اپنی اور دلّی کی خراب حالت کا بیان۔ حاتم کا شہر آشوب سب اُسی زمانہ کی چیزیں ہیں۔ سوؔدا نے خصوصاً اپنے قصیدہ شہر آشوب میں جس تفصیل سے حالات کی ناسازگاری اور معاشی خرابی کا نقشہ کھینچا ہے وہ بہت مکمل ہے۔ سپاہی، موذن، خطیب، واعظ، گداگر، مصاحب، طبیب، سوداگر، کاشتکار، وکیل شاعر، مُلّا کاتب شیخ وغیرہ کی حالت زار کا جائزہ لیتے ہوئے یہی نتیجہ نکالتے ہیں:۔

دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام   عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشان ہے

یہاں فکر معیشت ہے تو واں وعدۂ محشر،   آسودگی حرفی ست نہ یاں ہی نہ وہاں ہے۔

یہ تھے سیاسی اور معاشی حالات جس میں ہندوستان کے عظیم شعراء نے اپنے نادر کارنامے چھوڑے اور اُردو زبان پروان چڑھی۔

ہمعصر اُردو شعراء کے متعلق یہ دیکھنا ہے کہ شاہ عبد اللطیف بھٹائی کے ہمعصر اُردو شعراء کون سے تھے اور اُنکا شاعرانہ ماحول کیسا تھا

---

[1] سیّد صباح الدین عبد الرحمٰن   بزم تیموریہ   مطبع معارف اعظم گڑھ   صفحہ ۳۰۶

[2] دلی کا دبستانی شاعری   مصنف ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی   انجمن ترقی اُردو (ہند) دلی   صفحہ ۱۶ - ۱۷

جس کے پس منظر میں اُردو شعراء نے نئی شاعری کی بنیاد رکھی تھی۔ اُردو شاعری۔ اُردو شاعری چونکہ فارسی شاعری کے نقش قدم پر چلی اور اس زمانے میں فارسی شاعری میں غزل کو نمایاں حیثیت حاصل تھی، اس لیئے اُردو میں بھی شروعات غزل ہی سے ہوئی[1] اُردو زبان کے اوّلین شعراء اکثر صوفی شعراء تھے لہٰذا اُن پر صوفیانہ اور تصوف کا بڑا اثر تھا۔ تصوف اس زمانے کے تمدن میں شعر و شاعری کے ہنگامہ کا بہت بڑا محرک ہے صوفیہ اس عہد اور تہذیب کا ذہنی طبقہ ہیں اور تصوف ہی معیارِ عقل، علمیت، تہذیب و اخلاق تھا۔ لیکن تصوف کے لیئے ضروری ہوگیا تھا۔ عشق و عاشقی اس زمانے میں عام تھی بلکہ عقلی صلاحیت، اخلاقی بلندی اور تہذیب کے نفس کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔[2] یہ دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے کہ شاعری میں اگر دل کی کوئی جگہ ہے تو وہ غزل ہے۔ چونکہ صوفی شعراء کا دل، آئینہ مثل، اور دماغ جام جہان نما ہوتا ہے۔ اس لیئے اُن کی شاعری غزل کی شاعری تھی جو اُن کی پوری زندگی پر محیط ہوگئی۔

غزل کی صنف کو شروع میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ عرب اور عجم کے شعراء بھی شروع میں قصیدہ کی صورت میں شعر کہتے تھے، جن میں غزل کے اشعار بھی ہوتے تھے جن کو بہاریہ اشعار کہتے تھے۔ جب ایران کے شاعر رودکی نے غزل کو قصیدہ سے الگ کیا تو غزل کی اہمیت بڑھ گئی۔ اس صنف میں بادشاہ کی جگہ محبوب کی مدح کی گئی، اور عورت کے متعلق گفتگو ہوئی یہ عشقیہ اشعار رہے۔ لیکن اُردو شاعری کو ایسا دور نصیب نہ ہوا کیونکہ اُردو شاعری کی ابتدائی تصوف سے ہوئی، لیکن اُردو شاعری کا بیشتر سرمایہ عشقیہ ہی ہے۔ ایک اُردو کے ممتاز نقاد کی رائے ہے[3]

ہمارے صوفی شعراء غزل اس لئے نہ کہتے تھے کہ اُنہیں چند اشعار عشق و محبت کے نکالنے پڑتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ طریق عشق کو طریق زندگی، فلسفہ، عشق کو فلسفہ حیات اور سیاستِ عشق کو سیاست زمانہ جانتے تھے اور غزل میں ہی گفتگو کرتے تھے۔

شہنشاہ اورنگزیب کے آخری عہد میں ایک شاعر مرزا عبدالقادر بیدل[4] جو کامل شاعر، فقرِ تصوف میں بے مثال تھے۔ ان کی وفات ۱۱۳۴ھ میں ہوئی فرمایا ہے:۔

مت پوچھ دل کی باتیں۔ وہ دل کہاں ہے ہم میں	اِس تخم بے نشان کا حاصل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے داستاں پر عشق آنکر پکارا	پردے سے یار بولا کہاں ہے ہم میں۔

ایک عرصے تک اردو شاعری نے بہت سے رواج اپنا لیئے اور شاعری کا چرچہ ہوا۔ یہاں تک کہ شعراء کے حلقہ میں ریختہ کے خالق ولی دکنی نے دلی میں آکر شاعری کے فن کو رونق بخشی اور ہندوستان میں اُردو شاعری کو فروغ دیا۔ فارسی کی طرح دیوان مرتب کیا۔ اگرچہ اس سے پہلے اور بھی۔ مثلاً حکیم، یار علی شفا، غازی، غواص، تجلی، سراج الدین، جولاں اور طالب شاعر موجود تھے جو صاحب دیوان تھے جنہوں نے فارسی بحروں میں اُردو کے اشعار کہے ہیں۔ لیکن کوئی بھی شاعر ولی دکنی کے رتبے کو پہنچ نہ سکے خود میر تقی میرؔ نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ ریختہ کا آغاز دکن سے ہوا۔ اسکے کہا تھا

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا۔

۱۔ تذکرہ شعراء اُردو مرتبہ اطہر حسین نظر لدھیانوی صفحہ ۹۔ ۲۔ دلّی کا دبستانِ شاعری مصنف ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صفحہ ۲۳۔

۳۔ رودکی کا نام محمد تھا۔ جو رودک نخشب کا رہنے والا تھا۔ قصیدہ کا رواج اور غزل کی یہ ارتقا بھی انہوں نے کی جو آج تک چلی آرہی ہے۔

۴۔ "غزل یا شاعری" "روح ادب" مقالہ نگار ممتاز حسین۔ شمارہ نمبر ۱۷ سال: ۱۹۵۱ء

۵۔ بحر الفصاحت مصنف نجم الدین نجم الغنی۔

۶۔ "پنجاب میں اُردو" مصنف حافظ محمود خان شیرانی۔ صفحہ ۳۹۔

ولی دکنی نے اُردو شاعری کی تاریخ میں اپنا نقش قدم جمایا جو قیامت تک اُن کا حق استادی رہیگا۔ ولی دکنی اردو زبان میں سب سے پہلے صاحب دیوان تھے اور عورتوں میں پہلی عورت بھی حیدرآباد دکن کی مہ لقا تھی۔ جسکا دیوان موجود ہے "چندا" تخلص کرتی تھی۔ اُنہوں نے ۱۷۹۹ء میں اپنا دیوان کسی ذیشان انگریز کو نذر کیا تھا جو سرکار کمپنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور اُسکا نسخہ لنڈن کی آرٹ گیلری میں بھی موجود ہے اس کے کلام میں سے صرف ایک شعر اکثر تذکروں میں ملتا ہے۔

اخلاق سے تو اپنے واقف جہان ہے گا
پر آپ کو غلط کچھ ابتک گمان ہے گا۔

اِس طرح اُردو شاعری اپنے منازل طے کرتی گئی۔ ھندوستان کے فارسی گو شعراء نے بھی اُردو زبان میں طبع آزمائی کی اُن میں حشمت میر محتشم علی خان، مرزا فضل ثابت، اور شیخ عبد الرضا متین، میر شمش الدین فقیر دہلوی قابل ذکر ہیں۔ سراج الدین آرزو جو فارسی زبان کے بڑے شاعر تھے۔ جن کی تربیت سے ھندوستان کے بڑے باکمال شعراء ریختہ شاعری میں پیدا ہوئے۔ جو اُردو زبان کے صحیح معنیٰ میں استاد مانے جاتے ہیں۔ آگے چل کر اس دور کے بزرگ شعراء کی زبان صاف اور فصیح ہوگئی تھی۔

دلی میں اردو کے اولین شعراء حاتم۔ خان آرزو، ناجی، آبرو، تاباں، یہ سب کے سب فارسی شاعر اول تھے اور بعد میں اُردو کے شاعر تھے۔ اس لئے اُن کی شاعری میں دکنی شعراء کے مقابل میں ھندی الفاظ کم نظر آتے ہیں، اور فارسی ترکیبیں زیادہ ہیں۔ فارسی زبان اثر اردو زبان پر زیادہ ہونے کی وجہ سے فارسی زبان کا اُردو زبان میں منتقل ہونا لازمی تھا۔ لیکن آگے چل کر اُردو زبان کو موجودہ صفائی، سلاست اور شیرینی حاصل ہوئی اور ھندوستان کی بڑی زبان بن گئی۔ شاہ مبارک آبرو کے زمانے میں ھندوستان کے یہی استاد شعراء تھے جنہوں نے اُردو شاعر کو بڑی ترقی دی۔

دکن کے اُردو شعراء

اُردو زبان اور شاعری میں دکنی زبان کی آمیزش بہت پائی جاتی ہے۔ قدیم دکنی اردو الفاظ کا غلط تلفظ، غلط ترکیبیں، اُصول ترتیب و قوائد سے بے پرواہ، حروف کا تقطیع سے گرنا، اس قسم کے عیوب اکثر موجود تھے۔ تاہم ہر قسم کے موضوع پر شاعری موجود ہے۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلاطین نے شعراء کی قدردانی کی اور خود قطب شاہی، عادل بادشاہوں نے شاعری میں دلچسپی لی۔ خود محمد قلی قطب شاہی کے درباری شعراء غواصی، ابن نشاطی، شاہی، مرزا بیچارہ، نوری، فائز مشہور تھے قطب شاہی دور کے اُور مشہور شعراء نصرتی، ھاشمی، حاتم علی تھے عادل شاہی دور کے مشہور شاعر پیرزادہ روحی تھے، جو مرثیہ گو شاعر تھے۔ لیکن غزل اور مخمس وغیرہ بھی لکھتے تھے۔ اُن کی شاعری کا نمونہ یہ ہے:۔

نس دن سجن تجھ درس کا آدھار ہوتا کاش کے
پل پل میں ہی یہ مرن یک بار ہوتا کاش کے
جانا ہمیں مہ رخ کینے بسیار ہوتا کاش کے
واقف ہمارے حال پر دلدار ہوتا کاش کے۔

شیخ داؤد ضعیف:۔ یہ اپنے دور کے اچھے شعراء میں سے ایک تھا۔ اس کے ساتھ عالم دین اور فقیہ بھی تھے۔ اُن کے کلام میں مثنوی مشہور ہے ضعیفی نے ایک کتاب اردو زبان میں مرتب کی تھی۔ جس کے لئے لکھا ہے کہ یہ زبان آج کل اس ملک کے حصہ میں بہت مقبول ہے اور شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ اِس کتاب میں اورنگزیب عالمگیر کی شان میں مدح لکھی تھی۔ جس کی مثال دی جاتی ہے۔

بحر الفصاحت مصنف نجم الغنی صفحہ ۴۲.

بہ دور جہاں دار اورنگ زیب
کہ جس سے ہوا اس زمانے کوں زیب۔

ذوقی   نام سید شاہ حسین تخلص ذوقی۔ یہ مذہب کے پابند شخص تھے۔ شعر و شاعری میں اُن کو کافی دسترس حاصل تھی۔ اور اپنی شاعری پر بڑا فخر کرتے تھے۔ اُنہوں نے بہت سی مثنویاں تصنیف کی تھی جس میں "وصال العاشقین" "غوث نامہ" "منصور نامہ اور ماں باپ" مشہور۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو

بقا ابن بطو کہے ایک روز   تھے منبر پو اور سرور نیک روز
تجلی کیا اُن کے دل پر خدا   ہوئے اوس تجلی میں سون جدا۔
کری اُون کوں بیخود تجلی رب   لگی ہونے پو کرنے نہ لاتاب تب۔

بلبل :- اس دور کا یہ شاعر گذرا ہے جس کا تفصیلی حال کسی تذکرہ میں نہیں ملتا۔ ان کی ایک مثنوی ادبیات اردو میں محفوظ ہے یہ مثنوی ۱۱۰۰ھ کے قبل تصنیف ہوئی تھی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تو بلبل خاص گلزار سخن ہے   سخن تیرا چمن اندر چمن ہے۔

—

وہ سن بہر مبارک باد آواز   کیا بلبل او چون پروانہ پرواز۔

عبدالعلی واجی :- کی سوانح حیات نہیں ملتی۔ اُنہوں نے ۱۱۱۰ھ مطابق ۱۶۹۹ء میں ایک مثنوی "نامۂ علی" لکھی تھی۔ جس میں حضرت علیؓ کی شان مبارک میں منقبت ہے۔ اور حضرت علیؓ کے کارنامہ اور واقعات کو داستان کی حیثیت میں لکھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

کہ ایک دن محمد علیہ السلام   جو بیٹھے تھے اصحاب یاران تمام
ابابکرؓ ہو عمرؓ عثمانؓ   علیؓ مرتضیٰ شاہ مردان تھے۔
دس نکوں بیٹھے تھے اس پاس   شفاعت کا شربت پئے عام خاص (الخ)

دریا - یہ بلند پایہ شاعر تھے۔ دکن کے شہروں میں اکثر اُن کے اشعار پڑھے جاتے تھے اور بہت مقبول تھے۔

بنا اول کروں حمد خدا میں   زبان اوپر آپس کے ابتدا میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت   بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت۔

وجہ الدین وجدی :- یہ صوفی شاعر اپنے دور کے بڑے شعراء میں سے تھے۔ ان کی تین مثنویاں مشہور ہیں۔ اُن کی شاعری سے اس وقت کے تمدن اور تہذیب، رسم و رواج پر روشنی نظر آتی ہے۔ وجدی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

شاہ عبداللہ عاشق :- اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ اور وہاں کے مشہور بزرگ شاہ نظام الدین ثانیؒ کے خاص مرید اور خلیفہ تھے۔ اُن کی ایک تصنیف "اشارات الغافلین" مشہور ہے۔ اس میں اکثر فقہ پر مضامین منظوم کئے ہوئے ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

سنو نام اس کا سنو اے مسلمین   کہتے اس کوں اشارت الغافلین۔
یو دکنی میں بولیا ہوں اس واسطے   ہر اک شخص کی یو سمجھ واسطے۔
مسلمان کو اس تے ہوئے فائدا۔   اگر بختور ہے یاد ہو دے گا۔

سید اشرف شاہ :- تخلص بھی اشرف کرتے تھے۔ اس مشہور شاعر کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے۔ اُنہوں نے ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء میں ایک مثنوی جنگ نامہ حیدر لکھی تھی۔ جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جنگی حالات تفصیل سے بیان کیئے ہیں۔ اُن کے کلام میں فارسی ترکیبیں اور اضافتوں کا اثر

نظر آتا ہے۔ سید اشرف نے مرثیہ بھی لکھے تھے کلام میں زبان کی شستگی پائی جاتی ہے: کلام یہ ہے۔

خداوند اکبر ہے صاحب کریم ۔ کہ جس کا محمدؐ ہے نائب مقیم

نہ مادر پدر اس کون نانا رہے ۔ دو جگ اُو پیدا کر ہنہار ہے۔

محمد فیاض ولی ویلوری یہ شاعر اپنے ہمعصر اور ہم نام ولی دکنی سے الگ ہیں۔ اُن کا زمانہ سنہ ۱۶۹۰ء اور سنہ ۱۷۹۰ء کے درمیان ہے ویلور مدراس علاقہ میں ایک شہر ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ سنہ ۱۱۶۳ھ تک زندہ تھے۔ اُن کی ایک مثنوی قصہ "رتن پدم" ملک محمد جائسی کی "پدماوت" کی طرز پر لکھی تھی۔ جس میں اندازاً آٹھ ہزار اشعار موجود تھے۔ اُن کی دوسری مثنوی "روضۃ الشہدا" جس میں دس ہزار ابیات موجود ہیں یہ سنہ ۱۱۳۷ھ میں لکھی تھی کچھ تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ یہ مثنوی حضرت ملا حسن واعظ کاشفی کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ ولی ویلوری کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے

خدایا توہے پاک پروردگار ۔ ترن کا رو آتا رو اچھے آتار۔

حکایت عجب یک نفو دردمند ۔ ہیں کو کھلے سے قفلان کے بند

سنو اس کہیں کان دے دل سوں سب ۔ کہتے ہیں محمدؐ رسولؐ عرب۔

میر جعفر زٹلی:۔ ان کا اصلی وطن شمال ہند تھا۔ لیکن شہزادہ کام بخش کی فوج کے ساتھ دکن آئے تھے۔ حیدر آباد اور اورنگ آباد دونوں شہروں میں قیام کیا۔ اُس وقت وہاں شعر و شاعری کی محفلوں سے متاثر ہوکر دکنی اُردو میں شعر کہنے لگے۔ اکثر اُن کے شعر میں ہجو پائی جاتی ہے فحش گوئی اختیار کی تھی اس وجہ سے سنہ ۱۷۱۳ء میں شہزادہ فرخ سیر کے حکم سے قتل کردیئے گئے۔ میر جعفر کے کلام پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے زمانے میں اردو میں فارسی زبان کا پیوند بدستور جاری تھا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

جو کوئی مجھ اوپر شفقت کرے ۔ جگت بیچ اس کی خدا پت رکھے۔

نہ ایں ہجو از راہ حرص و ہوا است ۔ دلآزار را ہجو کردن روا است

بیا جعفر اکنوں شکایت مکن ۔ ز موذی و ماضی حکایت مکن۔

فتح:۔ نام فتح شریف اور تخلص فتح تھا۔ ان کی دو مشہور مثنویاں موجود ہیں۔ ایک زلیخا ثانی دوسری "پند نامہ لقمان" ان کے حالات زندگی کا کوئی پتا نہیں۔ وہ گوڈر کے رہنے والے تھے۔ اپنے ایک دوست محمد امین کے کہنے پر زلیخا مثنوی لکھی۔ دونوں مثنویاں فارسی سے ترجمہ کیا۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہیں۔

عزیزاں روایت سنو کان دھر ۔ اول فارسی تھا۔ یو دکنی وگر

انھا گوڈر ایک شہر کا جو نام ۔ ہمیشہ فتح کا انھا وہاں مقام

ولی دکنی:۔

اُردو ادب کی مشہور شخصیت اور سب سے بڑے شاعر۔ اور اُردو شاعری کے موجد اور بابا آدم شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ ان کے بیانات کا جائزہ لے کر صحیح حالات پیش کیئے جائیں:۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف "آب حیات"[۲] میں ولی کا نام شمس الدین ولی اللہ لکھا ہے۔ عبدالحی نے گل رعنا میں شمس الدین لقب

۱۔ دکن میں اُردو مرتب نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۲۵۰

۲۔ آب حیات مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد۔

ولی اللہ نام تحریر کیا ہے۔ دوسرے تذکروں میں خاص طور پر تذکرہ گلزار ابراہیم میں ابراہیم خلیل نے اس طرح لکھا ہے [1]

ولی دکھنی شاہ ولی اللہ اصلش گجرات در شعرائے دکن مشہور و ممتاز ست۔ گویند در
زمان عالمگیر بادشاہ بہ ہندوستان آمدہ مستفید از شاہ گلشن گرویدہ۔

نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف "دکن میں اردو" میں اس طرح لکھتے ہیں۔ [2]

"ولی کا صحیح نام ولی محمد تھا، دکن کے رہنے والے تھے، پیدائش کا صحیح سن معلوم نہیں ہے"

دکنی ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر زورؔ نے بھی سید ولی محمد ولیؔ اورنگ آبادی لکھا ہے' خود ولیؔ کے دوست سید ابو المعالی کے بیٹے میر محمد تقی میرؔ نے ولی کا نام ولی محمدؔ لکھا ہے۔ اُن کا مرتب کردہ دیوان کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: [3]

تمت تمام شد دیوان مغفرت نشان ولی محمد مرحوم متوطن دکن تاریخ دوم شہر ذی قعدہ سنہ ۱۱۵۶ھ روز
پنج شنبہ بوقت صبح تحریر یافت۔ مالک و کاتب ایں دیوان عاجز المذنب محمد تقی ولد سید ابو المعالی است۔

ولی کا سال ولادت سنہ ۱۰۷۹ھ بتایا جاتا ہے۔ ولی کی ابتدائی تعلیم کی تحصیل گجرات میں ہوئی ظاہری علوم کے ساتھ باطنی فیض اپنے مرشد حضرت علی رضا گجراتی سے حاصل کیا جسکا اشارہ اس طرح کیا ہے

بعد شاہ نجف رضی اللہ، ولی اللہ پیر کامل علی رضا پایا [4]

اورنگزیب عالمگیر کا دکن کی فتوحات اور طویل قیام کی وجہ سے یہ قابل فخر نتیجہ نکلا کہ ولی جیسا شاعر پیدا ہوا۔ اور اورنگ آباد تقریباً ایک صدی تک درخشاں رہا۔ بیس برس کی عمر میں تعلیم کی تکمیل کے لئے گجرات گئے تھے۔ گجرات میں قیام کے دوران اُنکے شباب کا زمانہ تھا، اس لئے وہ زمانہ اُسے ہمیشہ یاد رہتا تھا۔ اس وقت میں سیر و تفریح، دلچسپیوں، دوستوں کی جان نثاری و محبت۔ اور مولانا نور الدین اور انکے فرزند شیخ محمد صالح کی صحبت اور مدح سرائی کی وجہ سے بعض تذکرہ نویس اُنہیں گجرات کا لکھتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اُنہوں نے ایک نظم گجرات پر لکھی تھی جس میں وہاں کی سیر و تفریح کا ذکر کیا ہے۔ اور ہر جگہ خود کو دکن کا باشندہ ظاہر کرتا ہے۔ [5]

ولیؔ نے دو مرتبہ دلیؔ کا سفر کیا۔ پہلی بار سنہ ۱۷۰۰ء یعنی اورنگزیب عالمگیر کے حیات میں۔ اس وقت دلی میں سید سعد اللہ شاہ گلشن سے ملاقات کی جو نقشبندی سلسلہ کے مشہور صوفی بزرگ اور فارسی کے شاعر تھے، شاہ صاحب نے اُنھیں اُردو غزل کو فارسی رنگ میں پیش کرنے کی ترغیب دی دوسری مرتبہ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں سنہ ۱۷۲۲ء میں دلی گئے تھے۔ ساتھ ساتھ ابو المعالی بھی گئے تھے، ولی اپنے ساتھ اپنا دیوان بھی لے گئے تھے، ان کے کلام میں جو انوکھا پن اور نئی اسلوب تھے، دلی والوں کو بہت پسند ہوا۔ کیوں کہ وہاں کے شعراء فارسی زبان میں شعر کہتے تھے۔ اور اس سے بلکہ اس چیز سے بےبہرہ تھے۔ تقریباً چار سو برس سے دکن میں اُردو ریختہ نظم و نثر لکھی جا رہی تھی، دہلی والوں نے ولی کو اس زبان میں کس صفائی اور عمدگی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے دیکھا تو اس بات سے بہت متاثر ہوئے، اور ان کے کلام کو اس قدر مقبولیت ہوئی کہ لوگ

---

[1] تذکرہ گلزار ابراہیم مرتب محمد ابراہیم خان خلیل۔

[2] دکن میں اردو مصنف نصیر الدین ہاشمی

[3] نکات الشعرا مصنف میر تقی میر مرتب مولوی عبد الحق صاحب مغفور

[4] یعنی اے ولی اللہ (شاعر خود) شاہ نجف رضہ (حضرت علی رض) کے بعد پیر کامل علی رضا ہیں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان

[5] تاریخ ادب اُردو مرتب ادارہ ادبیات اُردو۔

سرِ عام اُن کی غزلیں گانے لگے۔ ہر جگہ ان کی عزت اور قدر ہونے لگی۔ دلی میں اُن کی شاعری سے ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ ولیؔ نے ۱۱۱۹ھ میں وفات کی تھی۔ ان کی تاریخ وفات میں بھی اختلاف رائے ہے۔ محترمی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے اپنے ایک مقالہ "ولی گجراتی" میں تحریر فرمایا ہے لکھتے ہیں

جامع مسجد بمبئی کے کتاب خانہ میں دیوان ولی کا ایک نسخہ موجود ہے جس میں مفتی احسن کا لکھا ہوا ایک قطعۂ تاریخ ملتا ہے۔ راقم الحروف نے بھی اُسے دیکھا ہے، وہ اس طرح ہے۔

مطلع دیوانِ عشق سیّدِ ارباب دل — والیٔ ملکِ سخن صاحب عرفاں ولیؔ

سال وفاتش فرد از صبیہ الہام گفت — باد پناہ ولی (۱۱۱۸ھ)، ساقی کوثر (۱۱۱۹ھ) علی رض۔

ولی اپنے دور کے باکمال شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری کے تین دور تھے، پہلا دکنی خالص زبان میں کلام کا دور، دوسرا جس میں اُردو اور دکنی الفاظ استعمال کئے ہوئے۔ تیسرا خالص اُردو زبان میں شعر۔ ابتدا میں ان کے کلام پر بھاشا کا اَثر نظر آتا ہے۔ دلی کے سفر کے بعد فارسی شاعری کی طرز پر غزل کہی جس میں فارسی ترکیبیں، ردیف، قافیہ وزن کا بھی خیال کیا تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری فارسی کے تتبع میں ہوئی۔ فارسی شعراء کی طرح اردو شعراء نے بھی تخلص اختیار کیا۔

ولی دکنی کی اردو شاعری میں ایک خاص طرز تھی اور عجیب و غریب دلکشی پائی جاتی ہے۔ ولی کا کلام نہایت صاف اور سلاست سے بھرپور ہے اُنہوں نے فارسی شاعری کی تقلید کی تھی۔ اور ایرانی شاعری کی طرز پر دیوان مرتب کیا۔ غالباً یہ پہلا شاعر تھا، جس کا اُردو شاعری میں دیوان موجود ہوا۔ ولی نے دلی پہنچ کر فارسی زبان کو اپنایا۔ اور اپنے کلام میں امیر خسرو اور نظیری کا اَثر قبول کیا مثلاً امیر خسرو کی مشہور غزل

جاں زتن بردی و درجانی ہنوز — دردہا دادی و درمانی ہنوز۔

ولی اسی غزل پر اپنی غزل اس طرح لکھی:۔

تو ہے رشکِ ماہ کنعانی صنوز — تجھ کو ہے خوباں میں سلطانی ہنوز۔

نظیری کی ایک مشہور غزل ہے

چہ خوش ست باد ویک دل سر حرف باز کردن — سخن نہفتہ گفتن گلۂ دراز کردن۔

ولی اس طرح کہتا ہے:۔

ہے ناز میں صنم کا زلفاں دراز کرنا — فتنے کا عاشقاں پر دروازہ باز کرنا

اس طرح نظیری کی مسلسل غزلوں کی تقلید کی ہے۔ اس کے علاوہ خاقانی، عرفی، وغیرہ کو اپنا رہنما سمجھتا ہے۔ اور ان کی تقلید پر فخر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے: "عرفی و انوری و خاقانی مجھکو دیتے ہیں سب حساب سخن"۔

ولی کا کلام اتنا رنگین اور دلکش ہے کہ کوئی بھی ان کے اسلوب کا اعتراف کیئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اُن کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ محبوب کے قصیدہ خوانی میں یہ ایک صوفی کی وصف ہے۔ ولی کی طبع کا میلان تصوف کی طرف زیادہ تھا۔ ان کے اسلوب بیان میں سادگی اور صفائی کے رونق اور رفعت پائی جاتی ہے۔ انکی شاعری اُس زمانے کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا خیال کتنا درست ہے[2]۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اُردو کے اولین اسلوب پرست شاعر ہیں جن کی شاعری اُن کے معانی سے زیادہ ان کے اسلوب کی وجہ سے زندہ رہے گی۔

۱۔ رسالہ برگ گل مقالہ "ولی گجراتی" مقالہ نگار محترمی جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ۔

۲۔ "ولی سے اقبال تک" مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب صفحہ ۳۵

ولی دکنی کا کلام نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے :۔

غزل

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا،
جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا۔
دی حق نے تجھے بادشہی حسن نگر کی
یہ کشورِ ایراں میں سلیمان سے کہوں گا
زخمی کیا ہے مجھ تیرے پلکوں کی انی نے
یہ زخم تیرا خنجر بھالاں سے کہوں گا
بے صبر نہ ہوا ہے ولی اس دور سے ہر گاہ
جلدی سے تیرے درد کے درماں سے کہوں گا۔

غزل

پھر میری خبر لینے کو صیاد نہ آیا۔
شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا
بلبل و پروانہ کرنا دل کے تیئں۔
کام ہے تجھ چہرہ گل ناز کا
آرزوئے چشمہ کوثر نہیں۔
تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ دیدۂ بیدار کا۔
اے ولی ہونا سرنجن پر نثار
مدعا ہے چشم گوہر یار کا۔

غزل

صاف دل کو اگر مدام رکھو — جام جمشید کا مقام رکھو
گر تمہیں تاب انتقام نہیں — بے سمجھ مت کسی سے کام رکھو۔
خیال کی مت کرو طرف داری — خاطرِ زلف مشک فام رکھو
ناز سے سرکشی کوں دیکھوں گا
آج میرا نیاز نام رکھو۔

دکن میں اردو مولف نصیر الدین ہاشمی صفحہ ۲۵۵۔

باب پنجم

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور معاصر اُردو کے شعرا

(دہلی کے ہمعصر شعراء)

مماثلت

ولیؔ دکنی کے دہلی پہنچنے کے بعد وہاں کے ادبی ماحول میں عجیب انقلاب پیدا ہوا۔ اور زبان میں غزل گوئی کی تحریک پیدا ہوئی۔ حالانکہ اُس وقت مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ اورنگزیب عالمگیر تک مغل شہنشاہت کا نام تھا۔ لیکن بعد میں جو بھی تاجدار بنے وہ بہت کمزور پڑ گئے۔ ۱۷۰۷ء سے لیکر ۱۷۱۹ء تک مختلف حکمران تبدیل ہوئے۔ وہ بھی خانہ جنگی اور دوسری محاذ آرائیوں سے دوچار ہوئے۔ ۱۷۱۹ء میں محمد شاہ بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ لیکن وہ بھی کوئی اچھے تاجدار ثابت نہ ہو سکے۔ اُن کے دورِ حکومت میں بیرونی حملوں نے دہلی کو تاراج کر دیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ شعر و شاعری اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ اس دور کے شعراء کرام کی سرپرستی کرتے تھے۔

اس انقلابی اور ہنگامہ آرائی کے دور میں دلی کے ادبی ماحول کو بڑی ضرب لگی۔ کیونکہ بڑے بڑے استاد اور اہلِ سخن دہلی کو خیرباد کہکر ہندوستان کی دوسری جگہوں پر چلے گئے۔ جس سے دہلی کا ادبی ماحول بڑا متاثر ہوا۔ حالانکہ اس دور نے بڑے احبابِ سخن پیدا کیئے۔ جن میں اوّلین دور کے شعراء میں سے معزالدین فطرتؔ۔ قزلباش خان امیدؔ۔ سلیمان قلی خان۔ سعد اللہ گلشنؔ۔ مرتضیٰ خان فراقؔ۔ شمس الدین فقیرؔ۔ عبدالقادر بیدلؔ۔ علی قلی خان ندیمؔ قابلِ ذکر ہیں جو فارسی اور اُردو ریختہ میں شعر کہتے تھے۔ یہ وہی دور تھا، جس میں وادیٔ سندھ کے دور افتادہ علاقہ میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سندھی زبان میں اپنی نغمہ سرائی سے جادو جگا رہے تھے۔ تو دہلی کے شعراء، اُردو زبان کی شاعری کو بلندی پر پہنچانے میں ہمہ تن معروف تھے۔ ان معاصر شعراء نے مسلمانوں کو خدا تعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت کی۔ اِن شعراء کرام کا احترام اُن کی وفات کے بعد سے آج تک اُسی طرح کیا جاتا ہے، جس طرح اُن کی حیات میں کیا جاتا تھا۔ ان شعرا کی زبان مختلف تھی۔ اُن کا رنگ اور لباس بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ اس دوری اور طبعی و جغرافیائی اختلافات کے باوجود اُن کے خیالات میں نمایاں مماثلت پائی جاتی ہے۔

شاعر اپنے تجربات کو ہجر اور فرقت کے الم انگیز لمحات اور ان سے مرتب شدہ واردات قلب کو اپنے اشعار میں بیان کرتا ہے۔ دل کی بے چینیاں الفاظ کا لباس پہن کر اشعار کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ پر کیف اور معنیٰ خیز جذبات حقیقی شعر کی تخلیق ہوتی ہیں۔ شعر میں یہ کیفیت رنج و الم کی آمیزش کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ اگرچہ شاعر اپنے ذاتی تجربات اور انفرادی محسوسات کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کردے کہ ہر پڑھنے والا اسے اپنی بات سمجھے۔ وہ شعر پڑھ کے چونک اُٹھے اور ذرا دیر کو یہ محسوس کرنے لگے جیسے وہ شعر وہ شعر خود اس نے کہا ہے۔ یہی شاعر کی کامیابی کی دلیل ہے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی شاعری میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جو اُس وقت کے اکثر اُردو شعرا میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے اُن کی شاعری میں جادو کا اثر ہے۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے شاعر گذرے ہیں اُن کے کلام میں ہمگیری عشقیہ جذبات اور پرخلوص انداز بیان کا یہی عنصر پایا جاتا ہے البتہ اُنہوں نے اظہار خیال کے لئے علیحدہ اسلوب اختیار کئے ہیں۔ یوں تو متعدد شعراء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے معاصر شعرا تھے۔ مگر ان سب کا ذکر طوالت کے پیشِ نظر دینا مشکل ہے لیکن اُن کے مشہور ہمعصر اور متاخرین اُردو شعرا کو شاہ عبداللطیف کے کلام کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ اِن شعرا کے منتخب اشعار کا آپ کے کلام سے موازنہ کیا گیا ہے تاکہ اردو دان طبقہ اس حیرت انگیز وحدتِ خیال، یکسان فکر اور عمل کی جھلک دیکھ سکیں۔ ان تمام شعرا کے کلام کے تقابلی مطالعے سے اس دور کے ذہنی رجحانات اور ثقافتی زندگی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

شاہ بھٹائیؒ نے جس زبان میں اپنا کلام پیش کیا ہے، وہ بلاشبہ ایک مخصوص علاقہ تک محدود ہے لیکن اُنہوں نے جس اُنس و محبت کا پیغام دیا ہے اس کی افادیت اور وسعت عالمگیری حیثیت رکھتی ہے۔ شاہ بھٹائیؒ اور اردو کے ہمعصر شعرا کا ذکر اس طرح ہے۔

وؔلی دکنی:۔

وؔلی دکنی کا تفصیل سے ذکر پہلے آچکا ہے۔ اُنہوں نے دہلی میں آکر اُردو شاعری کی نشو و نما کی تھی۔ اس لئے وہ اُردو شاعری کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ دہلی کی پوری ادبی فضا شاعری کے نغموں سے گونجنے لگی تھی۔ وؔلی دکنی طبقۂ اوّل کے شعرا میں سے تھے۔ ان کی ولادت ۱۰۷۹ھ میں بتائی جاتی ہے اور شاہ بھٹائیؒ کی ولادت ۱۱۰۲ھ میں ہوئی تھی۔ اس حساب سے وؔلی، شاہ بھٹائیؒ سے ۲۳ سال بڑے تھے۔ ان دونوں شعرائے کلام میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

وؔلی دکنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے حمد میں کہتے ہیں:۔

الہی، یا الہی تجھے سا جے جگت کی بادشاہی

وؔلی ہے یوں سبب خالی بہانہ، اس کا کام ہے دینا دلانا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اللہ تعالیٰ کی توصیف کی ہے اس میں انکساری کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے فرماتے ہیں:۔

اللہ جيئين نالو، تيئين موں وڏو آسرو

خاوند تنهنجي ڳالهه جو پرو پاند نه کو

نالو رب سندو، رهيو آهي روح ۾.

یا اللہ جتنا تیرا بڑا نام ہے، اتنی ہی مجھے تجھ میں اُمید ہے

یا الہی تیرے صبر (رحم و کرم) کی کوئی حد نہیں ہے

یا رب تیرا ہی نام ہمیشہ میری روح میں سمایا ہوا ہے۔

وؔلی دکنی محبوب کی تعریف اسطرح کرتے ہیں:

جب صنم کو خیال باغ ہوا   طالبِ نشۂ فراغ ہوا

فوج عشاق دیکھ ہر جانب   نازنین صاحب دماغ ہوا

مان میں تجھ لباں کے سرخ ہوا   جگر لالا داغ داغ ہوا۔

دل عشاق کیوں نہ ہو روشن   جب خیال صنم چراغ ہوا

اے وؔلی گلبدن کون باغ میں دیکھ

دلِ صد برگ باغ باغ ہوا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اسی خیال میں محبوبِ خدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں آپ کے حسن کی نکھار اس طرح کرتے ہیں۔

ڪٽي نيڻ خمار مان، جان کياءُن ناز نظر

سورج شاخون جهڪيون، کماڻو ڪمر

تارا ختيون تاڻب ٿيا، ڏيکيندي دلبر

جهڪيو ٿيو جوهر، جانب جي جمال سين.

میرے محبوب نے جب خمار آلودہ نظریں اُٹھائیں تو اسے دیکھکر سورج کی روشنی مدھم پڑگئی اور چاند مرجھا گیا
ستارے اُن کے حسن کی تاب نہ لاکر تائب ہوگئے بلکہ پورے جہان کا جوہر ان کے حسن و جمال کے آگے ختم ہوگیا۔

وؔلی کہتے ہیں:۔ وؔلی اس گوہر کا حیا واہ کیا کہنا
میرے یہاں اسطرح آوے ہے
جوں سینے میں راز آوے ہے

شاہ لطیفؒ اس خیال یوں ادا کرتے ہیں۔ پيشاني ۾ پرين جي پلاڻي جا پيهه
اڳ اکين جي ڏيه پاڻهي پير.
قمر پاڙي هير، شمس سڀرين سڀن.

میرے محبوب کی صورت میں اچھائی اور حیا کے انبار ہیں۔ طالبوں کے گھر بڑے کرم سے قدم لے کر آتے ہیں
سورج اور چاند کو کیا مجال ہے کہ وہ انکی ہمسری کرسکیں۔

وؔلی کہتے ہیں براگی جو کہلاتے ہیں گھر بار کرنا کیا
ہوئی جوگن جو کہی پی کی اسے سنسار کرنا کیا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں:۔ واري ويراڳين کي ويل جي وسار ڪج
قدم ڪاپڙين جا ليلائي لهيج
پرت پسو پٽ جي وڃڻ کي وهيج
رات ڏينهن رهج ميچ، آءُ نه جيئندي انري

"بیراگی کی اگر مدد کرنا۔ اس کے مشکل وقت نہ بھلانا۔ اُن جوگیوں کے قدم تک کوشش کرکے پہنچنا (قدم حاصل کرنا)
جو بیراگی جو مرشد کی طرف گئے ہیں اُن کی راہ پر چلنا۔ دن رات اُن کی طرف چلتے رہنا میں اُن کے بغیر زندہ نہ رہوں گی۔"

وؔلی دکنی نے فرمایا ہے:۔

کیوں عاشقاں کی صف میں پائیں وہ سرخروئی
جن کی انکھیاں کے اوپر خون جگر نہ آیا

عشق میں تفریق نہیں ہوتی۔ جس نے فرق رکھا وہ محبوب کے وصال سے محروم رہیگا۔ شاہ بھٹائی وؔلی کے خیال کی وضاحت کرتا ہے

ايڪ پيالو ٻه ڄڻا، عشق نه ڪريائين
ليکيا جي لکڻ ۾، سي قرب رسنداڪين
هڻي ڪيا هيڻ، وانجهيا پس اوصال کي.

ساغر ایک ہو اور مے خوار دو عشق میں ایسا نہیں ہوتا۔
گنتی کرنے والوں میں جو ہوگا، وہ محبوب کے وصل کو کیوں کر حاصل کریگا
خودی نے اُن کو اسطرح محبوب کے وصال سے محروم کردیا۔

شاہ ظہور الدین حاتم :- ۱۱۱۱ھ/۱۶۹۹ء — ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۲ء۔

شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم، اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ شروع میں رمز تخلص کرتے تھے۔ دلی کے شعراء کے بانی تھے۔ اپنے شاگردوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ حاتم کی ولادت شاہجہان آباد میں ۱۱۱۱ھ کو ہوئی اور ۱۱۹۷ھ میں وفات پائی۔ حاتم شاہ بھٹائیؒ کے ہمعصر تھے یعنی شاہ بھٹائیؒ سے ۹ سال بعد میں پیدا ہوئے اور ۳۲ سال زیادہ عمر پائی۔ حاتم کے دور میں اردو زبان صاف ستھری ہوگئی تھی۔ اُن کے کلام میں تصوف کا رنگ نظر آتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

شاہ حاتم نے فرمایا ہے :-

ہجر کی زندگی سے موت بھلی

کہ جسے سب کہیں وصال ہوا۔

شاہ بھٹائیؒ ہجر و وصال کے جذبہ کو اس انداز سے پیش کرتا ہے فرماتے ہیں :-

جي قيام مڙن ته ڪر اُوڏا سپرين.

تعان پري سڄڻ، واڌاڻون وصال جون .

اگر قیامت کے دن بھی محبوب کا وصال ہوجائے تو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں

لیکن اس سے بھی دور وصال محبوب ہو تو میرے لیئے مبارک ہے۔

شاہ حاتم

ابر میں یاد یار آوے ہے

گریہ بے اختیار آوے ہے

اس خیال کو شاہ بھٹائیؒ پیش کرتے ہیں :- جهڙ نينهُون نه لهي، ڪڪر ڪون نه هون

ساريو سپرين کي لڙڪ ڳلن تي پون

سي مر رويو رون، جن سافر سپرين .

محبوب کی یاد میں ابر آنکھوں سے نہیں اترتا، گرچہ آسمان پر بادل موجود نہیں ہے

دوستوں کو یاد کرکے لڑک (آنسو) گالوں پر ٹپکتے ہیں۔

وہ کیوں نہیں روئینگے جنکے محبوب دوست مسافر ہوں۔

شاہ حاتم کہتے ہیں :- محتاجگی سوں مجھکو نہیں ایک دم فراغ

حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا۔

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں :- جي جو ڏٺ ڪري ته ڏونگر ڏورڻ ڏاڪڙو

چپرڪين ڏئي، سو ڪڙتي سنئن ڪي .

سراج الدین آرزو

پیش رو شعرا میں قابل قدر شخصیت اور دہلی کے شعرا کے سرپرست تھے اکثر شعرا کے استاد تھے، فارسی اور اُردو زبانوں میں اُن کے شعر موجود ہیں۔ آرزو کا اصل وطن اکبر آباد تھا۔ اُن کا انتقال ۱۱۶۹ھ کو لکھنؤ میں ہوا اور دہلی میں دفن کیئے گئے میر حسن لکھتے ہیں۔

"استادانِ ریختہ نیز شاگرد او میند برائے تفنن طبع دو سہ ریختہ خود ہم فرمودہ"

آرزو کی وفات سے ۴ سال پہلے شاہ لطیف بھٹائیؒ کا انتقال ہوا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

آرزو کہتے ہیں:- آتا ہے ہر سحر اُٹھکر تیری برابری کو۔
کیا دن لگے ہیں، دیکھو خورشید خاوری کو۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں:- چنڊ تنهنجي ذات پاڙيان تان نه پرين سين
تون اڇو منجھ رات، سڄڻ نت سوجھرو۔

اے چاند میں تجھے اپنے محبوب کے برابر نہیں سمجھتا
تم رات کو روشن ہوتے ہو لیکن میرا محبوب ہمیشہ روشن ہے۔

آرزو فانی زندگی کے لئے کہتے ہیں:- جان تم پر کچھ اعتماد نہیں
زندگانی کا کیا بھروس ہے۔

شاہ لطیف نے مستعار زندگی کے لئے فرمایا ہے:- فاني ۾ فاني دنيا دم هيڪڙو
ھوڏ ۽ ھاڃ، آھي سر سيڪھين۔

یہ دنیا فانی ہے اس جان پر کوئی اعتبار نہیں ہے یہ ایک دم کے برابر ہے
پھاوڑا اور مزکل ہر ایک سر پر آئیگا (قد سے ناپ کر قبر کھودی جائے گی۔

اشرف علی خان فغاںؔ :- (۱۱۸۶ھ متوفی)

فغاںؔ شاہ جہان آباد کے رہنے والے تھے۔ اور احمد شاہ بادشاہ کے دودھ شریک بھائی تھے۔ دہلی کی طوائف الملوکی سے گھبرا کر مرشد آباد چلے گئے، جہاں سے اعظیم آباد گئے اور وہیں انتقال کیا۔ اُن کے کلام میں سوز وگداز موجود ہے۔ کلام یہ ہے:-

فغاںؔ :- بجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گذر گئی میری ووں بھی گذر گئی۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں:- نه ڪاتي نه ڪانهن، نڪو ڏوهه قلم جو،
انگ اُتيئي لکيو، جت نه رسي ٻانهن
ڪنهنکي ڏيان ڏانهن ؟ قلم قضا وھائيو۔

نہ تو خنجر کا دوش ہے نہ ہی قلم کا گناہ ہے یہ تو تقدیر کا لکھا ہے جہاں کوئی پہنچ نہ سکتا
جو کچھ تقدیر کا لکھا ہوا ہے اُسے ہر حال میں شکر سے نبھانا ہے۔

تذکرہ شعرا اُردو (فارسی) مولفہ میر حسن دہلوی صفحہ ۵ - مطبع انجمن ترقی اُردو دہلی۔

شیخ شرف الدین مضمونؔ :۔

شیخ شرف الدین مضمون. حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر کی اولاد میں سے تھے. جاجمئو صوبہ اکبر آباد کے رہنے والے تھے سپاہی پیشہ ور تھے، بعد میں صاحب قلم بن گئے. مضمون نے درویشانہ زندگی بسر کی خان آرزو کے شاگرد تھے. انہوں نے ۱۷۳۵ء میں وفات کی کلام یہ ہے۔

مضمونؔ :۔ میرا پیغام وصل اے قاصد

کہو سب سے اسے جدا کرکے.

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں:۔ نيئي نيئي ڏيج اي آدا قاصد. ساڻي پرين سنيهو.

پيرين وجهي هٿڙا منهنجا پون نهوڙ ڪريج.

اے قاصد میرا پیغام لے کر جا میرے محبوب کو دینا.

اور پاؤں پر ہاتھ رکھ کر منتیں کرنا.

مضمون :۔ چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے.

کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں، کبھو جی ڈوب جاتا ہے.

اس خیال کو شاہ بھٹائی نے اس طرح پیش کیا ہے:۔ سيئي جوڀن ڏينهن، جڏهن سڄڻ سفر هليا.

موٽا مرڻ نه سيڀرين ايل عربان ڪيئن.

مونکي چاڙهي چيڻ، ويو وڻجارو اوڀري.

میرا محبوب ان جوبن (جوانی) کے دنوں میں سفر پر چلے گئے.

اے میری ماں میرے رونے سے بھی وہ نہیں رکتے.

مجھے اس طرح چھوڑ کر بنجارے سفر پر چلے گئے.

غلام مصطفیٰ خان یکرنگ :۔

غلام مصطفیٰ خان یکرنگ شاہ مبارک آبرو کے دوست اور ہمعصر تھے. اپنے دور کے کہنہ مشق شاعر تھے لیکن بزرگی کی وجہ سے بڑے احترام سے دیکھے جاتے تھے. مثال

یکرنگ نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے

دل سے صبر و قرار جاتا ہے

شاہ بھٹائی نے محبوب کے فراق کا نقش اس طرح کھینچا ہے :۔

ناهه جميعت جان کي هوت پنهنجا ڌير.

سڄڻ ڪاهڻ سير، ووڻ پنڌ بس ونده جا.

جان کو کوئی جمعیت نہیں ہے کیوں کہ میرا محبوب چلا گیا.

میرے دل کا صبر و قرار جا چکا ہے میں اسے ہر راہ میں ڈھونڈوں گی.

201

مرزا مظہر جان جاناں ۱۶۹۸ء - ۱۷۸۱ء۔

مرزا جان جاناں کی ولادت ۱۱۱۱ھ کو علاقہ مالوہ میں ہوئی۔ ان کے والد شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ مرزا اپنے دور کے عالم، فاضل اور صوفی و شاعر تھے۔ آپ کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے فارسی زبان کے بھی بلند پایہ شاعر تھے انکا شعر شہرت دوام حاصل کرچکا ہے

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن ۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را ۔

مرزا نے ۱۱۹۸ھ میں شہادت پائی۔ اُردو زبان کے استاد شعرا تھے۔ ان کے دامن فیض سے کثیر تعداد میں شعراء نے تربیت حاصل کی تھی۔ کلام سے چند مثالیں دی جاتی ہیں

مرزا مظہر۔ ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار

ہائے بس چلتا نہیں۔ کیا مفت جاتی ہے بہار۔

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں۔ ڪيڏانهن ڪاميان ڪرهو، ڇتائو ڇوڏاس،

منهين ڪاڪوري، منهين باغ بهار،

ڪاڻي پي تنوار ۔ ٻيو مڙدي ميندي ر۔

کس طرف اونٹ کا رخ کرکے لے جاؤں، ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے ۔

اسی میں ہی جیسے کاک محل ہے اور اس میں ہی باغ و بہار ہے ۔

میندرے (محبوب) کے سوا اور کوئی بات میری زبان پر نہیں ہے ۔

مرزا مظہر گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا

لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں۔ ڪين ساڳهيم سپرين ا جاتون ڪيم جال

سوڍا مون ڪي ڪال موتي منهن ۾ آئيون۔

محبوب کے الطاف کو سمجھنے میں میں نے بڑی غفلت برتی ۔

میرے محبوب (سودھی) مجھے تو کل ہی اس غفلت کی سزا مل گئی

شیخ محمد قائم ۱۷۳۰ء - ۱۷۹۳ء۔

شیخ محمد قائم چاندپور بجنور کے رہنے والے تھے، عمر کا زیادہ وقت دہلی میں گذارا۔ آخر عمر میں رامپور چلے گئے جہاں انتقال کیا۔

قائم:۔ ہمنشیں ذکر یار کر کچھ آج

اس حکایت سے جی بہلتا ہے

شاہ لطیف:۔ يا تہ هجي پرين وٽ يا ڪجي پرين پچار

انهن ٻنهين ڪان ڌار، قادر ڪنهن کي نه ڪري۔

یا تو محبوب کے پاس رہنا چاہیے یا اُن کا ذکر کرنا چاہیے، ان دونوں باتوں سے الگ خداوند تعالیٰ کسی کو نہ کرے ۔

میر عبدالحی تاباںؔ

میر عبدالحی تاباںؔ شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے۔ خوبصورت اور صاحب جمال عین جوانی میں انتقال کرگئے۔ تاباںؔ کے کلام میں بڑی لطافت موجود ہے۔ چند اشعار دیئے جاتے ہیں:۔

تاباں تقدیر کے فلسفہ کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

میرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن
لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہے کیا قدرت۔

شاہ لطیفؒ نے اس خیال کو بڑے جاذب انداز میں بیان کیا ہے فرماتے ہیں۔

قسمت قيد ڪيا س، نه ته ڪير اچي من ڪوٽ ۾
آڳي لکي لوح جي، هنئ ڏيکاريم سيئ.

قسمت نے مجھے قید و بند کیا ہے ورنہ کون اس قید میں آکر رہے
تقدیر نے مجھے یہ جگہ دکھائی ہے اسکے کے لکھے ہوئے کو کون مٹا سکتا ہے۔

تاباںؔ

مرتے ہیں آرزو میں اس وقت آن پہنچو،
ٹک تم کو دیکھ لیں ہم۔ جلدی جان پہنچو۔

شاہ لطیفؒ اس دائمی جدائی کے کہتا ہے

ڪنهن ڪنهن نيهه نڀاءِ، جي مون واجهائيندي نه ورو.
جيڪي مٿي ڪندا، سو جانب ڪرهو جيئري.

تجھے کس شوق نے روکا ہے میرے محبوب میری آرزو کرتے سے بھی نہیں آئے۔
جو کچھ تجھے میرے مرنے کے بعد کرنا ہے وہ اگر جیتے جی میں کرو۔

تاباںؔ

عشق کیا شے ہے کسی کامل سے پوچھا چاہئے۔
کس طرح جاتا ہے دل، بیدل سے پوچھا چاہئے۔
جس نے اس کا زخم کھایا ہو اُسے معلوم ہو
تیغ ابرو کی صفت گھائل سے پوچھا چاہئے۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

محبت جي ميدان ۾، سر جو سانگ م ڪر
لاهي سر لطيف چئي، اڳيان دوستن ڌر
عشق آهي نانگ، خبر ڪا ڏنگ کي پوي.

محبت کے میدان میں سر کی بازی لگا، اور سر کٹ جانے کی پرواہ نہ کر۔
شاہ لطیف فرماتے ہیں سر تن سے جدا کرکے دوست کے آگے رکھلے
عشق وہ سانپ ہے جسکی خبر ڈسے ہوئے سے پوچھو۔

مرزا محمد رفیع سودا ۱۱۳۵ھ - ۱۱۹۰ھ۔

مرزا محمد رفیع سودا کی ولادت ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ اُن کے والد محمد شفیع کابل افغانستان سے تجارت کے خیال سے ہندوستان میں آئے تھے۔ سودا نے ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ شاعری میں اُن کے استاد شاہ ظہورالدین حاتم تھے۔ سودا شاعری میں اتنے بلند ہوگئے کہ انکو تاج الشعرا کا لقب ملا۔ نادرشاہ کے حملے کے بعد دہلی کو چھوڑ کر فیض آباد چلے گئے۔ شمس العلماء نواب امداد امام کا قول ہے "سودا اردو شاعری کے شیکسپیئر تھے۔ سودا ستر برس کی عمر میں ۱۱۹۰ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ آپ کے کلام سے چند اشعار کا شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام سے موازنہ کیا جاتا ہے دونوں شعرا کے کلام میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔

سودا کے کلام میں تصوف کی باریکیاں نمایاں نظر آتی ہیں کہتے ہیں:

میں عاشق اپنا، اور معشوق اپنا آپ ہوں پیارے

مجھے پرواز اس مجلس میں کا ہے شمع محفل ہوں۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ کا تصوف عشق الہٰی سے سرشار ہے۔ اس جذبۂ عشق کو لے کر شعر کہتے ہیں۔ اُن کا ہر شعر روح کو بیتاب کرکے خدائے واحد کی طرف لے جاتا ہے

پاڻ ئي پسي پاڻ کي، پاڻ ئي محبوب

پاڻ خلق خوب، پاڻ ئي طالب تئي جو۔

اپنے آپ کو خود ہی دیکھتا ہے اور خود ہی اپنا محبوب ہے

خود ہی خوب پیدا کرتا ہے، خود ہی اُنکا طالب ہوتا ہے۔

مرزا سودا — ہنوز آئینہ گرد اس غم سے اپنے منہ پر ملتا ہے

خدا جانے کہ کیا صورتیں اس خاک میں گڑ ہاں۔

انسان کی مستعار زندگی کا نقش کس خوبی سے بیان فرماتے ہیں۔

ڪڏهن گهاٽ هو گهوٽ، ڪڏهن مڙهه مقام ۾

واريءَ سندو ڪوٽ، آڻي اڏيندين ڪيترو

کبھی اے انسان تو دولہا بنتا ہے، تو کبھی میت بن کر قبر میں ہوتے ہو

اس ناپائیدار دنیا میں کب تک تو ریت محل بناتے رہو گے۔

سودا کا ایک اور شعر ہے: — غیرتِ عشق آکے اب سودا تو پروانہ سے سیکھو

شمع سے اپنا ہی ملنا دیکھ جل جاتے ہیں یہ

اس خیال کو شاہ بھٹائیؒ نے بھی پیش کیا ہے: — پچ پتنگ ڪان سڌ پون ڪا مڻ خبرون

آڻيو وجهن آڳ ۾ جيءُ پنهنجو جي

ڀيڙي ڀنين ڪي، لڳا نيرا نينهن جا۔

عشق کی تپش پوچھنی ہے تو پروانہ سے جلنے کی خبر پوچھو

وہ خود کو لے کر آگ میں اپنی جان ڈال دیتے ہیں

اُن کو تو جینے جی میں محبت کے بجالے لگے ہیں۔

سودا: آنکھوں کو ٹک سنبھالو یہ مارتی ہیں راہیں۔
سب ہی مسافروں کو دیتی ہیں نگاہیں۔

شاہ لطیف بھٹائی: اکڙين آهو، مون ڪان پڇي نه ڪيو.
اُتي وڃي اٽڪيون، جتي ڇوٽ نه ڇاهه
هنئڙو ويچارو، واتون ڀليو ڀلي.

آنکھوں نے مجھ سے پوچھ کر محبت نہ کی تھی
وہ تو اس جگہ جا کر اٹکیں جہاں کہنے کی مجال نہیں ہے
دل بیچارا اس محبوب کے راستے کو دیکھتے ہوئے غم کھاتا ہے۔

سودا انتظار کی کیفیت کو فریاد کی حد تک لے جاتا ہے فرماتے ہیں۔
سودا تیری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

شاہ بھٹائی انتظار کی کیفیت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔
شمع ٻاري ٿي شب برهه ڪاڻ ڪيئون.
موٽ مرڻ ٿي مينڌرا ساڻا ڪاهڻ ڪيٽ
تنهنجي ٿي ات طلب ڪانگ اُڏايم ڪاڏجا.

رات شمع کو جلاتی رہی اور صبح کو سورج طلوع ہوا
میرے محبوب (مینڈرے) تو واپس آجا میں تیرے انتظار میں مرتی ہوں
تیری طلب میں کاک کے کوؤں کو اُڑاتی ہوں (پیغام دیتی ہوں)

سودا: دل سے خوش طرح مکان پھر بھی کہیں بنا ہے
اس عمارت کو تو ٹک دیکھ کے ڈھایا ہوتا۔

شاہ لطیف: ٻاٽي ڪان ڪمان ۾ ميان ماهه ۾ موڻ
مون ۾ آهين تون متان تنهنجوئي تو کي لڳي.
تیر کمان میں لگا کر اے دوست مجھے نہ مارنا
کیوں کہ تیرا وجود مجھ میں ہے کہیں وہ تیر تجھ نہ لگے۔

سودا: احسان ناخدا کا اُٹھائے میری بلا کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

شاہ لطیف کی توکل دیکھئے: سپرد ڪري سبحان جي ڪر هوائي ڪم
تي تحقيق تسليم ۾ لاهه غم وهم
ته قادر ساڻ ڪرم حاصل ڪريئن حاجتون.

"ہر چیز کام رب پاک کے حوالے کر دے، اس حقیقت کو تسلیم کرلے اور فکر اور وہم کو چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے ہر کام آسان کر دے گا"

میر تقی میر ۱۱۲۵ھ - ۱۲۲۵ھ.

میر محمد تقی میر کی ولادت ۱۱۲۵ھ مطابق سنہ ۱۷۲۲ء (سنہ ۱۷۱۳ء) میں ہوئی آپ کے والد میر عبد اللہ اکبر آباد کے رہنے والے تھے. نادر شاہ کے حملہ کے بعد دہلی سے ہجرت کرکے لکھنو چلے گئے. میر کا زمانہ اردو کے کمال کا زمانہ تھا. میر کے کلام پر دہلی کی غارتنگری کا بڑا اثر نظر آتا ہے. اس وجہ سے ان کے کلام میں حزن و یاس، درد الم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے. غزل کے بادشاہ مانے جاتے تھے. کلام پر تصوف کا بھی اثر ہے. میر تقی لکھنو میں سنہ ۱۲۲۵ھ مطابق سنہ ۱۸۱۰ء میں وفات کی. کلام کا نمونہ یہ ہے.

میر تقی میر:-

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کو ہمیں
ہے بڑا حیف ہمیں، اپنی ہی نادان کا.

اس خیال میں شاہ لطیف کا شعر دیکھئے.

عشق نہ آهي راند جيئن کيڏن ٻيا ٻار
جيءُ جھي ۽ جانب جي، پيهي جو ميڙائي
سيسي نيزي پاند، اُچل نہ آڏ تئي.

عشق کو بچوں کا کھیل نہیں ہے جسے نوجوان کھیلتے ہیں
بلکہ دل جسم اور جان کے میلاپ کو توڑتا ہے
نیزے کی نوک کے سامنے اپنی سر کو پھینکوے تو آدمی ہو جائے

میر تقی میر

آنکھوں میں جیو میرا ہے ادھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

شاہ لطیف بھٹائی-

اکین ۾ تي ويھہ تہ آءٌ واري ڍڪيان
تو کي ڏسي نہ ڏيھہ آءٌ ڏسان نہ ڪو ٻيو.

میری آنکھوں میں میرے محبوب تو اگر بیٹھ تو میں پلکیں ڈھانپ لوں
تاکہ تجھے زمانہ نہ دیکھے اور میں بھی کسی اور کو دیکھوں.

میر تقی میر-

ہم اسیروں کو جلا کیا جو بہار آئی نسیم
عمر گذری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا.

شاہ لطیف بھٹائی

ڏريائين ڏار جي وڍي وڻ جدا ڪيا
تن سڪن کڙي سار ڪي اُڀا مينھن ملير ۾

شروعات سے ہی درخت کے تنے کو کاٹ کر اس سے جدا کیا
اس سوکھے تنے کو کیا معلوم کہ برسات برستی تھی.

مذھب میں میرؔ کی انتہا پسندی دیکھئے. فرماتے ہیں.

میر کے دین و ایمان کو کیا پوچھو ہو انہوں نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب سے ترک اسلام کیا.

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں:۔

نکو کم کفر سین نکا مسلمانی من

آیا آئین چون تہ پرین کجو پنھنجو۔

نہ تو کفر سے کوئی کام ہے۔ نہ تو مسلمان دل میں ہے۔

اوپر سے کہتا ہے کہ اے دوست تو مجھے اپنا بنانا۔

میرؔ دوستوں کی جدائی میں جو ابتدا ہی میں ہوتی۔ ملی فرماتے ہیں:

میرؔ۔

ابتدا ہی میں مرگئے سب یار

عشق کی کون انتہا لایا۔

شاہ لطیف اپنے دوستوں کے اٹھ جانے پر آنسو بہاتا ہے۔ اُن کے مسکن اور میٹھی میٹھی باتوں کو یاد کرتا ہے اس فراق کی تصویر کھینچا ہے۔

آج نہ اوطاقن ۾ طالب تنوارین

آدیسي اُتي ديا مٿيون مون مارين۔

جي جيءَ کي جلائين سي لاھوتي لڏي ويا۔

آج اس مسکن میں وہ دوست نہیں ہیں جن کے میٹھے بول سنتے تھے۔

وہ دوست چلے گئے ان کی خالی جگہیں دیکھ کر بڑا ارمان ہوتا ہے۔

وہ زندہ دل دوست اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

میرؔ کی تشبیہ ان کے کلام نمایاں نظر آتی ہے کہتے ہیں۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے۔

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔

شاہ لطیف کی تشبیہ ملاحظہ ہو:۔

جھڙا گل گلاب جا تھڙا مٿن ويس

ڇوٽا نيل چنبيليءَ جا ماٿو ھوا ھميش

پسو سونھن سيد چئي. ھيئڙن اچن نيش۔

لالن جي لبين آتڙ اکر نہ اُجھي۔

جیسے گلاب کے پھول ہیں اسی رنگ کے لباس پہنے ہوئے ہیں بال چنبیلی کے تیل سے تر ہیں وہ ہمیشہ حسین معلوم ہوتے ہیں۔

ان کے حسن کو دیکھ کر شاہ فرماتے ہیں دل میں زخم ہوتے ہیں۔ محبوب کے لباس کو دیکھ کر کانٹے کی جگہ میں ایک حرف بھی نہیں نکلتا

میر تقی میرؔ ۔

سراپا میں اس کے نظر کر کے تم

جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ ہے۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں،

جیڏانھن ڪريان پرک تيڏانھن صاحب سامھون

جس طرف بھی نگاہ اٹھاتا ہوں۔ اس طرف (صاحب) اللہ ہی اللہ نظر آتا ہے۔

میر سوز :۔

سید محمد میر سوز۔ والد کا نام سید ضیاء الدین تھا۔ میر سوز کی ولادت ۱۷۱۸ء کو دہلی میں ہوئی۔ اردو شاعری میں بڑا نام پیدا کیا۔ سوز خوش طبعی اور خاکساری کے باعث ہردلعزیز تھے۔ دہلی سے لکھنو چلے گئے تھے جہاں ۱۲۱۲ھ میں فوت ہوئے

میر سوز

آپ ہی عاشق ہے، تو آپ ہی معشوق

پردے سے نکل یہ شرم ساری کب تک

شاہ لطیف بھٹائیؒ

پاڻھين پسي پاڻکي، پاڻھين محبوب

پاڻھين خلق خوب، پاڻھين طالب تن جو.

خود ہی اپنے آپ کو دیکھتا ہے، خود ہی خود محبوب ہے

خود ہی اسے پیدا کرتا ہے، اور خود ہی انکا طالب ہوتا ہے۔

میر سوز

تم بن ہے عذاب زندگی

ہے میری خراب زندگی۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں :۔

ستي سيھر يوم کوڳ پاھوچن جو

عنق وھاڻو پنو، ھريو ست تيوم

سوتے ہی محبوب کی یاد آنے لگی، جس کے بغیر یہ زندگی عذاب ہے

جس کی یاد میں سر کے نیچے تکیہ آنسوں سے تر ہو گیا ہے۔

میر سوز :۔

رزق کا ضامن خدا، شاہد کلام اللہ ہے

تس پہ اپنی صورتوں سے روز حاجتمند ہیں۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں :۔

قسمت آنديون کو ڄريون، وطن سندن ٻروھ

ڪنھنجو ڪوني ڏوھ، رزق رازق سٿ جي

قسمت نے سارس (کونجوں) پرندے یہاں لے آئی، ان کا وطن تو جبل ہے

اس میں کسی کا یہ گناہ نہیں ہے، رزق کا ضامن تو خدا ہے۔

میر سوز نے محبوب کی دوری کو زمانے کا انقلاب تصور کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

یاریوں دور جا بسے اللہ

کیا زمانے کا انقلاب ہوا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ ان محبوبوں کی یاد میں فکر مند ہے جن کی خصلتوں سے یاس و غم میں پریشان ہے فرماتے ہیں :

سدا جن پرياڻ پانڌي پکي لڌ سين

مارو ڳٺڻ ساڻ، ويڙا تر اڪري.

جن کے نشان ہمیشہ موجود تھے وہ دوست دور کہیں جا کر بسے

میرے محبوب جو خصلتوں کے مالک تھے یہ جگہ چھوڑ کر تھر کی طرف چلے گئے۔

خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ – ۱۱۹۹ھ

خواجہ میر درد کی ولادت ۱۱۳۳ھ کو دہلی میں ہوئی آپ کے والد سید خواجہ ناصر عندلیب اپنے دور کے بڑے بزرگ اور صاحب علم تھے خواجہ میر درد نے جوانی کی ابتدا میں سپہگیری کی ملازمت اختیار کی تھی۔ بعد میں والد صاحب کے مشورہ سے نوکری چھوڑ کر عابدانہ زندگی بسر کی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد دہلی کے اکثر باشندے امن و عافیت کی تلاش میں دہلی چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن خواجہ میر درد کی توکل، فقر اور رضا نے ان کی استقامت و استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہ کی، وہ دہلی ہی میں پرسکون رہے۔ خواجہ صاحب نے ۲۴ صفر بروز جمعہ ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴ء کو دہلی میں انتقال کیا۔ یعنی شاہ بھٹائیؒ کی وفات سے ۳۲ سال بعد میں فوت ہوئے۔ خواجہ صاحب بزرگی اور شعر و شاعری کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کے کلام پر تصوف کا گہرا رنگ نظر آتا ہے اور کافی حد تک حضرت شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام سے خیالات اور تخیل میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

چند مثالیں دی جاتی ہیں:۔

خواجہ میر درد فرماتے ہیں:۔ مٹ جائیں سب یک آن میں کثرت نمائیاں

ہم آئینہ کے سامنے، جب آ کے "ہو" کریں۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ اس خیال کو بڑے جاذب انداز میں بیان فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

آندر آئينو ڪري پرين سو پسيج

انهيءَ راهه رهيج ته مشاهدو ماڻين.

اپنے اندر دل کو آئینہ کے مانند کر کے محبوب کی صورت کو دیکھ۔

اسی راہ پر گامزن ہو جا۔ تو تجھے محبوب کا مشاہدہ حاصل ہوگا۔

خواجہ میر درد تصوف کے نکات کو اکثر اپنے کلام میں پیش کرتا ہے فرماتے ہیں:۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا۔

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا۔

شاہ لطیف کا کلام سراپا تصوف کے باریکیوں سے سرشار ہے اسی زمن میں فرماتے ہیں۔

ايڪ قصر در لک، ڪوڙين ڪُڙس ڳُڙکيون

جيڏانهن ڪريان پرک تيڏانهن صاحب سامهون.

ایک محل جس کے اندر بیشمار دروازہ اور کھڑکیاں موجود ہوں

جس طرف بھی دیکھتا ہوں۔ اس طرف صاحب (اللہ تعالیٰ) نظر آتا ہے۔

خواجہ میر درد فرماتے ہیں:۔ مانندِ حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی۔

کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا۔

بے ثباتی کے لئے شاہ بھٹائی فرماتے ہیں:۔ جر تي ڦوٽو جئين لهرن لڳي اُڌ ٽٽي.

تون پڻ آهين تئين ڪو ڏينهن جهان.

پانی کی سطح پر حباب لہروں کے لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے

اے انسان تو بھی اس جہان میں حباب کی طرح کچھ دن کے لئے ہو۔

صوفیوں نے شمع و پروانہ کی حالت کو حیرت کا مقام کہا ہے. جس میں حق کے طالب کو اپنی ہستی کی کوئی خبر نہیں ہوتی. خواجہ میر درد نے اُن کی یہ کیفیت بیان کرتے ہوئے. فرماتے ہیں

کاش تا شمع نہ ہوتا گذر پروانہ
تم نے کیا قہر کیا! بال و پر پروانہ.
شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اُسے
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ.
گر ترا حسنِ برشتہ نظر آجائے اُسے
نت رہے آگ میں سوز جگر پروانہ.
کیوں اُسے آتشِ سوزاں میں لیے جاتے ہے
سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظرِ پروانہ
ایک ہی جست میں کی منزلِ مقصود اس نے.
رہرو، رشک کی جا ہے سفر پروانہ
شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی.
پوچھوں اے درؔد میں کس سے خبر پروانہ.

حضرت فریدالدین عطارؒ نے پروانہ کے ایثار کا بیان اسطرح کرتے ہیں:

یک شبی پروانگان جمع آمدند   در مضیقِ طلبِ شمع آمدند
جملگی گفتند می باید یکی   کو خبر آرد ز مطلوب اندکی
شد یکی پروانہ تا قصری ز دور   در فضای قصر یافت از شمع نور
بازگشت و دفتر خود باز کرد   وصف او بر قدر فہم آغاز کرد
ناقدی کو داشت در مجمعِ مہی   گفت اُو را نیست از شمع آگہی

ایک رات پروانے اکر جمع ہوئے. اور مجلس میں شمع کو ڈھونڈنے لگے. سب نے کہا ہم میں سے ایک کو جاکر مطلوب کی خبر لے آنی چاہیئے. ان میں سے ایک نے محل میں دور سے شمع کی روشنی کو دیکھا. اور واپس اکر اپنی سمجھ کے مطابق اس حقیقت کا بیان کیا. اُن میں ایک نکتہ چین بھی تھا. جو انکے سردار بھی تھے. اس نے کہا اس کو شمع کی کیا خبر.

شد یکی دیگر گذشت از نور در   خویش را بر شمع زد از دور در
دشت در کش کرد با آتش بہم   خویش را گم کرد با او خوش بہم
چون گرفت آتش ز سرتا پائی او   سرخ شد آتش اعضائی او
ناقد ایشان چو دید او را ز دور   شمع با خود کردہ ہمرنگش ز نور
گفت این پروانہ در کار است بس   کس نہ داند او خبردار ست بس

اُن مین سے ایک اور اُس روشنی کے دروازہ سے گذرا، دروازہ سے اندر جاتے ہی خود شمع کی آگ مین چلا گیا، آگ اسکے چارون پھیل گئی، اور خود بڑی خوشی سے شمع کی آگ مین گم ہو گیا، اور آگ نے اسکے جسم کو لال کر دیا، نکتہ چین نے اُن کو دور سے دیکھ کر کہا (شمع نے اپنے نور سے اس کو ہم رنگ کر دیا) کہ ایسے پروانہ کی ضرورت ہے، جس کے لئے یہ معلوم ہو نہ سکے کہ وہ باخبر ہے

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی عشقیہ شاعری درد اور یاس سے بھرپور ہے۔ پروانہ کے متعلق جو ابیات آپ نے بیان فرمائے ہیں وہ گویہ خواجہ میر دردؔ اور فریدالدین عطار کی نظمون کے اختصار ہے جس میں آپ نے اس حقیقت کے راز کو پر تاثیر تخیل سے بیان فرمایا ہے۔

پُڇ پتنگن کي سنديون کامڻ ڄرڻ

آئيو وڃن اگہ ۾ جيءَ پنهنجو ڇي

جيئڙي جنين کي، لڳا نينهن نينهن جا.

پروانون سے جاکر جلنے کی خبر پوچھ

جو اپنے آپ کو آکر آگ میں ڈالتے ہیں

کیونکہ اُن کو حیات میں عشق کے چھالے گئے ہیں۔

دوسرا بیت ہے:۔

پتنگ چائين پاڻ کي، ته اچي اگہ اُجهاءِ

پڇڻ گهڻا پچايا تون پچڻ کي ٻه پچاءِ

واقف ٿي وساءِ، آگ نہ ڏجي عام کي.

تم اگر اپنے آپ کو پروانہ کہتے ہو تو آکر آگ کو بجھا دو

آگ نے تو سینکڑون کو جلایا ہے تو آکر آگ کو بھی جلا دو

ہوشیار بن کر آگ کو بجھا دو یہ راز عام کو نہ بتانا۔

ایک اور شعر ہے:۔

پتنگن پہ کيو، مڙيا مٿي مچ

پسي لس نہ لچيا، سڙيا مٿي سچ

سدا گهرين اگہ، ديچارن وڃائيا.

پروانون نے ارادہ کیا، سب آگ کے اوپر جمع ہوئے۔

وہ آگ کو دیکھ کر نہیں لرزے اور حقیقت (سچ) پر جل گئے۔

اس طرح اُن کی گردنیں بھی آگ مین جل کر راکھ ہوئیں۔

ان تینون شعرا کے کلام مین کتنی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہیں۔ ان شعرا کے کلام کے تخیل میں بڑی یکسانیت موجود ہے خواجہ میر دردؔ نے بے ثباتی کا نقش اسطرح کھینچا ہے فرماتے ہیں۔

اس زیست کا اعتبار کیا ہے

کوئی دم میں یہ زندگی ہوا ہے

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:- فاني بي فاني دنيا دم هيڪڙو.

لٽي لوڙهه لتن سين، جو ٿيندو جاءِ.

دنیا بے فانی ہے اور ایک ساعت میں ختم ہو جائیگی۔

اے دوست تیری قبر میں مٹی کو لاتوں سے دبا کر بنائینگے۔

خواجہ میر درد: ہووے کب وحدت میں کثرت سے خلل

جسم جان گو دو ہیں، پر ہم ایک ہیں۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:- وحدت مان ڪثرت ٿي ڪثرت وحدت ڪل

حق حقيقي هيڪڙو ٻولي ٻي م ڀل.

هو هلاچو هل بالله سندو سچيٽ.

وحدت سے ہی کثرت ہے اور کثرت سے وحدت کل ہے۔

اللہ تعالیٰ (معبود) ایک ہے اور دوسری بات زبان پر نہ لا۔

یہ شور و غل باللہ اس دوست کا مظہر قدرت ہے۔

خواجہ میر درد۔ نہ گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار

کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

شاہ لطیف فرماتے ہیں ڪڏهن گهاٽ گهوٽ، ڪڏهن مڙهه مقام ۾

داريءَ سندو ڪوٽ، اڏي اڏيندين ڪيترو.

تو کبھی دولہا بنتا ہے تو کبھی میت بن کر قبر میں دفن ہوئے ہو۔

تو اس ریت پر کب تک محل بنانے رہو گے۔

خواجہ میر درد فرماتے ہیں:-

موت کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے۔

مرنے سے پہلے ہی لوگ تو مر جاتے ہیں۔

خواجہ حافظ شیرازیؒ نے یہی تخیل پیش کیا ہے:- ہرگز نہ میرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں:- مرڻا اڳي جي مئا، سي مري ٿين نه مات

هوندا سي حيات جيئا اڳي جي جيئا.

جو موت سے پہلے مرتے ہیں وہ در اصل مرتے نہیں ہیں

وہ تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور زندگی سے پہلے ہی حیات ہیں۔

ضیاءُ الدین ضیا

ضیاءُ الدین کی ولادت دہلی میں ہوئی، وہ سودا کے ہمعصر تھے۔ جوانی میں فیض آباد چلے گئے تھے وہاں سے لکھنؤ آئے اور وہیں انتقال کیا۔

ضیا نے فرمایا ہے:۔ برس اے ابر جتنا چاہے تو، اب تیری باری ہے۔
کبھی دل تھا، تو میں رو روکے اک دریا بہاتا تھا۔

شاہ لطیفؒ نے فرمایا ہے:۔ وسن اکڙيون جئن، جيئن وسندا سڪين مينهن.
ڏھوندا راتو ڏينهن، ھي ٻوڏيون نه ڪن.

جس طرح میری آنکھوں سے آنسو برستے ہیں۔ اے ابر تو اگر ان سے برسنا سیکھیں
تو، تو دن رات برستا رہے اور دریا بہا دے۔

انعام اللہ خان یقین:۔

انعام اللہ خان یقین شاہجہان آباد کے رہنے والے تھے۔ اور حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے نواسے تھے۔ یقین مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے، عین جوانی کے عالم میں شہید کیئے گئے تھے۔

یقین کہتے ہیں کہ تسخیریں آئینہ کو آتی ہیں۔
دل سے نہ ہو جو کام آئینہ سے کیا ہوگا۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:۔ آندر آئينو ڪري، پرين سو پسيج
اهڙي راه رميج، ته مشاهدو ماڻين.

اپنے دل کو آئینہ کے مانند کرکے محبوب کا دیدار کر
ایسی راہ اختیار کر تاکہ تجھے مشاہدہ حاصل ہو سکے۔

یقین:۔ عاشق اور معشوق کی عالم سند کرتے ہیں سب
تجھ سے خونخوار کی طرز اور مجھ سے غم کھانے کی طرح

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔ عاشق! معشوق جو وٺ ڏيھيج تَرَنُ
پيارينديء پاڻيھن، ميخانه جو مَنُ
ڪيم ڪيج ڪنڌ، اوڏو ٿي اُن ڪي.

عاشق تو محبوب کی وہ راہ لے کر بیٹھ جا،
وہ تجھے خود بخود آکے میخانہ کا شراب پلادیگا۔
اس کے آگے جاکر اپنی جان مت چھڑانا۔

یقین:۔ ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہے تو دارو ہے یہ سب کچھ سن کے ساقی پی جانے کا کیا حاصل

شاہ لطیفؒ:۔ تو حبيب تون طبيب تون درد جو داروُ دوا آھين دل کي تنھنجون تندون
ڪريان ٿي ڪاروُن جئين ٻکي ھينئون نه ٿئي.

(تو حبیب ہے تو ہی طبیب ہے اور تو ہی میرے درد کی دوا ہو۔ میرے دل کی دوا تیری یاد ہے۔ میں تجھے پکارتی ہوں میرا علاج کسی اور کے ہاتھوں نہ ہو)

خواجہ محمد میر اثر :-

خواجہ محمد میر اثر، خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ میر درد کی صحبت میں علم تصوف اور معرفت سے بہرور ہوئے تھے۔ بھائی کی طرح درویشانہ زندگی بسر کی۔ اردو زبان میں ایک چھوٹا سا دیوان اُن کا موجود ہے۔

اثر — تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں ۔ پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں ۔

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں :- سو ھي سوھو، سو اجل سو اللہ
سو پرين سو پساہ، سو ويري سو ڏھو .

ہر جگہ اللہ کی ذات پاک موجود ہے اور ہر جگہ اُنکا جلوہ نمایاں ہے
وہی محبوب ہے جو سانس میں بھی موجود ہے وہی دشمن بھی ہے تو رہبر بھی

شیخ بقا اللہ بقاؔ :-

شیخ بقا اللہ اکبر آبادی پہلے حاتم سے اور بعد میں درد سے اصلاح لیتے تھے۔ اُن کے والد کا نام لطف اللہ تھا جو دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے بقا کا کلام ہجو گوئی کے لئے مشہور ہے۔ اُن کی وفات ۱۲۰۶ھ میں ہوئی :-

بقاؔ :- بقا جو راہی ہوئے عدم کے، تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا
یہ راہ ہستی کی پرخطر ہے، چلو یہاں سے قدم اٹھائے۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے اس خیال کو بڑے جاذب انداز میں بیان فرمایا ہے۔

مَتان ڪِڇِ ڪُڙِ، جي ماڻهو، سي ريون .
ساجن سوڻهن سُرتِ وڪان ٿي ويهو گڏو .

جو اس فانی دنیا سے کوچ کرکے اس دنیا میں پہنچے
تو اس کو محبوب حقیقی ایک لحظہ میں ملے گا۔

سید سراج الدین سراج ۱۷۱۰ء - ۱۷۶۶ء

سید سراج الدین۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے وہ اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ کلام میں تصوف کا رنگ موجود ہے۔ کلام یہ ہے

سراج — وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کے طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی۔

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں :- صد کتاب و صد ورق در نار کن
خفتہ دل را یک دمے بیدار کن ۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں :- اکی پڙهه الف جو ورق سڀ وسار
اندر تون اجار، پنا پڙهندين ڪيترا

سبق پڑھ الف کا، اور دوسرے اوراق کو چھوڑدے ۔ اپنے سینے کو صاف کر تو کتنے اوراق پڑھوگے ۔

سید میر حسن

سید میر حسن بن سید غلام حسین ضاحک سنہ ۱۱۳۶ھ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان خراسان کے دارالسلطنت ہرات سے ہجرت کرکے ہندوستان میں آیا۔ جس بزرگ نے ہرات سے ہجرت کی تھی وہ حضرت میر امامی کے نام سے مشہور تھے۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے بزرگ اور مورث اعلیٰ حضرت سید میر علی ہروی رح اُن کے چھوٹے فرزند حضرت سید حیدر شاہ اپنے والد کے ساتھ امیر تیمور کے ہمرکاب ہندوستان میں آئے تھے۔ اور والد سے اجازت لے کر ہندوستان کی سیاحت پر نکلے تھے اور سندھ میں آکر ہالا میں مقیم ہوئے وہیں شادی بھی کی تھی اُن کی اولاد سے سندھ میں میرن پوتا کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی شاخ سے سید عبدالکریم بلڑی کی اولاد سے سندھ کے غیر فانی شاعر اور صوفی حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح پیدا ہوئے۔ ان دونوں سادات کا شجرہ کسی منزل پر ضرور آپس میں ملتا ہوگا۔

سید میر حسن دہلی کے تباہ ہونے کے بعد والد کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے جہاں ضیاالدین ضیا کے شاگرد ہوئے۔ لکھنؤ میں آپ نے سنہ ۱۲۰۲ھ میں وفات پائی۔ میر حسن فارسی اور اُردو زبانوں کے بڑے عالم تھے۔ سید میر حسن اور شاہ لطیف کے کلام میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔

سید میر حسن

ثنا پہلے اس خالق پاک کو | دیا جس نے رتبہ کف خاک کو۔
اس خاک سے خلق آدم کیا | ہوا کرکے دم اس میں آدم کیا
پھر آدم کی خاطر بنایا جہان | عدم اور ہستی دو رو یہ مکان۔

خداوند تعالیٰ کی حمد اور توصیف میں شاہ لطیف بھٹائی رح نے اپنے کلام کی شروعات اس طرح کی ہے فرماتے ہیں:۔

اول الله عليم اعليٰ عالم جو ڌڻي.
قادر پنهنجي قدرت سين قائم آهه قديم.
والي واحد وحده رازق رب رحيم
سو ساراهه سچو ڏڻي چئي حمد حڪيم
ڪري پاڻ ڪريم جوڙون جوڙ جهان جون.

اول اللہ علیم کی اعلیٰ ذات ہے جو مالک ہے پوری کائنات کا
قادر اپنی قدرت سے قائم ہے قدیم
وہ مالک واحد۔ وحدہٗ۔ رزاق اور رحم والا ہے
حمد و توصیف اس سچے مالک کی کریں جو حکمت والا ہے
رب رحیم پورے جہان کا والی اور شش جہات ہے۔

میر حسن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں:۔

مرتبہ اس کا یہاں تک ہے بلند | عقل کل کی واں نہیں لگتی کمند۔
شافع محشر ہے وہ خیر البشر | ہو درود اس پر اور اس کی آل پر
وہ جو پیرو اس کے ہیں اور دوست دار | چار یار و چار یار و چار یار

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چار یار کی محبت میں سرشار شاہ لطیف بھٹائی ؒ فرماتے ہیں:-

جوڙي جوڙ جهان ٻي ، پاڻ ڪيائين پرواز

حامي هادي هاشمي ، سردارن سردار

سنهي صحابن سڀ ۾، منجهه مسجد مٺيادار

چاري چڱا چوڌار ٿا، سيڪا ڏي حبيب سين .

اللہ تعالیٰ نے اس جہان کو پیدا کیا اور اس پر پھر پرواز کیا .

حامی ، ھادی ، ہاشمی اور سرداروں کے سردار کو پیدا کیا .

آپ اپنے دوستوں کے درمیان مسجد میں بہت اچھے لگتے ہیں .

چاروں یار اپنے حبیب گرد ہمیشہ رہتے ہیں .

میر حسن فرماتے ہیں:-

اس عشق میں جو قدم دھرے گا

جیتا نہ بچے گا وہ مرے گا .

شاہ لطیف فرماتے ہیں:-

محبت جي ميدان ۾ ڪڏي پوءِ ڪامي .

ڇڏ اسانگا ارواح جا لاهوتي لامي

عشق نانگ آهي، خبر ڪاڏن کي پوي .

عشق کے میدان میں جو قدم لاکے دھرے گا .

وہ اپنی زندگی کی امید کا سہرا چھوڑ دیگا .

عشق وہ سانپ ہے جس کی خبر اس سانپ کے ڈسے ہوئے سے پوچھو .

متاخرین شعرا کے کلام سے مماثلت

جہاں تک اُردو شاعری کی ترقی کا تعلق ہے، اس کی نشوونما میں متاخرین شعرا کا بڑا حصہ ہے دہلی کی پریشان حالی کی وجہ سے وہاں کے ارباب وکمال شعر و سخن کے باکمال حضرات دہلی کو چھوڑنے پر مجبور ہوکر روزگار اور قدردانوں کی تلاش میں ہندوستان کے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کرگئے ۔ چنانچہ لکھنو دہلی سے قریب تھا۔ اور وہاں کے نواب بڑے فراخدل اور علم و ادب کے سرپرست تھے، خاص طور پر اودھ کے نواب آصف الدولہ کی فیاضی بڑی مشہور تھی جنہوں نے دہلی کے اکثر شعرا کو اپنے یہاں روک رکھا تھا۔ دوسری طرف لکھنؤ کے لوگ بھی ادب دوست تھے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر تھوڑے عرصہ میں لکھنو اردو ادب اور ثقافت کا مرکز بن گیا، اُردو شاعری نے اس جدید مرکز میں رہکر وہاں کے معاشرتی حالات کے مطابق چند اُنکی خصوصیات پیدا کرلیں۔ اس طرح لکھنو کا دبستان ادب دہلی سے بڑھ کر ممتاز ہوگیا اور زبان کی تبدیلی کی وجہ سے غزل میں نئی حیثیت اور نیا اسلوب پیدا ہوا۔

اس دور کی اُردو میر تقی میر، سودا، میر انشا، مصحفی، اور جرأت کی اصطنا نعتد ہے۔ جنہوں نے زبان کو ہر حیثیت سے توسیع کرنے میں بڑا کام کیا حالانکہ یہ سبھی شعرا قدیم شعرا کے پیرو تھے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے کتنا سچ تجزیہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "تاریخ ادب کا یہ دور قطعی طور پر پہلے سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ ایک کے دوسرے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں اس دور کے شعرا اپنی جوانی میں شعرائے طبقہ سوم کے بوڑھے شعرا کے ہمعصر تھے۔ یہ ابھی جوان تھے، اور وہ کہنہ سال مشاق اور مشہور ہو چکے تھے۔ اسکے علاوہ زبان اور بندش کے اعتبار سے بھی ان دو دوروں میں فرق پایا جاتا ہے۔ بہت سے پرانے لفظ اور ترکیب متروک ہوگئیں، ان کی جگہ نئے لفظوں اور نئی ترکیبوں نے لے لی۔ اس معاملے میں سید انشا کی بہت ممنون ہے کہ اُنہوں نے اس کی ترقی اور توسیع کے لیے بہت سے نئے نئے تجربہ کیئے۔ مصحفی نے البتہ پرانی روش قائم رکھی۔ رنگین آدمی رنگین تھے، اُنہوں نے اپنی رنگینی الگ دکھادی انشا اور رنگین نے مل کر ریختی ایجاد کی"[1]

دہلی میں اس وقت ارمان و یاس کی شاعری تھی۔ تو لکھنو میں عیش و نشاط کے نغمے تخلیق ہو رہے تھے۔ ریختی شاعری کی ایجاد کی وجہ سے لکھنو میں عورتوں کی آرائش و زیبائش، اُن کی شرارتیں اور دربار کی شاعری کا پورا سامان نظر آرہا تھا۔ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدرعلی آتش جیسے استاد شعرائے لکھنو میں شعر و شاعری کو عروج پر پہنچایا تو دہلی میں شاہ نصیر، ابراہیم ذوق مرزا غالب اور ظفر نے شاعری کو پھر سے فروغ دیا۔ ڈاکٹر ہاشمی لکھتے ہیں[2]

> "زبان کا جہاں تک تعلق ہے ان بزرگوں نے اس میں مزید اصلاح اور درستی کی۔ اور جو ناملائم الفاظ باقی رہ گئے تھے، اُن کو متروک قرار دیا اور فارسی ترکیبوں کے ساتھ دہلی کے روزمرہ محاوروں کو اس طرح سمویا کہ کہ خوش نمائی اور شیرینی پیدا کردی۔ دہلی اور لکھنو میں اس دور میں دونوں جگہوں پر صفائی اور شستگی زبان کے لئے کام ہوا"

یہاں اُن متاخرین شعرا کے کلام کا موازنہ شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ شاہ بھٹائیؒ کے کلام کی بنیاد اُن کا صوفیانہ انداز بیان اور ہے اُن کے کلام کو سمجھنے اور اُن کے شاعرانہ محاسن سے لطف اندوز ہونے کے لئے ہمیں یہ بات ہر وقت ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ شاہ بھٹائیؒ صوفی شاعر تھے۔ تصوف و شاعری اس حد تک ان کی ذات اور شخصیت کا جز بن گئے تھے کہ پڑھنے والا کلام کے کسی حصہ کے متعلق بھی آسانی سے یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ تصوف ہے یا عشقیہ شاعری ہے۔ بہرحال متاخرین شعرا میں مرزا غالب اور مصحفی کا کلام بڑی حد تک شاہ بھٹائیؒ کے کلام کے نزدیک نظر آتا ہے

---

[1] دہلی کا دبستان شاعری۔ مصنف ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب صفحہ ۹۰ انجمن ترقی اردو ہند دہلی سنہ ۱۹۴۹ء

[2] ایضاً ، ، ،

مصحفی ۱۱۶۱ھ _ ۱۲۴۱ھ .

مصحفی کا نام غلام ہمدانی اور والد کا اسم گرامی ولی محمد تھا. وہ امروہہ کے ایک ممتاز خاندان میں سے تھے. مصحفی کی ولادت سنہ ۱۱۶۱ھ میں ہوئی. بچپن اپنے گاؤں بلب گوڑھ میں گذارا جوانی دہلی میں رہے وہاں کی پریشان حالی سے تنگ آکر لکھنؤ چلے گئے. وہاں مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں ملازمت کی. مصحفی اپنے دور کے باکمال شخصیت کے مالک تھے. اُردو زبان کی اصلاح میں بڑا حصہ لیا. مصحفی کی وفات سنہ ۱۲۴۱ھ مطابق سنہ ۱۸۲۴ء میں ہوئی یعنی شاہ صاحب کی وفات کے وقت ان کی عمر چار رسال کی تھی. شاہ بھٹائی اور مصحفی کے کلام سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں.

مصحفی :- کیا تجھ سے کہوں حال شہود عالم کچھ ایک سی ہے بود نبود عالم

بس تو ہی جو چھپے تو ہو نادان جو عین وجود حق وجود عالم

شاہ بھٹائی اسی خیال کو بیان کیا ہے. جن وڃايو وجود کی سی فاني ٿيا في الله ۾

نه تن قيام نه قاعدو، نکو ڪن سجود.

جيلاڻ ٿيا نابود، تيلاڻ گنگا بود ڪي.

جس نے اپنے وجود کو فنا کیا. وہی اللہ کی ذات میں فنا ہوا.

ان کے ساتھ نہ کوئی قاعدہ ہوگا اور نہ کو حساب کتاب جائےگا نہ وہ سجدہ کرتے ہیں.

مصحفی اس فانی عالم کے لئے کہتے ہیں :-

رہا ہے کون عالم میں سدا عالم یہ فانی ہے .

گر اٹھ جاویں گے ہم بھی ایک دن عالم سے کیا ہوگا .

شاہ لطیف فرماتے ہیں :- فاني ني فاني، دنيا دمُ هيڪڙو

لَئي لوڙه لَٽِ ۾ جوڙيندو جاني.

یہ عالم فانی ہے، جس میں کوئی بھی ایک دم نہ ٹھہریگا.

میرے دوست، موت کے بعد تیری قبر میں مٹی لاتوں سے دبا کر بنائینگے.

مصحفی کہتے ہیں :- کل میں جو راہ اُسے پہچان رہ گیا.

کچھ وہ بھی مجھکو دیکھ کے حیران رہ گیا.

شاہ لطیف کہتے ہیں. ڪاله گڏيو سون ڪاپڙي، بابو بيڪاري

ساڻي سيلو سر تي، مالا موچوري

ڏيئي ڏيکاري، ڦٽي دل فقير ويو.

ایک جوگی راہ میں کل مل گیا.

سر پہ تھی پیچیدہ پگڑی دلپذیر

اس پہ طرہ موتیوں کی تھی لڑی

کر گیا زخمی، نگہ سے دل فقیر.

مصحفی:۔

شبنم کا قطرہ ہی نہ فقط آب دیدہ تھا۔
تربت پر میری گل بھی گریبا دریدہ تھا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ

پيئي جا پرڀات، سا ماڪ م ڀسو ماڻها.
روئي چنڊي رات ت سڀي ڏکويڻ کي.

صبح کے وقت جو شبنم گرتی ہے اُسے شبنم نہ کہو۔
یہ تو رات کے رونے کے آنسو ہیں، جو غمگین لوگوں کے دکھ میں بہاتی ہیں۔

مصحفی

مخلوق ہوں یا خالق یا مخلوق نما ہوں
معلوم نہیں مجھکو میں کون ہوں کیا ہوں۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

آئون جيهائي ذات، تون پاڻ سنڀالج سپرين.
اَديون آدبسين جيون - پريان ساري رات.

میں جیسا بھی ہوں تو میرے دوست مجھے پہچان
میری ہمجولیاں میں دوستوں کی یاد میں پوری رات جاگی ہوں۔

مصحفیؔ کہتے ہیں:۔

گر ابر گھرا ہوا کھڑا ہے آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے۔
ہے موسم گل چمن میں ہر نخل پھولوں لدا ہوا کھڑا ہے۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ:۔

ميگهان ۽ نيهان، پيئي اکر هيڪڙو
وسڻ جا ويس ڪري ته عڪر تي ٻيهان.

بادل (ابر) اور عشق میں کوئی فرق نہیں ہے
بادل برسنے کی تیاری کرے۔ اور میں آنسو بہاتا رہوں۔

مصحفی

دنیا ہے سرائے فانی اس سے
چلئے کہ مقام ہو چکا اب۔

شاہ لطیفؒ:۔

جوڳي جڳ ڇڏي، پُربا، پورب پنڌ ٿي.
لاهوتي، لطيف چئي. هليا لعل لڏي.
وَاللهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السلام صاحب سين سڏي.
عيب! اميئ، ٿيو هڏي. همه کي حيران ڪيو.

جوگی فقیر یہ جہاں چھوڑ کر پورب کی طرف چلے گئے (وفات کر گئے)
وہ لاہوتی فقیر میرے دوست یہاں سے چلے گئے۔
اللہ تعالیٰ انسان کو سلامتی اور آرام کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔
لیکن افسوس اس دنیا کی لالچ نے سب کو حیران کیا ہے۔

نظیر اکبرآبادی سنہ ۱۷۴۰ء - سنہ ۱۸۲۵ء.

نظیر کا اسم گرامی ولی محمد تھا. لیکن اپنے تخلص سے مشہور ہوئے. اُن کی ولادت سنہ ۱۷۴۰ء کو دہلی میں ہوئی، بچپن میں اُنکے والد محمد فاروق کا انتقال ہوگیا. احمد شاہ ابدالی نے جب دہلی پر حملہ کیا تو نظیر اگرہ چلے گئے اور وہیں اپنی آزادانہ زندگی بسر کی اُنکی شاعری میں نئی راہیں اور نیا اسلوب پایا جاتا ہے. اور اپنی شاعری میں انفرادی حیثیت کے حامل تھے. نظیر نے بڑی دراز پائی سنہ ۱۸۲۵ء میں وفات کی. نظیر کا کلام یہ ہے.

ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا
کھلی نقاب رہی جب تلک نہ دیکھ سکا.

تو وہ ہے نور سراپا کہ تیری صورت کو
بشر تو کیا ہے، مری جان ملک نہ دیکھ سکا

گلی کی خاک بھی ہوکر نہ ٹھہرنے پائے
یہیں تو آہ! فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا.

یہ ناتوان ہوں کہ آیا جو یار ملنے کو
تو صورت اُسکی اُٹھا کر پلک نہ دیکھ سکا.

شاہ لطیف بھٹائی اس مفہوم کو یوں واضح کرتے ہیں.

کڇي نيڻ خمار مان جان کيائون ناز نظر

سورج شاخون جھکيون کماٹو قمر

تارا کتيون تائب ٿيا ڏيکيندي دلبر

جھکيو ٿيو جوهر، جانب ڄي جمال سين.

میرے محبوب نے جب خمار آلودہ آنکھوں کو بڑے ناز سے اُٹھایا

تو سورج اور قمر نے اپنے شعاعوں کو کم کرکے روشنی کم کردی

ستارے میرے دلبر کے حسن کو دیکھ کر تائب ہوگئے.

بلکہ پورے جہاں کا جوہر میرے محبوب کے جمال کے آگے مدھم پڑگیا.

نظیر برسات کا نظارہ یوں پیش کرتا ہے.. کالی گھٹا سے ہردم برسے ہیں مینہ کی دھارین

اور جس میں اُڑ رہی ہیں بگلوں کی سو قطارین

کوئل پپیہے کوکیں اور کوک کر پکارین

اور مور مست ہوکر جوں کو کلا چنگارین.

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں.. سارنگ کي سارين، ماڙهو مرگهه مينهون

آڙيون ابر آسري ناڙا تنوارين

سپون ڀي سمنڊ جون نڌيون سپ نهارين.

پلر پيارين نہ سنگهارن سڪ ٿئي.

گرمی کی موسم میں برسات کو انسان جانور اور پرندے یاد کرتے ہیں

مرغ آبی ابر کے سہارے پر جیتے ہیں. ہرنٹے سورج نکلتے ہی اسمان کو دیکھتے ہیں

سیپ بھی سمندر کی سطح پر آکر اسمان کی طرف دیکھتی ہیں.

اے مالک (پروردگار) برسات کا پانی برسا تو غریبوں کو خوشی حال ہو.

نظیر کہتے ہیں :- محبوب قمر شکل جسے رشک سے دیکھیں

اس چہرۂ انوار میں وہ نقشا نظر آیا ۔

شاہ لطیف چاند کو اپنے محبوب کے حسن کے مد مقابل نہیں لا سکتے ۔ فرماتے ہیں :-

چنڊ تنهنجي ذات پاڙيان تان نه پرين سين

تون اڇو منجھ رات سڄڻ نت سوجھرو

اے چاند میں تجھے اپنے محبوب کے حسن کے مد مقابل نہ کر سکتا

تو صرف رات کو روشن ہوتے ہو، لیکن میرا محبوب تو ہمیشہ روشن رہتا ہے ۔

آب و دانہ کا قید بہت سخت ہے نظیر اکبرآبادی اس کے متعلق کہتے ہیں ۔

ہم کو پھنسنا تھا قفس میں کیا گلہ صیاد کا ۔

بس ترستے ہی رہے ہیں اب اور دانے کو ہم

شاہ لطیف بھٹائی نے عربی مقولہ قَیْدُ الْمَاءِ اَشَدُّ مِنْ قَیدِ الْحَدِیدِ (پانی کا قید لوہے کے قید سے زیادہ سخت ہے) کی اپنے کلام میں ترجمانی فرمائی ہے

فرماتے ہیں :-

قَیْدُ الْمَاءِ جنهن جو، سو مون پانھ پيو .

جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ . وهي قلم ڏيو .

اي قضا ڪم ڪيو، جنهن ٿر مارو آن ماڙين

آب کا قید مجھے کھینچ کر لایا جو میری تقدیر میں لکھا ہوا تھا ۔

تقدیر کے قلم نے جو کچھ لکھا وہ لکھ کر اپنی سیاہی خشک کر دی

یہ تو تقدیر کا کام ہے جو میرے عزیز تھر میں ہیں اور میں اس غیبت میں

نظیر اکبر آبادی فرماتے ہیں :-

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لائے چلے گئے ۔

کیا کیا بڑے جوان تھے ۔ آئے چلے گئے ۔

شاہ لطیف بھٹائی نے اس خیال کو اپنے عظیم کلام میں اس طرح بیان فرمایا ہے ۔

گوليان ۽ ڳنڊيان ، ويا ويراڳي نڪري

صحبت جا سنڌيان، آئون نه جيئندي اُن ري ،

میں اس محبوب کو ڈھونڈتا ہوں جسکے دیکھنے کی تاب نہیں ہے وہ تو چلے گئے ۔

جن کے ساتھ محبت کی باتیں ہوتی تھیں ۔ میں ان کے بغیر زندہ رہ نہ سکوں گا ۔

انشاء اللہ خان انشا ۔

انشاء اللہ خان انشا بن حکیم ماشاء اللہ نجف اشرف کے اصل باشندے تھے، جہاں سے انکے آباؤ اجداد ہجرت کرکے دہلی میں اکر مقیم ہوئے ۔ انشا سنہ ۱۱۶۹ھ کو مرشد آباد میں پیدا ہوئے تھے، جوانی میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے اور وہاں نواب سعادت علی خاں کے یہاں ملازمت کی۔ لیکن چند وجوہات کی وجہ سے انہیں لکھنو چھوڑنا پڑا ۔ انشا سنہ ۱۲۳۳ھ میں بڑی کسمپرسی کی حالت میں وفات کی۔ انشا اپنے دور کے بڑے عالم اور ذہین شخصیت کے مالک تھے ان کی تصنیفات میں "رانی کیتکی" اور "دریائے لطافت" مشہور ہیں کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

انشا

اُن کی دھونی لگا در پہ تیرے خاک نشیں
راکھ جوگی کی طرح منہ پر ملے بیٹھے ہیں ۔

شاہ لطیف

ڪالهه گڏيو سون ڪاپڙي. بابو ننگ ڀڀوت
سيڙيو سون سڪوت. جوڳي سندي ذات کان

مل گیا کل راہ میں اک کاپڑی   جسم پر اُن کے نمایاں تھا بھبھوت لہ
اس حمیدہ ذات سے حاصل ہوا   بیقراروں، دردمندوں کو سکوت ۔

انشا :۔

جو کوئی ہم سے ستم کشوں کو عبث ستا کر خفا کرے گا
یہی کہینگے کہ جاؤ صاحب خدا تمھارا بھلا کرے گا ۔

شاہ لطیف

جانب اٿين نه جهڳڙو، جيئن مارئيو موٽيو نه پڇين ۔
رتي رت نه سنجري، سڀ تنهنجي ساءِ
اسان ته توئي لاءِ، تون پرين پڇائين ڪيون ۔

میرے محبوب تجھے یہ اچھا نہیں لگتا، ایک طرف تو مارتے ہو اور پھر پوچھتے بھی نہیں
یہاں تیری محبت میں ایک رتی خون کی بھی نہیں رہی ۔
اس کے باوجود بھی ہم تو تیرے لئے دعا کرتے ہیں ۔

انشا کہتے ہیں :۔

بجلی نہیں چمکتی ہے ابر سیہ تجھ بن
پھرتی ہے رنگ اڑاتی کالی بلا چمن میں ۔

شاہ لطیف بھٹائی :۔

جهڙ ڀنڊڻ نه لهي. ڪڪر هون نه هون
آنکھوں سے برسات تھمتی ہی نہیں۔ ابر موجود ہو یا نہ ہو
سارو مينهن ڪي لڙڪ ڳلن تي پون ۔
محبوب کو یاد کرکے آنسو گالوں پر ٹپکتے ہیں ۔

لہ اس بیت کا منظوم ترجمہ قبلہ بزرگوار مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی نے کیا ہے مرحوم ل رانہ مسودہ

جرأت :۔

جرأت کا نام یحییٰ امام تھا۔ لیکن قلندر بخش کے نام سے مشہور ہوا۔ اُن کے والد کا نام حافظ امام تھا۔ بچپن میں دہلی سے فیض آباد چلے گئے تھے۔ شاعری کا شوق بھی صغیر سنی سے ہوا۔ جوانی میں چیچک کی بیماری آنکھوں کی روشنی سے محروم ہوگئے تھے۔ سنہ ۱۲۲۴ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ جرأت اپنے دور کے استاد شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ اُن کی شاعری میں حسن و عشق کے ساتھ صوفیانہ رنگ بھی نظر آتا ہے۔

جرأت :۔ اس سرائے دہر میں غافل تو اے جرأت نہ بیٹھ
ہو رہی ہیں چار سو جانے ہی کی تیاریاں۔

شاہ لطیف نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

تتيءَ ٺڏيءَ ڪاهه، ڪاهي ويل ويهڻ جي
متان ٿيئي اونداهه پير نه لهين پرين.

گرمی ہو یا سردی تو چلتا رہ کیونکہ یہ وقت بیٹھنے کا نہیں ہے
جب تاریکی چھا جائے گی تو تم محبوب کے پاؤں کے نشان نہ دیکھ سکو گے۔

جرأت ایک فطرت نگار شاعر بھی تھے تو تصوف کے شاعر بھی تھے۔ ان کے دو شعر دیئے جاتے ہیں جن اُنہوں نے محبوب کے دیدار کے لئے لکھے ہیں۔ کہتے ہیں :

جس طرف دیکھتا ہوں میں اس بن
یہ نہیں جانتا کدھر دیکھتا۔
درد کی طرح جان جرأت کو
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھتا

دوسری مثال ہے :۔

اپنا جب کوئی تصور میں گذر آئے نظر
جس طرف دیکھیں اُدھر یار آئے نظر۔

اس خیال کو شاہ لطیف بھٹائی نے بھی پیش کیا ہے۔

ايڪ قصر در لک، ڪوڙين ڪٽس ڳڙکيون
جيڏانهن ڪريان پرک، تيڏانهن صاحب سامهون.

ایک محل جس میں لاکھوں کھڑکیاں اور دروازہ موجود ہیں
جس طرف بھی دیکھتا ہوں اُدھر (صاحب) یار نظر آئے۔

رنگین

رنگین کا اسم گرامی سعادت حسین یار خان تھا۔ اُن کے والد طہماس خان، نادر شاہ کی فوج کے ساتھ توران سے ھندوستان میں آئے تھے۔ رنگین کی ولادت سنہ ۱۱۶۹ھ کو سرھند میں ہوئی۔ رنگین اپنے دور کے مشہور شاعر تھے۔ اُن کا انتقال سنہ ۱۲۵۱ھ میں لکھنؤ میں ہوا۔ رنگین کی شاعری کی مثال یہ ہے

رنگین:۔ حمد کریم کی سب سے پہلے ۔ دھو کے زبان رنگین کہہ دے

کیونکہ وہ خلاق جہان کا واقف ہے پنہان و عیان کا

سب مخلوق میں خالق ہے وہ سب کا دائم رزاق ہے وہ۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔ اوّل الله عَليمُ اعلي، عالم جو ڌڻي،

قادر پنھنجي قدرت سين قائم آھ قديم

والي واحد، وَحدَہٗ، رازق رَبّ رحيم

سو ساراھ سچو ڌڻي، چئي حمد حڪيم

ڪري پاڻ ڪريم، جوڙيون جوڙ جهان جي.

سب سے پہلے الله تبارک و تعالیٰ کی ذات گرامی ہے جو علیم اعلیٰ اور اس جہان کا دھنی ہے

الله تبارک و تعالیٰ اپنی قدرت سے قائم ہے قدیم۔

مالک واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے رزاق اور رحیم ہے

اس کی تعریف کر جو سچا دھنی۔ اس کی حمد و ثنا کر۔

وہ کریم تو خود بہ خود اس عالم کا نظام چلاتا ہے۔

دریا رواں بہ سوئے عدم دیکھتے ہیں ہم

رنگین:۔ مثل حباب ہوں کوئی دم دیکھنے ہیں ہم

شاہ لطیفؒ جر تي ڦڙو جيئن لهر لڳي اُڌ ٿيئي.

تون پڻ آھين. تيئن ڪوڙ ڀنئين ھن جهان ۾.

پانی پر حباب لہر لگنے سے آدھا ہو جاتا ہے

اے انسان تو بھی مثل حباب ہو کوئی دم اس جہاں میں۔

رنگین ہر چند گناہ میں ہے تو غرق پر اس کی نہ بندگی میں کر فرق۔

شاہ لطیفؒ ڪيچ ڪمايم ڪوڙ، ڀڳم عَھدُ الله جا.

پيرو جو پاپن جو، سو چوٽيءَ تائين چوڙ

معلوم آھيئي مُونہ، ڪوڙھا اھنيءَ ڳالھ جو.

میں نے جھوٹے کام کیئے ہیں، اور الله تعالیٰ کے عہد کو توڑا ہے۔

یہ پورا جسم ہر چند گناہوں سے بھرپور ہے

اے میرے پروردگار تجھے ہر چیز کا علم ہے تیری عنایت کے بغیر چھٹکارا نہیں۔

ناسخ :-

شیخ امام بخش ناسخ اپنے دور کے بڑے شاعر تھے۔ اُن کی ولادت لاہور میں غالباً ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۴ء میں ہوئی۔ فارسی اور عربی زبانوں پر بڑی دسترس تھی۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ بچپن میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں وفات کی۔

ناسخ

ناسخ وطن میں دیکھئے، دیکھیں گے گھر کو کب
غربت میں مدتوں سے ہے اپنا مکان
سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ، آج وطن سے نکل گیا۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں:-

وڃائي وطن کي آئون جي هت مياسن
گور منھنجي سومرا! کڄ پنهوارن پاس
ڏج ڏاڏاڻي ڏيھ ۾ منھنجان ولڙين واس.
مُياڻي جياس ٿي وڃي مڙھ ملير ڏي.

وطن کو یاد کر کے اگر میں یہاں مر جاؤں
تو میری قبر میرے عزیزوں کے پاس جا کر بنانا
میرے آباؤ اجداد کے دیس کی جھاڑیوں کا دوپٹہ دینا
تو میری لاش میں پھر سے جان آجائے گی۔

ناسخ

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انساں سے ہوتا ہے۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:-

سوکي پاڻين سيکو، اوکي توڻي تون
مولا مٺان موں پڙولاھ م پاڇ جو.

آسان بات ہر ایک اپنی طرف سے سمجھتا ہے لیکن مشکل تیری طرف
میرے رب تو میرے اوپر سے رحم کی نظر نہ ہٹا دے۔

ناسخ نے گور کا ذکر کیا ہے فرماتے ہیں:-

گور آتی ہے نظر جب مجھکو گھر آتا ہے یاد
اس سفر میں ہائے دنیا سے سفر آتا ہے یاد

شاہ لطیفؒ نے اس غافل انسان کو تلقین کرتا ہے کہ دنیا چند ساعت کے برابر ہے۔ تجھے تو آرام کرنے کے لئے قبر میں کافی وقت ملیگا فرماتے ہیں:-

هيءَ تان ٿورڙيون ئي تون پورھا پسي پلڙين
راتيون پيون گھڻيون، جي تو اينديون هيڪليون.

یہ وقت (دنیا) بہت تھوڑا ہے اگر اے نادان تو سمجھے
بہت سی راتیں تجھے قبر کی تنہائی میں ملینگی آرام کے کرنے کے لئے۔

آتش :-

آتش کا نام حیدر علی تھا. اُن کے آباء اجداد دہلی کے قدیم باشندے تھے. آتش کے والد خواجہ علی بخش وہاں سے فیض آباد چلے گئے تھے. آتش کی ولادت ۱۷۶۷ء سنہ میں ہوئی. آتش غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد تھے. ناسخ سے شاعری میں مقابلہ ہوتا تھا. جس کی وجہ سے اُن کے کلام میں بڑی پختگی موجود ہے اُن کی وفات ۱۸۴۷ء سنہ میں ہوئی. آتش کا کلام آج بھی بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے.

آتش

ہوا ہے عشق ہم کو اُسکے حسنِ پاک سے پیدا.
کیا ہے نور کے بتوں کو جس نے خاک سے پیدا
ظہور آدمِ خاکی سے یہ ہم کو یقین آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشین آیا.

شاہ لطیف فرماتے ہیں. :-

سيرانجي سولن جي ڳالهه ڪين وڃي.
وڃي در دوستن جي سوريءَ سِرُ ڏجي.
عاشق آڱڻ چڙهيا، هيو سيڪو ڏجي.
ٻيجهه پلوءِ پريتڙون - ڦرين سڀ سڀي.
عاقل ٿي اوچون تيا، پورهو ڪين پڄي.

محبوب کے پاک حسن کی کیا تعریف کروں جس سے ہم کو عشق ہوا ہے
اس کے دروازہ پر سولی کی طرح سر قربان کریں.
عاشق ہی سولی پر چڑھ کر شہادت قبول کرتے ہیں.
اپنے سر کو اسکی طلب سے پہلے دینا چاہیئے
اس معمہ کو سمجھنے سے عاقل بھی حیران رہ گئے ہیں.

آتش کہتے ہیں

نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں ہم کو.
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا.

شاہ لطیف بھٹائی :-

ڪوڙين ڪيائون تنهنجون ڪلن لک هزار.
جيءَ سيڪنهن جيءَ سين درشن ڏاڍون ڏار
پسيم تنهنجا پار، ڪيتڙا جيٺي ڪيتڙا چوان.

یا رب تیری تعریف ہزاروں اور لاکھوں انسانوں نے کی ہے
ہر ایک نے اپنی نظر سے تیرا دیدار مختلف طریقے سے کیا ہے
اے میرے پروردگار تیری کون کون سی تمنا کروں کروں.

شاہ نصیر دہلوی

سید نصیر الدین نصیر کے والد کا نام شاہ غریب تھا۔ اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ نصیر اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اس لئے بڑے ناز و نعمت سے پرورش پائی۔ نصیر کو شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ اور شاہ محمد مائل کے شاگرد ہوئے۔ شاہ نصیر نے اپنے شاعرانہ عظمت سے دہلی میں شعر و شاعری نئے سرے سے اجاگر کیا۔ شاہ نصیر دہلی سے دکن کی طرف چلے گئے تھے جہاں ۱۸۳۸ء میں وفات پائی۔ کسی شاگرد نے "چراغ گل" کے الفاظوں سے تاریخ نکالی ہے۔

شاہ نصیر فرماتے ہیں :۔

سدا ہے اس آہ و چشم تر سے
فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
نکل کے دیکھو ٹک اپنے گھر سے
فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں ۔

شاہ لطیفؒ نے اپنے عظیم کلام میں خزینہ شاعری کثیر تعداد میں کی ہے۔ اس شعر میں اُنہوں نے برسات کو آنسوؤں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا ہے

ھڙ نيڻون نہ لھي، ڪڪر هون نہ هون
سارينو سپرين کي لڙڪ ڳلن تي پون
سي مر روئيو روئن جن مسافر سپرين

عاشق کے ہمیشہ چشم تر رہتے ہیں چاہے آسمان پر بادل موجود نہ ہو۔
محبوب کو یاد کرکے آنسوں گالوں پر تھم جاتے ہیں
وہ کیوں نہیں روئینگے جن کے محبوب مسافر ہوں۔

شاہ نصیر کا ایک اور شعر ہے :۔

ہر دم نصیر رہ تو امیدوارِ رحمت۔
تیری زبان پہ کس دن لاتقنطو نہ آیا۔

اس قبیل میں شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں

ڏٻنا مون ڏکي، ڪي الله لڳ اُهڃاڻ
لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَتِ اللّٰهِ، پرين چيو پاڻ۔
اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا، سچواي پرياڻ۔
آدلون عبداللطيف چئي، اهڙو آهي اڳواڻ۔

اس غمزدہ کو اللہ کے واسطے وہ نشان بتا دینگے
اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نااُمید نہ ہونا۔ یہ تو محبوب کا خود فرمان ہے
بیشک (تحقیق) اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف کرتا ہے، یہ سچی بات ہے
شاہ لطیف فرماتے ہیں میرا رب بڑا کریم اور رحم والا ہے۔

ذوق ۱۷۸۹ء - ۱۸۵۴ء

شیخ محمد ابراہیم ذوق ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے۔ ذوق ۱۲۰۲ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں اپنے استاد حافظ غلام رسول کی صحبت میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ آخر شہزادہ ظفر کے استاد بنے اور "خاقانی ہند" کا لقب ملا۔ ذوق غزل اور قصیدہ کے بادشاہ مانے گئے۔ اُن کی شاعری میں سادگی اور دلفریبی موجود ہے۔ چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

ذوق کا ایک شعر ہے۔

جھوٹ ہی جانو کلام اس دشمن ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا۔

شاہ لطیف سچے مسلمان اور منافق میں فرق بتاتے ہوئے منافق کو ظاہر کرتا ہے فرماتے ہیں۔

اِن پرِ ايمانُ، جئن ڪلمي گو ڪوٺائين۔
دغا تنهنجي دل ۾، شرڪ ۽ شيطان۔
منهن ۾ مسلمان، اَندر آذرَ آهين۔

اس طرح یہ تیرا ایمان نہیں ہے، جس طرح تو اپنے آپ کو کلمہ گو کہلاتے ہو
تیرے دل میں دغا ہے اور شرک و شیطانیت سمائی ہوئی ہے۔
ظاہر صورت میں تو مسلمان ہے، لیکن باطن میں آذرؑ ہو۔

ذوق کا ایک اور شعر ہے:۔

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ۔
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔

شاہ بھٹائی اس خیال کو انسانی زندگی کی کامیابی پیہم کشمکش پر مدار رکھتے ہوئے اس فلسفیانہ نکتہ کو بڑی سادگی سے بیان کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جان جيئين تان جَل، جو ڪاڻهي جاءِ جلڻ جي
تتي ٿڌيءَ ھل، جو ڪاڻهي جاءِ ويهڻ جي۔

جب تک زندگی ہے جبت میں چلتا رہ جو چلنے کے بغیر کوئی راہ نہیں ہے
گرمی ہو یا سردی تو چلتا رہ۔ جو چلنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

ذوق نے فرمایا ہے:۔

نہ ہوتا گر وہ شوخ خود تماشہ گر آرائش۔ اُٹھاتا تو خورشید فلک آئینہ دار سے

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

وحدت تا ڪثرت ٿي، ڪثرت وحدت ڪل
حق حقيقي هيڪڙو، ٻولي ٻي مَ ٻول
هو هلايو هل، بالله سندو سڀئين

وحدت ہی سے کثرت ہے اور وحدت کل کثرت سے ہے
ایک ہی معبود حقیقی ہے اس کے سوا اور کوئی چیز زبان پر نہ لا۔
یہ دنیا کا شور و غل اس قادر مطلق کی مظہر قدرت کا ہے۔

مومن

حکیم محمد خان مومن بن حکیم غلام نبی خان، کشمیر کے رہنے والے تھے۔ مومن کی ولادت ۱۲۱۵ھ کو کوچہ چیلان میں ہوئی۔ مومن کی ابتدائی تعلیم اچھی طرح سے ہوئی۔ وہ بڑے ذہین اور ذکی دماغ تھے۔ ان کے کلام میں اکثر خلفائے راشدین کی شان میں قصائد اور مدح نظر آتی ہیں۔ غزل میں انکی انفرادی حیثیت تھی۔ مومن ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

مومن کا شعر ہے

غیر سے سرگوشیاں کرلیجئے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دل رشک، آشنا کہتے ہیں۔

شاہ لطیف بھٹائی[2] فرماتے ہیں:۔

ڦرَ سين وڃي وَڃائِ، ڪرَ سين ڪڻ پائين
پوري! منهن اَجاڻ، ڪڻ ڇڏيو ته ميڙين.

دوست سے لڑائی مول لیتی ہو، اور رقیب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہو
اے نادان عورت تو، تو آناج کو چھوڑ کر اُنکے چھلکے جمع کر رہی ہے۔

مومن کا ایک اور شعر ہے۔۔

ہو سعیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن
نیند آتی ہے بآرام دگر آخر شب۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

غافل غفلت ڇوڙ تون ڪين اُٿا سين اُوجهرين
هو چپاتا چڙهي ديا وڃي چتنا تون.
نڪي ننڊ اکوئي، جم ورن جي واڪاڙين.

اے غافل تو غفلت کو چھوڑ دے تو نے کیوں کم سستی برتی ہے۔
جن کو منزل کی طرف جانا تھا وہ خاموشی سے منزل مقصود پر پہنچے
اپنی آنکھوں سے نیند کو اکھوڑ دیں ورنہ بیابان میں بھٹکنا پڑے گا۔

مومن کہتے ہیں:۔

نالہ روتے ہیں جو لکھا تو بھیگا کاغذ
کہ بنا ہم گھر صفح تو دریا کاغذ۔

شاہ لطیف[2] کا شعر ہے:۔

اَلا! اُوٺي آئين جي نيا پا نين
آئون اُنهن جي آميان، توڻي مون نه چين.
مس منهنجي مٽ ۾ ڪاغذ ڪي آٿين
لڙڪ نه لکڻ ڏين ڪريو پون قلم تي.

یا اللہ! اس قاصد کو بھیج دے جو میرے عزیزوں کا پیغام لائیں
میں تو اُن کی ہوں وہ چاہیے مجھے اپنا نہ بنائیں۔
سیاہی تو میرے ہاتھ میں ہے وہ کوئی کاغذ لائیں
میرے آنسوں مجھے لکھنے نہیں دیتے اور قلم پر گر جاتے ہیں۔

ظفر ۱۷۷۵ء - ۱۸۶۲ء

سراج الدین محمد ابوالمظفر بہادر شاہ ظفر ۱۷۷۵ء میں تولد ہوئے۔ تیموری سلاطین کے آخری تاجدار تھے۔ ظفر ۶۲ برس کی عمر میں ۱۸۳۷ء میں اپنے والد اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے، لیکن حکمران کہ لئے ہیں۔ سلطنت تو فرنگیوں کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ ظفر تاج سلطنت کا بادشاہ نہ ہوا لیکن سخن سنج کا بادشاہ تو بنا۔ ظفر کو دہلی میں شعر و شاعری کا ماحول ملا۔ اس طرح بچپن میں ہی شاعری سے رغبت پیدا ہوئی۔ شروع میں شیخ محمد ابراہیم ذوق سے اصلاح لیتے رہے، بعد میں مرزا غالب سے بھی اصلاح لی۔ ظفر نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے آباؤ اجداد کی عظیم سلطنت کو اجڑتے ہوئے دیکھا، اور دنیا کی ناپائداری کا رونا رویا۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر کی شاعری میں رنج و الم یاس و حسرت کے جذبات موجود ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد فرنگیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر رنگون میں نظربند ہوئے جہاں ۹۰ برس کی عمر میں کسمپرسی کے عالم میں وفات پائی۔ ظفر کے کلام میں بڑا سوز و گداز موجود ہے۔

ظفر کا شعر ہے

لطف سے کُن کے ہوئے پیدا ہیں دونوں عالم
لطف سے روح ہوئی داخل جسم آدم۔

شاہ لطیفؒ کا شعر ہے:۔

فَیَکُوْن فدا جَري جَڏهِن سين ڪن۔
تنظيماً تمام ڪري، پوءِ پٽس پاڻين پن

فیکون فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کن
دنیا کے نظام کی تنظیم کرکے پھر اس دنیا کو بچھایا۔

ظفر کہتے ہیں۔

لطف سے گرچہ ہو معشوق بھرے عشق کا دم
لطف سے غیر بنے بندہ ہے دام و درم
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

شاہ لطیف فرماتے ہیں

جيڪي منجهه جهان سو تاري ٽِڪي تنهنجي
لطف جي لطيف چئي تو وٽ ڪمي ڪان
عدل ڇنان آئون نه ڪو قيمه وڪيج فضل جو

جو کچھ بھی اس جہان میں موجود ہے وہ تیرے سہارے پر چلتا ہے
لطیف کہتا ہے میرے رب لطف و کرم کی تجھ میں کمی نہیں ہے۔
میں گنہگار ہوں انصاف کرنے سے چھٹکارا نہ ہوگا جب تک تو رحم نہ فرمائیگے۔

ظفر کا ایک اور شعر ہے:۔

نماز و روزہ و تسبیح و حج
یہ سب باقی نہیں تو باقی نہیں ہے

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے روزہ اور نماز کے ساتھ ایک اور فہم کو بھی دیا ہے۔ وہ فہم کون سا ہے، وہ حقیقت میں عشق ہے جو انسان کی تخلیق کے ساتھ انکو ودیعت کیا گیا ہے جو انکی زندگی کا ایک جز ہے فرمایا ہے:۔

روزه ۽ نمازون، اي پڻ چڱو ڪم
پر اُو ڪو ٻيو فهم، جنهن پسجي پرين کي۔

روزے اور نمازیں، یہ بھی بہتر کام ہے
اور ہیں وہ افہام، جس سے دیکھیں دوست کو۔

ظفر معلم اخلاق کی حد سے جب ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے تو وہ خدا پرست صوفی کی طرح محبوب حقیقی کی لگن میں سرشار ہوکر فرماتا ہے

تیرا حسن ہم جلوہ گر دیکھتے ہیں۔

جہاں دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں۔

شاہ لطیف بھٹائی کا مشاہدہ جمالِ دوست سے محروم نہیں ہوتا۔ وہ جمال طور سوز اور حسن عالم افروز کا دیدار خودی کا پردہ اٹھاکر فرماتا ہے۔

جیڏانھن ڪريان پرک تيڏانھن صاحب سامهون۔

جس سمت کو دیکھتا ہوں اس سمت دیدار یار ہوتا ہے۔

ظفر محبوب کی تعریف میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے فرماتے ہیں

اے معدن کرم تری همت کے روبرو — کم تر ہے سنگ ریزہ سے قدر رنگین جم

صدقے زمین کے ہوتا نہ پھر بوئے آسماں — دکھتا سرزمین نہ اگر اپنا تو قدم

محروم ترے دست مبارک سے رہ گیا — کیوں کر نہ چاک اپنا گریبان کرے قلم

قرآں میں جبکہ خود ہو ثنا خواں ترا خدا — کیا طلب پھر قلم کو جو کچھ کر سکے قلم۔

شاہ لطیف بھٹائی اس قبیل میں فرماتے ہیں

نازمنجھان نڪري، جڏهن پرين ڪري ٿو پنڌ

پون پڻ بسم الله چئي راھ چمي ٿي ترنڌ

اڀيون گهٽي ادب سين حورون حيرت ھنڌ

سائين جو سوڳنڌ، منھنجو ساجن سڀنئان سھڻو۔

میرا محبوب جب ناز سے باہر نکل کر قدم رنجہ فرماتا ہے

تو یہ زمین ان کو دیکھکر بسم اللہ کہہ کر راہ کو بوسے دیتی ہے۔

بڑی حیرت اور احترام سے حوریں ایک ٹک کھڑی رہی ہیں

میرے محبوب کی خوشبو کتنی پیاری ہے وہ تو سب سے زیادہ حسین ہے

ظفر کہتے ہیں: ظاہر پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ — ہے وہ بہت قریب

شاہ لطیف اسی خیال پیش کرتا ہے: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ وطن آن ويندياس

ماروئن کي ملندياس ڪونيون ڇڏي ھتھ ھن۔

اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں بندے میں تری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔ اس قید و بند کو چھوڑ کر اصل وطن جاؤں گی۔

ظفر کا شعر ہے: ظفر اوی اس کو نہ کہئے گا وہ کتنا ہی صاحب فہم وذکا — جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہے

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں: ڦريا پس ڦيڻ ڪرين کير نہ چکيو،

دنيا ھاري دين، وڃائي وڪاٽيا۔

بگڑے ہوئے لوگوں نے (گھی) جھاگ کو صرف دیکھا ہے انہوں نے دودھ کی لذت حاصل نہ کی

انہوں نے تو دنیا کے واسطے اپنا دین و ایمان گنوا دیا۔

مرزا غالبؔ

دبیرالملک نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ، اُردو ادب کے درخشاں ستارے۔ اُردو ادب میں جو مرتبہ اُنکو حاصل ہوا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ مرزا غالبؔ کی ولادت ۸ رجب سنہ ۱۲۱۳ھ مطابق سنہ ۱۷۹۶ء حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحؒ کی وفات سے ۲۸ سال بعد آگرہ میں ہوئی۔ مرزا صاحب کے دادا مغلیہ شہنشاہ شاہ عالم کے زمانے میں توران سے ہجرت کرکے ھندوستان میں آئے تھے۔ مرزا غالبؔ کے والد کا نام مرزا عبداللہ عرف مرزا دولھا تھا جن کی عین جوانی کے عالم میں وفات ہوئی۔ غالبؔ کی پرورش انکے چچا نصراللہ بیگ کے ذمے ہوئی۔ جنہوں نے مرزا کو بڑی اچھی تعلیم دلوائی۔ غالبؔ کو بچپن سے شعروشاعری سے شوق تھا۔ شادی کے بعد اُنہوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ غالبؔ کے کلام پر امیر خسرو کی شاعری کا بڑا اثر ہوا۔ شروع میں عرفی کے قصائد کی تقلید کرتے رہے۔ ابتدا میں اسد تخلص کرتے تھے۔ لیکن بعد میں غالبؔ اختیار کیا۔ غالبؔ کی شاعری سے متاثر ہوکر شہنشاہ بہادر شاہ ظفر نے اُنہیں اپنا استاد مانا اور نجم الدولہ دبیرالملک کا خطاب دیا۔ مرزا غالبؔ بڑے ذہین اور شگفتہ مزاج تھے۔ اپنے تمام مصائب جو زندگی درپیش آئے، اُنہیں نہایت صبر اور شکر سے برداشت کئے۔ مرزا غالبؔ نے ۷۳ سال کی عمر میں سنہ ۱۲۸۵ھ مطابق سنہ ۱۸۶۹ء دہلی میں وفات کی۔ شاہ بھٹائی رحؒ اور مرزا غالبؔ کے کلام میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اُن کی مثال دی جاتی ہے

مرزا غالبؔ نے ربّ کی رضا پر راضی رہنے کے لئے فرماتے ہیں:-

گو میں رہے رنجِ و تنگی پر ساقی ہے دلربا

اے شیخ بن پڑیگی نہ کچھ ہاں کئے بغیر۔

قضا کے معمہ کو حل کرنا مشکل ہے اس لئے رضا اور تسلیم کی راہ پر چلنا چاہئے۔ اس کے لئے شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں۔

جڏهن ڪُنْ فَيَڪُونَ چئي اربابِ ارواح

انگ اُڳهين لکيو، منهنجو ميڙا تاءِ

وڏڻن ته وڙ ڪندا، نه ته اُڳين جي اختيار

سرڪشي سرداريءَ سين، مون ڪميڻيءَ ڪهڙو۔

جب اللہ تعالیٰ نے کُنْ فَیَکُونَ فرمایا اور روحوں کو پیدا کیا۔

اس میثاق کے دن میری تقدیر میں جو کچھ لکھنا تھا لکھ دیا۔

اب ان کی مرضی پر ہے چاہے تو رحم فرمائیں۔

میں کم تر کی سرکشی سردار کے آگے کیا بنےگا بس اس کی رضا چاہئے۔

غالبؔ کا شعر ہے:-

ہرچند سبک دست ہوئے ہم بت شکنی میں۔

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اُور

شاہ لطیف فرماتے ہیں۔

نڪي پاڻ کڻي پاڻ سين نڪو ساٿي پاڻ

پرين تڏهن پرچيام، اڄ جڏهن اُن گئي۔

وہ نہ تو اپنے ساتھ کچھ لیتے ہیں نہ تو کوئی چیز اُن کے ساتھ ہوتی ہے

محبوب کو اس وقت راضی کیا جب میں اُٹھ کر چلا گیا۔

جب انسان کامل ہوتا ہے تو وہ خداوند تعالیٰ کا رنگ حاصل کرتا ہے۔ یہ پوری کائنات انکی تجلی اور عکس ہے ہر چیز اس تجلی سے مختلف صورتیں اختیار کرتی ہیں غالب کہتے ہیں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں۔

شاہ لطیف بھٹائی اس قبیل میں فرماتے ہیں۔

ڪوڙين ڪيائون تنهنجو، لکن لک هزار
جيءُ سڀ ڪنهن جيءَ سين درشن ڏيهون ڏار
پريم تنهنجا پار ڪهڙا چئي ڪهڙا چوان۔

تیری ذات صفات کے لکھنے والے نے لاکھوں صفات لکھے ہیں۔
ہر ایک نے اپنی اپنی نظر سے مختلف درشن کئے ہیں۔
میرے محبوب میں تیرے کن کن صفات کا ذکر کروں۔

غالب کہتے ہیں:۔
وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو۔

شاہ لطیفؒ فرماتے ہیں:۔
عاشق عزازيل پيا مڙوئي مٺا ٿيا۔
منجهان سڪ سبيل لعنتي لعل ٿيو۔

سچا عاشق ہے تو عزازیل ہے۔ دوسرے کہنے کے عاشق ہیں۔
عشق کی انتہا کی وجہ سے وہ لعنت کے مستحق ہوئے

غالب کہتے ہیں:۔
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
آب آبروئے اہل نظر گئی۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:۔
لڙ کي لنئون نہ سڃاتو راند پانيائين راز کي۔
رلي پائڻ راند، پانڌ عشق پروڙي جو۔

لڑکی محبت کو سمجھ نہ سکی۔ اسکو بچون کا کھیل سمجھا۔
وہ بلوچ کے عشق کے راز کو سمجھ نہ سکی اور کھیل سمجھتے رہی۔

غالب کہتے ہیں:۔
میں اور صد ہزار نوائے دل خراش
تو اور وہ یک نہ شنیدن کہ کیا کہوں۔

اس خیال کو حافظ شیرازی نے بھی کہا ہے
حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
دربند این مباش کہ شنید یا نہ شنید۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں:۔
هت سڪ جي حد، هت پرين پرواه نہ ڪا

یہاں محبت حد سے زیادہ ہے وہاں محبوب کو کوئی پرواہ بھی نہیں ہے۔

غالب کا ایک شعر ہے:۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے

بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن۔

شاہ لطیف بھٹائی فرماتے ہیں:۔

ڏيکارين ڏکن کي، سنهو رکس پرين جو

سو ڏکائي سوهڻن کي، ميڪاندي هوت سان.

غم کی تکلیف نے محبوب کی طرف جانے کا راستہ بتایا

غم نے ہی تو دستگیری کی اس محبوب سے ملنے کی۔

غالب کہتے ہیں:۔

درد منت کشِ دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا۔

شاہ بھٹائیؒ اس خیال پیش کرتا ہے

سور جنين کي سريو، سري تن صحت.

مٺي مصيبت اصل عاشقن کي.

جن کو عشق کا درد پیدا ہوا اُن کو صحت ملی۔

یہ میٹھی میٹھی مصیبت اصل عاشقوں کا حصہ ہے۔

غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

ڪڏهن ڳاٽ گهوٽ، ڪڏهن مٿي مقام ۾

واريءَ سندو ڪوٽ، آڏي آڏيندي ڪيترو.

کبھی تو دولھا بنتا ہے، تو کبھی میت بن کر قبر میں دفن کئے جاتے ہو۔

اے بندہ تو ریت کے محل کب تک بناتے رہو گے۔

• •

غالب فرماتے ہیں:۔

زندگی اپنی جو اس طرح سے گذری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے ہیں۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ نے فرمایا ہے:۔

نڪو ڪم ڪفر سين، نڪا مسلماني من

نڪا دل دوزخ ڏي، نڪو بهشت گهرن

آپا آئين چون ته، پرين ڪجهو پنهنجو.

میرا کام نہ تو کفر سے ہے نہ ہی مسلمانی سے سروکار ہے

نہ تو دل دوزخ کی طرف مائل ہے نہ بہشت کی تقاضا کرتے ہیں

لیکن پھر بھی کہتا ہے، اے میرے محبوب تو مجھے اپنا بنا دے۔

غالب کا شعر ہے:: اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   یا ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا.

شاہ لطیف بھٹائی‌ؒ: سو ھيڏي سو ھوڏي، سوئي من وسي

سو سو پسي نينھن سندي سوجھري .

وہ ہی ادھر ہے وہ ہی اُدھر ہے وہ ہی دل کے اندر بستا ہے

وہ ہی دیکھتا ہے اس کی روشنی کو .

غالب - دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

شاہ لطیف‌ؒ: پسڻ جا پاڻ ۾ ڪيم روح رھاڻ .

نڪو ڏونگر ڏيھ ۾ نڪا ڪيچين ڪاڻ .

پنھون ٿيس پاڻ، سسئي تان سور ھئا .

اپنے آپ جب اپنے دل سے باتیں کی (روح کو پکارا)

نہ تو مجھے پہاڑوں نظر آئے نہ ہی مجھے کیچوں اپنھوں کے عزیزوں کی پرواہ ہوئی

پنھوں تو میں خود ہوں وہ تکلیفیں تو سسئی پر تھی .

٢

غالبؔ: یوں تو کہتے ہو کہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہیں

جائے حیرت ہے کہ پھر آنکھ سے کیوں دور ہوئے .

مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں:: آنکہ حق است اَقرَب اَز حَبلِ الوَرِید

تو فگندی تیر فکرت را بعید .

شاہ لطیف فرماتے ہیں:: جو اکين آڏو سو سپرين پراھون ڇو چئو

ھوت تنھنجي منجھ ۾ پڇين ڪوھ پيو .

جو محبوب آنکھوں کے سامنے ہی انکو دور نہ کہو .

محبوب تو تیری گود میں ہے پھر توں کیوں دوری کی پوچھتے ہو .

غالبؔ فرماتے ہیں:: طاعت میں تا نہ رہے مئے و انگبیں کی لاگ

دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو .

شاہ لطیف‌ؒ: اکر پڙھي اُيا گيا، قاضي تہ ھيا .

ان سرڪي سنڌ وساءِ پڇج اعزائيل کان

حرف ایک پڑھ کر تو اپنے آپ کو قاضی کہلاتے ہو .

اس محبت کی لذت اگر پوچھنی ہے تو اعزائیل سے پوچھو .

غالب کا شعر ہے:۔

آتا ہے داغِ حسرت کا شمار یاد

مجھ سے میرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

عدل چھٹان نہ آھیو قیھو کیجے فضل

میرے رب تو انصاف کرے گا تو میں گنہگار نجات حاصل نہ کر سکوں گا

اگر اپنے رحم و کرم کی نظر فرمائیگا تو نجات ہوگی۔

مرزا غالب کا شعر ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔

شاہ لطیف فرماتے ہیں

ھوئي اُت کوھیار، جت تو پوري پانئون

پندمِ کھڑا، ذي، آتني وجودئي وٹکار

ڈاریان پانئج ڈاھ، سچ پریان کریاڈ تو۔

اے نادان جہاں تو محبوب (پنھوں) کو ڈھونڈتی ہو وہ تو وہاں نہیں ہے

پہاڑوں کے کٹھن راستے کی طرف کیوں جاتی ہو۔ وہ راہ (دشوار) تیرے وجود میں ہے

غیر کو تو نے غیر سمجھا تو خود اپنے آپ کو محبوب بنالے

مرزا غالب

محیط دہر می بالیدن از ہستی گذشتن

کہ یہاں ہر ایک حباب اسا شکست آمادہ آتا ہے

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

جرکی ڈوڑو جئین ھرین لگی اڌ تئي۔

تون پڻ آھین تئین دنیا ۾ کو ڏینھڙو

پانی کی سطح پر حباب لہر کے لگنے سے آدھا ہو جاتا ہے

اے بندہ تو بھی حباب کی طرح چند دن کے مہمان ہو اس جہاں میں۔

غالب:۔

اس کو کون دیکھ سکتا ہے کہ یگانہ ہے وہ یکتا

جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا۔

مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں:۔

چشم احوال از یکے دیدن بقین

ناظر شرک است ہر شئی تو صد بین

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

ٻنھون کي ڏيئي ٻن ھلج پاسي ھيڪ

ورنہ سمھي ديڪ تون نِنڊ ھوتو ننڈھا ئين ڪري.

دوسروں کی محبت کو چھوڑ کر ایک طرف چل ورنہ تجھے کوئی صحیح راہ نظر نہ آئیگی اپنچاتا نا تو چھادیگو گا

باب ششم

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور اُردو شعراء کے کلام کا تقابلی موازنہ

فن تنقید میں موازنہ کے فن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک دلچسپ صنف بھی ہے۔ جس کے ذریعہ مختلف شعراء کے متعلق تقابل کرکے ایک رائے قائم کی جاتی ہے۔ جس سے کافی حد تک مسائل حل کیئے جا سکتے ہیں۔ فارسی ادب کے نقادوں نے اس فن کو خوب چمکایا۔ اکثر تذکروں میں فارسی۔ اردو اور سندھی زبانوں میں ہر دور کے شعراء کے کلام کا تقابلی موازنہ نظر آتا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے شعراء کے کلام کو باہمی طور پر مدِ مقابل بنا کر اُن کا موازنہ کرکے دکھایا ہے۔ یہ موازنہ کہیں تو بہت درست نظر آتا ہے جو الہامی طور پر یکساں نظر آتا ہے اس سلسلہ میں منقول ہے[1]

"جب حضرت رسالت پناہ صلعم معراج کو تشریف لے گئے تو زیر عرش ایک نفیس و مقفل مکان دیکھا۔ استفسار پر جبریلؑ نے عرض کیا کہ یہ مکان مخزنِ معانی ہے اور آپ کی اُمت کی السنہ اس کی کنجیاں ہیں۔ اس پر دو شعر لے لئے گئے اور قلب منوّر میں رکھ لیا۔ ایک روز حسّان بن ثابتؓ کو آپ نے ایک سادہ کاغذ عطا کرکے حکم دیا کہ یوم الجمعہ کو ایک قصیدہ لکھکر لائیں۔ لیکن اتفاقاً سہو ہوگیا اور جب حضورؐ نے قصیدہ پڑھنے کو فرمایا تو پاس ادب سے جسارت انکار نہ دیکھکر ہاتھ میں کاغذ لیا۔ اور فی البدیہہ پڑھنا شروع کیا۔ اُسی دوران میں وہ دو اشعار بھی زبان حسّانؓ سے صادر ہوگئے جن کو بجز رسالت پناہ صلعم کے کوئی نہ جانتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اِن دو اشعار سے کوئی واقف نہ تھا۔ بالضرور یہ قصیدہ بدیہہ کہا گیا ہے اور دونوں شعر جبریلؑ نے القا کئے ہیں۔ پھر حسانؓ کو تحسین و آفرین کے بعد دعائے خیر دی اور زبان فیض ترجمان سے ارشاد ہوا کہ شاعر کی طبیعت میں معنی کا پیدا ہونا الہام غیبی ہے۔ جس کا حصول بغیر تائید ایزدی محال ہے"

مگر بعض اوقات محض ایسے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے جو پرانے موازنہ کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے جو خود بخود شعراء کے کلام میں نظر آتا ہے بعض متقدمین میں سے منقول ہوتا ہے۔ یا تو بزرگوں۔ بادشاہوں اور شہزادوں کے ادبی مناقشہ اور تنقیدی معرکوں کی یادگار ہیں۔ ان میں ادبی و تنقیدی دلچسپیوں میں تیموری شہزادوں نے جو حصہ لیا ہے۔ اُن کی مثالیں اکثر تذکروں سے دستیاب ہوتی ہیں۔

یہاں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور اُردو شعراء کے کلام کا تقابلی موازنہ کیا جاتا ہے۔ شاہ بھٹائیؒ سندھ کے سب سے بڑے عوامی شاعر تھے اس موازنہ سے مراد یہ ہے کہ شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو اُردو کے کلام کے نزدیک لایا جائے اور خیالات کی ہم آہنگی دیکھی جائے اور تخیل کی یکسانیت کو دیکھا جائے۔ جو شخص مواقع کلام سے آگاہ نہ ہوگا وہ ناقص اور کامل کلام میں فرق کر نہیں سکتا۔ یہ اصلیت اسوقت حاصل ہو سکتی ہے جب دو شعراء کے کلام کا "متحد المعنی" اور مختلف الفاظ ہوں۔ یہ فرق طبائع انسانی کی لطافت و کثافت پر موقوف ہے۔ امام عبدالقاہر جرجانی نے اپنی تصنیف "دلائل الاعجاز"[2] میں اس کی تشریح یوں کی ہے "لطافتِ کلام روحانی معنوں کی قسم ہے"

حیرت کی بات یہ ہے کہ قدیم شعراءِ پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں رہتے تھے۔ جو ایک دوسرے الگ تھلگ اور بہت دور رہتے تھے۔ ہر ایک کی ثقافت علیحدہ علیحدہ، زبان مختلف، رنگ اور لباس بھی مختلف، نقل و حرکت کے وسیلے بھی محدود ملاقات کے امکانات کم اس طرح شعر و سخن کا اظہار بھی

---

[1] "ورد شعری" مقالہ نگار مولانا شریف احمد صاحب مارھروی۔ رسالہ "مخزن" مدیر احسان اللہ تاجور نجیب آبادی ماہ نومبر ۱۹۱۸ء صفحہ ۴۔

علیحدہ لیکن کسی حد تک خیالات میں نمایاں مماثلت نظر آتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگ ایک ہی چشمہ سے سرشار تھے سب نے اپنی زبان میں تصوف کی باریکیوں، خدا تعالیٰ اور رسول صلعم سے عشق اور اخلاقِ حسنہ کو پیش کیا ہے۔ شاہ بھٹائی کی شاعری دوھوں کی شاعری ہے۔ لیکن اردو زبان کے قدیم وجدید شعراء کی شاعری غزل کی صنف میں ہیں۔ اگرچہ شاہ بھٹائی نے جس زبان میں شاعری کی ہے، وہ بلا شبہ ایک خاص علاقہ تک محدود ہے لیکن انہوں نے جس اُنس ومحبت، اُخوت، وحدانیت، رسالت مآب کی محبت کا پیغام دیا ہے، اس کی افادیت، وسعت اور عالمگیراہمیت مسلّم ہے زبان، رنگ اور لباس کے اختلاف کے باوجود اُن کے احساسات اور رجحانات کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے

شاہ عبد اللطیف بھٹائی "سندھی شعراء کے سرتاج ہیں آپ کا کلام سندھی پسند عوام میں اس حیثیت کا حامل ہے، جیسے مولانا جلال الدین رومی کا کلام فارسی دان طبقہ میں۔ اور میر تقی میرؔ اور خواجہ میر درد کا کلام اردو زبان والوں کے لیئے۔ شاہ بھٹائی کی شاعری اپنی قدیم روایتی خصوصیات کی بنا پر سندھی ادب میں ایک امتیازی شان وشوکت رکھتی ہیں الفاظ کا مناسب استعمال زبان میں موسیقیت پیدا کرتی ہیں۔ خوش نصیبی سے اس کے ساتھ ہی سادگی اور پر وقاری بھی شاعری کی طبع نازک کو میسر ہو تو شاعری کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اور ایسا سوز وگداز پیدا ہوتا ہے جو ہر پڑھنے اور سننے والے کو بے اختیار ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ ان کی اس ہمہ گیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری جو سراسر "آمد" سے دلی واردات کی صحیح عکاسی کرتی ہے، اور حقیقت ومجاز کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی، اُن کا بے پناہ اور اثر آفریں سوز وگداز، ایک محبت سے سرشار اور زخم خوردہ دل کی غمگساری کرتا ہے، عشق کے بعض نازک معاملات کو اس فنکارانہ انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ایک بے اختیار پکار اُٹھتا ہے:۔

"مینے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

شاہ لطیف کی شاعری میں زبان کی فصاحت وسادگی، خیالات کی نزاکت، وسعت وجدت، تشبیہہ واستعارہ، کنایہ، یہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ہر ایک دنیا کے شاعر کو نصیب نہیں۔ شاہ صاحبؒ رنگ سخن فلسفیانہ نکات، حکیمانہ اقوال، تصوف اور عاشقانہ آہنگ اپنے مخصوص انداز میں نہایت سادگی اور حسن طرز سے ادا کیئے ہیں، خیالات کی پاکیزگی، نزاکت ولطافت، شاہ صاحب کے کلام کا خاص جز ہے، آپ کا زیادہ تر کلام درد سے لبریز ہے۔ شاہ بھٹائی کو غریب عوام کے درد کا احساس تھا اور طبیعت میں درد سمایا ہوا تھا۔ آپ کے والد بزرگوار سید حبیب شاہ بڑے دردمند انسان تھے، اور درویش سادات خاندان سے تعلق تھا، یہی وجہ ہے کہ بھٹائی بچپن سے ہی تارک دنیا تھے۔ شاہ لطیف کی سوانح اور پاکیزہ کلام نے مل کر اُن کا سندھی ادب میں بڑا مقام ہوا۔ بلا شبہ ایسی باکمال ہستیاں مدتوں بعد عالم وجود میں آتی ہیں، اور اپنا نقش حیات اس قدر گہرا اور دائمی چھوڑ جاتی ہیں کہ زمانہ اگر چاہے بھی تو انہیں مٹا نہیں سکتا۔ شاہ لطیف کا کلام عالمگیر حیثیت حاصل کر چکا ہے اور اُن کا کلام قیامت تک ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔

شاہ لطیف تصوف کے شاعر تھے، اور تصوف کے باریک مسائل کو کھول کر پیش کیا ہے، خاص طور پر وحدت الوجود اور ہمہ اُوست کو موازنہ کرتے وقت دونوں پہلوؤں کا ذکر کرتا ہے، ایسے حالت میں وہ ایجاز واختصار کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے، مگر ایسا ایجاز واختصار جو تفصیل وتشریح کے برابر ہے، بلکہ دلچسپی کے لحاظ سے بہتر ثابت ہوگا۔ اس سلسلے میں اُردو ادب کے مشہور نقاد وقار عظیم کی یہ رائے ہے:۔ جسکو بڑی اہمیت حاصل ہے لکھتے ہیں۔

---

[1] "سندھ کا عوامی شاعر" مقالہ نگار وقار عظیم، رسالہ "روح ادب" شمارہ ۱۵-۱۶ مئی - جون سنہ ۱۹۵۳ صفحہ ۱۰۸

"شاہ عبداللطیف کے کلام کی بنیاد اُن کا صوفیانہ انداز نظر ہے۔ لیکن اس صوفیانہ فکر کے لئے اُنہوں نے سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے شروع کی دیہاتی زندگی کے مادی اور جذباتی پہلوؤں کے پیکر سے مدد لی ہے اور اس عہد کی زندگی میں ظاہری اور باطنی حقیقی اور روایتی جتنے رخ تھے، سب پر نظر رکھکر اپنے گیتوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ اس لئے گو اُن کے خیالات سرتا سر صوفیانہ ہیں۔ لیکن ان صوفیانہ خیالات میں تصوف کی خشکی کی بجائے ایک صحت مند تازگی، شگفتگی اور سچے عشق کی ولولہ انگیزی موجود ہے۔ ان کے تصوف میں فلسفہ نہیں رومان ہے۔"

شاہ عبداللطیفؒ بھی ایک صوفی اور عالم تھے۔ شعر کے دروازے عالموں پر کبھی بند نہیں ہوئے۔ اور شاعروں نے علم کو کبھی ایک منحایۂ حقیقت قرار نہیں دیا۔ ہماری گذشتہ تہذیب میں شعر کو ہمہ گیر حیثیت حاصل ہے۔ پرانے لوگ شعر کو شائستگی کا جز سمجھتے تھے، اس لئے بقدر ضرورت شاعری سے ہر موضوع میں کام لیتے تھے۔ صحیح یہ ہے کہ شعراء اپنے مقصود میں جن وسائل اور ذرائع سے کامیاب ہوتے ہیں، ان میں علم بھی ایک اہم وسیلہ ہے۔ شاعر کو فطری طور پر ایک ایسی وجدانِ فطرت سے آراستہ ہونا چاہئے جو عام انسان میں نہیں ہوتی۔ شاعر کا احساس نازک اور طبیعت لطیف ہوتی ہے۔ دل دردمند اور متخیلہ نقاش، وہ ایسا شخص ہوتا ہے جو دنیا پر کاروباری قسم کی نگاہ نہیں ڈالتا بعض ایسی ایسی معمولی باتیں اسے متاثر کرلیتی ہیں جو دوسروں کو محسوس تک نہیں ہوتیں وہ دوسروں کے درد کو اپنا تا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے۔

خنجر چلے کس پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ

سارے جہان کا درد ہمارے ہی دل میں ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کے متعلق مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؔ نے فرمایا ہے۔

مثنوی مولوی معنوی

ہست قرآن در زبان پہلوی۔

مرزا اسد اللہ غالبؔ نے اپنے کلام کے لیئے خود فرمایا ہے۔

گر شعر و سخن بدھر آئین بودے

دیوان مرا شہرت پرویں بودے

غالبؔ "اگر این فنِ سخن دین بودے

آن دین را ایزدی کتاب این بودے

اگر شعر و سخن کی دنیا میں قانون ہوتا، تو میرا کلام دیوان کمال شہرت کا حامل ہوتا۔

غالبؔ کی فنِ سخن دین ہوتا، تو میرا دیوان خدائی کتاب ہوتا۔

جدید دور میں علامہ اقبال مرحوم کو اُردو شاعری کا نیچرل شاعر کہتے ہیں ان کا کلام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کے متقدمین خواہ متاخرین میں کوئی بھی اُردو یا فارسی شاعری میں ہمسری کر نہیں سکتا۔ اپنے کلام کے لئے فرمایا ہے

محمد بھی تیرا جبریل بھی، قرآن بھی تیرا

مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا۔

ایک اور جگہ اپنے کلام کے لئے کہتے ہیں:۔

خوش آگئی ہے جہان کو قلندری میری
وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؔ دنیا کے شاعروں کا استاد مانا گیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم، مولانا رومیؔ کو اپنا روحانی مرشد مانتے ہیں اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ تخیل سخن جو مولانا رومیؔ نے آدھورا چھوڑا۔ اس کا بہت کچھ حصہ علامہ اقبال نے مکمل کیا۔ لیکن حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے علامہ اقبال سے دو صدیاں پہلے جو عقیدت تھی اس بنا پر دیکھا جاتا ہے کہ ان کے نامکمل تخیل کو شاہ بھٹائیؒ نے مکمل کردیا تھا۔ شاہ بھٹائیؒ اپنے کلام کے لئے فرمایا ہے:۔

جي تون بيت پائين، سي آيتون آهين.
نيو من لائين پريان سندي پار ڏي.

جنکو تم ابیات سمجھتے ہو، وہ آیتیں ہیں
جو دل کو محبوب حقیقی کی طرف لے جاتے ہیں

شیخ امام بخش ناسخ اپنے کلام کے لئے کہتا ہے:۔

ہر بیت میں اک شاہد معنیٰ کی ہے تصویر
ناسخ ہے مرقع نہیں دیوان ہمارا۔

صوفیانہ شاعری میں چاند کا حسن ایک مرکزی خیال رہا ہے۔ کیوں کہ کائنات میں چاند جیسی حسین چیز قدرت نے پیدا نہیں کی لیکن صوفی شعراء نے اپنے محبوب کے حسن کی تجلی کے آگے چاند کے حسن کو ہیچ سمجھتا ہے۔ چنانچہ اکثر شعراء نے چاند کو مخاطب ہوکر کہا ہے۔ مولانا جامیؒ فرماتے ہیں

عارض ہست این یا لالہ احمر ہست این
یا شعاع شمس یا آئینہ دل ہست این۔

حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں

حسن تو با ماہ سنجیدم بہ میزان قیاس
پلۂ او بر سما رفت و تو ماندی بر زمیں۔

اُردو زبان کے قدیم شاعر سراج الدین خان آرزوؔ نے چاند کو مخاطب ہوکر کہا ہے۔

آتا ہے ہر سحر اُٹھ تیری برابری کو،
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو۔

سید انشاءاللہ انشاؔ نے فرمایا ہے

بال زلف یار کے رخ پر بل کھانے لگے
چشمۂ خورشید میں بھی سانپ لہرانے لگے۔

میر انیس کہتے ہیں:۔

240

رخسار کو قمر جو کہوں اُس میں داغ ہے ۔

خورشید ہے تو کیا ہے دن کا چراغ ہے ۔

علامہ اقبال مرحوم نے چاند کے حسن سے متاثر ہو کر کہے :۔

اے چاند حسن تیرا فطرت کی آبرو ہے

طوف حریم خاکی، تیری قدیم خو ہے

یہ داغ سا جو تیرے سینے میں نمایاں

عاشق ہے تو کسی کا یہ داغ آرزو ہے

میں مضطرب زمیں پر، بیتاب تو فلک پر

تجھکو بھی جستجو ہے مجکو بھی جستجو ہے ۔

علامہ اقبال نے چاند کے حسن کی جو تصویر کھینچی ہے، اس میں ان کی نکھار صاف نظر آتی ہے ۔ لیکن اس میں اتنی جاذبیت نظر نہیں آتی ہے

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ[2] نے چاند کے حسن کی نکھار کرنے میں استطاعت رکھتے ہیں، لیکن اس کے حسن کو محبوب کے حسن کے مد مقابل نہیں لا سکتے فرمایا

چنڊ تنهنجي ذات پاڙيان تان نہ پرين سين

تو اچو منجھ رات، سڄڻ نت سوجھرو ۔

اے چاند! تیرے حسن کو میں اپنے محبوب کے حسن کے برابر نہیں سمجھتا

تو صرف رات کے وقت چمکتا ہے، لیکن میرا محبوب تو ہمیشہ روشن ہے ۔

ایک جگہ چاند کے حسن کو محبوب کے حسن کے آگے اسطرح کمتر سمجھتا ہے ۔ فرماتے ہیں:

پيشاني جي پرينءَ جي ڀلائي جا ڀيس

اڳ اُڀندين جي ڏسي پا ٻوسي پيس

قمر پاڙي ڪير، شمس سپرين سين ۔

میرے محبوب کی پیشانی میں نیکیوں کے خزانہ ہیں ۔

انکی یہ مہربانی ہے کہ مجھ جیسے منتظر کے گھر میں آنے سے گریز نہیں کرتے ۔

چاند اور سورج کو کیا مجال ہے کہ وہ میرے محبوب کی ہمسری کریں ۔

ایک اور جگہ سر کنبھات میں فرماتے ہیں :

چوڏهين چنڊ تون اُڀرين سهسين ڪرين سينگار

پلڪ پرين جي نہ پرين جي جيلا ڪرين هزار

جھڙو تون سڀ جمار، تھڙو دم دوست جو ۔

اے چودھویں کے چاند تو سو مرتبہ سنگھار کر کے آسمان پر کھڑا ہو جا ۔ لیکن میں تیرے حسن کی نکھار کو محبوب کی ایک ساعت کے برابر بھی نہ سمجھونگا ۔

تیری پوری زندگی، میرے محبوب کے ایک دم کے برابر بھی نہیں ہو سکتی ۔

ایک جگہ چاند کو مخاطب ہو کر کہتا ہے، اے چاند میرا محبوب راستے میں. جب تک وہ میرے پاس نہ پہنچ جائے تو نہ اُترنا

چنڊ تنهنجي ذات، سڀ مڙئيان سون سين

آئين پرين پنڌ ۾. گڻ سجائي رات

اڄ جنهن ساعت پوءِ لهي وڃ لطيف چئي.

اے چاند تیرے وجود کو سونے سے جڑا دوں تو پوری رات روشن رہنا، میرا محبوب راستے میں ہے

جس وقت وہ میرے پاس آجائے پھر تو اُتر جانا

اُردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی کو مشرق کا شیکسپئر سمجھا جاتا ہے. ان جیسی منظر نگاری کسی اور اُردو شاعر نے نہیں کی. اُنہوں نے چاندنی رات کے منظر کو بڑے جاذب انداز سے پیش کیا:

صحنِ چمن میں واہ واہ زور بچھی تھی چاندنی.

چاند بلوریں لیتا تھا، اور کھلی تھی چاندنی.

آیا تھا یار گلبدن پہن کے بادلہ زری

چمکی تھی تار تار میں مہ کی چمک نوری ذری.

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اسی طرح چاندنی رات کا منظر کتنا سنجیدہ اور شائستگی سے پیش کیا ہے. جس میں جدت اور خیال آفرینی سے کام لیا ہے. سندھ میں شتر سواری ایک روایتی امر ہے. شاہ بھٹائیؒ نے اس شعر میں عجیب روح پرور کیفیت بیان فرمائی ہے. اونٹھ پر سوار ہو کر بیابان کا سفر طے کر کے محبوب کی مجلس میں پہنچنا ہے. فرماتے ہیں:

رات سهائي پون سنئين، پرٿن وڏو پنڌ

هلندي حبيب ڏي، ڪرها موڙ نه ڪنڌ.

ٻڌڻ سوئي ٻنڌ، جو پهچائي پرين کي.

سہانی رات ہے، راستہ بھی سیدھا ہے، لیکن بیابان کا دشوار سفر

اے اُونٹھ میرے محبوب کی طرف چل اور اپنا رخ نہ موڑ

تو اپنے دل میں وہی خیال رکھ جو جلدی حبیب کی طرف پہنچا دے.

نظیر اکبر آبادی نے اپنی ایک نظم میں آگرہ کے نزدیک جمنا ندی کے کنارے کا منظر دیا ہے، جس میں لوگوں کا ندی میں تیرنے کا دلکش نظارہ دیا ہے

جب پیرنے کی رُت میں دلدار پیرتے ہیں

عاشق بھی ساتھ اُن کے غمخوار پیرتے ہیں.

بھولے سیانے، نادان ہوشیار پیرتے ہیں

پیر و جوان لڑکے، عیار پیرتے ہیں.

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے سر سوھنی میں دریا، مناظر اور سوھنی کے تیرنے کا دلکش انداز میں بیان فرمایا ہے

وڻن ويٺا ڪانگ ، وڃين ٿي ويلا ڪري .

گهڙي گهڙ و هٿ ڪري. سڻي سانجهيءَ بانگ

سپٽي ديو ندي سانگ ، جتي ساهڙ سيرين .

شام کا وقت گذر رہا ہے ، درختوں پر کلنگ جا بیٹھے ہیں .

سوھنی مغرب کی اذان سن کر گھڑا ہاتھ میں لے کر دریا میں کودتی ہے .

وہ ان سب جگہوں کو دیکھتی رہتی ہے جہاں اُسکا محبوب ساھڑ موجود رہتا ہے .

بھگت تلسی داس ہندی دوہوں کے خالق سمجھے جاتے ہیں ۔ اُنہوں نے اپنی تصنیف رامائن میں رام اور سیتا کی محبت کا منظر پیش کیا ہے .

لوچن مگہ رامہ ارآنی   دینھی پلک کپاٹ سیانی

رام کو سیتا نے اپنی آنکھوں میں دیکھکر ، اپنی پلکیں بند کر دیں .

بھگت کبیر نے اس کیفیت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے

آو پیارے نین ماں ، موند پلک توکی لیوں

نا میں دیکھوں اُور کو نا توہی دیکن دیوں

میرے محبوب تو میرے آنکھوں میں آکر بیٹھو ، اور میں آنکھیں بند کرلوں

تاکہ نہ میں کسی اور کو دیکھوں نہ اور کسی کو تجھے دیکھنے دوں

ایک اور ہندی شاعر نے اس خیال کو اپنی طرز سے پیش کیا ہے [1]

آؤ پریتم نین میں پلک ڈھانپ تو لوں

نا میں دیکھوں اور کو ، نا توہی دیکھن دوں :

ہندی زبان کے مشہور شاعر ملک جائسی نے بھی اس خیال کو پیش کیا ہے .

نینوں آئتر آئیو نین جھانپ توھی لیوں

نامیں دیکھوں اور کی ، نا توھی دیکن دوں

اس خیال کو اکثر فارسی شاعری میں بھی دیکھا گیا ہے ۔ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے :۔

جانا بیا درچشم من تا چشم را برہم زنم .

نی من ببینم سوئی کس نہ کس ترا دیدن دھم .

ایک اور شاعر نے کہا ہے .

جانا بیا درچشم من تا چشم را برہم زنم

ھرگز نہ بینم کس دگر نے کس ترا دیدن دہم .

---

[1] منتخب ہندی کلام مقالہ نگار ڈاکٹر جعفر حسین . رسالہ نگار ماہ جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۵۸ .

فارسی زبان کے ایک مشہور شاعر آذری نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

بیا بنشین من بہ چشم غم بیو ساغر

من و تو بے نیاز جلوہ را غیراں نواں باید

اس خیال کو جس خوبی سے شاہ عبداللطیف بھٹائی رح نے اپنے عظیم تخیل سے پیش کیا ہے وہ بہت جاذب اور مختصر حروف میں جامع ہے۔

اکین ۾ ڦي ويھہ تہ آءُ واري ڍکيان

توکي ڏسي نہ ڪيھہ، آءُ نہ ڏسان ڪو ٻيو۔

میرے محبوب تو میری آنکھوں میں آکر بیٹھو۔ تو میں اپنی پلکیں بند کرلوں

تاکہ تجھے جہاں نہ دیکھے اور میں بھی کسی اور کو نہ دیکھ سکوں۔

اردو کے شاعر کاظمی نے شاہ بھٹائی رح کے اس شعر کا اردو زبان میں اس طرح ترجمہ کیا ہے۔

آنکھوں میں آ بیٹھو ساجن، آنکھیں موندوں میں

نہ تم کو دیکھے پھر کوئی نہ کسی کو دیکھوں میں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے دوہوں اور ہندی و پنجابی، سرائیکی دوہوں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ ان دوہوں میں جو خیال پیش کیے گئے ہیں ان میں مماثلت موجود ہے۔ حضرت خواجہ غلام فرید نے ملتانی (سرائیکی) شاعری کو عروج پر پہنچایا۔ صوفیانہ اور مذہبی شاعری کے لئے وہ مشہور ہیں شاہ بھٹائی رح کے متاثرین میں سے تھے، اور شاہ لطیف رح کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ کہا ہے:

کاگا نین نکاس دوں، اور پی کے رکھ لے جائے۔

پہلے درس دکھائے کے، تو پاچھے لیجیے کھائے

کوے میں اپنی آنکھیں تجھے نکال کے دوں، تو اسے میرے محبوب کی طرف لے جا

پہلے انہیں محبوب کا دیدار کرانا، پھر تو انہیں کھا لینا

ھندی زبان کی مشہور شاعرہ میراں بائی نے اس زمین میں کہا ہے

کاڈھ کلیجا میں دھروں کوڈا تو لے جا،

ساجن میڈا دیس بست ہے، وہ دیکت تو کھا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی رح نے بھی اسی خیال کو بڑے جاذب انداز سے پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

ڪيي ڪانگا تو ڏيان، هنيون ساڻ هٿن

وڃي کاءِ ولايت ۾ اڳيان عجيبن

پرين مان پڇن تہ هيءَ قرباني ڪنهن ڏني.

کوے میں اپنے ہاتھوں سے تجھے اپنا دل نکال کے دوں تو اسے پردیس میں لے جا کر میرے محبوب کے سامنے کھاؤ

تاکہ وہ تجھ سے پوچھے کہ یہ قربانی کس نے دی

دیوان فرید کلام خواجہ غلام فریدؒ مرتب محمد عزیز الرحمن صاحب بہاولپوری۔

۲۴۴

ہزاروں شعراء آج تک پیدا ہوئے ہیں، اکثر شعراء نے محبوب کا وصال اور ہجر کی کیفیت کو بڑے دلسوز انداز میں بیان کیا ہے وصل کے لئے ہجر میں تڑپتے رہیں
اُردو کے مایہ ناز شاعر سید ظہور الدین شاہ حاتم نے اس خیال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

ہجر کی زندگی سے مرگ بھلی
کہ جہاں سب کہتے ہیں وصال ہوا

شاعر نعیم نے کہا ہے:۔

کہتے ہیں مرگ کو وصال نعیم
نہ ہوا وصل تو ہم نے مر دیکھا۔

اردو کے ایک اور شاعر نے بھی اپنی اس جذبات کو اس طرح پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

مرنے کو بھی لوگ کہتے ہیں وصال
یہ اگرچہ سچ ہے تو مرجاتے ہیں ہم۔

محمد حفیظ جونپوری، جو حضرت امیر مینائی کے شاگرد تھے، اُنکا کلام سوز و گداز سے لبریز نظر آتا ہے۔ اس خیال کی زمین میں کہتے ہیں

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیمانہ شکنی ہوتی ہے۔

شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی نے بھی اس طرح اپنے خیالات پیش کیئے ہیں:۔

موت کو اصلِ دل سمجھتے ہیں
زندگانی عشق کا آغاز

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد نے کہا ہے

کون مرتا ہے کوئی مرتا نہیں
موت جو ہے، وہ فقط ہے ایک حجاب۔

منشی برج نرائن چکبست نے کہا ہے:۔

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے اُنہی اجزا کا پریشاں ہونا۔

شیخ عبداللطیف تپش نے کہا ہے:۔

آرزو میں موت کی مرتا ہوں میں زندگی میری فنا آغوش ہے۔

اُردو کے شعراء نے اس خیال کو بیان کرنیکی کوشش کیہیں لیکن جذبات کی پاکیزگی جو شاہ لطیفؒ نے پش کی ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

جي قيام مڙن تہ ڪر اوڏا سپرين.
ٿئان پري سڀڪي، واڌايون وصال جون.

اگر قیامت کے دن بھی دوست کا وصال ہوا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی لیکن وصل موت تو نہیں ہے وہ تو قیامت سے بھی دور ہے۔

اس استحکام زندگی کے لئے حضرت خواجہ حافظ شیرازیؒ نے فرمایا ہے:۔

ہرگز نہ میرد آن کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

نظیری نے کہا ہے:۔

روزم تو برفروز و شبنم را تو نور دہ
این کار بیت کار مہ و آفتاب نیست

صائب نے کہا ہے:۔

ماہ ہر چند خوش آیندہ نہ باشد در روز
حسن مہتابی دلدار تماشائی کرد۔

خواجہ میر درد نے اپنی جذبات کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

موت کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مرجاتے ہیں۔

مرزا اسد اللہ غالب فرماتے ہیں

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی۔

شاہ لطیفؒ اس جذبات کی ترجمانی یوں کرتے ہیں:۔

مرڻا اڳي جي مئا، مري ٿين نہ مات
هوندا سي حيات، جيئا اڳي جي جيئا

موت سے پہلے جو مرجاتے ہیں وہ مرتے نہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ رہینگے جو کہ حیات سے پہلے زندہ تھے۔

انسان کی فانی زندگی پر کوئی اعتبار نہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں زندگی ایک پانی کے بلبلہ کے مثل ہے۔ "ابر کا سایہ" جو ہوا کے ایک جھونکے سے ختم ہو جاتا ہے۔ اکثر شعراء نے اس خیال کو موضوع کیا ہے۔ اور انسان کو خبردار کرتے ہیں کہ اس عارضی زندگی پر اعتبار نہ کیا۔ بھگت کبیر ہندی زبان کے قدیم شاعر تھے، کہا ہے:۔

پانی کیرا بلبلا اس مانس کی ذات۔
دیکھت ہی چھپ جائیگی جیوں تارا پربھات۔

انسان کی زندگی پانی کے بلبلے کی طرح ہے
جو دیکھتے دیکھتے صبح کے ستارے کی طرح گم ہو جاتا ہے۔

خواجہ میر درد اردو زبان میں صوفی شاعر تھے۔ فرماتے ہیں:۔

مانند حباب آنکھ اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا۔

ایک شاعر نے انسانی زندگی کی بے ثباتی پر تشبیہ پیش کی ہے

آدمی بلبلہ ہے پانی کا　　کیا بھروسہ ہے زندگانی کا.

مرزا غالب نے خوب کہا ہے:-

محیط دھر سی بالیدن از ھستی گذشتن ہے

کہ یاں ہر ایک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے.

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ نے زندگی کو حباب سے تشبیہ دیکر پیش کیا ہے. فرماتے ہیں:-

جر ٻڦ ٿو تو جئين، لهرن لڳندي آڌ ٿيي.

تون پڻ آهين تئين، دنيا ۾ ڪو ڏينهڙو.

پانی پر جسطرح بلبلہ ہوا کے جھونکے لگنے سے ختم ہوجاتا ہے. اے انسان تو بھی اس حباب کی طرح دنیا میں چند روز کے لیئے ہے

زندگی اور موت کی حقیقت کے فلسفہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے، دنیا کے شعراء نے بہت کچھ لکھا ہے، لیکن اس فلسفہ کو سمجھانے میں قاصر رہے ہیں. میر انیس یہ کہکر خاموش ہوجاتے

خاموش کہ یہاں سخن کو بھی راہ نہیں.

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں.

تو ازان روزی کہ در ھست آمد.

اتشی یا خاک یا بادی بدی

از مبدل ھستی اول نماند ھستی بجائے او نشاند

این بقاها از فناها یافتی، از فنا پس رو چرا برتافتی.

در فناها این بقاها دیدہ بر بقائے جسم چون چسیدہ

حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:-

این جان عاریت کہ بحافظ سپردہ دوست

روزی بینم اورا، تسلیم وی کنیم

یہ مستعار جان جو حافظ کو دوست نے سپرد کی تھی، ایک دن اسکو دیکھتے دیکھتے دوست کو واپس کردونگا.

عرفی فرماتے ہیں

شوری شدہ از خواب عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم.

مرزا غالب نے کہا ہے:-

فنا کو سونپ مشتاق ہے اپنی حقیقت کا

فروغ طالع خاشاک ہے گلخن پر.

شاہ بھٹائیؒ کا تخیل ملاحظہ ہو فرماتے ہیں :-

اُونچو اُتاھون گھڻو ، جيئڻ جي جبل

مرڻ موں سين ھل ، پٺيءَ تو پنڌ ڪريان .

"پہاڑ کی اونچائی زندہ رہنے کے لائق ہے . اے موت تو میرے ساتھ چل میں تیری پیٹھ پر سوار ہو کر چلوں ".

مرزا غالب فرماتے ہیں :-

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لو دو چار

یہ شیشہ و قدح و ساغر و سبو کیا ہے .

شاہ بھٹائیؒ نے اس خیال کو مرزا غالب سے پہلے پیش کر چکے ہیں . فرماتے ہیں :-

گھڻن ۾ گھڻڪي ، وٺيون پيين وه گاڏيون .

بر خيز بده ساقي پيار ڪي پرين

پڪين نه پرچن مٽ ڍڪيائون منجهان .

حکیم امت اور شاعر فطرت علامہ اقبال اس قبیل میں فرماتے ہیں :-

وہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں

اسے کیا خبر کہ کیا ہے وہ رسم شاہبازی

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں :-

ماڻڪ چوڻو جن جو ھنج حضور سي ،

چلر ۾ چھب مٽي ميجي ڪين نه اي

لوڪ نه لکيائي جي ، پٿن پکين گڏيا .

ھنس پرندے کی غذا سچے موتی ہوتی ہیں وہ کیچڑ میں چونچ ڈال کر مچھلی نہیں کھاتا .

دوسروں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ کس جگہ پر وہ جمع ہوتے ہیں .

علامہ اقبال نے عبادت اور شان کریمی ، اپنی حالت کو عرق انفعال کہا ہے جس کے لئے کہا ہے .

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے

قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ اپنی پوری زندگی کو (کچ) کچا شیشہ سمجھا . آپ نے اپنی عبادت کرنے میں بڑی انکساری سے کام لیا ہے . پوری زندگی کی عبادت کو اپنے رب کے سامنے پیش کرتے ہوئے بہت شرم محسوس کرتے ہیں کہ میری عبادت اللہ پاک قبول فرماتے ہیں یا نہیں . لیکن پھر بھی نا امید نہیں ہوتے کیونکہ اللہ تعالی قبول فرماتے تو کچ شیشہ بھی قبول فرمائے ورنہ موتی بھی واپس کر دیں

فرماتے ہیں :-

اگھیو ٹائو ٹیج ماٹکن موت ٿي.

پلئہ پایو سچ ، اپینہ ی بچ مران .

ربّ پاک کے یہاں قبول ہو تو کھاشیشہ بھی قبول ہوتا ہے ، ورنہ سچے موتی بھی واپس ہوتے ہیں .

میں اپنی سچی عبادت کو اللہ تعالیٰ کے آگے پیش کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں .

مرزا اسد اللہ غالب دوست کی رضامندی اس بات میں دیکھتا ہے کہ وہ اُنہیں ہر وقت یاد رکھے جیسے پروانہ شمع کا شیدائی ہے . اس لیئے شمع بھی اس کی حالت پر رات سے لیکر سحر تک جلتی رہتی ہے . مرزا غالب نے فرمایا ہے :-

پروانہ کا نہ ہو غم تو پھر اس لئے اسدؔ ،

ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

لیکن اس زمین میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا تخیل کتنا بلند ہے . وہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو اپنے سامنے رکھتے "فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ "

تو جنين جي تات، تن پڻ آهي تنهنجي .

فَاذْكُرُوْنِي اَذْكُرْكُمْ، اي پروڙج بات

"جن کی تجھے یاد ہے ، اُن کو تیری بھی یاد ہے . تو مجھے یاد کر ، تو میں تجھے یاد کروں یہ بات سمجھلے"

وفاداری ایمان کا جزہے . اُنہیں ہمیشہ دوست سے ملنے کی تمنا رہتی ہے جس کے لئے وہ کوشاں رہا ہے . مرزا رفیع سوداؔ نے کتنی عمدہ مثال دی ہے :-

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن

بازی اگرچہ پا نہ سکا ، سر تو کھو سکا

کس مونہہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشقباز

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا .

خواجہ میر دردؒ اس خیال کو یوں پیش کیا ہے :-

مثلِ حباب نہ نظر سے گیا گیا ،

میں وہ غریق ہوں کہ نہ ڈوبا اچھل سکے .

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں :-

اول آخر آهه هلڻ منهنجو موٽ ڏي ،

پورهيو جن پورهيت جو دالي ڪيم وڃاءِ

سو مون ٿورو لاهه تہ جيئَري ملان جت کي .

اول اور آخر مجھے اپنے دوست کی طرف جانا ہے

اس محنتی کی محنت کو میرے مالک ختم نہ کردیں

میرے اوپر مہر کی نظر کرتا کہ میں اپنے محبوب سے جا کر ملوں

جب دوست روٹھ جائے تو اسکے منانے کے لئے بڑی منت و سماجت کرنی پڑتی ہے خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں :-

امشب بیا تا در چمن سازیم پر پیمانہ را تو شمع و گل را داغ کن من بلبل و پروانہ را

پروانہ، شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند اے دوست بیا رحم بہ تنہائی ماکن۔

شاہ بھٹائی رح نے سر مومل رانہ میں محبوب کی جدائی کے جذبات کو بڑی رقت آموز انداز میں پیش کیا ہے۔

رُس مَ رَس گھوريو، چڏ راڻا ريڏائي،

منهنجي ميٽ ميندرا تون عاقل اگلائي،

لپيٽج لطيف چئي، منهنجي ڪامل ڪچائي،

ڪر معاف مڏائي ته سودا سکيائي تيان.

اے! رانہ غصہ کو چھوڑدے مجھ سے روٹھ نہ جا بخش دے میری خطاؤں کو تو سمجھدار ہے

میری خطاؤں سے درگذر ہوجا، میری تقصیر معاف کر، تو جب معاف کریگا، تو مجھے سکون ہوجائے گا۔

پروانہ، شمع کی روشنی پر فدا ہوتا ہے، جب تک خود کو شمع کے شعلے میں جلا کر ختم نہیں کرتا، تب تک اسے سکون نہیں ہوتا۔ صوفی شعراء پروانہ کو سچے عاشق سے تشبیہ دیتے ہیں، جو محبوب حقیقی کے نور میں خود کو نابود کرتے ہیں۔ پروانہ شمع کا عاشق اپنی تعمیر میں تخریب کی صورت پنہان رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کا سبب اس کی موت کا باعث ہے۔ ظاہر بین آنکھ اس راز کو نہیں سمجھ سکتی کہ پروانہ کی فنا میں، اس کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس لئے افسوس ہوتا ہے کہ اگر پروانہ شمع کے حسن کا شیدا نہ ہوتا، اگر شمع تک اس کی رسائی نہ ہوتی تو بیچارہ ناحق اپنی جان کیوں دیتا۔ اس کی موت کا الزام ہے پروانہ کی طاقت پرواز پر، یہی طاقت پرواز ہے جو اسے معشوق کا قرب نصیب کرتی ہے۔ اور اس کی ہلاکت کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ خواجہ میر درد کی ایک غزل ہے۔

کاش تا شمع نہ ہوتا گزر پروانہ تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ۔

شمع کے صدقے تو ہوتے اسے دیکھا تا ہی پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثر پروانہ

کیوں اسے آتش سوزان میں لئے جاتی ہے سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظر پروانہ۔

ایک ہی جست میں لی منزل مقصود اُسنے راہرو رشک کی جا ہے سفر پروانہ۔

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی پوچھوں اے درد میں کس سے خبر پروانہ۔

پروانہ اپنی منزل سے باخبر ہے اور منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن ایک ہی جست میں اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے، شب اسی مشاھدہ میں گذری، صبح کو نہ شمع تھی نہ پروانہ۔ شمع تو جل بجھی اور پروانہ کی خبر کسے معلوم۔ میر تقی میرؔ نے خوب کہا ہے۔

جوں شمع صبح گاہی اللہ بار بجھ گئے ہم

اس شعلہ خو نے ہم کو مارا جلا جلا کر

ایک اور جگہ فرمایا ہے

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب

شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا۔

مرزا محمد رفیع سودا نے فرمایا ہے:-

پروانہ اور شمع کی الفت نہ مجھ سے پوچھ

اپنی نہ کہہ سکا تو کہوں کیا پرائی بات

ظہور الدین حاتم فرماتے ہیں:-

جلتا لگن میں شمع صفت سخت کام ہے۔

پروانہ جوں شتاب عبث جی دیا تو کیا۔

حفیظ جونپوری کہتے ہیں:-

تیرے آگے یہ پتنگے گرے گرد شمع جل کر

دل بیوفا کا کبھی رکھ کے جام لینا۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس خیال کو اپنے صوفیانہ نظر سے بڑے موثر انداز سے سر یمن کلیان میں دیا ہے:- فرماتے ہیں:-

پُڇُ پتنگن کي، سنديون ڪامڻ خبرون

آڻيو وجهن آڳ ۾، جيءُ پنهنجو جي.

جيئري جنين کي. سگهه نينهن نيه جا.

"پتنگے سے پوچھو جلنے کی خبریں، وہ آگ میں آکر اپنی جان ڈال دیتے ہیں۔ انکو تو حیات میں محبت کے نیہ لگ۔"

پتنگ چائين پاڻ کي، ته اچي آڳ اُجهاءِ،

پچڻ گهڻا پچايا، تون پچڻ کي ب پچاءِ،

واقف ٿي وساءِ، آڳ نه ڏجي عام کي.

تو اگر اپنے آپ کو پروانہ کہلاتا ہے، تو آکر آگ کو بجھا دے۔ آگ نے تو سب کو جلایا ہے، تو آکر خود آگ کو بھی جلا دے

خاموش رہ کر عشق کے راز کو سمجھ۔ عام کو اس راز سے واقف نہ کر۔

پتنگ چائين پاڻ کي، ته جيري پوءِ چاڙهي

تان تان تاڃ نه ڏي، جان آڳ نه اُجهائي

ويهه وهائي، آڳ نه ڏجي عام کي.

تو اگر اپنے کو پروانہ کہلاتا ہے، تو آگ کی طرف جان بوجھ کر بڑھو۔ تب تک آگ کی طرف بڑھتے رہو جب تک آگ بجھ نہ جائے۔

اس پر اعتبار کرو اور اپنے راز کو عام سے واقف نہ کر۔

انسان اپنی حیثیت سے آگے نہ بڑھے۔ انکو اپنی ہمت سے دنیا کے تلخ واقعات اور مصائب سے مقابلہ کرنا چاہئیے، کیوں کہ تکلیف میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا

اُردو کے مشہور شاعر شیخ امام بخش ناسخ نے خوب کہا ہے:-

سیہ بخت میں کب کوئی کسی ساتھ دیتا ہے

کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انسان سے ہوتا ہے۔

ایک فارسی شاعر نے اس خیال دیا ہے :-

بوقت تنگ دستی آشنا، بیگانہ می گردد

صراحی چون شود خالی، جدا پیمانہ می گردد

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں :-

سوکي پاڻين سيڪو، اوکي تون ئي تون

مولا متان مون پڙ ولاءِ مر پاڇو جو .

چیز آسان ہر ایک اپنی طرف سے سمجھتا ہے اور مشکل خدا کی طرف ۔ اے میرے خدا میرے اوپر رحم کی نظر نہ اٹھادے

دوست کو اپنے گھر میں دیکھکر مرزا غالب کہتے ہیں :-

وہ آئے گھر ھمارے خدا کی قدرت

کبھی انکو کبھی ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں ۔

سر کاموڈ میں شاہ بھٹائی فرماتے ہیں :-

گندا جنين جي گوڏ پا پوتڙا پوشاڪ

انهن جي اوطاق راجا رهي آيو .

ماھیگیر جن کے تہبند میلے اور اُنکی پوشاک کمی کے لیئے پتے ہیں، اُنکے گھر میں راجا راضی ہوکر آئے ۔

ولی دکنی کے زمانہ میں شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی شاعری شباب پر تھی ۔ جو آج تک شباب پر ہے اور اسے زوال نہ ہوا ۔ لیکن ولی کی شاعری پر دلی کے شعراء نے اُردو شاعری کی بنیاد رکھی ۔ اُنکا کا کلام ہر لحاظ سے قابل قدر اور مقبول عام ہے ۔ خیالات کی پاکیزگی اور شستگی موجود ہے ۔ ایک جگہ پر محبوب کی محبت میں سب کچھ قربان کرنے کا ذکر کیا ہے ۔ سب کچھ لٹانے کے بعد دوست کے دروازہ چھوڑنا گوارا نہیں کرتے ۔ کہتے ہیں :

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے

زخمی ہے، شکار کیونکہ جاوے

دشمن دین کا، دین دشمن ہے

راھزن کا چراغ، رھزن ہے ۔

شاہ عبد اللطیف بھٹائی جس خوبی سے اس خیال کو پیش کرتا ہے وہ آپکے کلام کا اعجاز ہے :-

محبت جي ميدان ۾، ڪر پتراڙو پٽ

سر سوريءَ، ڌڙ ڪنڪرين، متان ڇڪين ڪٽ .

عشق نانگ پٽ، خبر ڪاڏن کي پوي .

محبت کے میدان میں دل کو صدائے بازگشت کر ۔ تیرا سر سولی پر ہو اور جسم پتھروں اور کنکریوں پر ۔ سر کٹنے پر اُف نہ کرنا

عشق خطرناک سانپ ہے، جسکو اُس نے ڈسا ہے اس سے جا کر خبر لے

محبوب حقیقی کی طرف سے جو بھی حاصل ہو اس پر شکر کرنا لازمی امر ہے ۔ سالک و بزرگ کا سر جھکنا ہے بھگت کبیر کہتے ہیں ۔

سمرن سرت لگائے کے مکھ سے کچھ نہ بول

باہر کے پٹ دیئے کے، اَنتر کے پٹ کھول

(خدا کی (سرت) سمجھ رکھ، مگر زبان سے کچھ نہ بول. باہر کے دروازہ بند کرکے اندر کے دروازہ کھول دے)

علامہ اقبالؔ اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں .

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر

کہ زہر بھی کرتا ہے کار تریاقی .

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور علامہ اقبال مرحوم کے پرواز فکر کا مقصد ایک ہے، مگر اُن کی انداز بیان مختلف ہیں. شاہ بھٹائی ؒ کے کلام میں عجز و نیاز صبر و تحمل ہے جو کہ اُنکی شاعری کا بڑا جز ہے. شاہ بھٹائی فرماتے ہیں .

پريان سندي پار جي مٺئي مٺائي .

ڪانهين ڪڙائي چکين جي چيت ڪري .

(محبوب کی طرف سے جو بھی حاصل ہو وہ مٹھائی ہے. وہ کڑوی نہیں ہے جس نے چکھ لی اس نے لذت حاصل کی)

دوسری جگہ صبر کرنے کا انتہا سبق دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

نهائين کان نينهن، سک منهنجا سپرين

سڙي سارو ڏينهن ٻاهر ٻاڦ نه نڪري .

(محبت سیکھنی ہے تو کمہار کی آوے سے سیکھ وہ سارا دن جلتا رہتا ہے. لیکن دھواں باہر نہیں ہوتا)

سالک کے یہاں خدا تعالیٰ کا نام ہمیشہ ورد زبان ہوتا ہے. سوائے خدا تعالیٰ کی عبادت کے اور کوئی بات اُنہیں نہیں سوجھتی. بھگت کبیر کہتے ہیں :-

نام بھجو، من کرو بھی بات ہے تنت

کاہی کو پڑھ پچ، مرد کوٹن گیان گرنتھ .

(خدا تعالیٰ کا نام یاد رکھو اور دل کو قابو میں رکھ یہ ہی بہوتے کتاب پڑھنے سے کیا حاصل ہوگا)

شاہ صاحب کہتے ہیں :-

اکر پڙهہ الف جو ورق سڀ وسار

اندر سو اجار، پنا پڙهندين ڪيترا .

(الف کا حرف پڑھ اور دوسرے اوراق بھول جا، اپنے وجود کو صاف کردے، ایسے کاغذ کتنے پڑھوگے)

ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں :-

سا مٺ نه سارين، الف جنهن جي اڳ ۾

ناحق نهارين پنا پيا پڙهڻ لاءِ .

اس سطر کو یاد نہیں کرتے، جس کا پہلا حرف "الف" ہے

دوسرے اوراق پڑھنے کا قصد کیوں کرتے ہو .

حضرت مولانا جلال الدین رومی رح نے اس قبیل میں فرماتے ہیں :-

صد کتاب و صد ورق در نار کن

روئے دل را بیک دیجے بیدار کن ۔

بھگت کبیر حکیم کے متعلق کہتے ہیں

کبیرا بید بلائیا، پکڑ کے دیکھی بانھ

بید نہ بیدن جانئے، کرک کریجے مانھ

(کبیر تونے حکیم کو بلایا وہ نبض دیکھکر مرض کی تشخیص کریں ۔ لیکن حکیم کو کیا خبر کہ درد دل میں ہے)

شاہ لطیف رح فرماتے ہیں

اَج پڻ ڪهڙي دانهه دانهه وڌي منهن ۔

وبج ورائي ٻانهن چوري، چاڪ چڪائيا ۔

(آج بھی زخمی کے جھونپڑی سے آہ و فغان ہونے لگی ۔ حکیم نے بازو پکڑ کر دیکھا کہ وہ درد تو ان کے غم کی ماجرا ہے)

اُردو کے مشہور شاعر نظیر الہ آبادی دین کے لئے کہتے ہیں :-

دین ہوتا ہے بزرگوں کے نظر سے پیدا

شاہ بھٹائی رح نے کہا ہے :-

ڪوڙين ڪتابن ۾ حرف مڙوئي هڪ

جي نظر، تو نيڪ ته بسم الله ئي بس ٿي ۔

(کروڑوں کتابوں میں حرف ایک ہی نظر آتا ہے ۔ اگر تیری نظر نیک ہے تو بسم اللہ ہی کافی ہے)

ظفر علی خان خوب نے کہا ہے :-

جو نکتہ وروں سے کھل نہ سکا، جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا ۔

وہ راز اک کملی والے نے، بتلادیا چند اشاروں میں

اس قبیل میں شاہ بھٹائی رح نے فرمایا ہے

صنو قدوري قافيه، ڪڏهن ڪونه پڙهيوم

جتان پيرين لڌوم، اُو پاڙو ئي ڪو ٻيو ۔

(فقہ کی کتابیں اور قافیہ میں نے کبھی نہیں پڑھے ۔ جہاں سے میرے محبوب نے ہجرت کی وہ گلی اور ہے)

عشق ایک عام انسانی جذبہ ہے ، جس سے ہر دل آشنا ہے ۔ عشق حقیقی بہت نایاب ہے ۔ ہر شخص کے بس کی بات نہیں بہت کم لوگ ہیں جو اس باخبر ہیں ۔ اس لئے جن اشعار میں عشق حقیقی پنہاں ہے ، وہ زود اثر نہیں ہوتے ۔ لیکن پاکیزہ جذبات کا اثر عوام پر بہت جلدی ہوتا ہے کیوں کہ عشق حقیقی کا مرتبہ عشق مجازی سے بلندتر ہوتا ہے ۔ اُردو شاعری میں اسکی چاشنی موجود ہے ۔ لیکن جو اثر شاہ بھٹائی رح کے پیغام ہے وہ انفرادی ہے ۔ عشق ہے پھر سب کچھ ہے ، دین بھی ہے تو ایمان بھی ۔ اگر عشق نہیں ہی تو پھر مسلمانی بھی کفر ہے ۔ علامہ اقبال مرحوم فرماتے ہیں ۔

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

نہ ہو تو مرد مسلمان بھی کافر و زندیق

عشق حقیقی کی پہلی شرط ہے عبادت الہیٰ، جس میں دل کی حضوری ہو۔ لیکن عبادت کے علاوہ ایک اور عشق کا فہم ہو۔ شاہ بھٹائی فرماتے ہیں

روزاہ ۽ نمازون اي پڻ چڱو ڪم

اُو ڪو ٻيو فهم، جنهن سان پسڻ پرين جو .

(روزہ اور نماز ادا کرنا تو فرض ہے اور ضروری امر ہے، لیکن وہ کوئی اور فہم ہے جس ذریعہ محبوب کا دیدار ہو)

علامہ اقبال مرحوم نے اس ملا جس کے دل میں غیر ہوتا ہے۔ اس کی تصویر کھینچی ہے :-

مسجدیں مرثیہ خوان ہیں کہ نمازی نہ رہے .

یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے .

شاہ صاحب فرماتے ہیں :-

منهن ۾ موسيٰ جهڙو، اندر ۾ ابليس

اهڙو خام خبيث، ڇڏين ڇون پوءِ اُرين

(صورت تو حضرت موسیٰ جیسی ہے لیکن دل میں ابلیس ہے ایسے خام اور خبیث کو ٹھکرا کیوں نہ کرو)

اسی خیال کو حافظ شیرازی نے فرمایا ہے :-

واعظاں چوں جلوہ بر محراب و منبر می کنند

چوں بہ خلوت می روند، آں کار دیگر می کنند

علامہ اقبال نے اس خیال کے پیش نظر حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور آذر کو رکھا ہے۔ لیکن شاہ بھٹائی کا رنگ کچھ اور ہے علامہ اقبال فرماتے ہیں:

براهیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے .

ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں

ان پر نہ ایمان جئن ڪلمي گو ڪوٺائين

دغا تنهنجي دل ۾ شرڪ ۽ شيطان

منهن ۾ مسلمان . اندر آذر آهين .

(اس پر ایمان نہیں ہے جیسے تو اپنے آپ کو کلمہ گو کہلاتے ہو۔ تیرے دل میں دغا ہو اور شرک و شیطانیت سمائی ہو)

(صورت میں تو مسلمان لگتے ہو لیکن اندر میں آذر ہو .)

شعراء کرام کے یہاں محبوب کی طرف پیغام بھیجنے کا تخیل بھی عجیب ہوتا ہے۔ کوئی صبا کو پیغامبر بناتا ہے۔ کوئی کبوتر کو، ھنس کو چمن کی خوشبو یا ندی کے بہاؤ کو لیکن حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس تخیل میں بھی وطن پرستی کو مقدم جانا۔ اور کوّے کو پیغام رسان کر کے محبوب کی طرف بھیجتا ہے، کوّا خالص دیسی پرندہ ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں اپنے محبوب کا پیغام صبا سے حاصل کرتا ہے۔ جس میں چمن کے پھولوں کی خوشبو رچی بسی ہے فرماتے ہیں:۔

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ۔
اس واسطے لگا ہوں، چمن کی ہوا کے ساتھ۔

عرب کے مشہور شاعر مسلم بن ولید نے اپنے محبوب کی تلاش میں فرات ندی کے پانی سے دریافت کرتا ہے۔ کہتا ہے:۔

یالیت ماءُ الفرات یخبرنا   این تولت باھلہا السفن
ما احسن الموت عند فرقتھم   واقبح العیش بعد ماھنوا۔

اے فرات کے پانی مجھے خبر دے کہ میرے محبوب کی ناؤ کون سے شہر کو گئی۔ ان کی جدائی میں موت کتنی میٹھی لگ رہی ہے۔ ان کی جدائی نے زندگی زہر کر دی ہے۔

حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:۔

صبا وقت سحر بوئے زلف یاری آورد
دل شوریدۂ ما را زنو در کاری آورد۔

(صبا، صبح کے وقت محبوب کے زلفوں کی خوشبوئے کر آتی ہے تو میری بیقرار دل کو نئی زندگی اور تازگی دے کر کام پر لگا دیتی ہے)

خواجہ میر دردؔ اس خیال کو بڑے جاذب انداز میں پیش کرتا ہے:۔

پھرتی ہے میری خاک، صبا دربدر لئے
اے چشم اشکبار یہ تجھ کو کیا ہوا۔

مرزا غالبؔ نے کہا ہے:۔

پھر تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ مگر یاد آیا۔

شاہ بھٹائیؒ نے کس خوبی اس خیال کو پیش کیا ہے اور کوئے سے اپنے محبوب کی خبر پوچھتا ہے۔

پرين جي پرديس ۾ تون ڪانگا ڪج خبر
ته سپ مڙا ميان سون سين پکي تنهنجا پر
گهمي مٿان گهر ڏج پاهنيا پرين کي۔

کوا۔ میرے محبوب جو پردیس میں ہیں، انکی خبر بتادے۔ تو تیرے پر اور پرندے سب سونے سے جڑادوں محبوب کے گھر کے اوپر گھوم کر، انکو میرا پیغام دیدے

اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس عظیم و عالی ہے ولی دکنی اپنے حمدیہ کلام میں حمد و توصیف کرتے ہیں:۔

الٰہی یا الٰہی تجھے ساجے جگت کی بادشاہی
ولی ہے یو سبب خالی بہانہ
اسی کا کام ہے دنیا دلانا۔

شاہ بھٹائیؒ کے حمد و توصیف میں نازک خیالی اور اسلوب بیان ولی دکنی سے بہتر نظر آرہا ہے فرماتے ہیں :۔

اللہ جتین نالو، تڏين مون وڏو آسرو

خاوند تنھنجي کانہ جو پرو پاند نہ کو۔

نالو رب سندو، رھيو آھم روح ۾۔

یااللہ جتنا تیرا بڑا نام ہے، اُتنا ہی مجھے بڑا آسرا ہے خالق تیرے صبر کی کوئی انتہا نہیں ہے نہ کوئی نشان

میرے ربّ تیرا ہی نام میری روح میں بسا ہوا ہے

علامہ اقبال نے حمد و نعت میں خالص اخلاقی حقائق اور نکات خوبصورت انداز میں بیان فرماتے ہیں۔ خداتعالیٰ اور انسان کے باہمی روابط کے متعلق کہا ہے

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا۔

اس کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن

زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا۔

فارسی زبان میں بڑی بڑی خوبصورت نعتیں کہی ہیں۔ اور بعض نعتیہ کلام تو ضرب المثل ہیں۔ مثال

تا حشر اے دل ارشاد گفتی همه گفتی چو مصطفیٰ گفتی۔

بصورت تو بنی کمتر آفرید خدا۔

ترا کشیدہ و دوست از قلم کشیدہ خدا۔

یوں تو اُردو میں میر، سودا، خواجہ میردرد اور دوسرے کلاسیکی شعراء نے عمدہ منقبت اور نعت کہی ہیں لیکن ظفر علی خان کا یہ مطلع تو خواص اور عام کی زبان پر ہے جو بہت مشہور ہے۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

اک روز چمکنے والی تھی، سب دنیا کے درباروں میں۔

شاہ لطیف بھٹائیؒ کے کلام میں ہر جگہ حمد، نعت، مذہبی، اخلاقی، ناصحانہ حقائق اور نکات ایسے خوبصورت انداز سے ملتے ہیں جن کا بدل کسی اور شاعری میں نظر نہیں آتا۔ شاہ بھٹائی کا کلام اپنی انفرادیت کی وجہ سے کامیاب ہے پورا کلام حمد و توصیف سے بھرپور ہے :۔

جيڪي منجھ جھان، سو تاري تڳي تنھنجي

لطف ۾ لطيف چي، تو وٽ ڪمي ڪانہ

عدل ڇڏيان آءُ نہ کو ڇيھو ڪج فضل جو۔

جو کچھ بھی اس جہان میں کل موجودات ہیں، وہ تیرے ہی سہارے پر چلتا ہے

شاہ لطیف کہتا ہے، یا ربّ تیرے لطف و کرم کی کوئی کمی نہیں ہے

اگر انصاف فرمائینگے تو میں گنہگار بچ نہ سکوں گا۔ علاوہ فضل و کرم کی نظر کے۔

اردو شاعری میں اکثر تشبیہ و استعارہ افراط سے نظر آتے ہیں، مبارک علی خان آبرو تو اُردو شاعری میں تشبیہ اور استعارہ کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے ان کی شاعری بڑی جاذب ہے آبرو کے غزل میں تشبیہ کے علاوہ ایہام اور رعایت لفظی بھی موجود ہے۔

عزت ہے جوہری کی جو قیمتی ہو جوہر

ہے آبرو سخن کوں جگ میں سخی ہمارا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ[2] کے کلام میں جو تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور ایہام نظر آتے ہیں وہ مشکل سے کسی شاعر کے کلام میں نظر آئینگے فرماتے ہیں۔

جي نہ سڃاڻن، سپ کي ويھہ م تنين وٽ

املہ کي اڌ ڪري، پاڻان ھڻن پٽ۔

ھر تنين وٹ، مٹ جي پاہ کو پاس جا

جو سپ کو سمجھ نہ سکے ان کی صحبت میں نہ بیٹھو۔ جو اس انمول چیز کو توڑ کر زمین پر مارتا ہے (برباد کرتا ہے)

جو اس انمول چیز کی قدر کرتا ہے، اُن کے پاس ہی محبت ہوتی ہے۔

اشرف خان فغان، اردو زبان کے اولین شعراء میں سے تھے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز کی خاص کیفیت پائی جاتی ہے، اور کلام میں صبر اور شکر کے جذبہ موجود ہیں کہتے ہیں۔

مجھ سے جو پوچھتے ہو ہر حال شکر ہے

یوں بھی گذر گئی، وہ بھی گذر گئی۔

شاہ صاحب صبر و شکر اور تقدیر کے قائل تھے۔ محبوب کے لطف و کرم کو اپنے لئے عام سمجھتے تھے فرماتے ہیں۔

نہ ڪاتي نہ ڪانہ، نکو ڏوھ قلم جو۔

اَنگ اُتيئي لکيو، جت نہ رسي پانھ

ڪنھن کي ڏيان دانھ، قضا قلم ڪاھيو۔

نہ تو کاتی کا نہ گھاس کا کوئی دوش ہے نہ ہی قلم (و تقدیر) کا، میری تقدیر وہیں لکھی گئی جہاں کو بس نہیں چلتا

کس سے جا کر کہوں میری تقدیر قضا کے قلم نے لکھدی۔

چودھویں کا چاند اپنے آب و تاب سے جلوہ افروز ہے، ستارے اس ماہتاب کے حسن کا تاب نہ لا کر فلک کی نیلی چادر میں چھپ جاتے ہیں، مگر فراق و درد کا ستایا ہوا نالہ کش کیا رہا ہے، اس یاس کی تصویر اُردو کے مشہور شاعر تنویر نے اس طرح کھینچی ہے:۔

یہ ستارے ہیں موتیے کے پھول کسکی مالہا خزاں میں ٹوٹ گئی

چاند ٹیکا ہے کسکے ماتھے کا، رات کسکا سہاگ لوٹ گئی۔

آنکھوں سے آنسوں کے دھارے جاری ہیں لب نالاں، فراق کی رات، پریشانی اور اُداسی، ہر طرف سے نا امیدی نظر آ رہی ہے، حسرت و یاس، آتشِ فراق میں جلیل دل جذبات و احساسات سے متاثر ہو کر شاعر لکھنوی کہتا ہے:۔

کر دیا دل کو تیرے درد نے نازک ایسا

سانس بھی لی تو نکل آئے ہمارے آنسو۔

محبوب کے فراق میں روتے روتے رات ختم ہوگئی اور پھر نمودار ہوا مسر موحل رانہ میں اس فراق کی تصویر شاہ لطیف بھٹائیؒ نے کھینچی ہے جس میں رانہ کی فراق میں مومل نے اپنی حالت غیر کرتی ہے فرماتے ہیں :۔

وٹ سوریندي ولها! ادبو تیل ٻري.

موٽ مسافر سپرين! چانگي تي چڙهي،

راتڙي لاءِ رڙي، ويٺي وهامي راتڙي.

چراغ کی بتی کو اوپر سرکاتے سرکاتے. اس کا تیل ختم ہوگیا. میرے محبوب (رانہ) مسافر اُونٹ پر سوار ہوکر واپس آجا

رانہ کے لئے روتے روتے. رات ختم ہوگئی.

تقدیر کا قید (دانہ پانی کا قید) لوھے کے قید سے شدید ہے عربی زبان میں مقولہ ہے قَیْدُ الْمَاءِ اَشَدُّ مِنْ قَیْدِ الْحَدِیْدِ پانی کا قید لوھے کے قید سے سخت ہے. اس خیال کو خواجہ میر دردؔ نے بیان کیا ہے.

گر قید ہی قسمت میں. کچھ اور ہو یا رب

پر دل کو دل سے تو گرفتار نہ ہووے

اس طرح شاہ بھٹائیؒ نے سر مارئی میں اپنا عظیم تخیل بیان فرمایا ہے :۔

قَیْدُ الْمَاءُ، ٿیوم، هتِ آڻائي گهاريان.

هُنَاکَ جِسمِي وَالْفُؤَادُ لَدَیْکُمْ، هنئون هُتِ سندوم

قادر شال کڻندوم، ميڙائو سين مارئين.

دانہ پانی کا قید مجھے یہاں کھینچ کر لایا. جس کی وجہ سے میں یہاں بڑی تکلیف دن کاٹ رہی ہوں

میرا جسم تو یہاں ہے (عمر کے قید میں) مگر دل وہاں (عزیزوں) ہے

اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے مجھے اپنے مارئوں (عزیزوں) سے ملائیگا.

کوشش کے بغیر مقصد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے. خدا تعالیٰ کی عبادت سے انسان کو راہ نجات ملجاتی ہے، کشتی میں سوار ناخدا اگر آرام سے سو جائے. تو کس طرح کشتی دریا کو عبور کرے گی. محنت کے بغیر انسان کچھ بھی حاصل کر نہیں سکتا. اس خیال کو بڑے جاذب انداز سے واجد صبیں یاسؔ نے پیش کیا ہے :۔

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے.

بہانہ کرکے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا.

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اس تخیل کو بڑے موثر انداز سے بیان فرمایا ہے. جس میں نصیحت کے علاوہ عملی زندگی کا حل بھی موجود ہے

پیڙا ڏٺا پٽي تو نه ڦهڙا بون ڳاليون.

ٻجيون راتيون سمهين پر سکان ڏيئي.

سيان سيئي، پار پڇنداءِ خبرون.

اے ناخدا تجھے یہ دونوں باتیں کیسے حاصل ہونگی پوری رات پتوار کے نزدیک سوئی اور دریا پار اُترنے کی امید بھی رکھی کل تجھے اس غفلت کی باز پرس ہوگی.

اُردو زبان کے ایک ہندو شاعر ہری چند اختر نے کہا ہے

میرِ دنیا سے غرض تھی تم کو دنیا کر دیا .

میں نے کیا چاہا ، میرے اللہ نے کیا کر دیا .

شاہ بھٹائیؒ سر سریراگ میں فرماتے ہیں :۔

ميڪي پاڻي ڇتَ ۾ ٻيڙي سڻي صاحب .

ڪيئي اُوڏي ڪن مان ، اي اڳي جو عجب

اي سائينءَ جو سبب ، جنءَ ٻڏا اُڪاريا پار پيان .

انسان کے دل میں ایک بات ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کچھ اور کر دیتا ہے . ربّ پاکؐ کی عجیب قدرت ہے کہ گرداب میں پھنسے ہوئے کو نکال لیتے ہیں .

یہ ربّ پاکؐ کا سبب ہے جو ڈوبتے ہوئے جہاز سلامتی سے پار ہو جاتے ہیں .

دنیا کی بے ثباتی پر نظیر اکبر آبادی نے کتنا دلاویز انداز سے بیان فرمایا ہے .

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لاتے چلے گئے

کیا کیا بڑے جوان تھے آتے چلے گئے

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ .

تخت زمین پر سیکڑوں ، آئے چلے گئے .

مرزا غالب نے کہا ہے :۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہونگیں کہ پنہاں ہو گئیں

اردو کے بزرگ شاعر خلیفہ عبدالحکیم نے فرمایا ہے .

نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں

خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے .

شاہ بھٹائیؒ نے بڑے جامع انداز میں اس خیال کو پیش کیا ہے فرماتے ہیں .

ڪڏهن ڳاٽ هو گهوٽ ، ڪڏهن مڙهه مڪان ۾

واريءَ منڊو ڪوٽ آڏي ، اڄ ٿيندي ڪيترو .

(انسان کبھی دولہا بنتا ہے کبھی میت ہو کر دفن ہوتا ہے . اے بندے تو کب تک اس دنیا میں ریت کے محل بناؤ گے)

سمندر کی گہرائی میں صدف پیدا ہوتے ہیں ، لیکن وہ ہمیشہ پیاسا رہتا ہے . انکا سہرا بارش کے پانی پر ہوتا ہے . جب بارش ہوتی ہے تب وہ اپنا ننھا سا موتہ سمندر کی سطح پر کھولا رکھتا ہے اتفاق بارش کا قطرہ اسکے موتہ میں جاتا ہے تو اس کی پیاس بجھتی ہے . آغا ظفر بیکر کہتے ہیں .

افتاد زمانہ پہ پڑی ہے ایسی ہر سانس کی آواز ہے نفسا نفسی

بیگانگی دہر کو دیکھو تو ذرا رہ کر بھی سمندر میں رہتی ہے مچھلی پیاسی .

شاہ بھٹائی سرِ مارئی میں فرماتے ہیں :۔

سپ سمندین سیپ، اَبرَ آساہوس

پاتڑو پٹی نہ پیتڑی، منو منھن لگوس

ماڻک ٿي متیوس جن تنگ کیو یاڻین تاں جی

صدف سمندر کی پیدائش ہے۔ لیکن انکو ابر باراں پر نظر ہوتی ہے۔ سمندر کا نمکین پانی نہیں پیتی۔ اسے میٹھا پانی پسند ہے

اس صبر و انتظار کے عیوض وہ قطرہ جو اسکے پیٹ میں جاتا ہے تموتی بن جاتا ہے۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ جب وہ اپنے محبوب کو آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھتا تو ہزار برس کا فراق محسوس کرتا ہے اس فراق میں یوں کہہ دیتا ہے

ساجن گئے دو دن بیتی، میں جانوں پچاس

بھولی پوچھے پنڈتا۔ دن میں کتنے ماس

میر حسن خان تسکین فرماتے ہیں :۔

جس کا رفیق جس سے جدا ہوگیا ہو یار

وہ اپنی بے کسی پہ نہ روئے تو کیا کرے۔

نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں دہلی کے اُردو اور فارسی شعراء میں سے تھے۔ اس خیال کو پیش کرتے ہیں۔

شب نہ آئے جو اپنے وعدہ پر

گذرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں۔

شاہ شرف الدین بٹالوی نے کہا ہے :۔

اکیاں میریاں دکھ پریاں، ویکھن یار تساں نوں

ڈٹی باجھوں رہن نہ مولی، لگی چوٹ نیناں نوں

جی تن لگی سوتن جانڈی، گجی دیدن اساں نوں

شاہ شرف دل درد گھیری، معلوم حال متراں نوں

حضرت امیر خسرو ریختہ میں اپنا خیال بڑے جاذب انداز میں بیان کیا ہے

زحال مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں، بنائے بتیاں

کہ تاب ہجراں ندارم، اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف وروز وصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں آندھیری رتیاں

مرزا مظہر جان جاناں نے فراق و یاس کی تصویر یوں پیش کی ہے :۔

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے

ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے فراق کی تصویر بڑی رقعت خیز انداز سے کھینچی ہے جس میں سوز و گداز کی عجیب کیفیت موجود ہے۔ فرماتے ہیں:۔

آج پڻ اکيرين، سڄڻ ڀنھنجا ساريا.

ڳلن تان ڳوڙهن جون بوندبون بس نہ ڪن

سندي سڪ پرين لوڪ ڏسڻ نہ لھي.

آج بھی میری آنکھوں نے دوست کو یاد کیا اور میری آنکھوں اور گالوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں نہیں تھمتی تھیں

اس دوست کی یاد لوگوں کو دیکھنے سے بھی پوری نہیں ہوتی.

مرزا غالب بوالہوس عاشق کے لئے کہتا ہے کہ[2]

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی،

اب آبروئے اہلِ نظر گئی.

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

عشق نہ آهي راند، جو کيڏن ڳڀرو

جيءَ جسي ۽ جان کي، ڀڃي جو ڀيڪاند

جسي نيزه پاند، اچل تہ اڌ ٿئي.

عشق کوئی کھیل نہیں ہے جو نوجوان کھیلتے ہیں، یہ جسم و جان اور دل کو پرزہ پرزہ کرتا ہے.

سر کو نیزہ کے آگے پھینک تو وہ آدھا ہو جائے.

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" مرزا اسد اللہ غالب نے کہا ہے.

یوں تو کہتے ہو کہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہیں ہم

جائے حیرت ہے کہ پھر آنکھ سے کیوں دور ہوئے.

مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:۔

آنکہ حق است اَقْرَبْ از حَبْلِ الْوَرِيْد

تو فگندی تیر فکرت را بعید.

شاہ لطیف فرماتے ہیں:۔

جي اکين اوڏا، سو سپرين پراهون ڇو،

صوت تنھنجي منھ ۾، پچين ڪوه پيو.

جو دوست آنکھوں کے سامنے ہے اسکو دور نہ کہو، محبوب تو تیرے ساتھ ہیں پھر تو ن

ظفر کہتا ہے:۔

ظاہر پرست پوچھتا کیا ہے خدا کی راہ

ہے وہ بہت قریب.

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات اقدس، معبود و قائم قدیم ہے نہ کسی کے محتاج ہیں نہ احتیاج کی ضرورت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اکیلی تھی اور کُن فیکون کا امر نہ کیا تھا، تب کل موجودات عدم میں تھے۔ لیکن کائنات کے تخلیق کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے تصور میں تھی جو ممکن وجود میں تھے۔ آپ کے امر عظیم سے یہ بات واضح ہے کہ سب چیزیں عدم سے وجود میں آئیں اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ کن فیکون کے حکم پر مکمل ہوئے۔ خدا تعالیٰ کا وجود واحد ہے۔ اور کائنات بھی واحد ہے۔ اس طرح وحدت الوجود میں خدا تعالیٰ کی ذات بھی شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز میں بستی ہے۔ جو کہ وحدت الوجود ہے۔ صوفی و سالک اسکا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ ذکر و فکر، عبادت و ریاضت پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ اپنی جان کو تکالیف میں ڈال کر نفس کو فنا کر کے دل کو آئینہ کی طرح صاف کرتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک
نقشہا بینی برون از آب و خاک

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اندر آئینو کري، پرین سو پسیج
انھيءَ راہ رمیج تہ مشاھدو ماڻین.

(اپنے وجود کو آئینہ کی طرح صاف و پاک کر کے اپنے محبوب کا دیدار کر، اسی راہ پر چل تو محبوب کا مشاہدہ حاصل ہوگا)

تصوف کا مقصد ہے اللہ تعالیٰ سے عشق۔ وہ عشق حقیقی جس کا زیادہ تر واسطہ معشوق حقیقی سے ہو تصوف میں عشق کی پہچان ہوتی ہے۔ عشق کی ماہیت پر اگر غور کیا جائے تو وہ ایک فطری جبلت ہے جس کی تکمیل لازمی ہے چاہے وہ رندی ہو یا بوالہوسی۔ عشق کے منازل بہت کٹھن ہوتی ہیں ہر ایک کی توفیق نہیں ہے۔ جسکو رب چاہے وہ مصیبتوں کو جھیلنے کے بعد کہیں منزل پر پہنچتا ہے۔ تصوف کے باعث اس قبیل میں اکثر قدیم شعراء نے لا تعداد اشعار کہے ہیں بعض شعراء رواجاً اس قسم کی کاوش کرتے ہیں۔ حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کے یہاں اس قسم کے اشعار آپ کے رسالہ میں کثرت سے موجود ہیں چونکہ آپ صوفی مشرب صاحب سلسلہ میں سے تھے۔ اس لیئے اس قسم کی شاعری کے امام کہے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی کثرت شعراء نے تصوف پر اشعار کہے ہیں جن خاص طور پر میر تقی میر۔ اور خواجہ میر درد، غالب مصحفی، ظفر، راسخ۔ اور مرزا مظہر جان جاناں قابل ذکر ہیں

خواجہ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں:

در کش جان فروشان هنر و فضل نگنجد
این جا نسب گنجد این جا حسب نه باشد.

اس میں کسی خاندان ہونے کا امتیاز نہیں ہے۔ شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:

ذات نہ آھي ذات تي، جو وڃي سو لھي.

حسب و نسب پر بزرگی نہیں ہے جو محنت کریگا اسکو حاصل ہوگی۔

انسانی ذہن اور وجدان کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ مجاز و حقیقت کو ایک دوسرے جدا کرنا دشوار ہے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما۔

مرزا غالب نے بھی صوفیانہ خیالات کی اکثر ترجمانی کی ہے وہ عشق سے واقف تھے یا نہ تھے لیکن عشق حقیقی سے ضرور متاثر تھے۔ مرزا غالب فرماتے ہیں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز   آپ ہی نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

ایک اور جگہ پر کہا ہے :۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں ۔

ظفر نے کہا ہے :۔

مری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا ۔
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا ۔

میر تقی میر کبھی کبھی رسماً عشق حقیقی کے رمزوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں :۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں   اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں ،
اپنی ہی میر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے ہیں   اس رمز کو وہ لیکن معدود جانتے ہیں

سودا نے فرمایا ہے

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا
موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہ طور کا ۔

خواجہ میر درد کا کلام عشق حقیقی میں رنگا ہوا ہے اُنکا کلام مربوط عجیب لذت رکھتا ہے ، جب تک جان ہے اسی کی جستجو ہے ، زبان ہے تو اُن کی گفتگو ہے :۔ فرماتے ہیں :۔

مراد ہی ہے جب تک تری جستجو ہے
زبان جب تک ہے یہی گفتگو ہے ۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا ۔

اصغر گونڈوی نے کہا ہے :۔

پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا
جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا ۔

شاہ مشتاق[2] فرماتے ہیں :۔

ایکَ قصرَ دَرِ لک ، کوتیں کٹس گژیوں
جیڈانی کریان پرک ، تیڈانی صاحب سامھون ۔

شیفتہ نے خوب کہا ہے :

سب اس میں محو اور وہ سب سے علاحدہ   آئینے میں ہے آب ، نہ آئینہ آب میں ۔

شاہ بھٹائیؒ کے کلام سے مثالیں ملاحظہ ہوں.

ایک قصر دَر لک، کوڙين کڙيون ڳوکيون

جيڏانھن عريان پرک، تيڏانھن صاحب سامھون.

(ایک محل جسکے لاکھ دروازے اور کروڑوں کھڑکیاں ہیں. جس طرف بھی نظر کرتا ہوں اُدھر محبوب کا دیدار ہوتا ہے)

ڪوڙين ڪيائون تنھنجون، لکن لک ھزار

جيءَ سيڪنھن جيءَ سين، درسن دارون دار

پرِيم تنھنجا پار، ھڪڙا ھڪڙي ھڙا چوان.

میرے رب تیری صفات کو لاکھوں بندوں نے لکھا ہے ہر ایک نے تیرے جلوہ کو مختلف طرح دیدار کیا ہے.

میرے محبوب تیری صفات اور خوبیاں کس کس بیان کروں.

اہلِ نظر کو مجاز میں حقیقت اور وحدت میں کثرت کا پرتو نظر آتا ہے. کیونکہ معرفت الٰہی بغیر نفس اور معرفتِ کائنات ممکن نہیں مرزا غالب نے کہا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ھنگامہ اے خدا کیا ہے

فانی بدایونی نے اس خیال کو بھی پیش کیا ہے.

کثرت میں دیکھتا جا، تکرار حسن وحدت

مجبور یک نظر آ مختیار صد نظر جا.

خواجہ میر درد نے کہا ہے

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا.

یہ عالم کثرت کا مسکن ہے. لیکن اگر غور سے دیکھو تو اس کثرت میں وحدت کا جلوہ نظر آتا ہے:

جمع ہیں افراد عالم ایک ہیں گُل کے سب اوراق برہم ایک ہیں.

ہووے کب کثرت سے وحدت میں خلل جسم وجان گو دو ہیں باہم ایک ہیں.

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:

وحدت تان ڪثرت ٿي، ڪثرت وحدت ڪُل

حق حقيقي هيڪڙو، ٻولي مَ ڀُلُ

هو هلاچو ڪُل، بالله سندو سڄڻين.

وحدت سے ہی کثرت ہے، اور وحدت ہی کُل کثرت ہے

خدا تعالیٰ کی ذاتِ حقیقی ایک ہے، اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے

ربِ پاک کی قسم ہر جگہ پر ھو حق کا شور وغل ہے.

مرزا غالب نے کہا ہے

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا۔

شوکت میرٹھی کہتے ہیں:۔

قدرت مہ و انجم آفرین تیری ہے — یہ مہر مبین مہر نگین تیری ہے
ہے تو ملک و ملائک و ملکوت — خاکی ہے بشر بھی۔ کل زمین تیری ہے۔

آغا شاعر نے بھی خوب کہا ہے:۔

وحدت ہی میں تنہا ہیں شاہی تیری — کثرت میں بھی ہے نیم نگاہی تیری
ذرے ہیں اڑتے ہیں سوئے مہر مبین — انگشت غبار ہے گواہی تیری۔

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں:۔

سو صِیْ سو ھو، سو اجل سو اللہ،
سو پرین سو پساہ، سو ویری سو واھرو۔

مرزا غالب کے کلام میں مجاز اور حقیقت دونوں کو بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ جس کے لئے فرمایا ہے:

خموشی کا عالم ہے اپنا مقام
نہیں آشنا بحث و تکرار کے
مبارک رہے تجھکو واعظ بہشت
میاں ہم تو طالب ہیں دیدار کے

بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں

دل کا آئینہ جب صفا دیکھا — وہ جو پنہاں تھا برملا دیکھا۔
کیا کہوں بتکدہ میں کیا دیکھا — جلوہ قدرت خدا دیکھا۔

میر تقی میر نے فرمایا ہے:۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — آپنے سوائے کس کو مسجود جانتے ہیں۔
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں۔

ان اشعار کی زبان اور اسلوب، تصوف کے اسرار و رموز کو بیان کرنیکے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ مجازی عشق کے معاملوں کی طرح حقیقی عشق کی کیفیت بھی تفصیل سے پیش کی ہے۔ مرزا غالب نے کہا ہے

کہیں ہے بادشاہ تخت نشین — کہیں کاسہ لئے گدا دیکھا۔
کہیں عابد بنا کہیں زاہد — کہیں رندوں کا پیشوا دیکھا۔

شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں:۔

پاڻهِ جَلّ جَلالَہٗ، پاڻهِ جان جمال

پاڻهِ صورت پرينءَ جي، پاڻهِ حسن ڪمال

پاڻهِ پير مُريد ٿيو، پاڻهِ پاڻ خيال

سڀ سڃاڻي حال، منجهائي معلوم ٿيو۔

خدا تعالیٰ جَلّ جَلالہٗ خود ہی جانِ جمال ہے محبوب کی صورت بھی خود ہے، خود ہی حسن کمال ہے

خود پیر و مرید ہے تو اپنا خیال بھی خود ہے۔ سب حقائق اُن کو خود ہی معلوم ہوتے ہیں۔

غیب الغیب سے تصوف کی اصطلاح میں احدیت ذات مراد ہے، جو عقل و ادراک کی حدود سے دور ہے شاہ بھٹائیؒ نے وحدت الوجود کے مسئلہ کو بیان فرمایا ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو خدا تعالیٰ کے سوا، اور کوئی موجود نہیں ہے، کیوں کہ کسی چیز کو اپنا وجود نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیض کرم سے وجود حاصل ہے ہر چیز میں حقیقت خدا کا نور سمایا ہے قرآن پاک کا قول مبارک ہے "اللہ نور السموات والارض"

مرزا محمد رفیع سودا نے فرمایا ہے:۔

ہیں عاشق اپنا معشوق اپنا آپ ہوں پیارے

گہے پروانہ اس مجلس میں، گاہے شمع محفل ہوں۔

میر تقی میر نے فرمایا ہے:۔

سراپا میں اس کے نظر کرکے تم،

جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ ہے۔

اُردو زبان کے ایک مشہور شاعر اکبر حسین نے کہا ہے:۔

کرم حق پہ رکھ نظر اپنی

جو عقیدہ ترا نہ ہو ڈھیلا

آمراب کا چھوڑ دے اکبرؔ

وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً

شاہ بھٹائی فرماتے ہیں:۔

پاڻهِ پسي پاڻ کي، پاڻهِ ئي محبوب

پاڻهِ خلقي خوب، پاڻهِ طالب تن جو۔

خدا تعالیٰ خود ہی اپنے آپ کو دیکھتا ہے، اور خود ہی محبوب ہے

خود ہی پیدا کیا اور خود ہی اس کے طالب ہوئے۔

اردو شاعری پر ایک نظر مصنف کلیم الدین احمد عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ کے کلام کا اردو شعراء کے کلام سے حتی المقدور موازنہ کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے خیالات سے اردو وهندی اور فارسی شعراء کے کلام میں کسی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔

شاہ لطیف کی شاعری سندھی زبان اور سندھی کلچر (CULTURE) میں موجود ہے جب تک سندھی زبان اور سندھی تھذیب کا علم نہ ہوگا۔ تب تک شاہ بھٹائی کے کلام و خیالات کو سمجھنا دشوار ہوگا۔ آپ کی شاعری کی بنیاد جذبہ اسلام اور تصوف ہے، اسلیئے عوام کے لئے مشعل راہ اور ذریعہ تسکین بھی ہے۔ شاہ لطیف کی شاعری تخلیقی (CREATIVE) ہے، یہی وجہ ہے کہ عوام، شاہ بھٹائی ؒ کے رسالہ کو بڑی عزت سے اور کلام کو بڑی توقیر سے دیکھتے ہیں۔

شاہ لطیف کے کلام کا ترجمہ کرنا آسان بھی ہے تو دشوار بھی ہے لفظی ترجمہ تو ہو سکتا ہے لیکن آپ کے تخیل کا شعر میں ترجمہ کرنا مشکل ہے، کیونکہ پورا کلام استعاروں، تشبیہات، کنایہ اور تمثیل و مثالوں سے پُر ہے۔ شیخ مبارک علی ایاز رسالے کے مقدمہ میں کہا ہے

> شاہ لطیف سندھی کے وہ پہلے اور شاید آخری شاعر تھے۔ جن کے کلام میں سندھی زبان کی قریب قریب تمام خوبیاں موجود ہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ سندھی زبان صرف اسی لیئے زندہ رہی ہے اور رہے گی کہ اس میں شاہ جیسے عدیم المثال کا دل آویز کلام موجود ہے اس کلام کی دل آویزی کو کسی دوسری زبان میں منتقل کردینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ایک غیرفانی شاعر اور اُنکے کلام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے وجود کا خود ثبوت ہوتا ہے۔ بعض اصنافِ شاعری یا شعراء کی شخصیت کو تقدس کا جامہ پہنا کر ہر طرح کی نکتہ چینی سے بالا و برتر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ صحیح حقیقت ہے کہ شاہ بھٹائی کا کلام ہر لحاظ سے بالاتر ہے جو قدیم اور صدیوں سے اپنی غیرفانی ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی (اردو ترجمہ) مترجم شیخ مبارک علی ایاز صفحہ ۹۹

ضميمه

ضمیمہ

شاہ بھٹائی کے سوانح نگار مترجم اور انکی تصنیفات

۱۔ تاریخ تحفۃ الکرام (فارسی)

تاریخ تحفۃ الکرام کے مصنف میر علی شیر قانع نے یہ تاریخ ۱۱۸۱ھ مطابق ۱۷۶۷ء میں یعنی شاہ بھٹائیؒ کی وفات ۱۶ سال بعد لکھی تھی میر علی شیر قانع شاہ بھٹائیؒ کے ہمعصر تھے شاہ بھٹائیؒ نے ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں وفات فرمائی تھی۔ یہ تاریخ سب سے قدیم اور مستند ہے۔ کیونکہ انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کو دیکھا تھا، اور انکی محفلوں میں بھی شریک ہوئے تھے۔ شاہ بھٹائی، مخدوم ٹھارو اور مخدوم معین ٹھٹوی سے بڑے دوستانہ تعلقات تھے۔ مخدوم صاحب میر علی شیر قانع کے استاد تھے۔ شاہ بھٹائی اکثر ٹھٹہ جاکر مخدوم صاحب کی صحبت میں رہتے تھے۔ میر علی شیر قانع نے شاہ بھٹائیؒ کا مختصر ذکر دیا ہے۔ لیکن اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میر قانع نے اپنی ایک اور مشہور تصنیف مکالات الشعراء میں بھی مختلف جگہوں پر ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"انجناب لطیف اگرچہ اُمی بودند، اما علم و عالم بتمام برلوحِ محفوظ دلِ شان مثبت بودہ الحق این بیت قابل لایق شان شانست"

چو طفلِ غنچہ نادیدہ دبستان

ببر سہ پارۂ اسرارِ رحمان

۲۔ مرغوب احباب (فارسی)

نظر علی بلوچ، لنواری شریف کے بزرگ خواجہ محمد زمان ثانیؒ کے مرید اور عقید تمند تھے انہوں نے ۱۲۲۶ھ مطابق ۱۸۲۵ء میں یہ کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں لنواری شریف کے بزرگوں کے حالات زندگی لکھے تھے۔ نظر علی بلوچ کے آباء اجداد کیچ مکران سے ہجرت کرکے سندھ میں آئے تھے، ان کے دادا اپنے وقت کے اچھے فارسی کے شاعر تھے اور "زندہ بہار" تخلص کرتے تھے۔ نظر علی بلوچ خود بھی فارسی کے شاعر تھے، انہوں نے یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی۔ جس کی شروعات نقشبندی طریقہ کے مشائخ کا تفصیل سے احوال دیا ہے۔ صوفیانہ طریقہ کے بانی حضرت شیخ خواجہ شیخ بہاؤ الدین ذکریا نقشبندی کا احوال دیا ہے، اس کے بعد لنواری شریف کے بزرگوں کی حالات زندگی دی ہے۔ حضرت خواجہ محمد زمان صاحب کے حالات زندگی حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ اور خواجہ صاحب کی ملاقات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جسکا ذکر اس کتاب کے پہلے صفحات پر دیکھ چکا ہوں۔ اس ملاقات کا ذکر سب سے پہلے آنجہانی ڈاکٹر گربخشانی نے رسالہ "سندھو" میں دیا تھا۔ جسکے بعد اپنی تصنیف "لنواری کے لعل" میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ شمس العلماء مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ صاحب نے اپنی تصنیف "ابیات سندھی" حضرت خواجہ محمد زمان لنواری بزرگ کے کلام اور سوانح میں بھی ذکر کیا ہے۔

۳۔ احوال شاہ عبد اللطیف بھٹائی:۔

سندھ کے مشہور عالم و فاضل مرحوم شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے ۱۸۸۷ء میں بھٹ شاہ کی درگاہ کے فقیروں، مریدوں سے حالات زندگی حضرت شاہ بھٹائیؒ کی جمع کرکے ایک کتاب لکھی جس میں سوانح کے علاوہ، آپ کے کلام کا فلسفہ، کھانیوں اور کرامات پر تفصیل سے لکھا ہے غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں شاہ بھٹائی کی سوانح تفصیل سے ملتی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی، لیکن بعد میں اسکا سندھی زبان میں خود مصنف نے ترجمہ کیا۔ مرزا صاحب کی یہ خوش نصیبی تھی جو اُنہیں وہ روایتیں حاصل ہوئیں۔ جن فقیروں نے ان عقیدمندوں سے سُنی تھی جنہوں نے شاہ بھٹائیؒ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور ان کی قرابت حاصل تھی۔ اس لیئے مرزا صاحب کی پیش کردہ روایتوں میں صداقت نظر آتی ہے

مکالات الشعراء فارسی میر علی شیر قانع، تصحیح سید پیر حسام الدین شاہ راشدی۔ سندھی ادبی بورڈ صفحہ ۴۲۹۔

لطائف لطیف (فارسی)

سندھ کے آخری تالپر تاجدار میر محمد نصیر خان شھدادانی کے پوتے اور میر عباس علی خان کے فرزند میر عبدالحسین خان سانگی حضرت شاہ بھٹائی کے بڑے عقیدتمند تھے۔ اور اپنا روحانی مرشد سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے آپ کی سوانح فارسی میں "لطائف لطیفی" کے نام سے سنہ ۱۸۸۸ء میں لکھی، بہت عرصہ تک یہ کتاب مسودہ کی صورت میں رکھا رہا۔ آخر ۱۴ اپریل سنہ ۱۹۶۷ء میں انجمن ثقافتی مرکز شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی طرف سے جناب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے شایع کرادی۔ یہ کتاب مرتب نے بڑی عقیدہ و احترام سے لکھی، جس میں شاہ بھٹائی کی حالات زندگی، شجرہ، کرامات اور دیگر حالات دیئے ہیں۔

سوانح:۔ میر عبدالحسین خان سانگی سندھ کے شھزادے تھے، ان کے والد میر عباس علی خان اپنے والد میر محمد نصیر خان کے ساتھ انگریزوں کی فتح سندھ کے بعد قیدی بن کر کلکتہ بھیجے گئے۔ میر عباس علی خان کی بھادری کو دیکھکر ایک انگریز خاتون نے اس سے شادی کی، جس کی بطن سے سنہ ۱۸۵۱ء میں میر عبدالحسین خان وہیں تولد ہوئے۔ آیام طفلی میں والدہ کا انتقال ہوا اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کے والد بھی کسی حادثہ میں وفات کی۔ اس طرح یہ بچہ مکمل طور پر یتیم بن گیا۔[2] دس برس کی عمر میں اپنے وطن حیدرآباد آنے کی اجازت ہوئی۔ ان کی نگرانی اپنے چچا میر حسن علی خان کے ذریعے ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کلکتہ میں ہوئی، اردو فارسی تعلیم اچھی ہوئی۔ سندھی زبان وطن واپس ہو کر ہوئی۔ بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا، فارسی اور سندھی شاعری آخوند احمد عبدالعلیم ھالائی سے ہوئی۔ اردو اور فارسی میں مولانا ابوالحسن ابن مولانا مھدی حسن لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے، سانگی کو اپنے استادوں سے بڑی عقیدت تھی۔ ایک جگہ انکی تعریف اردو شعر میں کی ہے:۔

مولوی سید ابوالحسن مقدس القاب   شھد و شکر سے ہوا آپ کا اشعار لذیذ۔

انگریز سرکار کی طرف سے میر عبدالحسین خان سانگی کو فرسٹ کلاس اسپیشل مجسٹریٹ مقرر کیا، یہ عہدہ بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ میر صاحب کو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے بڑی محبت تھی، دیوان سانگی میں مرشد کرکے یاد کرتے ہیں۔ ایک جگہ عقیدت سے کہتے ہیں۔

لطف لطیف شامل حالم اگر نہ ہو   تو شاہراہ عشق میں میرا گذر نہ ہو۔

میر عبدالحسین خان سانگی آخر عمر میں معمولی بیماری کے بعد ۱۲ جون سنہ ۱۹۲۴ء مطابق ۸ ذیقعد سنہ ۱۳۴۲ ہجری جمعرات کو وفات کی۔ ان کی مزار اس کی خواہش کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی درگاہ میں بنائی گئی۔

Sind and the races that inhabite in the valley of Indus - (سندھ اور وادی مہران میں بسنے والی قومیں):

سر رچرڈ برٹن نے اپنی یہ تصنیف میں مختلف جگہوں پر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے۔

"یہ ولی سید حبیب شاہ کے فرزند تھے بارھویں صدی ہجری کی اول میں سنہ ۱۶۸۹ء میں تولد ہوئے۔ وہ اپنی زیارت کے لئے مشہور، اُنہوں نے اگرچہ تعلیم حاصل نہ کی تب بھی وہ علوم و فنون کے مالک تھے۔ ان کے بیشمار مرید تھے۔ جن کو آپ سے بڑی محبت تھی، آپ کی وفات کے وقت کیئی مرید جان بحق ہوئے، ان میں بہت سے اپنے وقت کے ولی بن گئے۔ شاہ لطیف اس جہان سے سنہ ۱۱۶۱ھ ہجری میں وفات کی۔ آپ کی مزار بھٹ شاہ پر ہے جو ایک مقدس جگہ ہے۔ جہاں ماہ صفر میں سالیانہ عرس کا میلہ لگتا ہے"

---

[1] لطائف اللطیفی فارسی - شایع کردہ انجمن مرکز ثقافت شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ بھٹ شاہ ضلع حیدرآباد سنہ ۱۹۶۷ء

[2] سانگی شخصیت فن اور کلام مرتب مرحوم پروفیسر احسان احمد بدوی کراچی۔ سنہ ۱۹۶۵ء

[3] دیوان سانگی مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل پریس حیدرآباد سنہ ۱۹۰۲ء

Sind & the races that inhebit inhebit in the valley of Indus
by (Richard Francis Burton)

رچرڈ فرینسز برٹن :۔ برٹن انگلینڈ کے ایک شہر ہرفرڈ شائر میں پیدا ہوئے۔ اُنکا باپ ایک فوجی آفیسر تھا، جسکو فوج سے نکالا گیا تھا۔ برٹن کی ابتدائی تعلیم انگلینڈ اور فرانس میں ہوئی۔ آکسفوڈ یونیورسٹی سے ۱۸۴۳ء تعلیم مکمل کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی میں نوکری کی اور بعد میں ہندوستان بھیجے گئے سندھ میں ۱۸ رجمینٹ میں کیپٹن مقرر ہوکر آئے۔ سفر کے دوران جہاز میں ان کی ملاقات ایک انجینیر کیپٹن والٹر اسکاٹ سے ہوئی، جو سندھ میں سر چالس نیپیر کے کہنے پر سندھ کی سرزمین اور دریاؤں کے سروے کرنے آئے تھے۔ برٹن نے اسکا نائب بن کر کام کیا۔ سندھ کی معاشرتی اور تمدنی حالات کو سمجھنے کا اُنہیں بڑا موقعہ ملا جس کی وجہ سے اُنہوں سندھ کے حالات پر بہت سی کتابیں لکھی۔ برٹن بڑے عیاش ہونے کے باوجود محنتی آدمی تھے۔ دنیا کی کم بیش پچیس زبانیں جانتے تھے۔ برٹن ۲۰ اکتوبر ۱۸۹۰ء میں ٹریسٹ شہر میں مر گئے اور انگلینڈ میں دفن کئے گئے۔

۶۔ احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی :۔

سندھ کے کمشنر سر بارٹل فریئر (۱۸۵۱ء تا ۱۸۵۹ء) نے اپنی بیٹی کی تفریح کے لئے شاہ بھٹائی کی زندگی پر کہانیاں لکھادی، یہ کتاب پہلے انگریزی میں لکھی گئی۔ بعد میں سندھی میں ترجمہ کرایا۔ یہ دونوں مسودہ کمشنر سندھ کے خانگی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

۷۔ Some thing about Sind (سندھ کے متعلق تھوڑا احوال)

دیوان دیارام گدومل سگھا نے ایک مختصر رسالہ سندھ کے متعلق تھوڑا احوال کے عنوان سے ۱۸۸۲ء میں انگریزی زبان میں شایع کیا۔ اس رسالے میں شاہ بھٹائی ؒ کے حالات زندگی پر جامع روشنی ڈالی گئی تھی۔

۸۔ Shah Latif (شاہ لطیف)

دیوان لیلارام وطن مل لالوانی نے شاہ لطیف بھٹائی ؒ کی سوانح مذہب اور کلام پر دو حصوں میں کتاب لکھی۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے اور ۱۸۹۰ء میں شایع کرائی۔ دیباچہ میں لکھتا ہے :۔

> میں نے اس کتاب کے لکھنے پر بڑی محنت کی ہے۔ آٹھ سال کے طویل عرصہ میں جو بھی مجھے فرصت کا وقت ملتا تھا، کام میں لگ جاتا تھا۔ دو سال مسلسل قرآن پاک کے پڑھنے میں صرف کئے۔ جو انگریزی، ہندستانی اور فارسی زبانوں کی مدد سے قرآن پاک کو سمجھا۔ اسکے علاوہ ہندی اور انگریزی گرامر اور بہت سے ہندوستانی زبان کی کتابیں پڑھیں۔ قرآن پاک پڑھنے میں میرا مقصد یہ تھا کہ میں شاہ بھٹائی کے کلام میں جو آیات پاک موجود ہیں سمجھوں اور شاہ بھٹائی کے کلام کو قرآن پاک کی روشنی سمجھوں۔

دیوان لیلارام وطن مل کی یہ کتاب مستند سمجھی جاتی ہے، جس میں شاعری کی سوانح، تصوف ویدانت، کلام پاک کی آیات اور آخر میں مشکل الفاظوں کی معنیٰ دی ہے۔

۹۔ SHAH ABDUL LATIF OF BHIT (شاہ عبداللطیف آف بھٹ)

ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے، سندھی زبان کے محسن اور شاہ عبداللطیف ؒ کے شیدائی تھے۔ اُنہوں نے ۱۹۳۸ء میں شاہ بھٹائی ؒ کی سوانح، کلام اور اس وقت کے سماجی، تمدنی، معاشی اور ثقافتی حالات پر مکمل تحقیق کی۔ اس تحقیقی مقالہ پر آکسفوڈ یونیورسٹی لنڈن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اور یہ کتاب آکسفوڈ یونیورسٹی پریس لنڈن سے ۱۹۴۰ء میں شایع کرائی۔ کتاب میں اٹھارویں صدی عیسوی کی تاریخ اور معاشرتی حالت کے بعد، ادب اور تنقید، سوانح، کلام، کلام پر عربی فارسی اور ہندی زبانوں کا اثر اور بلوچی اردو زبانوں کا اثر، رسالہ تصوف مذہب، رسالہ کی کہانیاں، آخر میں دیوان پوکرداس کے مطبوعہ انتخاب، رسالہ کا انگریزی نظم میں ترجمہ دیا ہے

سوانح :- یہ عالم اور محقق ۔ انڈین سروس (سول) میں شامل ہوکر سندھ کے مختلف شہروں میں محکمہ مال میں رہکر آخر سکھر کے کلیکٹر مقرر ہوئے ۔ انہوں نے نہایت خاموشی سے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ پر تحقیق کی ان کی محنت کو دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے بڑے ادیب اور شاعر تھے ۔ پاکستان ہونے سے پہلے انگلنڈ چلے گئے تھے ۔ لیکن بعد میں ڈیونیو بورڈ کے میمبر مقرر ہوکر آئے تھے ۔ انہوں نے سندھی زبان کی بڑی خدمت کی ہے ۔ سندھی زبان کے متعلق ان کی رائے اپنی جگہ پر اہمیت رکھتی ہے ۔

"دنیا کے کسی بھی زبان کا تلفظ سندھی زبان کی رسم الخط میں صحیح طور پر لکھا جاتا ہے"

ڈاکٹر سورلے پہلے محقق ہیں جنہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے ۔ ان کے فلسفہ کو یورپ کے لوگوں سے روشناس کرایا ۔ سندھ اور سندھی زبان پر انکا بڑا احسان ہے ۔ ڈاکٹر سورلے یہ کام مکمل کرکے بڑا فخر محسوس کرتے تھے ۔ شاہ صاحب کے متعلق کہتے ہیں

" شاہ بھٹائیؒ جیسا بلند پایہ شاعر کا پیدا ہونا ، یا پیدا ہونے کی توقع کرنا ناممکن ہے ۔ جیسے انگلنڈ کے ادب میں ڈون اور ملٹن "

ڈاکٹر سورلے نے شاہ عبداللطیف اف بھٹ کے بعد سنہ ۱۹۵۳ء میں ایک تصنیف موسیٰ پروگنس "Musa Peravagans" کے نام سے لکھی ہے یہ کتاب بھی انگریزی زبان میں ہے ۔ جس میں دنیا کے سات زبانوں ۔ یونانی ۔ لاطینی ۔ فرانسی ، اطالوی ، عربی ، اردو اور سندھی کے مشہور شعراء کی غنائی شاعری (Lyrical) کو پیش کیا ہے ، جس میں شاہ لطیف بھٹائیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

شاہ بھٹائیؒ اٹھارویں صدی میں شعر کہتے تھے ۔ سامی اور آرائی زبانوں میں اپنے خیالات کا ایسا مثال چھوڑا ہے ، جسکا نظیر برصغیر ھندو پاک میں ملنا مشکل ہے ۔ یہ ایک قابل قدر حقیقت ہے کہ سندھ کے ھندو بھی مسلمانوں کی طرح شاہ لطیفؒ کے تصوف کو بڑی عقیدت سے مانتے ہیں ۔ شاہ بھٹائیؒ نے اپنی شاعری کا موضوع ان لوگ کہانیوں کو بنایا ہے جو سندھی عورتیں اپنے بچوں کو جھولے میں نیند کرانے کے وقت لوری کی طرح گاتی ہیں ۔ ان کہانیوں کو فطری شعر میں لاکر تصوف کے رنگ میں ڈبو کر پانی سے تر کرتے ہوئے ، ریشم جیسی چمک دیتا ہے ۔ سیدھی طرح اگر دیکھا جائے تو شاہ بھٹائیؒ فارسی زبان کے عظیم شعراء رومی اور جامی کی صف میں شمار کیا جاتا ہے ۔ اس طرح کہنے میں کوئی زیادتی نہ ہوگی کہ شاہ صاحب دنیا کے بڑے میں بڑے شاعر ہیں ۔

۱۰. A Battle Scene at Karbala کیڈارو

شکارپور سندھ کے ایک ھندو سنت سومدت ۔ بی ۔ گاجریہ نے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے رسالے سے سرکیڈارو کے ابیات کا انگریزی زبان میں نہایت پختہ ترجمہ کیا ہے یہ کتاب کی صورت میں شکارپور سے شایع ہوئی تھی ۔ جسکی مثال دی جاتی ہے ۔

۱. گھوڙن ۽ گھوٽن جيئڻ ٿورا ڏينھڙا

ڪڏھن منجھ ڪوٽن، ڪڏھن ماڻھي رڻ جا.

گھوڑوں اور بہادروں کا جینا مختصر ہوتا ہے — Horses and heroes have short a leave

کبھی قلعوں کے اندر ہوتے ہیں تو کبھی بیابان کے راہی ۔ — Some times they dwell in cities some times function on the fields.

۲. حسن مير حسين کي رنو ٽن ٽولن.

اردو ترجمہ :- امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی شھادت پر تین حلقوں نے رولایا ۔

گھر ماڻھون جھنگ مرون ۽ اڀ ملائڪن.

گھروں میں لوگ ۔ جنگل میں جانوروں نے اور آسمان پر ملائکوں نے ۔

Hasan and Mir Husain were wept by there groups, Men in houses, beasts in the field and hosts in heaven.

Risalo of Shah Abdul Latif

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ کے منتخب کلام کا انگریزی میں ترجمہ مرحومہ ایلسا قاضی نے کیا ہے جسے سندھی ادبی بورڈ نے ۱۹۶۵ء میں شایع کیا۔ ابیات کے ترجمے کو دیکھکر مترجمہ کی علمی لیاقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ترجمہ میں جاذبیت اور اصلیت نظر آتی ہے، اور شاہ بھٹائی ؒ کے تخیل تک پہنچتی ہے۔ کتاب کے شروع میں سندھ کی مایہ ناز شخصیت، ادیب وفلسفہ اے۔کے۔ بروہی نے عالمانہ تعارف لکھا ہے

مرحومہ ایلسا قاضی، مرحوم علامہ آئی۔آئی۔قاضی کی رفیق حیات تھی، وہ جرمنی نسل کی تھی، اور جرمن کے ایک شہر روڈل اشاٹ میں ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئی، اُنکا والد مشہور جرمن موسیقار تھا، وہ جرمنی سے انگلینڈ چلے گئے تھے، لنڈن کے نزدیک ڈلوچ شہر میں مقیم ہوئے جہاں قاضی صاحب بھی تعلیم کے سلسلے میں رہتے تھے، وہاں ان کی ملاقات ایلسا سے ملاقات ہوئی، کچھ عرصہ کے بعد شادی ہوئی ۱۹۱۱ء میں سندھ میں آئی قاضی صاحب صحبت میں بڑی ادیبہ بن گئی خاص طور پر انگریزی تصنیفات مشہور ہیں:-

1. Old English Garden Symphony (Novel) 2. Temptation (Drama of Sindh Life) 3. Civilization through the Ages. 4. Terrestrial and Celestiale Chose (5) Resalo of Shah Lataf.

ایلسا قاضی کو ادب اور مصوری سے موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی، یہ مشہور ادیبہ ۲۸ مئی ۱۹۶۷ء کو حیدرآباد سندھ میں وفات کی، جناب عتری ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی نے اُنکی تاریخ وفات اس قطعہ سے نکالی ہے۔

رافت وشفقت بہ ہرکس داشتہ — بود برخورد و کلاں ہردم رحیم۔

مثلہا لم یخلق است از روئی امر — ایلسا قاضی بہ جنت شد مقیم۔

۱۳۸۷ ھجری — ۱۹۶۷ عیسوی

RISALO OF SHAH ABDUL LATIF.

سندھ کے خاموش اور گوشہ نشین بزرگ آغا محمد یعقوب خان نے شاہ بھٹائی ؒ سے عقیدت ہونے کی وجہ سے، رسالہ کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں اور اس وقت رسالہ کے ۲۳ سروں کا ترجمہ مکمل کر چکے ہیں۔ اپنے ترجمہ میں فارسی شعراء کے کلام سے موازنہ بھی کرتے ہیں۔ بیقین یہ کام ایک شاہکار کی حیثیت ادب رکھے گا۔

آغا محمد یعقوب خان شکارپور کی مردم خیز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ کڑی عطا محمد خان کے مشہور محلہ کے رہنے والے ہیں۔ بی۔اے آنرس انگریزی اور فارسی میں کرنے کے بعد محکمہ مال میں ملازمت کا آغاز کیا۔ سندھ کے مختلف ضلعوں میں ڈپٹی کمشنر ہو کر رہے آخر میں مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن لاہور سے ۱۹۶۴ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ عربی۔فارسی۔سندھی اور انگریزی میں یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ شاہ بھٹائی کے رسالہ کے علاوہ قرآن پاک کے ۱۵ پاروں کا انگریزی میں تفسیر و ترجمہ کر چکے ہیں۔

بڑے ہمدرد، غریب نواز اور انسان دوست ہیں۔ آج کل حیدرآباد سندھ لطیف آباد میں مستقل سکونت ہے۔

LATIF and the Moden world.

شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا فارسی ترجمہ :-

شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا فارسی زبان میں ترجمہ سندھ کے مشہور عالم عطایت اللہ ھالائی نے کیا. اس ترجمہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ کلام فارسی میں منظوم ترجمہ کیا تھا. مولوی صاحب خود بھی فارسی کے بہترین شاعر تھے. انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کے کلام ترجمہ کا نام "النظم الشریف الکلام السید عبداللطیف" رکھا تھا. مولوی صاحب کی ولادت ۱۳۱۵ھ میں ہوئی اور وفات ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۹۴۶ء میں ہوئی. مولوی صاحب بڑے فقیہ تھے. انہوں نے شاہ بھٹائی کے رسالہ کی سندھی زبان میں شرح بھی لکھی تھی. ٹھٹہ میں سید کمال شاہ کی زیارت کے لئے گئے تھے. تو وہاں کسی نے وہ کتاب چرالی. علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم کی اس ترجمہ کے متعلق یہ رائے ہے

فارسی کا ترجمہ سندھی سے بھی زیادہ فصیح اور روانی سے پُر ہے. ترجمہ کی لطافت اور بلند خیالی شاہ لطیفؒ کے مطالب پر حاوی ہے. اور اہل ذوق کے لئے ایک بے بہا نعمت ہے.

ترجمہ کا نمونہ دیا جاتا ہے :-

ھوت تنھنجي منھن ۾ پيھين کوھ پرياڻ .
سو تان تو ھين ساڻ . جنھين لاءِ جبل گوليين .

مسکن او در حضور تو قریب، از دگر پرسش چہ کردی بے نصیب
ھست با تو نزد تو در تو مدام، آنکہ گردی در پئے او ھر مقام.

وڃين ڇو وٽڪاءِ، مت نہ گولين ھوت کي،
لڪو ھين لطيف چي، پاڙ وچو ئي پاڙ
تي ستي پئہ سنڌ ڙو، پرت پنھون سين پاڙ
ناڻي نينھ نھاڙ، تو ۾ ديس وڌوست جو.

از پے دلبر چہ گردی کوبکو، در وجود خود کن او را جستجو
دلبر تو از وجود درد نیست، درد گرا طراف آن مستور نیست
نخلی اندر جب وشو بستہ میاں، ھم دفاکن عذوجب جانجان
چشم خود را بیدست دار دکن نگاہ، ھست او را در وجودت جایگاہ.

شاہ لطیف کے کلام کا منظوم ترجمہ :-

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام فارسی میں منظوم ترجمہ سندھ کے نوجوان شاعر نیاز ھمایونی نے بھی کیا ہے. انہوں نے رسالہ کے چند سروں کا ترجمہ کیا ہے. ترجمہ کو دیکھکر اصل میں کوئی تفاوت نظر نہیں آتا. چونکہ نیاز ھمایونی خود بھی شاعر ہیں، ان کی شاعری میں جدید رجحان پائے جاتے ہیں. شاہ بھٹائیؒ کے کلام کو فارسی منظوم شعر منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے. لیکن نیاز ھمایونی نے اپنی علمی وفنی

شاہ لطیف کے کلام کا فارسی ترجمہ مقالہ نگار میمن کریم بخش خالد رسالہ نئیں زندگی (سندھی) ماہ نومبر ۱۹۵۱ء

ارمغان لطیف کلام کا فارسی ترجمہ مترجم نیاز ھمایونی (شکارپور) سہ ماہی رسالہ مہران ا. ۱۹۶۲ء.

صلاحیتوں کو یک جا جمع کرکے یہ بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ نیاز ھمایونی اگر ھمت سے کام لے کر رسالہ کا مکمل ترجمہ کرے تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوگا۔ ترجمہ میں فن کے لحاظ سے وہی سادگی اور پختگی موجود ہے جو شاہ بھٹائی کے کلام میں موجود ہے۔ مثال دی جاتی ہے۔

تون حبيب تون طبيب! تون درد جي دوا
جانب منھنجي جيءَ ۾ آزار جا انواع
صاحب ڏج شفا، ميان مريض کي.

حبیب من، طبیب من! دوائے درد ہائے من،
ھمی خواھم مدد از تو کہ ناخوش زندگی دارم
بجانِ زار من افتاد آزاری زھر نوعی
مریض استم شفائے دہ کہ تا خوش زندگی داوم

* * *

سائين سدائين ڪرين مٿي سنڌ سڪار
دوست تون دلدار، عالم سڀ آباد ڪرين.

خداوند بود بارانِ رحمت بر دیارِ سندھ ———— نماند خشک سالی، سایہ گستر ابرِ نیسان باد
توئی دلدار خویش و غیر، پاسِ دوستی از تو ———— بہ امن و آشتی، عالم ھمہ آباد و شاداں باد۔

شاعرن جو سرتاج (سندھی)

یہ کتاب محترمہ بیگم خدیجہ داؤد پوتہ نے ۱۹۶۳ء میں مرتب کیا۔ پاکستان پبلیکیشن کی طرف سے شایع ہوا اس مجموعہ میں سندھ کے بڑے عالم جنہوں نے تمام زندگی کے رسالہ میں شاہ بھٹائی کے متعلق مقالہ دیئے ان کا مقالوں کا مجموعہ ہے جس میں انتیس معیاری مقالے موجود ہیں۔ اس کتاب سے ادب میں اچھا اضافہ ہے۔

کامل جو کلام :-

شاہ بھٹائی کے رسالہ سے اندازً ایک ھزار ابیات منتخب کرکے کتاب کی صورت میں "کامل کا کلام" کے نام سے ایک ھندو محقق پروفیسر جھمٹمل خوبچند بھاونانی نے ۱۹۵۴ء میں ھندوستان سے شایع کیا جسکو ھندوستان ساھتہ مالا بمبئی سے طبع کیا۔ شاہ بھٹائی کے کلام کو مختلف عنوانات سے پیش کیا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور اُنکا کلام و فکر :-

یہ کتاب عبدالغفار بلوچ نے ۱۹۶۰ء میں، شاہ لطیف بھٹائی کے شعر و فکر کو پیش کیا ہے کلام کا تقابل مولانا رومیؒ، حافظ شیرازی، غالب اور اقبال سے کیا ہے۔ اور تصوف کے حقائق کو پیش کیا ہے۔ شاہ بھٹائی کی شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ اور کلام کو قرآن اور حدیث کی روشنی سے ثابت کیا ہے کہ شاہ بھٹائی کا کلام روحانیت سے مالا مال ہے یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک انوکھی تصنیف ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی برسی :-

سندھی ادب مرکزی صلاحکار بورڈ کراچی کی طرف سے ایک خوبصورت کتابچہ ۱۹۴۲ء کو شایع کیا گیا۔ جس میں سندھ کے بزرگوں اور دانشوروں کے تقاریر اور مقالوں کو جمع کیا گیا۔ جو شاہ بھٹائی کے مختلف پہلوں پر ہیں۔

شاہ جون سورمیون :۔

یہ کتاب نارائنداس میوارام بھنبھانی نے شاہ بھٹائی ؒ کے رسالہ کی عورتوں کے کردار پیش کئے ہیں۔ جو آپ کے کلام کی روشنی میں دیئے ہوئے ہیں۔ اسکے علاوہ ان کی تصویریں بھی دی ہیں، جس سے انکے کردار کی عکاسی نظر آتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۴ء کو کراچی سے شایع ہوا۔

شاہانہ کلام :۔

شکارپور سندھ کے بزرگ وعالم مرحوم مولانا عبدالکریم چشتی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں شاہ بھٹائی ؒ کے کلام کی تشریح شایع کی تھی۔ اس کتاب میں مختلف عنوان اور مضمون کے لحاظ سے تقسیم کرکے دیا ہے۔

کارڻي (کارنی = سبب)

یہ تصنیف شاہ بھٹائی ؒ کی حقیقت محمدیؐ کے فلسفہ پر بہتریں تصنیف ہے۔ سندھ کے مشہور ادیب سرور علی سرور نے ۱۹۷۰ء میں مکمل کرکے شایع کی۔ تصوف کے حقائق اور جامع اصولوں پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ۳۲۵ صفحات پر مستمل ہے۔

روح رہاڻ :۔

ڈاکٹر ھوتچند مولچند گربخشانی نے اپنے مرتب کئے ہوئے رسالہ میں جن بھی عورتوں کی کہانیوں کو پیش کیا ہے، اُن کہانیوں کو علاحدہ کتاب کی صورت میں شایع کرائی تھی

فرائیڈ اور شاہ :۔

یہ تصنیف عبدالکریم لغاری نے شاہ بھٹائی ؒ کے ایک مقالہ "فرائیڈ اور شاہ" پر کڑی تنقید کی۔ ان دلائل کو کتاب کی صورت میں شایع کیا۔

شاہ کے گم شدہ ابیات :۔

محمد سومار شیخ نے تحقیق کرکے شاہ بھٹائی کے گم شدہ کلام کو جمع کرکے شایع کرایا ہے۔

کنز لطیف :۔

یہ کتاب شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ کے مختلف چند رسالوں پر تنقید کی ہے۔ اس کتاب عبدالجبار جونیجو نے تصنیف کیا ہے۔ اور ۱۹۶۱ء میں شایع ہوا

شاہ کا پیغام :۔

جناب حافظ محمد احسن نے ۱۹۵۱ء میں یہ کتاب شایع کی تھی۔ جس میں شاہ بھٹائی ؒ کے کلام کی تمثیلات میں ان کی تعلیم اور پیغام کو پیش کیا ہے۔ جو نثر مقفیٰ اور تجنیس حرفی میں لکھا ہے۔

سندھ کی ادبی تاریخ حصہ اول

یہ کتاب دو حصوں میں سندھ کے مایہ ناز ادیب مرحوم محمد صدیق میمن نے لکھیں۔ پھلی جلد میں قدیم شعراء کے ساتھ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ کے سوانح اور کلام پر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ شاہ بھٹائی ؒ کے متعلق اپنے تاثرات دیئے ہیں :۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی ؒ سندھ کے سرتاج شعراء ہیں، جنکو دنیا کا بہتریں شاعر کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ جن عالموں نے مغرب کے شعراء مثلاً شیکسپیئر، چاسر، گیٹی کو پڑھا ہے وہ بغیر کسی شک وشبہ کے اقرار کرتے ہیں کہ شاہ عظیم شاعر ہیں۔

سندھ کی ادبی تاریخ حصہ اول مصنف خانبھادر محمد صدیق میمن۔ مطبع ار ایچ احمد برادرس حیدرآباد سندھ۔

ان تصنیفات کے علاوہ مختلف جریدوں، رسالوں اور درسی کتابوں میں شاہ بھٹائیؒ کے کلام اور فلسفہ کے متعلق ذکر ملتا ہے۔ شاہ لطیف کی سالگرہ (عرس) کے مواقع پر جریدہ شایع کیئے جاتے ہیں:۔ جن کی تفصیل دی جاتی ہے:۔

رسالہ مہران	مرکزی سندھی ادبی صلاحکار انجمن۔ سالگرہ نمبر ۱۳۷۰ھ مرتب الحاج محمد صدیق میمن۔		
رسالہ مہران	” ” ” ”	۱۹۴۹ء	” ” ” ”
مخزن شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ	لطیف یادگار مرکز	۱۹۵۴ء۔	
مخزن فردوس لطیف نمبر	مرتب محبوب علی چنہ	۱۹۵۷ء۔	
عرفان لطیف	مرتب مولانا غلام محمد گرامی	۱۹۴۹ء۔	
یادگار لطیف ۲۴۰ سالگرہ نمبر	مرتب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ	۱۹۵۳ء	یادگار لطیف کامیٹی۔
یادگار لطیف ۲۰۲ ” ”	” ” ” ”	۱۹۵۴ء	” ایضاً ”
یادگار لطیف ۲۰۳ ” ”	مرتب بیگم زینت عبداللہ چنہ۔	۱۹۵۶ء	” ایضاً ”
یادگار لطیف	مرتب اسد اللہ شاہ حسینی۔	۱۹۶۰ء	” ایضاً ”
لطیفی لئوٗ	مولف محبوب علی چنہ۔	۱۹۵۱ء	بزم لطیف گورمینٹ کالج حیدرآباد
نئی زندگی رسالہ	مدیر عبدالواحد سندھی اور شمشیر الحیدری	۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۳ء	

محکمہ اطلاعات مغربی پاکستان اور سندھ کی طرف سے شایع کردہ:۔

عرفان لطیف، یاد لطیف، نذر لطیف، تحفۂ لطیف، گلستان لطیف، معرفت کے موتی، بھار لطیف، نقش لطیف، تنذ تنوار پیام لطیف

Sind-To day. Payam-e-Latif - Poet Loureate of Sind -- ASAR-I-LATIF

اردو:۔

ایک مقالہ رسالہ خیام لاہور کی ۱۶۔اپریل ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں ملک محمد فاروق خان ابعن آبادی نے لکھا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے حقائق کو افسانوی رنگ میں دیا ہے۔ جو اصلی حقیقت سے دور ہے۔ اور عشقیہ داستان شاہ لطیف جیسے تارک اور کامل ولی سے منسوب کیا ہے۔

خیابان پاک:۔

ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی کی طرف سے شاہ بھٹائیؒ کے کلام کا مشہور ادیبوں وشاعروں نے منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جن میں رشید لاشاری شیخ ایاز، ابن انشا، مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی، مرحوم حفیظ ہوشیارپوری، جمیل نقوی نے کلام ترجمہ کیا۔

کراچی یونیورسٹی میگزین ۱۹۵۷ء

اس میگزین کے نگران ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب تھے۔ ادارہ تحریر اردو کے ادیب خواجہ نیومحمود جیسی۔ ابن انشا اور مشفق خواجہ تھے۔ میگزن کے ۳۶ صفحہ پر ایک تحقیقاتی مقالہ بعنوان "شاہ عبداللطیف بھٹائی اور اردو شعراء کے مشترک صوفیانہ خیالات" محترمہ شمس صدیقی نے لکھا جس میں شاہ بھٹائی کے صوفیانہ خیالات کی وضاحت کی گئی ہے۔

روح ادب:

ماہنامہ رسالہ روح شمار نمبر ۱۵۔۱۶۔ جون ۱۹۵۳ء، مرتب ممتاز حسن، ادارہ فروغ ادب اردو کی طرف سے شایع ہوا۔ اس شمار

کے صفحہ ۱۰۴ سے ۱۲۵ تک شاہ بھٹائی پر دو عالمانہ مقالہ "سندھ کا عوامی شاعر" مقالہ نگار اردو کے عظیم نقاد سید وقار عظیم کی قلم سے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی پر ایک تحقیقاتی نظر "مقالہ نگار سندھ محسن ادیب ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے لکھا. اور شاہ بھٹائی کے کلام کا منظوم ترجمہ "شمال سے ہوا چلی" مترجم شہاب رفعت. یہ مقالہ لطیفیات ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں.

منکر مہران

مصنف اختر انصاری اکبرآبادی نے بڑی محنت اور تحقیق سے یہ کتاب تیار کرکے محکمہ اطلاعات حیدرآباد سندھ کی طرف سے شایع کیا، جس شاہ بھٹائی کے ہر پہلو پر تحقیقاتی اور علوماتی مواد جمع کیا ہوا ہے.

ارمغان لطیف:

مرحوم رشید احمد لاشاری نے شاہ لطیف کی سوانح اور سرکلیاں کی تشریح اور ترجمہ دیا ہے یہ کتاب جون ۱۹۶۱ میں شایع ہوئی.

عکس لطیف:

مرحوم آغا تاج محمد نے شاہ بھٹائی کی سوانح اور سرکلیاں کی نثر میں تشریح لکھی اور ۱۹۵۱ء میں شایع کی.

سندھی ادب

مرتب پیر حسام الدین شاہ راشدی نے ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی کی طرف سے مرتب کیا اس کتابچہ میں ۴۳ صفحہ پر شاہ بھٹائی کی سوانح اور کلام کے متعلق مختصر احوال دیا ہے.

مغربی پاکستان کے صوفی شعرا.

اس کتاب میں بھی شاہ لطیف کا احوال دیا گیا ہے اور دوسرے شعراء سے تقابلی موازنہ بھی نظر آتا ہے.

تاریخ ادبیات سندھ (اردو) باب سوم حصہ اول.

یہ تاریخ ادب کے دو حصہ مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی، زیر اہتمام گروپ کیپٹن سید فیاض محمود، ناظم و جنرل ایڈیٹر شعبہ تاریخ ادبیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے لئے مرتب کیا حصہ اول کے ۱۸ صفحہ سے ۲۷ صفحہ تک تفصیل سے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سوانح کلام اور ہمعصر بزرگوں کے احوال کو لکھا ہے.

روح لطیف:

یہ کتاب بھی مرحوم رشید احمد لاشاری کا اردو شعر میں منظوم ترجمہ ہے، جو انہوں نے ۱۹۵۴ میں کیا تھا، جس میں سرکلیاں اور سین کلیان سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری.

جناب اے. کے. بروہی نے ۱۹۵۴ء میں ایک محققانہ تقریر شاہ بھٹائی کے عرس پر ریڈیو پاکستان سے نشر کی تھی، جسکا اردو زبان میں ترجمہ کتابچہ کی صورت میں محکمہ مطبوعات فلم و اشتہارات حکومت پاکستان کی طرف سے شایع ہوئی.

نئی قدریں (سندھی ادب نمبر)

اختر انصاری اکبرآبادی نے ۱۹۵۳ء میں نئی قدریں کا خاص نمبر سندھی ادب پر شایع کیا، جس میں شاہ بھٹائی کی شخصیت و کلام مضامین موجود ہیں

عکس لطیف

اپر سندھ کے مشہور ادیب و شاعر آفاق صدیقی تعرف کے محتاج ہیں. انہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام اور شخصیت کا پچیس سال

سے مطالعہ کرتے آئے ہیں۔ اور شاہ بھٹائی رح کے کلام کا اردو زبان میں منظوم ترجمہ کرنے کے ماہر ہیں۔ یہ ان کی شاہ بھٹائی رح سے عقیدت ہے کہ آپ نے فکر اور نکتہ سنجی سے شاہ بھٹائی رح پر ایک جامع تصنیف پیش کردی جو ایک قابل قدر محنت ہے۔

ان تصانیف کے علاوہ بہت سے مقالے اور تقاریر بھی شایع ہو چکی ہیں۔ اور بہت سے جریدے بھی نظر آتے ہیں جو حکومت کی طرف سے شایع ہوتے رہے ہیں۔ جن میں گلستان لطیف۔ مرتب کریم بخش خالد، نغمات لطیف مرتب اختر انصاری اکبر آبادی، نذر لطیف مرتب مرحوم ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی۔ اور پیام لطیف قابل ذکر ہیں۔

حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائی رح کے شارح

مرحوم شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کی ذات گرامی سندھ کو ہمیشہ فخر رہیگا۔ اس برگزیدہ شخصیت کے علمی و ادبی کارنامہ سندھ کی ادبی تاریخ میں محفوظ ہیں جو ہمیشہ نشان راہ رہینگی۔ علامہ صاحب ایک غریب خاندان کے فرد تھے۔ اُنہوں نے علمی درجات کو طے کرتے ہوئے اس منزل پر پہنچے جہاں بہت کم ~~لوگ~~ پہنچے۔ علامہ موصوف کی ولادت ۹ شوال ۱۳۱۳ھ مطابق ۲۵ مارچ ۱۸۹۹ء کو تعلقہ سیہون کے ایک تاریخی بستی ٹلٹی میں ہوئی۔ اگرچہ انکا خاندان زراعت پیشہ رہا تھا۔ لیکن وہ سندھ کے عباسی (داؤد پوتہ) خاندان کی عظمت کے یادگار تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی، ثانوی تعلیم مدرسۃ الاسلام کراچی میں ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں داخل ہوئے ۱۹۲۱ء میں بی۔اے آنرز کی سند فرسٹ کلاس میں حاصل کرنے کے بعد بمبئی چلے گئے۔ جہاں ایم۔اے انگریزی اور عربی میں پاس کیا اور اُسی کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، کچھ عرصے کے بعد سندھ واپس چلے آئے اور ڈی۔ جے۔ سندھ کالج کراچی میں پہلے سندھی ادب کے لیکچرر مقرر ہوئے، اُسی زمانے میں ڈاکٹر گربخشانی کے معرکۃ الآرا تصنیف شاہ کے رسالہ کی ترتیب و تدوین میں مدد کی، دو حصے چھپنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا کی اسٹیٹ اسکالرشپ پر کیمبرج یونیورسٹی لنڈن جا کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لئے مقالہ لکھا[1] "پارسی شاعری پر عربی شاعری کا اثر" یہ کتاب انگریزی، عربی اور فارسی ادب کی ایک شاہکار ہے۔ ۱۹۲۷ء میں لنڈن سے واپس وطن آئے، تو انہیں سندھ مدرسہ کے پرنسپال مقرر کئے گئے۔ اس عہدے کے دوران سندھ کے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ تھوڑے عرصے میں اندھیری کالج بمبئی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو کر گئے۔ سندھ سرکار نے ۱۹۳۹ء میں انہیں ڈی۔پی۔آء مقرر کیا۔ آپ نے محکمۂ تعلیمات سندھ میں بڑی اصلاحات کی اسی طرح ۱۹۵۰ء میں رٹائر ہوئے۔ سندھ اور مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں ہندسرکار نے ان کی علمی خدمات کے پیش نظر شمس العلماء کا خطاب دیا۔ یہ علم ادب کا شمس ۲۲ نومبر ۱۹۵۸ء میں غروب ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب شاہ بھٹائی رح کے بڑے شارح تھے۔ اور بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے شاہ بھٹائی رح کے کلام، فلسفہ، تصوف، سوانح، رسالہ پر بیش بہا مقالے لکھے جو تحقیق کے بہترین نمونے ہیں۔ بھٹ شاہ کی درگاہ پر جاکر رسالہ کے صحیح نسخہ کو تیار کرنے میں بڑی محنت کی جو آج تک کسی بھی نہ کی ہے ۱۹۵۷ء میں سندھی ادبی بورڈ نے شاہ بھٹائی رح کے صحیح نسخہ مرتب کرنے کا کام آپ کے سپرد کیا۔ بڑی محنت سے کافی کام مکمل کیا تھا۔ لیکن اچانک وفات کی وجہ سے یہ عظیم کام رہ گیا۔ وہ مسودہ مولانا قاسمی صاحب کے سپرد کیا گیا۔ شاہ بھٹائی رح پر بہترین مقالہ تحریر کئے۔ جن میں شاہ کی عظمت کے اسباب انسان کامل شاہ کی نظر میں، شاہ لطیف اور رومی رح، سر سارنگ، بھٹائی کے کلام میں وحدت الوجود کا مسئلہ، شاہ کے رسالہ کی شاعری مشہور ہیں۔

سید میران محمد شاہ

سید میران محمد شاہ سندھ کی مشہور شخصیت، شاعر، ادیب اور سیاستدان تھے۔ سید میران محمد شاہ ۱۹۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو ٹکھر شہر ضلع

---

[1] The Influence of Arabic Poetry on the Development of Persian Poetry.

حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار سید زین العابدین شاہ متعلوی سادات میں سے تھے۔ شاہ موصوف کے دادا کا نام بھی میراں محمد شاہ تھا۔ یہ بزرگ انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں سر بارٹل فریئر کے مقرر کردہ سندھی رسم الخط کامیٹی کے ایک رکن تھے۔ انہوں نے قدیم سندھی زبان میں دو مشہور ناول "سدھا تورو" اور "کدھا تورو" "مفید الصبیان" لکھے تھے۔

سید میراں محمد شاہ کی ابتدائی تعلیم گھر میں حافظ محمد یوسف کے زیر نظر ہوئی۔ سندھ مدرسۃ السلام کراچی سے ۱۹۱۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرکے ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں سے ۱۹۲۰ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد گورمینٹ کالج بمبئی سے ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ اور حیدرآباد میں آکر وکالت شروع کی اور سیاست میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۶ء میں سندھ بمبئی سے علحدہ کرنے کی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی سندھ لیجسلیٹو اسمبلی کے میمبر اور پہلے اسپیکر ہوئے۔ ۱۹۵۳ء میں پاکستان سرکار کی طرف سے اسپین کے سفیر مقرر ہوئے

مرحوم شاہ صاحب کی ادبی خدمات قابل القدر ہیں۔ سندھی ادبی مرکزی بورڈ قائم کرنے میں بڑی کوشش کی۔ سندھی ادبی بورڈ کے شروع سے آخر تک میمبر اور چئیرمین رہے۔ اپنے اقتدار کے دور میں حضرت شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کی سالگرہ منانے کے لئے لطیف یادگار کاؤنسل کا قیام کیا۔ جسکے چیئرمین رہے۔ سندھ کے عالموں، ادیبوں، شعراء، فنکاروں کو ایک مرکز پر اکٹھا کیا۔ انہوں نے شاہ بھٹائیؒ کی عقیدت میں بے شمار مقالہ اور تقاریر کی ہیں جو

۲. دیوان بھیرومل مھرچند آڈوانی:۔

شاہ بھٹائیؒ کے شیدائی، اور سندھ کے مشہور نثر نویس دیوان بھیرومل مھرچند آڈوانی ۱۸۷۶ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۱۸۹۶ء میں میٹرک پاس کرکے ایکسائیز کے محکمہ میں نوکری شروع کی جہاں سے ۱۹۲۲ء میں انسپکٹر ہوکر رٹائرڈ ہوئے ۱۹۲۴ء میں بمبئی یونیورسٹی نے سندھی زبان کالج میں شروع کی اور اس کے پہلے لیکچرر مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ مقرر ہوئے۔ جب ڈاکٹر صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیئے لنڈن گئے تو اس خالی جگہ پر دیوان بھیرومل کو لیکچرر مقرر کیئے گئے۔ آپنی بچپن سے سندھی ادب سے بڑی محبت تھی، اور بہت سی تصنیفات لکھی تھی۔ شاہ لطیفؒ کی سیر وسیاحت پر ایک مستند تصنیف "لطیفی سیر" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کی وجہ سے دیوان صاحب نے وہ دشوار راستوں کا سفر کیا جہاں جہاں شاہ بھٹائیؒ نے سفر کیا تھا۔ اس موضوع پر آج تک پھر کسی نے قلم نہ اٹھایا۔ یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں شایع ہوئی تھی۔ جب ڈاکٹر گربخشانی نے رسالہ مرتب کیا تو اس پر شکارپور سندھ کے مشہور جریدہ "سندھو" میں تنقید کا مسلسل آٹھ قسط لکھے یہ تنقید سندھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دیوان بھیرومل ۱۹۵۳ء میں سرگواس ہوئے۔

مرحوم محمد بخش "واصف"

سندھی زبان کے باکمال شاعر مرحوم محمد بخش بن محمد عثمان "واصف" کی ولادت ۱۸۹۲ء کو سکرنڈ، ضلع نواب شاہ میں ہوئی۔ لیکن اُن کے والد کسی وجہ سے حیدرآباد منتقل ہوئے۔ واصف نے اپنی ابتدائی تعلیم ختم کرکے لینڈ رکارڈ آفس حیدرآباد میں ملازمت شروع کی اُنکو شروع سے ہی ادب اور شاعری سے دلچسپی تھی، اور اسلامی علوم سے گہرا لگاؤ تھا، عربی، فارسی، ہندی، سندھی اور سنسکرت زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ شاعری میں صاحب دیوان تھے اس کے علاوہ رباعیات واصف اور علامہ اقبال کی مثنوی اسرار رموز کا بھی منظوم ترجمہ کیا۔ واصف صاحب نے "شرح لطیفی" کے نام سے شاہ بھٹائی کے رسالے پر تفصیل شرح لکھنی چاہی، سر کلیان کے ابتدائی پچیس ابیات کی شرح لکھی جس میں ہر ایک بیت کو اسلامی نکتہ نظر اور تصوف کے مطابق قرآن وحدیث اور اقوال صوفیائے کرام کی روشنی میں لکھی۔ شاید ایسی شرح کسی اور عالم نے شاہ بھٹائی کے کلام کی نہ لکھی۔ واصف صاحب نے کن وجوہات کے بنا پر یہ عظیم کام چھوڑ دیا، شاید پوری ہمت افزائی نہ ہوئی۔ بہرحال اس مستند شرح سے سندھ محروم رہ گئی۔

مولانا دین محمد وفائی مرحوم :-

سندھ کی برگزیدہ شخصیت مولانا دین محمد وفائی مرحوم کی قومی اور ادبی خدمات کو آج بھی توقیر سے دیکھا جاتا ہے۔ ادب اور صحافت کے میدان میں یکتا روزگار تھے۔ انہوں اپنی زندگی گویا ادب اور علوم کی اصلاح میں صرف کردی۔ اپنی زندگی کا بڑا عرصہ سندھ کی مشہور روزنامہ اخبار "الوحید" کے مدیر رہے۔ جسکے ذریعہ سندھ میں دینی، علمی، تہذیبی، اخلاقی فلاح بہبود کے لئے کوشاں رہے۔ مولانا صاحب کی ولادت ۲۷ رمضان ۱۳۱۱ھ کو تعلقہ گڑھی یاسین کی ایک بستی "نبی آباد" میں ہوئی۔ اُن کے والد بزرگوار خلیفہ گل محمد جتی ایک سنجیدہ بزرگ تھے۔ انہوں مولانا صاحب کی تعلیم پر خاص توجہ کی تھی لیکن جب مولانا صاحب ۹ برس کے ہوئے تو اُن کی وفات ہوئی۔ اس طرح نونہال بچہ کی تعلیم انکی والدہ کے ذمے ہوئی۔ اس نیک سیرت خاتون نے مولانا کو وقت کے رواج کے مطابق عربی و فارسی کی اچھی تعلیم دلائی۔ جوانی کے زمانہ میں دو سال سندھ مدرسۃ السلام کراچی میں عربی و فارسی کے استاد بھی رہے۔ اسی زمانے میں جمیعت العلماء سندھ کے ناظم مقرر ہوئے، اور توحید رسالہ جاری کیا جو آخری عمر تک جاری رہا۔

مولانا وفائی مرحوم صاحب کثیر التصانیف تھے انہوں نے اندازً ۲۲ کتاب تصنیف کیئے۔ مولانا نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، اسی جذبہ کے تحت شاہ بھٹائی رح کی سوانح پر ایک کتاب "لطف اللطیف" یہ تصنیف مولانا صاحب کی آخری تصنیف تھی، جو وفات کے بعد شایع ہوئی۔ انکی وفات ۲۳ جمادالثانی ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ "لطف اللطیف" کتاب سندھ میں اتنی ہی مشہور ہے جتنی ڈاکٹر گربخشانی کی تصنیف "مقدمہ لطیفی" مولانا نے شاہ بھٹائی رح کی سوانح پر بڑی تحقیق کی ہے۔ جو لطیفیات میں سنگ میل حیثیت رکھتی ہے۔

مرحوم عثمان علی انصاری :-

سندھ کے زندہ دل ادیب اور ماہر تعلیمات۔ شاہ بھٹائی رح کے شیدائی اور بڑے شارح تھے۔ مرحوم انصاری صاحب کے والد میاں ہدایت علی انصاری سہارنپور ضلع کی ایک بستی جنت آباد (انبہ) ھندوستان سے ہجرت کرکے سندھ میں آئے اور شکارپور کو ہمیشہ کے لئے سکونت گاہ بنایا۔ اور پولیس محکمہ کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۰۱ء میں مرحوم عثمان علی انصاری کی ولادت ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم شکارپور میں ہوئی ثانوی تعلیم نازھاء اسکول خیرپور سے شروع کی لیکن پانچویں جماعت سے تعلیم گورنمنٹ ھاء اسکول شکارپور مکمل کرکے ۱۹۱۸ء میں میٹرک پاس کی ۱۹۲۲ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد انگلینڈ چلے گئے ۱۹۲۵ء میں ایم۔اے اور ڈپلوما جرنلزم میں کرکے سندھ کو واپس ہوئے۔ ۲۷ نومبر ۱۹۲۵ء میں میرپور خاص کے مدرسہ ھاء اسکول میں ھیڈ ماسٹر مقرر ہوئے ۱۹۴۰ء میں کراچی کے ایڈیوکیشنل انسپکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں سندھ کے آخری ڈی۔پی۔آئی مقرر ہوئی۔ ۱۹۵۷ء میں سرکاری نوکری سے سبکدوش ہوئے۔

انصاری صاحب نے شاہ بھٹائی رح کی شخصیت اور کلام پر بڑی تحقیق، شرح لکھی اور ایک رسالہ بھی مرتب کیا ہے۔ شاہ بھٹائی رح پر لکھے ہوئے مقالہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

مرحوم پروفیسر لطف اللہ بدوی

سندھ کے باکمال شخصیتوں میں سے مرحوم مخدوم پروفیسر لطف اللہ بدوی کی ذات گرامی کو بڑی عزت اور توقیر حاصل ہے۔ مرحوم بدوی صاحب سندھی زبان کے عظیم شاعر، ادیب، مورخ اور فلسفی تھے، آپ نے اردو زبان کی بھی بے لوث خدمت کی ہے۔ شمع علم کے صحیح معنوں میں پروانہ تھے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کے شیدائی اور انکے کلام کے بڑے شارح تھے۔ تو دوسری طرف علامہ اقبال کے بڑے مداح تھے۔ سندھی ادب کے اگرچہ مایۂ ناز ادیب تھے تو دوسری طرف اردو اور فارسی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اس دور عصبیت میں آپ کا دم غنیمت تھا۔ آپ دو مختلف اللسان قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ثابت ہوئے۔ آپ کی خوش خط مشہور ہے۔

مخدوم بدوی صاحب کی ولادت ۴ جولائی ۱۹۰۲ء کو شکارپور میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار مرحوم حاجی امام بخش خادم، اپنے دور کے بڑے

عالم فاضل اور بزرگ ادیب و شاعر تھے، اور اپنے وقت کے سندھی اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے عالم مانے جاتے تھے۔ مرحوم قلیچ بدوی صاحب کی ابتدائی تعلیم عربی فارسی اور انگریزی اپنے والد کے زیر نگرانی میں ہوئی۔ بچپن میں والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تھا، اسی طرح پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے تو والد کا بھی انتقال ہو گیا، اور بے یار و مددگار اس دنیا میں رہ گئے۔ تعلیم منقطع کرکے محکمہ تعلیم میں ملازمت شروع کی بعد میں ادھوری چھوڑی ہوئی تعلیم مکمل کرلی بچپن سے ذہین تھے، اس لئے علم ادب و شاعری سے بڑا شوق تھا، جو آگے چل کر نمایاں ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج شکارپور میں سندھی ادب کے استاد مقرر ہوئے، اور ۲ جولائی ۱۹۵۸ء میں پروفیسر ہوکر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آپ کے علمی ادبی خدمات کا دور ۱۹۲۰ء سے لے کر آخری گھڑی تک تھا۔

آپ کثیر تعداد میں تصنیفات چھوڑیں ہیں جن میں ۲۵ کے قریب شایع ہو چکی ہیں اور ایک سو دس کے قریب مسودہ موجود ہیں جو چھوڑے ہیں آپ نے اپنی قابلیت سے بڑا ممتاز مقام حاصل کیا۔ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کے بعد آپ کا اسم گرامی ادب کے بے لوث خدمتگاروں میں آتا ہے آپ کی مشہور تصنیفات تذکرہ لطیفی "تاریخ ادبیات سندھ" تین حصہ میں ہیں اور علامہ اقبال کی پوری فارسی تصنیفات کا سندھی زبان میں منظوم ترجمہ ہے جو اقبال اکیڈمی نے شایع کیئے ہیں۔ جن میں جاوید نامہ، اسرار رموز، ارمغان حجاز اور "مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" شمس العلماء علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ آپ کو "جوان فکر شاعر اور ادیب" کہتے تھے، پیر علی محمد شاہ راشدی نے آپ کی وفات پر اپنے تاثر یوں بیان کیئے:-

جوگی بڑے محقق اور عظیم اہل قلم ثابت ہوئے، اس سے زیادہ جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا کہ وہ بڑا انسان ثابت ہوا۔ انسان میں جو خصلتیں اور خوبیاں ہونی چاہئیں، وہ سب ان میں موجود تھیں، مرحوم نے کبھی کسی جاندار کو بھی دکھ نہ پہنچایا۔ اور کبھی کسی امیر کے آگے نہ جھکے، قانع، صابر اور خوددار زندگی بسر کی۔

آخر عمر میں آپ کے جوان و صالح فرزند پروفیسر احسان احمد بدوی کی شہادت کا انکو بڑا صدمہ ہوا۔ اس سانحہ کے تیس سال بعد یعنی ۱۹ نومبر ۱۹۶۸ء کی شام کو داعی اجل کو لبیک کہکر اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔

قلیچ بدوی صاحب نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ پر بڑی تحقیق کی تھی، عقیدت کے بنا پر بیت نظمیں لکھیں، اپنی تصنیف تذکرہ لطیفی میں بڑے تفصیل سے شاہ بھٹائی کی سوانح، فلسفہ، تصوف، کلام اور معاصر شعراء عرب وغیرہ پر لکھا جو ۴۲۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اردو زبان میں بھی سوانح لکھنی شروع کی تھی لیکن افسوس کہ یہ گرانقدر تصنیف ادھوری رہ گئی۔ بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ پر انداز بیس کے قریب تحقیقی مقالہ لکھے اور کلام کا اردو زبان میں بھی ترجمہ کیا جس میں سرمارئی بہت مقبول ہوا۔ سر موسل رانہ کے ابیات کا بھی منظوم ترجمہ کیا تھا، جن کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں۔ یہ ترجمہ کتنا جاذب اور شاہ بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ کے تخیل سے کتنا قریب ہے۔

سر موسل رانہ

داستان اول

۱۔ ایک جوگی راہ میں کل مل گیا،
سر پر تھی پیچیدہ پگڑی دلپذیر
اس پہ طرۃ موتیوں کی تھی لڑی
کر گیا زخمی، نگہ سے دل فقیر

۲۔ ایک جوگی راہ میں کل مل گیا،
چاند سے روشن تھا چہرہ برملا
وہ جگا کر دل میں فیض عشق کا
دے گیا، سر پر جدائی کی بلا

لہ شروع کے زمانے میں بدوی صاحب اپنے شعر میں "جوگی" تخلص کرتے تھے، لیکن بعد میں اپنے نام سے "لطف" تخلص اختیار کیا تھا۔

راہ میں کل مل گیا اک کاپڑی
جس کے چہرے سے نمایاں تھا جلال
اُس رخِ زیبا کا جلوہ دیکھ کر
چھا گیا منظر پہ اک رنج و ملال
سچ ہے موہل کے گیا جو سامنے
لوٹنا منزل پہ اُس کا ہے محال

۴

مل گیا کل راہ میں اک کاپڑی
جسم پر تھا غازۂ خاکستری
بازوؤں میں تھی چمکتی سبز شال
اور سونے کی تھی گردن میں مُنری
کس قدر موہل کا دلکش ہے مجاز
کچھ بتا دے اس کا شانِ دلبری؟

۵

مل گیا کل راہ میں اک کاپڑی
جسم پر اُن کے نمایاں تھا بھبھوت
اس حمیدہ ذات سے حاصل ہوا
بیقراروں، دردمندوں کو سکوت

۶

اس گدا پر چڑھ گیا جنگل میں کیف
"کاک" کی باتیں سناتے رو پڑا
زخم اندر جو لگے تھے کھل پڑے
مٹ نہیں سکتا قضا نے جو لکھا

۷

صبح صادق کی طرح جاذب ترین
روئی پاکیزہ تھی جوگی کی صفا
تاج سے آتی تھی خوشبو کی شمیم
عطر کی کثرت نے بھر دی تھی فضا
مرکزِ عشق و محبت کا نشان
دیدیا کس سادگی سے رہنما۔

۸

جس طرح جاذب طلوعِ آفتاب
بخش دیتا ہے سحر کو روشنی
اس طرح جوگی کے چہرے کی نمود
دیکھنے والوں کی تھی ابدی خوشی
اس کے چہرے کی تجلی دیکھ کر
خیرہ ہو جاتی تھی نظریں اک گھڑی
پان کی سرخی یا لالی موم کی۔
کہہ نہیں سکتا کہ کیا تھی دلکشی
اس قدر سوڈے کی الفت تھی عظیم
جس طرح سیلاب میں چڑھتی ندی

وائی

فکر کر ساتھی تیاری کا سدا — رہ ہمیشہ تو تیار
کاک چلنا ہے کبھی۔
راہرو کتنے لڈونے کو گئے — ہو نہیں سکتا شمار
کاک چلنا ہے کبھی۔
جو گیا ہے لوٹ کر آیا نہیں — موت پر کیا اختیار
کاک چلنا ہے کبھی۔
ایک دن آئے گا پیغامِ رحیل — یہ حیاتِ مستعار
کاک چلنا ہے کبھی۔
موت آکر تجھکو لے جائیگا — کوچ کا کر انتظار۔
کاک چلنا ہے کبھی۔
سوئے دلبر اب چلا عبداللطیف — چھوڑ کر سب انتشار
کاک چلنا ہے کبھی۔

1

مرحوم آغا تاج محمد خان:-

آغا تاج محمد بن آغا عبدالمجید خان ۱۹۰۴ء کو باگرجی گاؤں ضلع سکھر میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہوئی ثانوی تعلیم سکھر میونسپل ہائی اسکول میں ہوئی۔ بچپن سے ہی بڑے ذہین اور سمجھدار تھے۔ تقریر کرنے کا بیحد شوق تھا۔ ۱۹۲۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ڈی۔ جے۔ سندھ کالج سے ۱۹۲۹ء میں بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ ٹی پاس کر کے ۱۹۳۵ء میں سکھر ڈسٹرکٹ اسکول بورڈ میں پہلا ایڈیوکیشنل سپروائیزر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد لاڑکانہ ضلع کے ائڈمنسٹریٹو افیسر مقرر ہوئے ان نمایاں خدمات کی بنا پر انہیں خیرپور ریاست کا ڈی۔ پی۔ آئی مقرر کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں انہیں خانصاحب کا لقب ملا ۱۹۴۷ء میں سندھ یونیورسٹی وجود میں آئی تو آغا صاحب ان کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ آغا صاحب نے بہت مرتبہ امریکا کا سرکاری دورہ کیا۔ آغا تاج محمد خان حضرت شاہ بھٹائی رح کے شیدائی تھے۔ شاہ بھٹائی رح کی سالگرہ منانے اور ان کے کلام کو فروغ دینے میں بڑی کوشش کی لطیف یادگار کامیٹی کی بنیاد رکھی۔ شاہ بھٹائی پر بہترین مقالہ اور تقاریر کی اسکے علاوہ ایک کتاب ارمغان لطیف کے نام سے اردو زبان میں لکھی۔ جس میں سر کلیان کے ابیات کا اردو زبان میں ترجما کیا۔

رشید احمد لاشاری مرحوم:-

مرحوم رشید احمد لاشاری سندھی اور اردو ادب کے نوجوان ادیب تھے۔ سندھی زبان کے مانے ہوئے شاعر تھے۔ ان کے والد کا نام زرک خان لاشاری تھا۔ رشید کی ولادت ۱۹۲۲ء کو تحصیل ملگزار نصیرآباد ضلع سبی بلوچستان میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم چار درجہ اردو پڑھنے کے بعد اوگاھی گاؤں تعلقہ کندکوٹ میں فائنل کا امتحان پاس کیا اس دوران انکے والد کا انتقال ہو گیا ۱۹۳۹ء میں عربی فارسی کی تحصیل کے لئے شکارپور سندھ میں مدرسہ اشرف العلوم داخل ہوئے۔ شکارپور میں چند دوستوں کی صحبت میں رھکر شعر و شاعری شروع کی۔ جن لعل محمد لعل، مرحوم احسان احمد بدوی۔ ڈاکٹر نعیم صدیقی اور شیخ ایاز تھے۔ ۱۹۴۴ء میں پرائمری استاد ہوئے ذھانت کی وجہ سے ۱۹۵۲ء میں ٹریننگ کالج حیدرآباد میں استاد مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد کراچی چلے گئے جہاں رسالہ نئی زندگی کے اسسٹنٹ مدیر مقرر ہوئے اسکے ساتھ سندھی فلموں کے ڈائلاگ اور نغمے لکھنے شروع کیئے آخر جامعہ ملی کراچی میں سندھی ادب کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

رشید لاشاری نے شاہ بھٹائی پر بڑا کام کیا ہے مختلف سروں کی سندھی زبان میں تشریح اور اردو زبان میں کلام کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے جو اکثر شایع ہوا ہے

اختتامیہ

ہر عمل تکیہ مکن خواجہ کہ در روز ازل

تو چہ دانی قلم صنع بنامت چہ نوشت

(اے خواجہ اپنے عمل پر بھروسہ مت کر، اس لئے کہ تجھے معلوم نہیں ہے کہ بنانے والے قلم نے روز ازل تیرے نام پر کیا لکھدیا ہے)

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور اُنکے معاصر اُردو شعرا کے تذکرہ کو بڑی سرگرمی کے ساتھ شروع کیا تھا۔ جسے محنت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا چنانچہ اپنی ناچیز استعداد اور ذہانت کی تمام تر صلاحیتوں کو انتہائی سعی و جہد کی حد تک بروئے کار لایا۔ جس کی تکمیل میں مجھے بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جو اپنی جگہ پر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ سب قدسی نفس حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ سے عقیدتمندی اور آپ کے دیئے ہوئے اسباق کا نتیجہ ہے۔ جو جذبہ محبت سے اس دشوار کام کو اختتام پر پہنچایا۔

حقیقت سے دیکھا جائے تو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ شاعر سے بڑھ کر برگزیدہ، ولی اور صاحب دل عالم تھے۔ جنہوں نے اپنے عظیم پیغام سے سندھ کے معصوم عوام کو سیدھی راہ پر لانے میں کامیاب ہوئے۔ جسکا فیض آج تک جاری ہے۔ آپ کے کلام پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی شاعری محبت اور امید، خوشی اور حسن کا ایک ایسا پرکیف اور پر سحر نغمہ ہے جس کے ذریعے آپ نے انسانوں کی زندگی میں خوش دلی پیدا کی اور اس طرح ان کے دلوں میں روحانیت اور مسرت کا اضافہ کیا۔ شاہ بھٹائیؒ کی شاعرانہ عظمت یہ ہے کہ اُنہوں نے محض ایک نقطہ نظر پیش کرکے زندگی کی تنقید ہی نہیں کی بلکہ زندگی کو ایک خاص طریقہ سے بسر کرنے کی ترغیب دی۔ جس نظریہ اور زندگی کے اسلوب کا پیغام دیا۔ اس کا رس اور آہنگ اُن کے کلام میں بسا ہوا ہے۔ جو سننے یا پڑھنے والے کے جذبات میں وہی شیریں اصوات اور وہی نغمے کے سُر گونجنے لگتے ہیں۔

کسی شاعر کی اہمیت اور اُسکا مقام، اُس وقت ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ جب کہ ہم اُسکے زمانے کے معاصر شعرا سے مقابلہ کریں پھر اسکے ماقبل اور مابعد کے دوروں میں شعری تحویل کا مطالعہ کریں، اُسے دیکھیں اور مجموعی طور پر اُن کی باریکیوں کے مد مقابل اس شاعر کے متعلق اظہار نظر کریں اور فیصلہ دیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے متعلق اگر ہمارا مقصد صحیح اور فیصلہ کن ہو تو یہ ضروری ہے کہ اُن کے کلام کا روحانی طور پر مطالعہ کریں اور اُن کے شعر کی لفظی اور معنوی خصوصیتوں سے واقفیت حاصل کرکے، اُن کا آپس میں مقابلہ کریں۔ اس ترتیب سے شاہ بھٹائیؒ کے زمانے اور اُنکے شعر تک رسائی حاصل کریں پھر انکی شاعری پر دو پہلوؤں سے نظر ڈالیں پہلے دیکھیں کہ استعمال شدہ الفاظ مہارت کے لحاظ سے کلمات و ترکیبوں کی ساخت اور کلام میں ظاہری حسن پیدا کرنے میں حاصل کیئے ہیں۔ دوسرا معنوی لحاظ سے شاعر نے مضامین میں مقصد بیان کس مناسب الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ مختلف انواع شاعری کے فنون میں ماہر تھے، وہ قدیم اسلوب شعر ہندی اور فارسی زبانوں کو خوب سمجھتے تھے ان زبانوں کا کبھی اقتباس بھی کرتے تھے۔ لیکن وہ نئی طرز اسلوب اور ہیئت کا موجد اور بانی تھے۔ اُن کی شاعری ہندی اسٹائیل کے مشابہ ہے جس کی تقلید بعد کے شعرا نے کی اور اس قدیم اسلوب کی شاعری نے دوبارہ عروج حاصل کیا۔ اپنے کلام کی وجہ سے لافانی شہرت کے مالک ہوئے۔ فنی خوبیوں اور شاعرانہ تخیلات میں سندھی شعرا سے بڑھ کر ہیں۔ بلکہ دوسری زبانوں کے شعرا سے بھی سبقت حاصل ہے۔ شاہ لطیف نے سندھی زبان کو زندہ کیا اور اُسے نئی رونق بخشی اپنے کلام کے ذریعے ہم وطنوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے روحانی تعلق کو تازگی عطا کی۔ آپ کے کلام میں جو کچھ بھی موجود ہے، وہ آیات قرآن سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جس نے خدا تعالیٰ اور انکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کو اپنے سامنے رکھا، انکی نجات

لابدی ہے۔ شاہ بھٹائی رح کے رسالہ میں ایران کی شاعری طرح گل و بلبل، گل و خار کی شاعری نہیں ہے بلکہ انہوں نے وطن کے خس وخاشاک کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مولانا جلال الدین رومی کی طرح بنی نوع انسان کو تصوف کے شاہراہ پر لے آنا چاہا جس میں امن و سلامتی، عشق و محبت، دلسوزی اور جذبہ اصلاح موجود ہے۔ دوسری طرف انسانی تخلیق کی مراد اپنے خالق سے وابستگی کو لیا ہے۔ عارفوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ "الدنیا سجن المومنین" ہے۔ دنیا میں اگر آپکے زیب و نگار پر اپنے خالق کو بھلانا دانشمندی نہیں ہے۔ شاہ بھٹائی رح نے اس حقیقت کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

سو نمن وجایم سومرا، میرو منهن ٿیوم

وڃڻ تت پيوم، جت ملڻ ناهه حسن ري

عمر سومرہ (بادشاہ) میں یہاں آکر اپنا حسن گنوایا ہے اور میری صورت میلی ہوگئی ہے۔

مجھے تو اس جگہ جانا ہے جہاں حسن کے بغیر چلنا ممکن نہیں ہے۔

یہی سبب ہے کہ سرزمین سندھ کو شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کی شخصیت اور پیغام پر فخر حاصل ہے۔ شاہ بھٹائی کا کلام شریعت اور مذہب، افادیت اور مقصدیت کی حیثیت سے دنیا کے شعرا میں بلند مقام رکھتا ہے۔

جناب اختر حسین سابق گورنر نے شاہ بھٹائی رح دوسو سالہ سالگرہ سنہ 1959 میں بھٹ شاہ پر اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

"حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی رح نے تمام سلیس اور دلنشیں رنگ میں اخلاقیات اور روحانیت کے منازل طے کرادیں اس بزرگ نے انسانی فلاح اور بھبود کے لئے ناقابل فراموش کارنامے سرانجام دیئے، انکا روحانی پیغام زندہ اور زندگی بخش ہے، انکے کلام کا کیف اور ذوق ہمارے دلوں پر طاری ہے۔ یہاں تک کہ ہم کوئی بھی اخلاق اور روحانی سبق اس بزرگ کے بغیر مکمل کر نہیں سکتے۔ شاہ صاحب نے ادب، تصوف اور بصیرت کی ہم آہنگی سے انسانی فکر کے لئے ایسا سرمایہ جمع کیا ہے، جس سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ شریعت و طریقت کے الفاظ اور حقیقی معنی کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ ان خدمتوں کے باعث انہیں حیات جاودان عطا ہوئی ہے۔"

ہندوستان کے اکثر شعرا کے کلام میں تضمین کا وجود کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے یہ صنف اس لئے ناگزیر ہے کہ شعرا نے اپنے متقدمین کے کلاسیکی ادب یا مصاحف قدیم کا سہارا لیتے ہیں۔ فارسی زبان کے شعرا میں عربی زبان کی عبارتوں اور قرآن پاک وحدیث کے فقروں یا ان کے اشاروں سے اعتنا کرتے ہیں۔ شیخ سعدی رح جیسے بزرگ شاعر نے عرب کے شاعر متنبی کے مضامین اور آسنوازیاں سے استفادہ کیا ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی رح نے قرآن پاک و حدیث کے مطالب کو کمال حسن کے ساتھ اپنے اشعار میں داخل کیا ہے۔ اس طرح شاہ بھٹائی رح کے کلام میں جابجا تضمین کے خوش تراش نگینے اپنی تابانی سے موجود ہیں اور بڑی خوبی سے قرآن پاک کی آیتوں، حدیث اور عربی مقولوں کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ اور اپنے عالمانہ فکر سے ان کی معنی بھی شعر کی صورت میں پیش کرتے جاتے ہیں۔

اردو شعرا نے بھی اکثر اپنے کلام میں فارسی، عربی اور ھندی شعرا کے کلام کے اشعار کو تضمین کے طور پر استعمال کیا ہے یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ اردو زبان کی نشو نما دکن میں ہوئی۔ اس دور کے ادبی سرمائے کا بڑا حصہ مذہبی، عشق الٰہیات اور تصوف پر مشتمل ہے۔ خواجہ میر درد کی ایک مثال دی جاتی ہے

درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست

تونے سنا نہیں ہے یہ مصرع مگر کہیں۔

ایک اور شاعر کی مثال ہے :۔

صنما برب کریم یاں وہ ہر ایک تیرا ہے مبتلا
یہ اگر الست بربکم، تو کہے تو کہہ ابھی "بلیٰ"

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے سر مارئی کے شروع بیت میں اس خیال کو دیا ہے ۔

اَلَستُ بِرَبِّکُمْ ، جڈھن کن پیوم
قالُوا بلیٰ ، قلب سین ، تڈھن تت چیوم
تڈھین وپر کیوم ، وچن ، ویڑھیچن سین ۔

اس بیت کا اُردو زبان میں ترجمہ جناب پروفیسر لطف اللہ بدوی مرحوم کا دیا جاتا ہے ۔

کان میں بانگ الستی کی پڑی جس دم صدا
قلب نے صدق و صفا سے کہہ دیا قالوا بلیٰ ۔
اور یارانِ وطن سے باکمالِ ذوق و شوق
میں نے فوراً عہد و پیمانِ محبت کر لیا ۔

سندھ کا صوبہ اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ یہاں کی سرزمین کو تصوف کی آب وہوا سے ہمیشہ ایک خاص تعلق رہا ہے ۔ ان مسلمان صوفیاء کرام کا اثر و اقتدار لوگوں پر برابر ہوتا رہا ۔ اسلام کی تبلیغ اور مسلمان کے عروج کو، تصوف کی تاریخ کی مدد سے مرتب کیا جا سکتا ہے ۔ جس سے لوگوں میں محبت، حسن اخلاق، سچائی اور انسانیت کا جذبہ پیدا کیا جاتا تھا ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ ایک سچے صوفی تھے ۔ جن کے اوپر خالص شریعت کا بڑا[15] اثر تھا ۔ اُردو داں حضرات شاہ بھٹائی کی صوفیانہ شاعری اور شخصیت کے متعلق سنتے ہیں تو اُن کا خیال ایک رواجی تصوف کی طرف جاتا ہے ۔ جس کے لئے فارسی اور اُردو ، دنیا سے تارک ہونے کی تلقین کرتے ہیں ۔ لیکن شاہ بھٹائیؒ کا عمل حقیقی اور روحانی قدروں میں سے ہیں ۔ جو عمل کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت دیتے ہیں ۔ سچا صوفی وہ ہے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت کے احکاموں پر پورا عمل کریں اور دل کو صاف اور پاک رکھیں ۔

علامہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے :۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اور شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اس بات پر علامہ اقبال سے اختلاف رکھتے ہیں علامہ اقبالؒ کہتے ہیں ، مسلم قوم ! اپنی خودی کو اتنا بلند کر دے کہ وہ پوری کائنات پر قابض ہو جائے لیکن مولانا رومیؒ اور شاہ بھٹائیؒ فرماتے ہیں ، خودی کو مار دیں تو دوست کا دیدار نصیب ہو ، اور پوری کائنات پر قدرت حاصل کر سکیں "

سچ بھی یہی ہے کہ خودی اور خدا کبھی اکھٹے رہ نہیں سکتے ۔

وَلَا تَجْعَلْهُ غَاضِبًا عَلَيْنَا ۝ وَاغْفِرْ لَنَا وَلِوَالِدِيْنَا وَلِجَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ الْاَحْيَآءِ مِنْهُمْ وَالْمَيِّتِيْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ماخذات

سندھی کتب

نمبر	مصنف کا نام	کتاب کا نام	ناشر	سال
۱	احسان احمد بدوی پروفیسر	تنقید و تنقید نگاری	انٹرنیشنل پریس میکلوڈ روڈ کراچی	۱۹۵۹ء
۲	احسان احمد بدوی پروفیسر	سانگی شخصیت اور کلام	ٹیکنیکل پرنٹرس میکلوڈ روڈ کراچی	۱۹۶۵ء
۳	امداد علی امام علی قاضی علامہ	رسالہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ	
۴	ارنیسٹ ٹرمپ	رسالہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ	..	
۵	بھیرومل مہرچند آڈوانی	لطیفی سیر	کرائون الیکٹرک پرنٹنگ ورکس حیدرآباد	۱۹۴۴ء
۶	عبد الکریم بلڑیؒ سید	بیان العارفین و تنبیہ الغافلین (مترجم عبد الرحمٰن)	مرتب محمد رضا عبد الواسع ٹھٹوی	۱۹۰۹ء
۷	عبد الغفار خان بلوچ	شاہ لطیف بھٹائی انکا کلام و فکر	وفاق پبلشنگ ہاؤس کراچی	۱۹۵۱ء
۸	عبد الجبار جونیجو	کنز اللطیف حصہ اول	ابراہیم پریس حیدرآباد سندھ	۱۹۶۱ء
۹	عمر بن محمد داؤد پوتہ شمس العلماء ڈاکٹر	کلام شاہ عبد الکریم بلڑیؒ	مولوی عبد الصمد شرف الدین بمبئی	
۱۰	عمر بن محمد داؤد پوتہ "	ابیات سندھی	ایڈیوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی	۱۹۳۹ء
۱۱	عمر بن محمد داؤد پوتہ "	کلام گرہوڑی	سندھی ادبی بورڈ سوسائٹی کراچی	۱۹۵۹ء
۱۲	غلام مرتضیٰ - ایم۔ سید	پیغام لطیف	ادارۂ انسانیت حیدرآباد سندھ	۱۹۵۴ء
۱۳	غلام محمد شاہوانی	رسالہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ	آر۔ ایچ۔ احمد برادرس حیدرآباد	۱۹۵۴ء
۱۴	قلیچ بیگ مرزا	احوال شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ	..	
۱۵	قلیچ بیگ مرزا	لغات لطیف	..	
۱۶	قاسمی غلام مصطفیٰ مولانا	رسالہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ	..	
۱۷	کلیانڑ آڈوانی پروفیسر	رسالہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ	ہندوستان کتاب گھر انڈیا	۱۹۵۸
۱۸	کلیانڑ آڈوانی "	شاہ	چیتن لیکھراج ماڑیوالا ہیڈمنڈ کالج بمبئی	
۱۹	رچرڈ برٹن مترجم (حنیف صدیقی)	سندھ اور سندھو ماتھری میں بسنے والی قوم	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ	۱۹۶۱ء
۲۰	سرور علی سرور	کارنی (شاہ بھٹائیؒ کا فلسفہ)	آر۔ ایچ احمد برادرس حیدرآباد سندھ	۱۹۵۹ء
۲۱	لطف اللہ بدوی پروفیسر	تذکرہ لطفی (تاریخ ادبیات سندھ حصہ اول)	آر۔ ایچ۔ احمد برادرس حیدرآباد	۱۹۶۳ء
۲۲	لطف اللہ بدوی پروفیسر	کنڈری والوں کا کلام	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ	۱۹۶۴ء
۲۳	لطف اللہ بدوی پروفیسر	سندھ میں تصوف اور صوفیانہ شاعری	مسودہ	
۲۴	لطف اللہ بدوی پروفیسر	بیاض لطفی	مسودہ	
۲۵	مولوی دین محمد وفائی	لطف اللطیف	..	
۲۶	مخدوم ابوالحسن سندھی	مقدم الصلوٰۃ	..	

۲۷- محمد بخش واصف .. شرح لطيف .. جارج پريس حيدرآباد سنڌ ۱۹۳۵ع

۲۸- مخدوم محمد زمان طالب المولىٰ .. ڪافي ..

۲۹- محمد صديق ميمڻ .. سنڌي ادبي تاريخ .. سنڌي مسلم ادبي سوسائٽي حيدرآباد

۳۰- نبي بخش خان بلوچ ڈاڪٽر .. رسالہ شاہ عبداللطيف ڀٽائي رح .. شاہ لطيف ثقافتي مرڪزي ڪاميٽي ڀٽ شاہ ۱۹۵۱ع

۳۱- نبي بخش خان بلوچ " .. بيلائن جا ٻول .. سردار علي شاہ بخاري الوحيد پريس ڪراچي ۱۹۵۱ع

۳۲- نبي بخش خان بلوچ " .. ميون شاہ عنايت . .. سنڌي ادبي بورڊ حيدرآباد

۳۳- هوتچند مولچند گربخشاني ڈاڪٽر .. رسالہ شاہ عبداللطيف ڀٽائي رح .. ڪمشنر صاحب ڪا پريس ڪراچي ۱۹۳۲ع

۳۴- هوتچند مولچند گربخشاني " .. لنواري جا لعل .. ايڊيوڪيشنل پبليڪيشن ڪراچي ۱۹۳۴ع

۳۵- هوتچند مولچند گربخشاني " .. مقدمہ لطيفي ..

سنڌي جريده

۳۶- افڪار قلندري .. .. محڪمہ تعلقات عام مغربي پاڪستان

۳۷- اخبار الوحيد (آزاد نمبر) .. الوحيد پريس ڪراچي ۱۹۳۶ع

۳۸- الرحيم (سنڌي) رسالہ .. مدير: مولانا غلام مصطفىٰ قاسمي ۱۹۷۱ع

۳۹- بهار اخلاق رسالہ .. مدير:

۴۰- پيام لطيف جريدہ .. سالگرہ شاہ لطيف محڪمہ تعلقات عام سنڌ

۴۱- تحفة اللطيف " .. ڈاڪٽر عارف شاہ جيلاني محڪمہ مغربي پاڪستان ڪراچي

۴۲- ستارِ سنڌ رسالہ .. .. مدير: پير علي محمد شاہ راشدي

۴۳- سنڌو رسالہ .. .. مدير: ٻولچند مہاجيال .

۴۴- عام راءِ رسالہ .. .. مدير: قاضي فيض محمد الوحيد پريس ڪراچي ۱۹۵۰ع

۴۵- گلستان لطيف جريدہ .. ڪريم بخش ميمڻ - محڪمہ مغربي پاڪستان ڪراچي .

۴۶- شاعرن جو سرتاج .. .. مرتب بيگم خديجہ داؤد پوٽہ پاڪستان پبليڪيشن ڪراچي ۱۹۲۳

۴۷- مہراڻ رسالہ .. .. سنڌي ادبي بورڊ . حيدرآباد سنڌ .

۴۸- مہراڻ رسالہ .. .. سنڌي ادبي بورڊ ڪراچي .

۴۹- مہراڻ . .. .. محمد صديق ميمڻ . لطيف يادگار ڪاميٽي .

۵۰- مخزن شاہ لطيف رح .. لطيف ڪاميٽي

۵۱- نئين زندگي رسالہ .. مدير مولانا عبدالواحد سنڌي

۵۲- ياد لطيف .. .. ڈاڪٽر نبي بخش خان بلوچ

۵۳ ياد لطيف .. .. بيگم زينت عبدالله چنہ .

۵۴ نخلستان مخزن .. گورنمينٽ ڪاليج شڪارپور سنڌ ۱۹۶۹ع

اُردو کتب

۵۵۔ ابو اللیث صدیقی ڈاکٹر	.. لکھنو کا دبستانی شاعری	.. اردو اکیڈمی سندھ
۵۶۔ ابوالکلام آزاد مولانا	.. حیات سرمد	..
۵۷۔ آیاز شیخ مبارک علی	.. رسالہ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ	.. سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۳ء
۵۸۔ اعجاز الحق قدوسی	.. تذکرہ صوفیایہ سندھ	.. اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۹ء
۵۹۔ امان اللہ خان ظلاتم الجوہری	.. غوث اعظم	.. شیخ غلام علی سنز لاہور ۔ مترجم ارمان سرحدی
۶۰۔ اربری۔ جے ۔ آرتھر	.. تاریخ تصوف۔	..
۶۱۔ ارسطو ۔ مترجم عزیز احمد	.. فن شاعری	.. انجمن ترقی اُردو دہلی ۱۹۴۱ء
۶۲۔ اظہر حسین نظیر لدھیانوی	.. تذکرہ شعراء اُردو	.. عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۵۳ء
۶۳۔ احمد حسین منشی	.. حالات سودا	.. خادم التعلیم لاہور ۱۸۹۶ء
۶۴۔ آغا محمد باقر	.. تاریخ نظم نثر	.. شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۲۵ء
۶۵۔ ابو سعید نورالدین ڈاکٹر	.. اسلامی تصوف اور اقبال	.. اقبال اکادمی کراچی ۱۹۵۹ء
۶۶۔ اُمہ عامیہ خاتون	.. حیات ابدی	..
۶۷۔ ابوظفر ندوی سید	.. تاریخ سندھ	.. معارف اعظم گڑھ دکن ۱۹۴۷ء
۶۸۔ خلیل الرحمان داؤدی	.. دیوان درد	.. مجلس ترقی اردو لاہور
۶۹۔ خواجہ غلام فریدؒ	.. دیوان فرید	.. عزیز پریس بہاولپور ۔ مولانا عزیز الرحمن صاحب
۷۰۔ دارا شکوہ شہزادہ	.. سفینۃ الاولیا	.. نفیس اکیڈمی کراچی ۔ مترجم محمد علی لطفی
۷۱۔ رام بابو سکسینہ	.. تاریخ اَدبِ اردو	.. گلوب پبلیشرز لاہور ۔ مترجم محمد عسکری
۷۲۔ راگوزون ۔ زیڈ ۔ اے ۔ میڈیم	.. ویدک ہند رگ وید	.. مترجم مولوی حمید احمد انصاری۔
۷۳۔ سلیمان ندوی سید مولانا	.. نقوش سلیمانی	.. اردو اکیڈمی سندھ حیدرآباد ۱۹۶۷ء
۷۴۔ سدھیشور ورما	.. آریائی زبانیں	.. مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۶۰ء
۷۵۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ	.. شاہ ولی اللہ کی تعلیم	.. سندھ یونیورسٹی حیدرآباد مترجم غلام حسین جلبانی ۱۹۶۳ء
۷۶۔ سید محمد عباس	.. سفینۂ غزل	.. تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور ۱۹۵۸ء
۷۷۔ طٰہٰ حسین ڈاکٹر۔	.. ابن خلدون	.. مترجم عبد السلام ندوی
۷۸۔ طٰہٰ حسین ڈاکٹر	.. تنقیدات طٰہٰ حسین	.. مترجم عبد الصمد صارم مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۱ء
۷۹۔ عابد علی عابد سید	.. اصول انتقادِ ادبیات	.. مجلس ترقی ادب لاہور
۸۰۔ عباس محمود العقاد	.. حضرت علی شخصیت اور کردار	.. مترجم منہاج الدین اصلاحی
۸۱۔ عبد الرحمٰن ابن خلدون	.. مقدمہ تاریخ ابن خلدون	.. مترجم مولانا سعد حسن خان یوسفی
۸۲۔ عبد الحق محدث دہلوی	.. اخبار الاخیار	.. دار الاشاعت کراچی ۱۹۶۳ء

۸۳- عبد السلام ندوی مولانا .. شعر الہند حصہ دوم .. معارف۔ اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

۸۴- عبد المجید سالک .. مسلم ثقافت ہندوستان میں .. ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان ۱۹۵۷ء

۸۵- عبد اللہ سید ڈاکٹر .. ولی سے اقبال تک .. مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۸ء

۸۶- عبد الرحمٰن .. مرآۃ الشعرا .. جید برقی پریس دہلی

۸۷- عبد الوحید ڈاکٹر .. شعرائے اردو .. فیروز سنز لاہور

۸۸- علامہ شبلی نعمانی .. الغزالی .. معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۸ء

۸۹- غلام رسول مہر .. تاریخ سندھ کلہوڑہ دور .. سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸ء

۹۰- فتح محمد سیوانی حکیم .. آئینہ سکندر لال شہباز قلندر .. منشی رام اگروال تاجر کتب لاہور

۹۱- فرید الدین عطار شیخ .. تذکرہ الاولیا .. مترجم علامہ عبد الرحمٰن شوق۔ مکتبہ سراج الدین سنز لاہور

۹۲- گب پروفیسر .. مقدمہ تاریخ ادبیات عرب .. مترجم سید محمد اولاد علی گیلانی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۵۹ء

۹۳- گستاؤلی بان .. تمدن عرب .. مترجم شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی۔ اعظیم پریس دکن ۱۹۳۶ء

۹۴- جعفر علی صاحب نشتر .. آب بقا .. المشتہر مہادیو پرشاد ورما نظیر آباد لکھنؤ ۱۹۱۸ء

۹۵- لطف اللہ بدوی پروفیسر .. تاریخ ادبیات سندھ (مسودہ) .. شعبۂ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۸ء

۹۶- لطف مرزا علی .. گلشن ہند (علی ابراہیم کے فارسی تذکرہ کا اضافہ) عبد اللہ خاں — دارالاشاعت پنجاب ۱۹۰۶ء

۹۷- محمد انوار الحسن .. حیات امداد .. شعبہ تصنیف و تالیف مدرسہ عربی کراچی ۱۹۶۵ء

۹۸- محمد اقبال ڈاکٹر .. زبور عجم .. شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۴۴ء

۹۹- محمد اقبال ڈاکٹر .. پیام مشرق .. ۱۹۴۸ء

۱۰۰- محمد اقبال ڈاکٹر .. اسرار رموز .. " " ۱۹۴۳ء

۱۰۱- محمد عزیز الرحمان بھاولپوری .. تاریخ قلعہ مروٹ .. عزیز المطابع پریس بھاولپور ۱۹۵۳ء

۱۰۲- محمد عزیز الرحمٰن بھاولپوری .. صبح صادق طبع ثانی .. عزیز المطابع پریس بھاولپور ۱۹۴۳ء

۱۰۳- محمد مبارک العلوی الکرمانی سید .. سیر الاولیا .. مترجم غلام احمد بریانی۔ مسلم پریس دہلی ۱۳۲۰

۱۰۴- محمد نجم الغنی .. بحر الفصاحت .. منشی نولکشور واقع لکھنؤ ۱۹۲۶ء

۱۰۵- محمد یحیٰ تنہا مولوی .. سیر المصنفین .. شیخ مبارک علی تاجران کتب لاہور ۱۹۲۸ء

۱۰۶- محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نواب .. گلشن بے خار .. نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء

۱۰۷- محمد حسین آزاد مولانا .. آب حیات .. شیخ مبارک علی تاجران کتب لاہور

۱۰۸- محمد نصیر الدین ہاشمی .. دکنی کلچر .. مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳

۱۰۹- محمد نصیر الدین ہاشمی .. دکن میں اردو .. مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۲ء

۱۱۰- محمود خاں شیرانی حافظ .. پنجاب میں اردو .. مکتبہ معین الادب لاہور

۱۱۱- مصطفیٰ حلیمی پاشا .. تاریخ اسلام .. مترجم رئیس احمد جعفری لاہور ۱۹۵۰ء

۱۱۲۔ مصطفیٰ حلیمی پاشا .. تاریخ تصوف اسلام .. مترجم۔ رئیس احمد جعفری

۱۱۳۔ ملک محمد جائسی .. پدماوت بھاکھا .. مترجم۔ بنڈت بھگوت پرشاد۔ منشی نولکشور راء لکھنو

۱۱۴۔ محی الدین زور سید ڈاکٹر .. ہندوستانی لسانیات .. مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۶۱ء

۱۱۵۔ مجدد الف ثانی حضرت امام ربانی رح .. مکتوب امام ربانی .. مترجم۔ قاضی عالم الدین۔ ملک فضل الدین لاہور ۱۹۱۳ء

۱۱۶۔ مسعود حسین ڈاکٹر .. مقدمہ تاریخ زبان اردو .. مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۱۱۷۔ محبوب عالم منشی .. اسلامی سائکلوپیڈیا

۱۱۸۔ میرامن دھلوی .. باغ بہار .. مترجم۔ عطا حسین خان۔ نیا ادارہ ادب لاہور ۱۹۵۷ء

۱۱۹۔ میر تقی میر .. دیوان ولی دکنی

۱۲۰۔ نورالدین عبدالرحمٰن جامی رح مولانا .. نفحات الانس (اردو ترجمہ) .. مترجم مولانا حافظ علی احمد چشتی۔ منشی نولکشور راء لکھنو ۱۹۰۲ء

۱۲۱۔ نبی بخش خان بلوچ ڈاکٹر .. سندھ میں اردو شاعری .. مہران آرٹس کاؤنسل حیدرآباد سندھ

۱۲۲۔ نورالحسن ہاشمی ڈاکٹر .. دلی کا دبستان شاعری .. ترقی اردو ادب دہلی

۱۲۳۔ کلیم الدین احمد .. اُردو شاعری پر ایک نظر

۱۲۴۔ شوکت حسین سبزواری ڈاکٹر .. اُردو زبان کی ارتقاء .. گہوارہ ادب ڈھاکہ ۱۹۵۶ء

۱۲۵۔ اُردو دائرۃ معارفِ اسلامیہ .. مدیر۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا۔ پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور

۱۲۶۔ محمد قاسم فرشتہ تاریخ فرشتہ .. منشی نولکشور راء لکھنو ۱۹۳۳ء

۱۲۷۔ تاریخ ادب اُردو .. اِدارہ ادبیات اردو لاہور

۱۲۸۔ مغربی پاکستان کے صوفی شعراء .. شعبۂ مطبوعات محکمہ اطلاعات مغربی پاکستان

۱۲۹۔ **اُردو جریدہ**

۱۳۰۔ مفکر مہران .. اختر انصاری اکبرآبادی۔ محکمہ اطلاعات حیدرآباد ۱۹۶۳ء

۱۳۱۔ نغمات لطیف .. اختر انصاری اکبرآبادی .. اطلاعات حیدرآباد ۱۹۶۰ء

۱۳۲۔ نغمہ لطیف .. .. مرحوم ڈاکٹر سید محمد عارف گیلانی .. گورمنٹ پریس کراچی

۱۳۲۔ رسالہ بزم صوفیہ ..

۱۳۳۔ رسالہ خیام لاہور .. مدیر حافظ محمد عالم ۱۶ اپریل ۱۹۲۸ء

۱۳۴۔ رسالہ صوفی .. . مدیر۔ خواجہ حسن نظامی

۱۳۵۔ رسالہ روح ادب مئی، جون ۱۹۵۳ء۔ ۱۹۵۶ء

۱۳۶۔ رسالہ ماہ نو کراچی۔ پاکستان پبلیکیشن کراچی

۱۳۷ رسالہ مخزن نومبر ۱۹۱۸ء مدیر احسان اللہ تاجور نجیب آبادی۔

۱۳۸۔۱۳۹ رسالہ نظام المشائخ جلد دوم محرم الحرام۔ رسالہ نیرنگ خیال اقبال نمبر ۱۹۳۶ء۔

۱۴۰۔۱۴۲۔ رسالہ شیخ قدری سندھی ادب نمبر۔ ۱۹۵۲ء۔ رسالہ نگار ماہ جنوری ۱۹۲۹ء۔ رسالہ ساقی۔ ماہ جنوری ۱۹۲۹ء

فارسی کتب

۱۴۳ - اسد علی خان تمنا ..	گل عجائب ..	ترتیب - مولوی عبدالحق صاحب - انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۳ء
۱۴۴ - امام بخش خادم بدوی حاجی ..	بیاض خادمی .. (مسودہ) ..	
۱۴۵ - جمال الدین علوی شکارپوری ..	بیاض .. (مسودہ) ..	
۱۴۶ - جلال الدین رومیؒ مولانا ..	مثنوی - مفتاح العلوم ..	مولانا محمد نذیر عرشی .. قریشی بک ایجنسی لاہور
۱۴۷ - جلال الدین رومیؒ مولانا ..	رسالہ شمس تبریز	
۱۴۸ - سید فتح علی حسینی گردیزی ..	تذکرہ ریختہ گویاں ..	مولوی عبدالحق صاحب .. انجمن ترقی اردو دکن ۱۹۲۲ء
۱۴۹ - سید عبدالقادر بن سید محمد ہاشم ٹھٹوی ..	حدیقۃ الاولیاء ..	پیر حسام الدین شاہ راشدی - سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
۱۵۰ - سپہ سالار ..	رسالہ فریدون ابن احمد ..	چاپ تہران
۱۵۱ - شیخ سعدیؒ ..	گلستان ..	ملک دین محمد سنز لاہور ۱۹۲۰ء
۱۵۲ - شیخ سعدیؒ ..	بوستان ..	ملک دین محمد سنز لاہور
۱۵۳ - شیخ محمد اعظم ٹھٹوی ..	تاریخ تحفۃ الطاہری ..	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد
۱۵۴ - شمس الدین محمد خواجہ حافظ شیرازی ..	دیوان حافظ ..	موسسہ انتشارات امیر کبیر.
۱۵۵ - شبلی نعمانی شمس العلماء ..	سوانح مولانا رومی ..	مجلس ترقی ادب لاہور.
۱۵۶ - عبدالحکیم عطا ٹھٹوی ..	دیوان عطا ..	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ
۱۵۷ - عبدالوہاب فاروقی سچل سرمست ..	دیوان آشکار ..	منشی بشن لال لکھنو.
۱۵۸ - علی بن عثمان ہجویریؒ داتا گنج بخش ..	کشف المحجوب ..	شیخ ظفر محمد اینڈ سنز تاجران کتب لاہور
۱۵۹ - فقیر اللہ صاحب علوی ..	مکتوبات ..	مولوی کریم بخش - اسلام پریس لاہور.
۱۶۰ - قادر بخش بیدل روہڑی سندھ ..	پنج گنج مسودہ ..	..
۱۶۱ - محمد اقبال ڈاکٹر ..	پیام مشرق ..	..
۱۶۲ - محمد عوفی ..	لباب الالباب ..	..
۱۶۳ - محمد علی ابراہیم خان خلیل ..	تذکرہ گلزار ابراہیم ..	ڈاکٹر سید محی الدین قادری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۳۳ء
۱۶۴ - محمد ابراہیمؒ خلیل ..	تکملہ مقالات الشعراء ..	پیر حسام الدین شاہ راشدی .. سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد ۱۹۵۸
۱۶۵ - میر علی شیر قانع ..	تاریخ تحفۃ الکرام ۱۱۸۱ھ ..	ناصری دہلی ۱۸۷۳ء
۱۶۶ - میر علی شیر قانع ..	مقالات الشعرا ..	سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد سندھ
۱۶۷ - میر عبدالحسین خان سانگی ..	لطائف لطیفی ..	ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ
۱۶۸ - میر تقی میر ..	نکات الشعرا ..	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۵ء
۱۶۹ - مفتی غلام سرور لاہوری ..	خزینۃ الاصفیا دو حصہ ..	منشی نولکشور رائے لکھنو
۱۷۰ - میر حسن دہلوی ..	تذکرہ شعراء اردو ..	مولوی عبدالحق .. انجمن ترقی اردو دکن ۱۹۴۰ء

عربی کتب

١٧١ - قرآن پاک .. تیسوان پاره آسان تفسیر - ابو سعید محمد عبدالحی .. مکتبہ الحسنات رامپور یو۔پی انڈیا

١٧٢ - ابی القاسم عبدالکریم بن ہوزان القشری .. الرسائل القشیریہ الدکتور محمد حسن .. المعهد المرکزی الاکزی محاث الاسلام پاکستان

١٧٣ - محمد بن عبدہ اللہ محمد شیخ ولی الدین اکمال فی اسماء الرجال

١٧٤ - سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ. چہل کاف (مسودہ) بیاض خادمی - حاجی امام بخش خادم

١٧٥ - الیاس انطوف الیاس قاموس الجیب انکلیزی

BIBLIOGRAPHY.

176 - Arberry, A.J. .. Sufism .. George Allen & Union, Londen. 56

177 - AL - Beruni's India .. Alberuni's India .. Authority of Govt of west Pak. Lahore 1962

178 - Bailey, T. Grahame. .. Urdu Literature. .. Association Press Culcutta - 32.

179 - Daudpota. Umar Muhammed .. The Influence of Arabi poetry on the Persian Poetry. The Fort Printing press Bombay 34

180 - Gibb. J.H. .. The Encyclopaedia of Islam. VOL I. AR - The Luzac & Co: Londen 56

181 - Goldsmd. F.G. (Captain) .. Selections from the records of Bombay Govt: Education Society Press Bombay 1855.

182 - Hunter. W. W. .. The Imperial Gazetter of Inida .. Trubner & Co: Londen 1887

183 - John Grierson, George. Abrahim Linguistic Seirvey of India. Vol - VIII .. Superintendent Govt: Press Culcatta Inida 1919.

184 - Kazi Elsa: .. Risalo of Shah Abdul Lateef .. Sindhi Adabi Board: Hyd

185 - Lalwani, Lilaram Watanmal Shah Latif: .. Phanix Press Karachi 1867.

186 - Lazarus. E.J .. Hindutani Proverbs .. Medical Hall Press Banaras.

187 - Muhammad Sadiq History of Urdu Literature .. Oxford University Press Karachi - 1964.

188 - Nicholson. Reynold. A. .. Rumi, Poet and Mystic .. George Allen and Union Londen 50

189 - Sadarangani. H.I Dr: .. Persian poets of Sind. .. Sindhi Adabi Board Hyd:

190 - Schimmel Annemarie Dr: .. Ernst Trumpp .. The Pakistan German Forum Karachi

191 - Smyth, J. W. .. Gazetteer of the Province of Sind Sukkur. Govt: Central Press Bombay 1919

192 - Smyth. J. W. .. Gazettur of the Province of Sind. Larkana. .. " "

193 - Sorley. H. T. .. Shah Abdul Latif of Bhit. .. Oxford University Press Londen 1940.

DICTIONARIES.

194 Abdul Haq Mulavi .. Students Standard English - Urdu Anjman Press Karachi 50

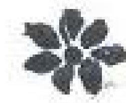
195 Fallon's .. English & Hindustani Dictionary Medical Hall Press Banaras

196 - Parmanad Mewaram ..	Sindhi English - Dictionry ..	Kaiseria Press. Hyderabad. 1910
197 Platt - Jone. I. ..	Urdu, Classical, Hindi & English .. Dictionry 5th (Impission)	Humphry Milford Oxford University Press London
198 Ram Narain Lal	Students Practical English & Urdu .. Dictionry	Natinal Press Allahabad. 1913
199 Tryon Edwards. D.D.	The New Dictionry of Thoughts ..	Classic Publishing Company London - New-York.

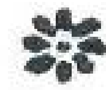
SHAH ABDUL LATIF OF BHIT
And
HIS CONTEMPORARY URDU POETS.



Dissertation For Ph:D; Degree.

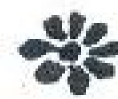


Ghulam Ahmed L. Badwi.
B.A.(Hons); M.A.
Professor.
C&S. GOVERNMENT COLLEGE, SHIKARPUR.



UNDER THE SUPERVISION OF

Dr: Ghulam Mustafa Khan.
M.A. LLB Ph:D. D.LITT:
Head Of The Department Of Urdu
UNIVERSITY OF SIND.



UNIVERSITY OF SIND,
JAMSHORO.
1975

BADVI G. L.


1

19½

Gestetner®

PAPER





FOR GOOD IMPRESSIONS

GHULAM AHMED L. BADWI.
B.A. (Hons) M.A. S.E.S. I
Assistant Professor,
C & S. Government College Shikarpur Sind



(5)

GHULAM AHMED L. BADVI
B A (Hons) M.A. P.E S. (II)
Lecturer,
Government College, Shikarpur.



7

6

7

PACKED PAPER REQUIRE SEPARATING TO ENSURE REGULARITY OF FEEDING

Procceed as follows

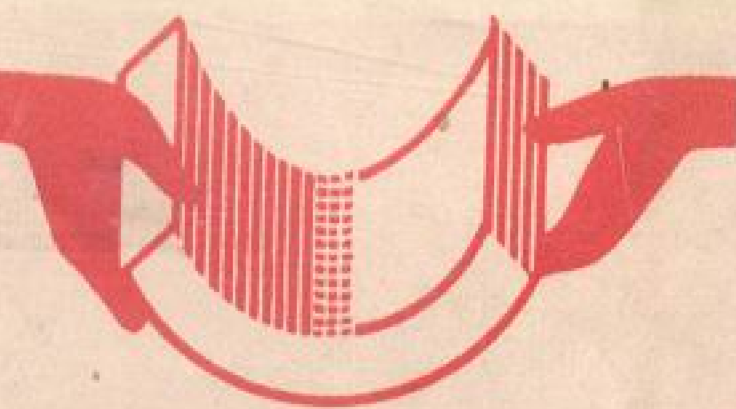
Take the most convenient number of paper that can be handled easily.



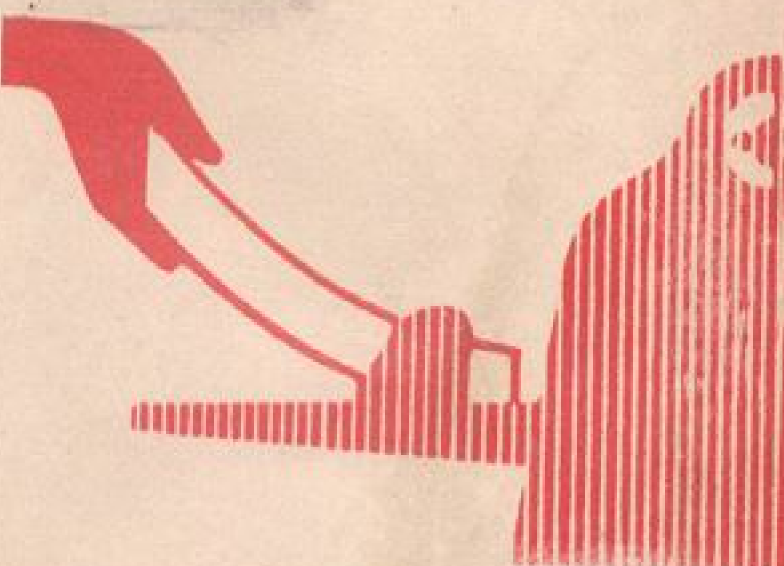
Bend paper across width and length without gripping



Bend paper again across length, grip with *left* hand and release *right* hand.



With paper still gripped in *left* hand, place on Feed board of Machine, allowing it to fall between guides.



(2)

3



Part 2

5/9/75

3/9/75

5

4

128

10

9

6/7/75

(6)

10





(2)

3



Part 2




GHULAM AHMED BUX

GHULAM AHMED L. BADWI
B.A (Hons) M.A.S.Es.(1)
Out Side Hathi Gate Shikarpur Sind

[illegible]

2

(1)

(1)



(2)

3



Part 2

26.02